
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
فروری 2018
PDF
FEBRUARY 2018



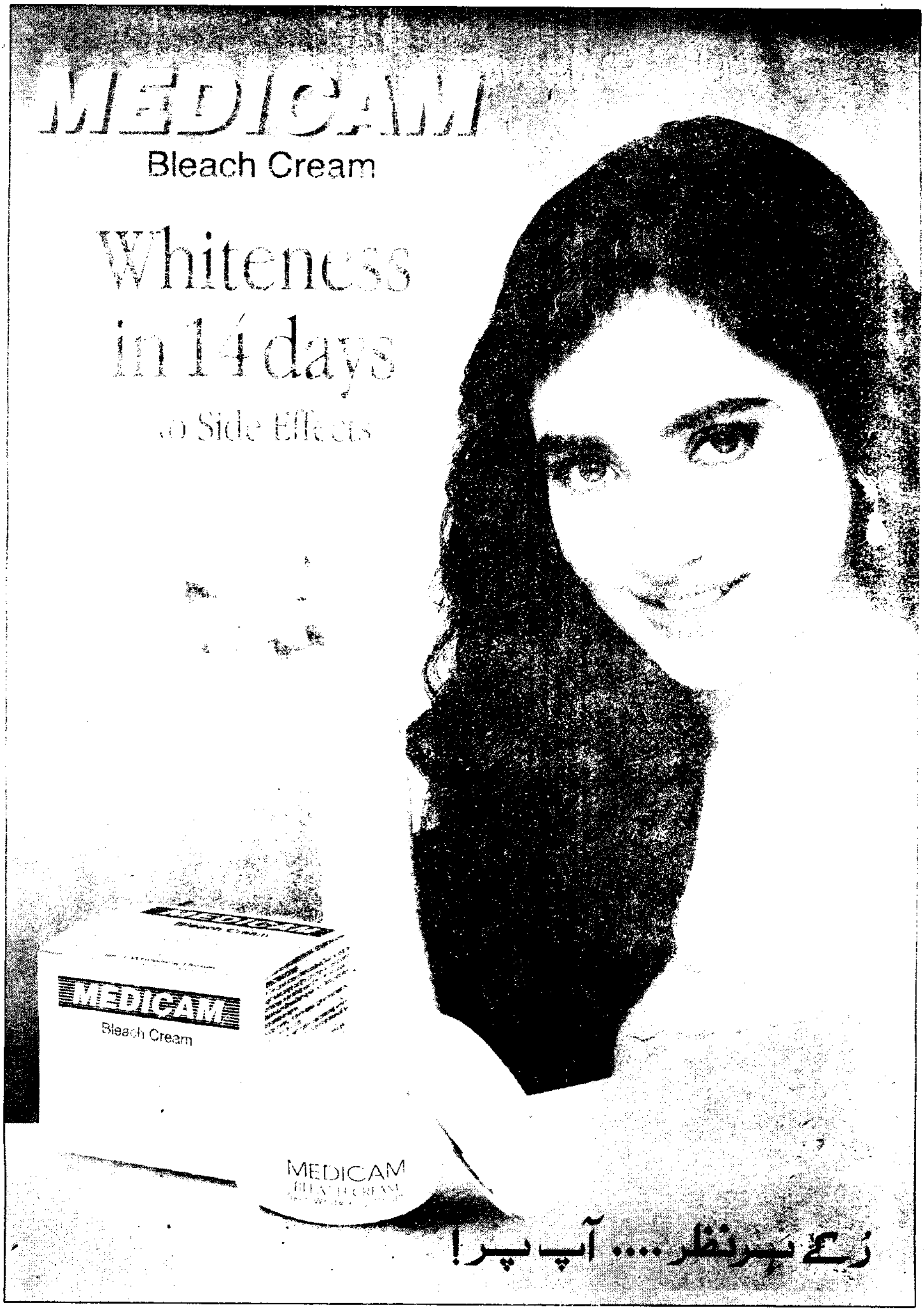
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

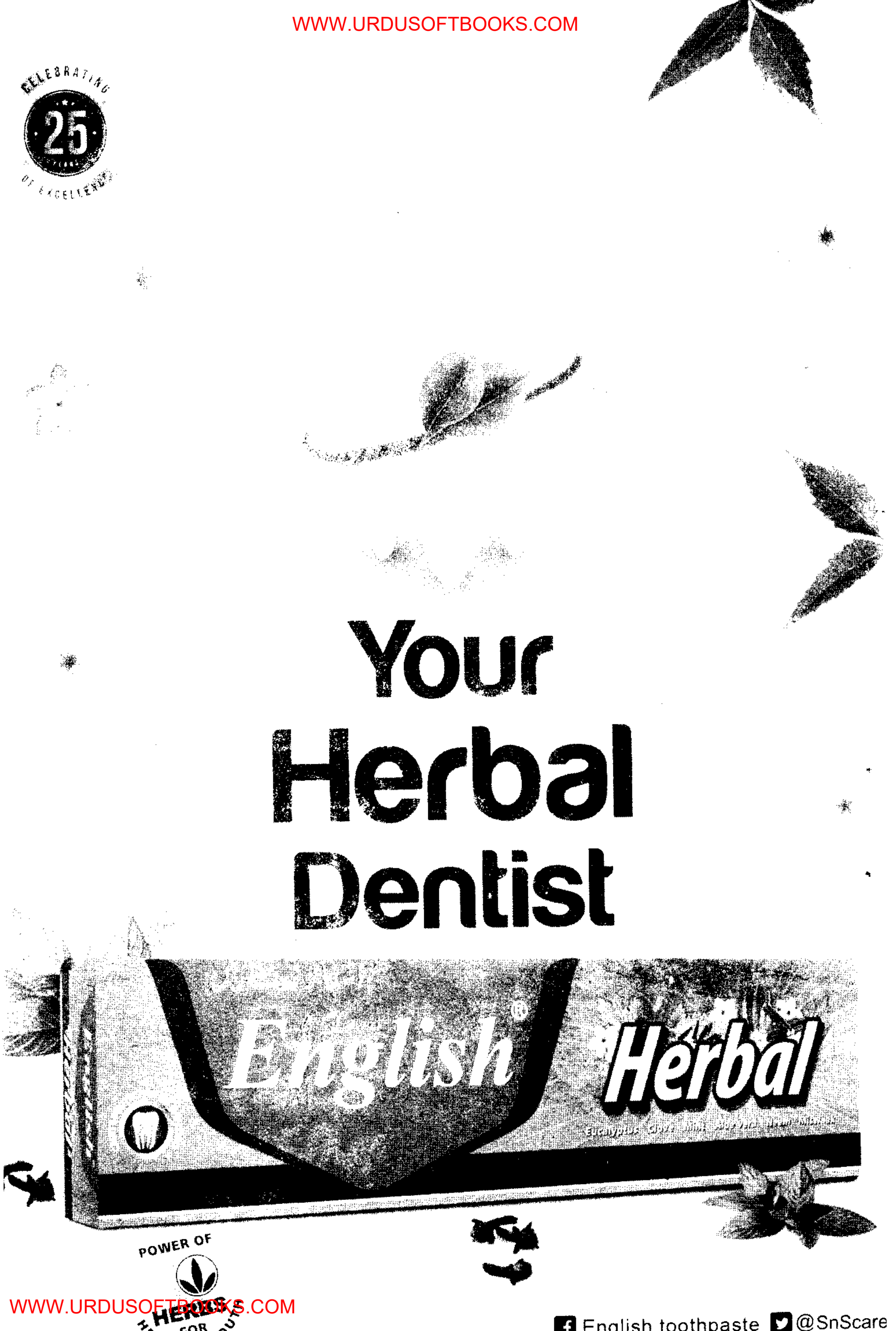


WWW.URDUSOFTBOOKS.COM


تبت
ٹالکم پاؤڈر
TIBET
TALCUM POWDER
KOHINOOR CHEMICAL CO. (PVT) LTD.
KARACHI
اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب
TIBET
Classic
Talcum Powder
TIBET
Select
Talcum Powder
TIBET
Luxury
KOHINOOR CHEMICAL CO. (PVT.) LTD.
KARACHI
کلاسِک
سِلیکٹ
لگژری
تبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام مہکے مہکائے

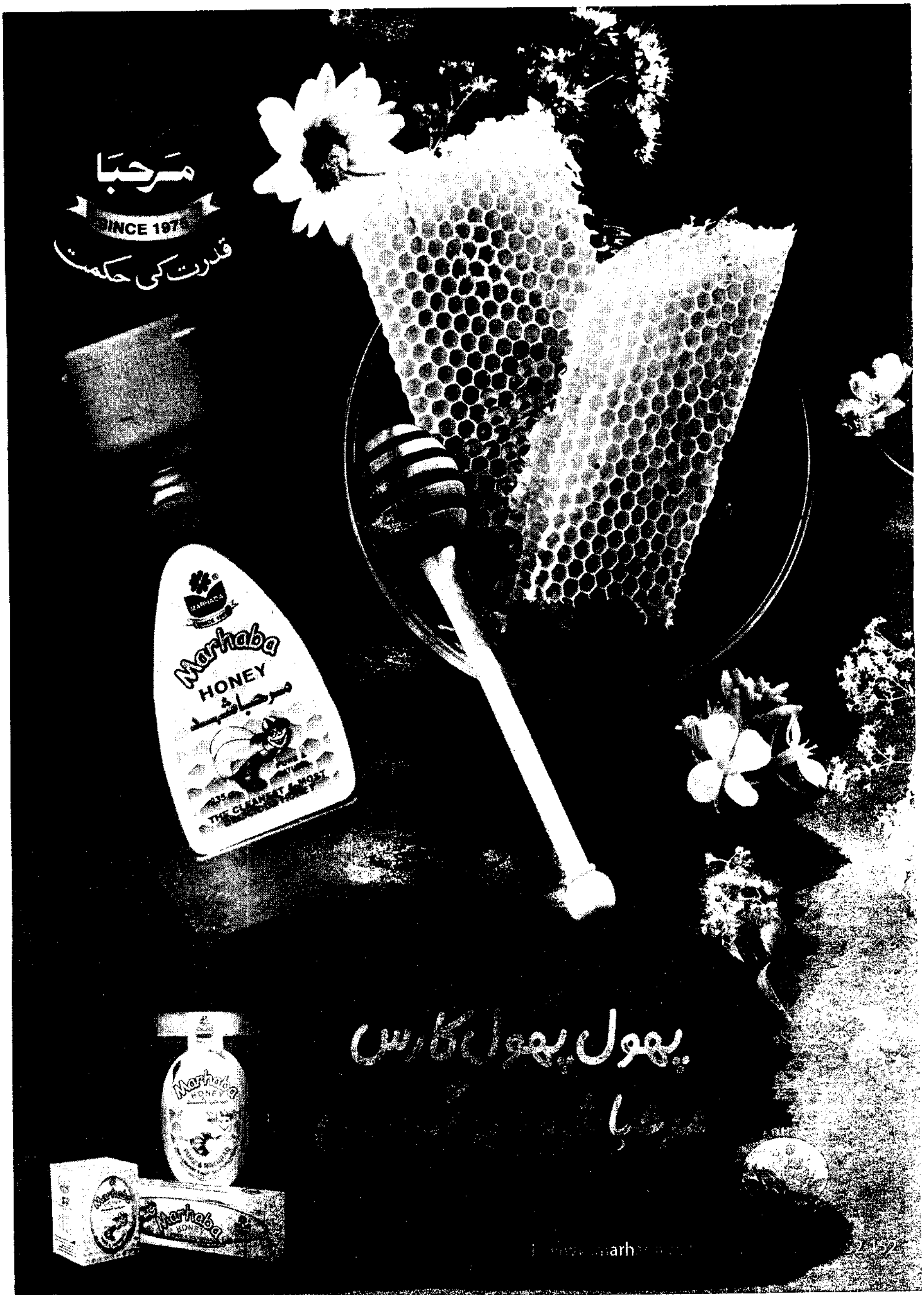
TTP/20/2K17


MEDICAM
Bleach Cream
Whiteness
in 14 days
Side Effects
MEDICAM
Bleach Cream
MEDICAM
رُکے ہر نظر.... آپ پر!


CELEBRATING
25
OF EXCELLENCE
Your
Herbal
Dentist
English®
Herbal
POWER OF
English toothpaste
@SnScare



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM


مرحبا
قدرت کی حکمت
Marhaba
HONEY
مرحبا شہد
پھول پھول کا رس


BAKE
PARLOR
consumers@bakeparlor.com
www.bakeparlor.com
bakeparlor

بانیِ و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— شادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز	MEMBER APNS CPNE

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700	روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000	روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000	روپے



نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشاءاللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تاکہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ



فروری 2018

جلد 45 شمارہ 10

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



Health

دنیا کا سب سے مہنگا زہر جس کی قیمت اربوں روپے میں ہے | World's Most Expensive Poison

computerxtech 0 Oct 03, 2017

اس ایک لیٹر زہر کی قیمت تقریباً ایک ارب 10 کروڑ پاکستانی روپوں کے مساوی دنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایکWorld's Most Expensive Poison(ہے۔ قسم "ل... Readmore

---



Health

بوڑھوں کو جوان بنانے والی سائنس | Old to Young Conversion Science

computerxtech 0 Sep 11, 2017

انسان کے جسم میں خلیوں کی دو سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ فوٹو : فائلپچھلے سال [illegible] 20... Readmore

---



Health

صحت کے معاملے میں خواتین کی 10 سنگین غلطیاں | Ten Health Mistakes by the Women

computerxtech 0 Sep 11, 2017

خوبصورت نظر آنے کے لیے خواتین دنیا بھر کے جتن کرتی ہیں لیکن اکثر کو شکایت رہتی ہے کہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فوٹو، فائلکراچی: اچھی صحت اور خ... Readmore

---



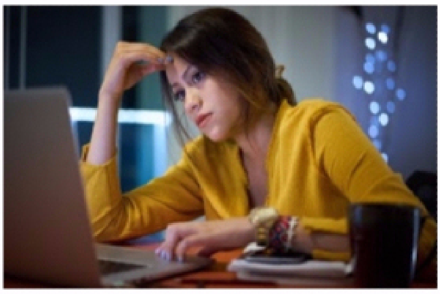
Health

ایسپرین دانتوں کو خرابی سے روک کر انہیں ازخود مرمت کے قابل بناتی ہے | Dental Treatment with Aspirin

computerxtech 0 Sep 11, 2017

کوئنزیونیورسٹی کے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایسپرین دانتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ فوٹو: فائل لندن: سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گھروں میں ... Readmore

---



Health News

فکر اور پریشانی سے نجات پانے کے تین آسان طریقے | Three easy ways to eliminate Tension

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ماہرین نفسیات نے پریشان خیالی سے چھٹکارا پانے کے تین اہم طریقے بیان کئے ہیں۔ فوٹو: فائل لندن: ماہر نفسیات کے مطابق پریشان اور فکرمندی کی س... Readmore

---



Health News

ادرک جوڑوں کے درد کے لیے اکسیر دوا | Benefits of Ginger

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ادرک میں کئی اجزا جلن، درد اور سوزش کو کم کرتے ہیں۔ فوٹو: فائلکراچی: ادرک کے جسمانی و طبی فوائد سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور اب ماہرین نے اس کے اس... Readmore



Interesting News

بچت کرنے کے 7 طریقے | Seven Methods of Savings

computerxtech 0 Oct 13, 2017

پیسہ خرچ کرنا جتنا ضروری ہے، پیسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ بچی ہوئی رقم مستقبل میں کسی آڑے وقت میں کام آ سکتی ہے۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی ... Readmore

---



Interesting News

دنیا کے خطرناک روڈ | World's Most Dangerous Roads

computerxtech 0 Oct 02, 2017

دنیا بھر کے خطرناک ترین روڈ میں ایسی گزرگاہیں شامل ہیں جو اپنی تعمیر، محل وقوع، اونچائی، طوالت اور موسم کی وجہ سے عام سڑکوں کی نسبت مختلف ہیں دنیا بھر... Readmore

---



Interesting News

عرب امارات کے حکمران کروڑوں ڈالر خرچ کرکے زمین پر مریخ بنائیں گے

computerxtech 0 Oct 01, 2017

امارات کی حکومت نے اگلے 100 سال میں مریخ پر انسانی آبادی بسانے کے منصوبے کا افتتاح کردیا. فوٹو: حکومتِ دبئی؛ متحدہ عرب امارات کے حکمران 15 ک... Readmore

---



Interesting News

کیا آپ مریخ پر جانا چاہتے ہیں ؟

computerxtech 0 Oct 01, 2017

مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ پانی کی موجودگی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرخ سیارہ انسان کی دلچسپی کا سبب بن چکا ہے فوٹو: فائل انسان چاند پر... Readmore

---



Interesting News

مریخ کے بارے میں 11 حیرت انگیز معلومات

computerxtech 0 Oct 01, 2017

خلائی کھوجیوں کی بڑی تعداد مریخ پر بھیجی گئی ہے اور امید ہے کہ اگر زمین کے علاوہ زندگی اسی سیارے پر ممکن ہے۔ فوٹو، فائلکراچی: زمین کے بعد مریخ عا... Readmore

---



Interesting News

اے ٹی ایم استعمال کرنے والے اسے ضرور پڑھیں اور فراڈ سے بچیں

computerxtech 0 Sep 24, 2017

سائبر لٹیرے اے ٹی ایم میں تبدیلی کرکے بھی آپ کو قیمتی سرمائے سے محروم کرسکتے ہیں۔ (فوٹو: فائل)کراچی: پورے ملک میں نقد رقم نکلوانے کے لیے آٹو ٹیل... Readmore

مدیر

کچھ تو کہیے

خواتین ڈائجسٹ جنوری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

روز افزوں بڑھتی مادیت پرستی نے جس فضا کو جنم دیا ہے اس میں اخلاقی قدریں پیچھے رہ گئی ہیں۔ اخلاقی سطح پر معاشرے کی روز بروز بگڑتی صورت حال خوف، انتشار اور بے چینی کا باعث بن رہی ہے۔ نفسیاتی امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس صورت حال کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ معاشی ناہمواری اور امن و امان کی بگڑتی صورت حال بھی اس کا ایک سبب ہو سکتی ہے۔ یہ سب اپنی جگہ درست لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرد ہی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ ہم سب حالات کی خرابی کا شکوہ کرتے ہیں۔ لیکن اس خرابی کو دور کرنے کے لیے عملی کوشش کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ اگر ہمارے کچھ حقوق ہیں تو ہم پر کچھ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ فرد کی تبدیلی معاشرے کی تبدیلی ہوتی ہے۔ جب تک ہم اپنی ذمہ داری نہیں سمجھیں گے، حالات میں کوئی سدھار نہیں آئے گا۔

سالگرہ نمبر،

اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں۔

سالگرہ نمبر۔ سروے،

پرچا بہت سے شہروں میں بہت تاخیر سے پہنچتا ہے۔ ہماری قارئین سروے کے جواب لکھ کر بھجواتی ہیں تو وہ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل نہیں ہو پاتے ہیں۔ اس بار ہم فروری کے شمارے میں سوالات لکھ رہے ہیں تاکہ ہماری قارئین سروے میں شرکت کر سکیں۔

زندگی تعلق اور رشتوں سے عبارت ہے اور کہانیاں ان ہی رشتوں کے رنگوں سے آشنا کرتی ہیں۔ ہمارا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔

1۔ ہمارے اردگرد بہت سے رشتے ہیں۔ والدین، بہن بھائی، دوست احباب، پڑوسی، استاد۔ اگر آپ کو ان میں سے کسی ایک کی خوبیوں، خامیوں پر لکھنے کو کہا جائے تو کس کا انتخاب کریں گے؟ اور کیوں؟ پندرہ سطریں لکھیں۔

2۔ ایک کہانی مختلف کرداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ سب سے اہم کردار ہیرو، ہیروئن کا ہوتا ہے۔ لیکن ان سے ہٹ کر کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جو خواہ منفی ہوں یا مثبت ہیرو، ہیروئن سے زیادہ متاثر کن ہوتے ہیں۔ کسی ایسے کردار کا نام لکھیں جس نے آپ کو ہیرو، ہیروئن سے زیادہ متاثر کیا ہو۔

3۔ ؎ ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے
اسی میں کون سا عالم نہیں ہے

اس شعر کے بارے میں کوئی دلچسپ جملہ لکھیے۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 15 مارچ تک موصول ہو جائیں۔ بہترین جوابات پر انعام دیا جائے گا۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ جھوٹی، ، فائزہ جبیں کا مکمل ناول۔ کب ٹھہرے گا دل،
- صدف نثار کے ناول کی دوسری اور آخری قسط، ، بشریٰ احمد کا ناولٹ۔ محبت تیرے رنگ،
- راشدہ رفعت، علیہ خالد، حیا بخاری، سارہ عرفان ، روزینہ معرفت شاہ اور پری زاد کے افسانے،
- آمنہ ریاض اور رمزہ احمد کے ناول، ، مشہور سائیکالوجسٹ مدیحہ لطیف سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ ملی شاہین خان سے باتیں، ، کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

پانچ نمازیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پانچوں نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعے تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک، درمیانی مدت کے گناہوں کو مٹا دینے والے ہیں جب بڑے گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔'' (مسلم)

فائدہ : اس میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ حدیث میں بیان کردہ اعمال صالحہ گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ہیں، لیکن اس وقت جب انسان کبیرہ گناہوں سے اپنا دامن بچا کر رکھے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ معاف ہونے والے گناہ صغیرہ گناہ ہیں۔ کبیرہ گناہ نماز روزوں سے معاف نہیں ہوں گے، ان کے لیے خالص توبہ کی ضرورت ہے۔

جمعہ کی تاکید

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے منبر کے تختوں پر یہ فرماتے ہوئے سنا۔

''لوگ جمعے چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ضرور ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ یقیناً غافل لوگوں میں سے ہو جائیں گے۔'' (مسلم)

فائدہ : غافل لوگوں میں سے ہو جائیں گے، کا مطلب ہے جو اللہ کے ذکر اور اس کے احکام سے بالکل بے پروا ہوں۔ اور ایسے لوگ کافر اور منافقین ہی ہوتے ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ گویا مسلسل جمعے کی نمازوں کا ترک ایک ایسا خطرناک فعل ہے کہ اس سے دلوں پر مہر لگ سکتی ہے جس کے بعد انسان کے لیے فلاح اخروی کی امید ختم ہو جاتی ہے۔

غسل کرنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی شخص جمعے کی نماز کے لیے آئے تو اسے چاہیے کہ (پہلے) غسل کر لے۔'' (بخاری و مسلم)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جمعے کا غسل ہر بالغ آدمی پر واجب ہے۔" (بخاری و مسلم)

واجب سے مراد وجوب اختیاری (استحباب) ہے۔ (موکد ہے نہ کہ ایسا واجب جس کے ترک پر سزا اور عقوبت ہو۔) واللہ اعلم۔

فوائد و مسائل : اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء نے جمعے کی نماز کے لیے غسل کو واجب قرار دیا ہے اور جو وجوب کے قائل نہیں ہیں، وہ امام نووی کی طرح واجب کی مذکورہ تاویل کر لیتے ہیں۔ وجوب یا استحباب غسل میں عورتیں بھی شامل ہیں، اگر وہ جمعے کے لیے مسجد میں جانا پسند کریں۔

راجح یہی ہے کہ بغیر مجبوری کے جمعے کا غسل ترک نہ کیا جائے۔

غسل افضل ہے

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے جمعے کے دن وضو کیا تو اس نے اچھا اور بہتر کیا۔ اور جس نے غسل کیا تو غسل افضل ہے۔"

(اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :

1- یہ حدیث عدم و جوب غسل کے قائلین کی دلیل ہے کیونکہ ایک تو اس میں وضو کی رخصت دی گئی جبکہ اسے اچھا قرار دیا گیا ہے اور دوسرے غسل کو افضل بتلایا گیا ہے جس سے ترک غسل کی اجازت نکلتی ہے۔ بہر حال اس کے مستحب اور مسنون ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ غسل کا وقت طلوع فجر سے خطبہ جمعہ کا وقت ہونے تک ہے۔

2- جو لوگ وجوب غسل کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کی افضلیت اس کے عدم وجوب پر دلالت نہیں کرتی جیسا کہ نماز باجماعت ادا کرنا واجب ہے لیکن یہ کہا گیا ہے کہ جماعت کے ساتھ پڑھی گئی نماز اکیلے نماز سے پچیس یا ستائیس درجے افضل ہے۔ اب اس افضل کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ نماز باجماعت ادا کرنا واجب نہیں ہے۔

جمعہ کا غسل

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص جمعے کے دن غسل کرے، اپنی طاقت کے مطابق پاکیزگی حاصل کرے، تیل لگائے یا اپنے گھر میں موجود خوشبو استعمال کرے، پھر وہ گھر سے نکلے اور (مسجد میں) دو آدمیوں کے درمیان (گھس کر ان میں) تفریق نہ کرے، پھر اس کے مقدر میں جو نماز ہے وہ پڑھے اور جب امام خطبہ شروع کرے تو خاموش رہے تو اس کے اس جمعے سے دوسرے جمعے تک کی درمیانی مدت میں ہونے والے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1- اس میں جمعے والے دن زیادہ سے زیادہ پاکیزگی حاصل کرنے اور تیل یا خوشبو وغیرہ لگانے کی تاکید ہے تاکہ جسم یا کپڑوں سے دوسروں کو بدبو نہ آئے بلکہ خوشبو آئے۔

2- جلدی جانے کی ترغیب تاکہ اسے لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے جانے کی یا دو آدمیوں کے درمیان گھس کر بیٹھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اور اگر مسجد میں جانے میں دیر ہو جائے تو وہ ان آداب کو ملحوظ رکھے اور جہاں جگہ ملے، بیٹھ جائے۔

3- مسجد میں جانے کے بعد نوافل کا اہتمام کرے۔

4- خطبے کے دوران بالکل خاموشی اختیار کیے رکھے اور اسے توجہ سے سنے۔

ان مذکورہ آداب کے ساتھ جو جمعہ پڑھے گا، وہ بیان کردہ فضیلت کا مستحق ہوگا۔

اول وقت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص نے جمعے والے دن غسل جنابت کی مانند (خوب اہتمام سے) غسل کیا، پھر پہلی گھڑی میں (نماز جمعہ کے لیے) گیا، تو گویا اس نے ایک اونٹ اللہ کی راہ میں قربان کیا۔ اور جو اس کے بعد والی گھڑی میں گیا تو اس نے گویا ایک گائے قربان کی۔ اور جو تیسری گھڑی میں گیا تو اس نے گویا سینگوں والا مینڈھا قربان کیا۔ اور جو چوتھی گھڑی میں گیا تو اس نے گویا ایک مرغی کا صدقہ کر کے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ اور جو پانچویں گھڑی میں گیا تو اس نے گویا ایک انڈہ اللہ کی راہ میں صدقہ کیا۔ پھر جب امام (خطبے کے لیے گھر سے) نکل آئے تو فرشتے (مسجد کے اندر حاضر ہو جاتے ہیں اور ذکر سنتے ہیں (نام درج کرنے والا رجسٹر بند کر دیتے ہیں)۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- اس میں نماز جمعہ کے لیے جلد سے جلد جانے کی ترغیب و فضیلت کا بیان ہے۔ جو جتنی جلدی جائے گا، اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہو گا اور تاخیر میں، تاخیر کے تناسب سے ثواب میں کمی ہوتی جائے گی، حتیٰ کہ خطبہ شروع ہونے کے بعد پہنچنے والا سرے سے ان فضیلتوں ہی سے محروم رہتا ہے، کیونکہ فضیلتوں والے رجسٹر میں اس کا اندراج ہی نہیں ہوتا۔

2- نماز جمعہ میں فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں جس سے جمعے کے خطبے اور نماز کی اہمیت واضح ہے۔

3- جمعے کا غسل خوب اہتمام سے کرنا چاہیے، جیسے جنابت کے غسل میں کیا جاتا ہے۔

قبولیت کی گھڑی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعے کے دن کا ذکر کیا تو ارشاد فرمایا: ''اس میں ایک گھڑی ہے، جس مسلمان بندے کو وہ میسر آ جائے اور وہ کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہو، تو وہ اللہ سے جس چیز کا سوال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔''

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس گھڑی کے مختصر ہونے کا اشارہ فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

1- اس میں جمعے کے دن کی ایک اور فضیلت کا بیان ہے کہ اس میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ اس میں کی گئی دعا اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتا ہے۔ یہ گھڑی مختصر سی ہوتی ہے اور اس کا وقت بھی نہیں بتلایا گیا، اس لیے جمعے والے دن کثرت سے اللہ کا ذکر اور اس سے دعا و مناجات کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ انسان اس ساعت سعید کو پا سکے جو قبولیت دعا کی ساعت ہے۔

حضرت ابوبردہ بن ابوموسیٰ اشعری رحمتہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''کیا تم نے اپنے والد سے جمعہ کی ساعت کے وقت کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہوئے سنا ہے؟''

حضرت ابوبردہ کہتے ہیں'' میں نے کہا: ہاں، میں نے اپنے والد سے سنا، وہ فرما رہے تھے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے نماز جمعہ کے ختم ہونے تک ہے۔'' (مسلم)

فائدہ:

اس گھڑی کی بابت علماء کے مابین بہت اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک راجح قول وہ ہے جو اس حدیث پر مبنی ہے کہ قبولیت دعا کی یہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے نماز کے ختم ہونے تک کے درمیانی وقفے میں ہوتی ہے۔ لیکن شیخ البانی وغیرہ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو موقوف قرار دیا ہے۔ دوسرے علماء نے ابوداود اور نسائی کی ایک مرفوع روایت کی بنا پر، جس میں اس گھڑی کو عصر کے بعد آخری ساعت میں تلاش کرنے کا حکم دیا گیا

ہے، عصر کے بعد مغرب سے پہلے اس کا وقت قرار دیا ہے۔

درود کا حکم

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہارے دنوں میں سب سے زیادہ فضیلت والا دن جمعے کا دن ہے، پس تم اس دن میں مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو، اس لیے کہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' (اسے ابوداود نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل:

1- اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ زمان و مکان کے شرف سے عمل صالح میں بھی مزید فضیلت کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے، جیسے اس حدیث میں جمعے کے دن زیادہ درود پڑھنے کا حکم ہے۔

2- اس دن درود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ براہ راست آپ کسی کا درود نہیں سنتے، قریب سے نہ بعید سے۔ قریب سے سننے کی ایک روایت مشہور ہے لیکن وہ صحیح نہیں۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ آپ خود کسی کا درود نہیں سنتے، فرشتے ہی آپ تک درود پہنچاتے ہیں۔

3- درود کے بہترین الفاظ وہی ہیں جو درود ابراہیمی میں ہیں کیونکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتلایا ہوا درود ہے۔

سجدہ شکر

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکے سے مدینہ جانے کی نیت سے نکلے۔ پس جب ہم عزورا جگہ کے قریب پہنچے تو آپ اپنی سواری سے نیچے اُترے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ دیر اللہ سے دعا فرمائی۔ پھر آپ سجدے میں گر گئے اور کافی دیر تک سجدے میں رہے، پھر کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ اٹھا کر کچھ دیر دعا فرمائی اور پھر سجدے میں گر گئے، اس طرح آپ نے تین مرتبہ کیا اور فرمایا۔

''میں نے اپنے رب سے سوال کیا اور اپنی امّت کے لیے شفاعت کی تو اللہ نے مجھے میری امت کا تہائی حصہ عطا فرمایا۔ چنانچہ میں شکر کے طور پر اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ پھر میں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے رب سے اپنی امت کے لیے سوال کیا تو میرے رب نے مجھے میری کا ایک تہائی عطا کیا۔ میں پھر شکر کے طور پر اپنے رب کے لیے سجدے میں گر پڑا۔ پھر میں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے رب سے اپنی امّت کے لیے سوال کیا تو اللہ نے مجھے آخری تہائی بھی عطا کر دیا۔ پس میں اپنے رب کے لیے سجدہ ریز ہو گیا۔'' (ابوداود)

فوائد و مسائل:

1- اپنی امت کے لیے سوال اور اس کے لیے شفاعت کرنے کا مطلب اس کے لیے مغفرت اور اسے جنت میں داخل کرنے کی دعا ہے۔

2- اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ امت محمد یہ کے تمام افراد، جنہوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا ہوگا، بالآخر جنت میں چلے جائیں گے، جہنم میں ہمیشہ کے لیے کوئی نہیں رہے گا۔ کوئی اپنے کبیرہ گناہوں کی سزا بھگت کر، کوئی شفاعت کے ذریعے سے اور کوئی اللہ کے فضل خاص سے۔ یہ مفہوم بلاشبہ اپنی جگہ صحیح ہے جو دوسری احادیث سے ثابت ہے اور اہل سنّت کا یہی عقیدہ ہے۔ اس لیے خوشی کے موقع پر یا کسی مصیبت کے ٹلنے پر بطور شکر الٰہی سجدہ ریز ہونا جائز اور صحیح ہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو اسے سن کر وہ بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گئے۔

رات کے قیام کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور رات کے کچھ حصے میں نماز تہجد ادا کرے۔ یہ تیرے لیے ایک زائد عمل ہے۔ امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو (قیامت کے دن) مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ان (اہل ایمان) کے پہلوان کے بستروں سے دور رہتے ہیں۔" (الاسراء 79)

اور فرمایا: "وہ (اہل ایمان و تقویٰ دنیا میں) رات کو کم ہی سویا کرتے تھے۔"

فائدہ آیات:

1- نافلۃ لک کا ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ اے پیغمبر! یہ تہجد کی نماز تجھ پر ایک زائد فرض ہے، جب کہ دیگر افراد امت پر یہ فرض نہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ تیرے ثواب اور درجات میں بلندی کا باعث ہے۔ دوسری آیات میں شب بیداری (قیام اللیل) کو اہل ایمان و تقویٰ کی خاص صفت اور ان کا معمول بتلایا گیا ہے جس سے نماز تہجد، یعنی قیام اللیل کی اہمیت و فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے اور اس کی ترغیب و تاکید بھی۔

شکر گزاری

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اتنا قیام فرماتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیر مبارک پھٹ جاتے۔ میں نے (ایک دن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

"اے اللہ کے رسول! آپ کیوں اتنی مشقت برداشت فرماتے ہیں جب کہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بھی بخش دیے گئے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا میں (اللہ کا) شکر گزار بندہ نہ بنوں۔" (بخاری و مسلم)

حضرت مغیرہ بن شعبہ سے بھی بخاری و مسلم میں اسی طرح روایت ہے۔

فوائد و مسائل:

1- رات کی نفل نماز پورے اطمینان، سکون اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے۔

2- جس شخص پر اللہ کے جتنے انعامات زیادہ ہوں، اسے اسی حساب سے زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت بھی کرنی چاہیے۔ بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز کے اظہار کا بہترین وقت آخر شب ہے۔

ترغیب

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رات کو تشریف لائے تو فرمایا:

"کیا تم (تہجد کی) نماز نہیں پڑھتے؟" (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی شب بیداری اور سحر خیزی کی تاکید کی جائے تا کہ وہ بھی مزید فضیلت حاصل کر سکیں۔

عاجزی

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے میری طرف اس بات کی وحی فرمائی ہے کہ تم عاجزی اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور نہ کوئی کسی دوسرے کے مقابلے میں فخر کرے۔" (مسلم)

فائدہ: اللہ نے کسی کو مال و دولت اور جاہ و منصب یا حسن و جمال یا علم و فضل عطا کیا ہو تو یہ اس پر اللہ کا احسان ہے، اس کو اللہ کے حکم کے مطابق تواضع اور عاجزی اختیار کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہیے نہ کہ فخر و غرور کا اظہار کر کے اللہ کی ناشکری اور لوگوں پر ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرے۔

تین چربہ کہانیاں، ننھے منّے بدھوؤں کے لیے

انشا جی

''اچھا تو میرے پیارے بزرگو! راج دلارے بزرگو! اب حقے کا ایک کش لو اور سو جاؤ، تم کام کر کے تھک گئے ہو گے۔ ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ کل کا کام آج پر نہ ڈالو یعنی جو کام کل ہو سکتا ہے اسے آج مت کرو۔ آرام بھی بڑی ضروری چیز ہے بلکہ زریں اصول تو یہ ہے کہ ''پہلے آرام۔ پھر بھی آرام''۔

''کہانی سنیں گے۔''

''ارے بدھونٹ کھٹ بدھو! ہم کہانیاں کہاں سے لائیں، نئی کہانیاں تو آج کل فلم والوں کو بھی نہیں ملتیں۔ بے چارے کابل جاتے ہیں اور وہاں سے ہینگ، سلاجیت، ٹرانزسٹر ریڈیو اور چربہ کہانیاں لاتے ہیں۔ اچھا تم بھی کچھ نصیحت آمیز کہانیاں ہم سے سنو، لیکن شور مت کرنا، چین سے سننا۔

۱۔ ایک گرو کے دو چیلے

ایک تھا گرو، بڑا نیک دھرماتما، دو اس کے چیلے تھے۔ وفادار، جاں نثار، گرو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کے لیے تیار۔ ایک کا شبھ نام پور بول تھا، دوسرے کا پچھمی چند۔ گرو جی جب لوگوں کو اپدیش دینے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد آرام کرنے کو لیٹتے تو چیلا پور بول ان کی داہنی ٹانگ دباتا پچھمی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی مٹھی چاپی کرتے، تیل چپڑ کر اسے چمکاتے۔ جھنڈیاں اور گھنگھرو باندھ کر اسے سجاتے، اس پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ ایک روز کرنا پرماتما کا ایسا ہوا کہ گرو جی ایک کروٹ لیٹ گئے اور ان کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پور بول کو بہت غصہ آیا، اس نے فوراً ایک ڈنڈا اٹھایا اور بائیں ٹانگ کے رسید کیا۔ گرو جی نے بلبلا کر داہنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب پچھمی چند کی غیرت نے جوش مارا، اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور بائیں ٹانگ کی خوب ہی مرمت کی۔ گرو جی بہت چلائے کہ ظالمو! کیوں مار ڈالتے ہو، ہائے۔ لیکن چیلے کہ علاقائی خود مختاری کے قائل تھے کب مانتے تھے۔ دونوں نے اخباری بیان جاری کیے اور زیادتی میں پہل کرنے کا الزام ایک دوسرے کو دیا، گرو جی کی ٹانگیں سوج کر کپا ہو گئیں، مدتوں ہلدی چونا لگانا پڑا۔''

''بس؟''

''نہیں، بس کیوں، کہانی آگے بھی چلتی ہے۔ لالہ پچھمی چند کے کئی بیٹے تھے، بڑے ہونہار اور ہوشیار، پشاوری مل، لاہوری رام، سندھو پرکاش وغیرہ جب لالہ پچھمی چند کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گرو جی کی ٹانگ تو دباتے تھے لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دباتا تھا، کوئی پنڈلی پر زیادہ محنت کرتا تھا، کوئی گھٹنے پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست جھگڑا ہوا اور طے ہوا کہ ہم اپنا اپنا حصہ الگ کر لیں گے، لالہ پور بول نے کہا۔

''ہاں ہاں ٹھیک کر رہے ہو، میں بھی اپنے حصے کی ٹانگ کاٹ کر لے جا رہا ہوں، اب ان برخورداروں نے گنڈاسہ منگایا، ایک نے ران سنبھالی بوری میں ڈالی، دوسرے نے پنڈلی لے لی۔ تیسرے نے گھٹنا اٹھایا اور گھر کی راہ لی، اس کے بعد سے سبھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔''

''گرو جی کا کیا ہوا؟''

''معلوم نہیں کیا ہوا، کہانی میں اس کا ذکر نہیں، حد سے حد مر گئے ہوں گے، اچھا اب اور ایک اور کہانی سنو۔

۲۔ مچھیرا اور انعام

''اچھا تو سنو! ایک مچھیرے کے ہاتھ ایک عمدہ سی

مچھلی آئی تو وہ انعام واکرام کی خواہش میں اسے لیے بادشاہ کے محل پہنچا اور اندر جانے کی کوشش کی۔ دربان نے روکا۔

"ہے کہاں جاتا ہے' پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے۔"

مچھیرے نے مدعا بیان کیا، دربان نے کہا۔ "دیکھ بابا جو کچھ انعام ملے' اس میں سے چھپن فیصدی میں لوں گا۔" مچھیرا آدھے پر راضی ہو گیا لیکن دربان اپنے چھپن فیصدی پر اڑا رہا بلکہ بولا۔ "اگر بادشاہ نے اس مچھلی کو برآمد کر کے فارن ایکسچینج کمایا تو اس میں سے بھی چھپن فیصد لا کر مجھے دینا۔" خیر اس بے چارے کو ہامی بھرنی پڑی۔ بادشاہ مچھلی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ "مانگ کیا انعام مانگتا ہے۔"

مچھیرے نے کہا۔ "حضور! اللہ کا دیا اور تو سب کچھ ہے' بس سو جوتے میرے سر پر کس کے لگا دیے جائیں۔"

بادشاہ بہت حیران ہوا۔ سمجھانے کی کوشش کی لیکن بوڑھا مچھیرا اڑا رہا، آخر بادشاہ نے ایک چوبدار سے کہا۔ "اس کے سر پر ہلکے ہلکے سو چھتر لگا دو' دماغ خراب معلوم ہوتا ہے بچارے کا۔"

جب گنتی چوالیس پر پہنچی تو مچھیرے نے کہا۔ "حضور بس میرا اس میں اتنا ہی حصہ ہے، باقی چھپن جوتوں کا حق دار باہر ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔"

بادشاہ نے پورا حال سنا، انصاف پسند تھا' اس نے کہا۔ "ہاں بھئی بات تو ٹھیک ہے' جمہوریت کا زمانہ ہے' ہر چیز میں اس کا حصہ واجب، ملنا چاہیے خواہ بے بھاؤ کے جوتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اب تو ہم اپنے ملک میں بھی یہ کرنے والے ہیں کہ اگر ایک حصے میں چوالیس آدمی پانی نہ ملنے سے پیاسے مر جائیں تو دوسرے میں چھپن کر پکڑ کر تالاب میں ڈبو دیا جائے، بے انصافی کب تک چلے گی۔"

"اچھا بس اب ہم تھک گئے۔"

"ایک اور...... ایک اور"

۳۔ دیوگری سے واپسی

اچھا اب ہم تمہیں ایک تاریخی حکایت سناتے ہیں' ملک ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا محمد تغلق۔ بڑا عقل والا' علم و فضل والا' ایک روز اس کو خیال آیا کہ دہلی میں اور تو ساری خوبیاں ہیں لیکن یہ ہندوستان کے وسط میں نہیں۔ اس نے فوراً نقشہ منگایا' پرکار رکھ کر دیکھا' معلوم ہوا کہ دکن کے اوپر دیوگری کا مقام زیادہ مرکزی ہے' فوراً حکم دیا کہ مابدولت کا دارالخلافہ وہاں بنایا جائے اور دہلی کی آبادی' نہ صرف اہل کار بلکہ اہل حرفہ بھی کوچ کر کے وہاں چلے جائیں۔ یہ ہمارا حکم ہے کوئی سرتابی نہ کرے، رعایا خچروں اور چھکڑوں پر بیوی بچے' مال اسباب لاد' روانہ ہوئے۔ کئی مہینے کی راہ تھی۔ کہیں ڈاکوؤں نے حملہ کیا، کہیں جنگلی جانور آن پڑے' بہت سے مرکھپ گئے، جو پہنچے انہوں نے وہاں سر چھپایا' کاروبار جمایا، مقام پُر فضا تھا پسند آیا لیکن نازک مزاج شاہاں، ایک روز جانے کیوں ان کا جی دیوگری سے اچاٹ ہوا اور انہوں نے فرمان جاری کیا کہ چلو دلی واپس۔ یہاں ہمارا جی نہیں لگتا، جو لوگ بچ گئے تھے' ان میں سے آدھے پھر ڈاکوؤں، جنگلی جانوروں اور راہ کی سختیوں کا شکار ہوئے' بس تھوڑے سے بُرے حالوں واپس پہنچے' اب اس سے بھی کئی اخلاقی نتیجے نکلتے ہیں' بھلا بتاؤ تو کیا......؟

خررر...... خررر......

"ارے کیا سو گئے! اچھا السلام علیکم! خدا حافظ، شب بخیر۔"



سائیکالوجسٹ

مدیحہ لطیف سے ملاقات

شاہین رشید

ہمیں کوئی جسمانی تکلیف ہو تو ہم فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ذہنی مسئلہ ہو، ڈیپریشن ہو تو ہم ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے۔ کیونکہ اس کا علاج کسی ایلو پیتھک ڈاکٹر کے پاس نہیں ہوتا۔ بلکہ ماہر نفسیات کے پاس ہوتا ہے۔ مگر لوگ ماہر نفسیات کے پاس اس لیے نہیں جاتے کہ کہیں کوئی انہیں پاگل نہ سمجھ لے۔ یا پاگل نہ کہہ دے اور اگر بہ حالت مجبوری جاتے بھی ہیں تو سب سے اس بات کو چھپاتے ہیں حالانکہ نفسیات باقاعدہ ایک علم ہے اور اس کے ماہر بھی موجود ہیں۔

اس بار آپ خواتین ڈائجسٹ میں پہلی بار کسی سائیکالوجسٹ (ماہر نفسیات) کا انٹرویو پڑھیں گے۔ ڈاکٹر مدیحہ لطیف سائیکالوجسٹ ہیں۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ سائیکولوجی کیا ہے اور نفسیاتی امراض کا کیا طریقہ علاج ہے۔

''کیا حال ہے ڈاکٹر صاحبہ''؟

''الحمدللہ۔ سب ٹھیک ہے۔''

''آپ بہت مصروف رہتی ہیں۔ کبھی ٹیچنگ تو کبھی مریضوں کے سیشن۔ اپنی مصروفیات کے بارے میں بتائیں۔''

''جی میں ٹیچنگ بھی کرتی ہوں اور مریضوں کے سائیکالوجیکل سیشن بھی کرتی ہوں۔ ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی کا ایک ڈیپارٹمنٹ ہے انسٹیٹیوٹ آف فزیکل میڈیسن اینڈ ری ہیبلی ٹیشن اس کے اندر نیورو سائیکیاٹری ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس کی میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہوں۔ اور بہ حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر کے ٹیچنگ بھی کرتی ہوں۔ ڈاکٹر آف فزیو تھراپی کے جو طالب علم ہوتے ہیں۔ ان کو پڑھاتی ہوں اور پراستھیٹکس ڈیپارٹمنٹ جو مصنوعی پیر لگاتا ہے اس کے اسٹوڈنٹ کو سائیکالوجی اینڈ بی ہیویر Behaviur سائنسز پڑھاتی ہوں۔

اس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی میں ایک ڈیپارٹمنٹ ہے، انسٹیٹیوٹ آف کلینکل سائیکالوجی وہاں بھی پڑھاتی ہوں اور جو ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طالب علم ہوتے ہیں، ان کی میں سپرویژن کلاسز بھی لیتی ہوں اور ہر طرح سے ان کی مدد کرتی ہوں کہ کس طرح کی بیماری کو تشخیص کیا جاتا ہے اور جتنے ذہنی امراض ہیں جیسے ڈیپریشن ہے۔ اینگزائٹی ہے یہ نام جو آپ سب نے سن رکھے ہیں، ان کا علاج ہم

سائیکالوجیکل تھراپی کے ذریعے سے کرتے ہیں۔
جیسے سائیکاٹرسٹ میڈیسن کے ساتھ ڈیل کرتا ہے۔ ہم سائیکالوجسٹ سائیکو، فزیوتھراپی کے ساتھ ڈیل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اسپتال ''زینب پنجوانی'' ہے وہاں میں ہر پیر 5:30 سے 7:30 تک اپنا کلینک کرتی ہوں، اس کے علاوہ قوت سماعت سے محروم اور بلائنڈ بچوں کا ایک اسکول ہے، وہاں میں ان بچوں کا ایک سیشن لیتی ہوں جو ان کی نفسیات پر مبنی ہوتا ہے۔ فیز ٹو میں نیورو کلینک ہے وہاں میں اپنی پرائیویٹ پریکٹس کرتی ہوں۔''

''اصل میں نفسیات ہے کیا؟''

''بنیادی طور پر نفسیات اسٹڈی ہے ذہنی رویے کی جو لوگ ذہنی امراض کا شکار ہوتے ہیں ہم ان کے ذہن کی پیمائش کرتے ہیں کچھ سائیکالوجیکل ٹیسٹ کے ذریعے سے۔''

''کہتے ہیں کہ جو نفسیات پڑھتا ہے وہ خود بھی آدھا پاگل ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسا کیوں کہا جاتا ہے۔''

''یہ آپ نے بہت ہی دلچسپ سوال کیا ہے کہ ایسا کیوں ہے تو سچ بات تو یہ ہے کہ نہ تو اس کی کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی کوئی ثبوت کہ نفسیات پڑھنے والا بھی آدھا پاگل ہوتا ہے۔

چند مشہور ماہر نفسیات کی اگر کیس ہسٹری پڑھی جائے تو یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں کچھ ایسے مسائل کا شکار رہے کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں خود ذہنی مریض بن گئے۔ مگر اس بات کو حتمی طور پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ تمام ماہر نفسیات اپنی آخری عمر میں ذہنی مریض ہوجاتے ہیں۔

بنیادی طور پر ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں انسان کی اپنی ذاتی زندگی میں کچھ ایسے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں کہ اگر انہیں صحیح سے ڈیل نہ کیا جائے تو کوئی بھی انسان ذہنی مریض بن سکتا ہے۔ مگر ریسرچ اس بات کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کرتی کہ نفسیات کا مضمون پڑھنے والے ضرور کسی نہ کسی ذہنی مرض کا شکار ہوں گے۔''

''لوگ ماہر نفسیات کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ کوئی انہیں پاگل نہ سمجھے؟''

''ابھی ہمارے یہاں ذہنی امراض اور ماہر نفسیات کے لیے (قبولیت) موجود نہیں ہے کہ اگر ماہر نفسیات کے پاس جائیں گے تو لوگ انہیں پاگل کا لیبل لگائیں گے اور اس لیبل کے ساتھ لوگ ڈیل نہیں کرپاتے اور لوگ ابھی بھی شرم محسوس کرتے ہیں ماہر نفسیات کے پاس جانے سے اور جیسا کہ آپ نے کہا کہ لفظ پاگل کیوں استعمال کیا جاتا ہے تو یہی وہ لفظ ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ ماہر نفسیات کے پاس نہیں جاتے اور وہ اس وجہ سے جھجکتے ہیں اپنے پرابلم شیئر کرنے سے اور اندر اندر اپنے مرض کو یا کیفیات کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور جتنا وہ دباتے جاتے ہیں اتنی ہی ان کی بیماریاں پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

لوگ ڈرتے ہیں کہ اگر کسی کو یہ بات پتا چل گئی کہ وہ اس طرح کا علاج کروا رہا ہے تو اس کے اردگرد کے جو لوگ ہیں جو رشتے دار ہیں، وہ اسے پھر ایک نارمل انسان نہیں سمجھیں گے۔ تو ہم نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا ہے اور اس نظریے کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ جہاں جسمانی بیماریوں کو اہمیت حاصل ہے وہاں نفسیاتی بیماریاں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں اور نفسیاتی مریض بھی بہت زیادہ تکلیف کا شکار ہوتا ہے اور اگر اس کا علاج کیا جائے اور اس کی مدد کی جائے تو وہ بہت آسانی سے اپنی تکلیف سے باہر آجاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب لوگوں کی اکثریت بڑے پُراعتماد انداز میں ماہر نفسیات سے رابطہ کرتی ہے۔

اگر بچے کو پڑھنے میں کچھ پرابلم ہے۔ یا بات سمجھنے میں کوئی مسئلہ ہے تو اسکول والے ماہر نفسیات کو بچے کے پاس بھیجتے ہیں کہ وہ اس بچے کو ڈیل کریں اور اس کے

مسائل حل کریں۔ ہمارا میڈیا بھی اس سلسلے میں کام کر سکتا ہے اور کچھ چینلز تو کر بھی رہے ہیں اور امید ہے کہ بہت جلد لوگ نفسیات اور اس کے علاج کی اہمیت کو قبول کرلیں گے۔ مگر ابھی بھی ایسے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں جو خود بھی شرم محسوس کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی منع کرتے ہیں ماہر نفسیات کے پاس جانے سے۔

''کیا نفسیاتی بیماریوں کی بھی اقسام ہوتی ہیں؟''

''جس طرح جسمانی بیماریاں بہت ساری ہوتی ہیں۔ اسی طرح نفسیاتی بیماریوں کی بھی بہت ساری اقسام ہوتی ہیں اور ان کی علامات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہم ڈپریشن کی بیماری کی بات کریں جسے ہم عام لفظوں میں ''اداسی کی بیماری'' کہتے ہیں۔ اس میں روز مرہ کے معمولات میں مریض کی دلچسپی ختم ہوجاتی ہے۔ اس کا بار بار رونے کا دل کرتا ہے۔ اداسی کی کیفیت ہر وقت پائی جاتی ہے اور ان علامات پر ہم تشخیص نہیں کرتے بلکہ اس کے کچھ ٹیسٹ کرواتے ہیں جس میں کچھ ہم سوالات کرتے ہیں اور ان کے جوابات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس لیول کا ڈپریشن ہے۔ شدید ہے، یا ہلکا ہے۔

اس طرح اینگزائٹی کی بیماری ہوتی ہے۔ جسے ہم گھبراہٹ کی بیماری بھی کہتے ہیں۔ اس میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ فوبیا ہوتا ہے جس میں جانور کا خوف ہوسکتا ہے۔ پانی کا خوف ہوتا ہے یا اونچائی کا خوف ہوتا ہے تو ان کی علامات کو ٹیسٹ کے ذریعے سے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان میں بیماری کس لیول کی ہے۔

اس طرح ایک بیماری ہوتی ہے جسے شیزوفرینیا کہا جاتا ہے۔ اس میں مریض کو ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو اس کے اردگرد کے لوگوں کو نہیں سنائی دے رہی ہوتیں۔ اس کو ایسی چیزیں دکھائی دے رہی ہوتی ہیں جو اس وقت ماحول میں موجود نہیں ہوتیں۔ وہ بول نہیں پاتا، اس کا حقیقت سے تعلق ختم ہوجاتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی کی کمی ہوجاتی ہے۔

جب مریض ہمارے پاس آتا ہے اور وہ اپنی کیفیات بتاتا ہے تو پھر ہم سوالات کے ذریعے سے ٹیسٹ کرتے ہیں اور بیماری کا لیول دیکھتے ہیں۔ اس میں مریض کو جو خیالات آتے ہیں، وہ انہیں اپنے دماغ میں روک نہیں پاتا۔ ایک دوڑ لگی ہوتی ہے سوچوں کی، خیالات کی اور وہ اسے روک نہیں پاتا۔ اسے وہم ہوجاتا ہے کہ اس کے ہاتھ گندے ہیں اور وہ انہیں بار بار دھوتا ہے۔ اس طرح کے دیگر ''وہموں'' کی وجہ سے انہیں اپنے روزانہ کے کام کرنے میں مشکلات پیش آرہی ہوتی ہیں۔ تو سب بیماریوں کا فوری علاج نہیں کرتے بلکہ پہلے تشخیص کرتے ہیں پھر اس کا علاج کرتے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ مجھے ڈپریشن ہو رہا ہے، اینگزائٹی ہو رہی ہے تو ہم اسے فوری طور پر دوائی نہیں دیتے بلکہ جیسا کہ کہا کہ ٹیسٹ ہوتا ہے۔ دیگر بیماریوں میں ایک بیماری یہ بھی ہے کہ نفسیاتی دباؤ جسم پر حاوی ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں لگ رہا ہوتا ہے کہ جیسے ان کا بازو یا ہاتھ ہل نہیں رہا۔ یا انہیں کسی جگہ شدید درد محسوس ہوتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی ٹیسٹ کروائے جائیں تو اس میں کوئی بیماری سامنے نہیں آتی۔ تو پھر ایسے مریضوں کو ماہر نفسیات کے پاس بھیجا جاتا ہے۔

اس طرح کچھ بچے بے چین طبیعت کے ہوتے ہیں۔ وہ کچھ چیزوں کے لیے انتظار نہیں کرسکتے۔ ان کی کسی چیز پر توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ پھر ان کو ایگزامن کرکے دیکھتے ہیں کہ ان کو تھراپی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ بچوں کے ساتھ بھی بہت مسائل ہوتے ہیں اور ان مسائل کی تشخیص

کر کے پھر ان کا علاج کرتے ہیں۔"
"کیا یہ علاج اس لیے اتنا مہنگا ہے کیونکہ دوائیاں مہنگی ہیں۔"
"یہ علاج بھی دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ سائیکلو جسٹ ہوتے ہیں، وہ تھراپسٹ کے ساتھ ڈیل کرتے ہیں اور جو ماہر نفسیات ہوتے ہیں وہ دواؤں کے ساتھ علاج کرتے ہیں اور دواؤں کے بارے میں آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ بہت مہنگی ہوتی ہیں اور لمبے عرصے تک میڈیسن لینی ہوتی ہیں۔ لیکن اب کچھ لوکل برانڈز آ گئے ہیں جو کہ اتنے زیادہ مہنگے نہیں ہیں اور سائیکو تھراپی بھی ایک مہنگا علاج ہے اور تھراپی کا دورانیہ بھی لمبا ہوتا ہے۔ جو مریض ذاتی مسائل کا شکار ہوتے ہیں انہیں تیس تیس سیشن بھی لینے پڑتے ہیں۔ اب گورنمنٹ کے ادارے ہیں جہاں سے یہ سروسز مفت لے سکتے ہیں۔
"خواتین نفسیاتی مسائل کا شکار زیادہ ہوتی ہیں یا مرد حضرات؟ یا لڑکے یا لڑکیاں؟"
"یہ تو نہیں بتایا جا سکتا کہ کون نفسیاتی بیماری کا شکار زیادہ ہوتا ہے۔ ہر بیماری الگ الگ ہوتی ہے۔ جیسے "ہسٹیریا" بہت کامن بیماری ہے اور یہ بیماری خواتین میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ بہت کم مرد حضرات اس کا شکار ہوتے ہیں۔ اینگزائٹی اور ڈپریشن مرد اور عورت دونوں میں عام ہے۔ اس طرح آٹیزم ڈس آرڈر زیادہ تر لڑکوں میں ہوتا ہے۔ ہر بیماری میں عورتوں اور مردوں کو الگ الگ دیکھا جاتا ہے۔
"خوراک کا بھی کچھ عمل دخل ہوتا ہے؟ رنگوں کا، کھلے آسمان کے نیچے نہ جائیں، اس طرح کی باتوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔"
"جی.... کچھ ایسی غذائیں ہوتی ہیں جو ہم مریض کے لیے کم منتخب کرتے ہیں کہ جن کو کھانے سے ان کا اسٹریس لیول ہوتا ہے۔ جیسے کہ "جئی" ہے وٹامن سی ہے۔ ہلکا پھلکا میٹھا کھانے سے بھی ہمارا موڈ بہتر ہوتا ہے۔ اسی طرح کچی سبزیاں اسٹریس (دباؤ) کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ فروٹ کا استعمال زیادہ کرنے کو کہتے ہیں۔ فروٹ میں ناشپاتی، اس طرح بلیک کافی اور چائے بھی استعمال کرنے کے لیے کہا جاتا ہے اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مریض کا کولسٹرول تو ہائی نہیں ہے۔ وہ شوگر کا مریض تو نہیں ہے۔
ڈرائی فروٹ جیسے پستہ بادام بھی اسٹریس کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے نہ رہیں یا بیٹھیں اس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس طرح پانی میں جانے، قدرتی ماحول پر بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ قدرتی ماحول کے قریب جا کر مریض اچھا فیل کرتے ہیں۔ اس طرح رنگوں کے حوالے سے بھی کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی۔
عموماً جو ڈپریشن کے مریض ہوتے ہیں ان کا رجحان لائٹ کلر کی طرف ہوتا ہے۔ اگر ان کی سائیکو تھراپی کی جارہی ہوتی ہے تو ان کی ظاہری حالت کو دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگ اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ تو انہیں اچھی طرح تیار ہونے کو بھی کہا جاتا ہے۔
"یہ علاج ایلوپیتھی سے کتنا مختلف ہے"؟
"جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ذہنی امراض کا علاج دو طرح سے ہوتا ہے، ایک دوائی سے دوسرا تھراپی سے، ماہر نفسیات دوائیں تجویز کرتا ہے، وہ ایسی دوائیں مریض کو دیتا ہے جو ڈپریشن کو کم کرتی ہیں۔ مریض کے دماغی خلیات میں کیمیکل کی کمی بیشی سے جو نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں۔ ان سے پیدا ہونے والے رویے کو بہتر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ مریض کے جو روزمرہ کے معمولات متاثر ہو رہے ہوتے ہیں ان کی بحالی میں مدد دیتی ہیں۔ اس کی گھبراہٹ کم کرتی ہے۔ مختلف مشقوں کے ذریعے تھراپی کی جاتی ہے۔ باہر کے ملکوں میں دوائیوں کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے۔ تو وہاں ڈپریشن اور اینگزائٹی کا علاج تھراپی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں لوگوں کو اتنی معلومات نہیں ہیں اس لیے ان کا خیال ہوتا ہے کہ مریض صرف

دوائیوں سے ہی ٹھیک ہوسکتا ہے۔ تو یہاں سے لوگوں کا علاج سائیکاٹرسٹ کے پاس ہوتا ہے بہ نسبت سائیکلوجسٹ کے۔

سائیکاٹرسٹ اور سائیکلوجسٹ میں فرق ہوتا ہے۔ اس بارے میں آپ کچھ بتانا چاہیں گی؟"

"جی، میں آپ کو بتانا چاہوں گی کہ سائیکالوجسٹ کی بھی بہت ساری اقسام ہوتی ہیں۔ جیسے کلینکل سائیکالوجسٹ اور سائیکالوجسٹ وہ ہوتا ہے جو تمام ذہنی امراض، بیماریوں اور مسائل کو حل کرنے میں مریض کی مدد کرتا ہے۔ یہ سائیکالوجسٹ اسپتالوں میں کام کرتے ہیں، کلینک میں کام کرتے ہیں۔

ایک ایجوکیشنل سائیکلوجسٹ ہوتا ہے۔ وہ اسکول اور یونیورسٹی میں کام کررہا ہوتا ہے۔ وہ وہاں پہ بچوں کے رویّے اور تعلیمی مسائل کو ڈیل کررہا ہوتا ہے اور ٹیچرز کی تربیت کررہا ہوتا ہے۔ بچوں کو گروم کررہا ہوتا ہے اور بچوں کے والدین کو بلا کر بچوں کے پرابلمز کو حل کرنے میں مدد کرتا ہے۔

اس طرح اسپورٹس سائیکلوجسٹ بھی ہوتا ہے جو کہ کھلاڑیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان پر سے دباؤ کو کم کرنا، ٹیم کو بلڈ کرنا۔ انہیں متحد رکھنا ہوتا ہے ان کے پرابلمز کو حل کرنا سائیکالوجسٹ کا کام ہوتا ہے۔

اس طرح ایک نیوروسائیکالوجسٹ ہوتا ہے۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جتنے بھی ذہنی امراض ہوتے ہیں جیسے فالج ہوجاتا ہے یا بھول جانے کی بیماری ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ضمنی ذہنی مسائل ہوتے ہیں ان کو حل کرتا ہے۔

اس طرح سے ایک آرگنائز سائیکالوجسٹ ہوتا ہے۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی تنظیم میں کام کررہا ہوتا تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ کام کے لیے رکھے جارہے ہیں، وہ جاب کے لیے صحیح ہیں یا نہیں۔ پھر وہاں کی مینجمنٹ کے ایشوز حل کرتے ہیں۔ بڑی بڑی انڈسٹریز میں بھی سائیکلوجسٹ کو ہائر کیا جاتا ہے حتیٰ کہ جب فورسز میں لوگ اپلائی کرتے ہیں تو وہاں بھی سائیکالوجسٹ کو لوگوں کے انتخاب کے عمل میں شامل کیا جاتا ہے اور وہ خاموشی سے کمرے کے ایک کونے میں بندے کو جانچنے کے لیے بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ بندے کی جسمانی حرکات کا، اس کے تاثرات کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اس کے بارے میں ایک رپورٹ بنا کے دیتا ہے اس کے بعد فورسز میں اس کی تعیناتی ہوتی ہے۔

"نفسیاتی بیماریوں کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔"

"کچھ وجوہات ایسی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ذہنی امراض جنم لیتے ہیں۔ اس میں جسمانی وجوہات بھی ہوتی ہیں۔ جس میں دماغی خلیات میں کیمیکل غیر متوازن ہوجاتے ہیں اور بیماریاں پیدا ہورہی ہوتی ہیں۔ کچھ نفسیاتی عوامل ہوتے ہیں، جیسے کہ آپ کی فیملی میں کسی کا انتقال ہوجائے اور آپ اس صدمے کو برداشت نہ کرپائیں یا طلاق یا علیحدگی، اس طرح کی تبدیلیاں نفسیاتی بیماریوں کو جنم دیتی ہیں۔

اس طرح اگر آپ کسی ایسے ایریا میں رہتی ہیں جہاں آپ کو سیکیورٹی کے خدشات ہوں۔ یا وہاں کچھ ایسے ایشوز ہیں جن کے ساتھ ڈیل نہیں کرپارہیں تو یہ بھی آپ کے لیے ذہنی دباؤ کا باعث بن سکتے ہیں۔

اس طرح اگر آپ کی فیملی کے ایشوز ہیں۔ آپ کے والدین بچوں کی پرورش میں بہت سخت رویہ رکھتے ہیں تو یہ ساری باتیں بھی نفسیاتی بیماریوں کو جنم دیتی ہیں اور اگر کسی کو مالی پریشانیاں ہیں تو یہ بھی نفسیاتی بیماری کا سبب بنتی ہیں۔ اسی طرح کینسر، ہیپاٹائٹس، شوگر ہے۔ ان کے ساتھ بھی منسلک ہوتی ہیں ذہنی بیماریاں۔ اگر کسی کو جان لیوا بیماری ہوجائے جس کو آپ برداشت نہیں کرپارہے ہوتے تو اس کے لیے آپ کو سائیکلوجسٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر فیملی میں کوئی بچہ معذور یا ابنارمل پیدا ہوتا ہے تو ماں اور باپ بہت صدمے کا شکار ہوجاتے ہیں تو ان کے اندر بھی نفسیاتی مسائل جنم لے لیتے ہیں۔"

"چلیں جی بہت باتیں ہوگئیں، آپ کے

پروفیشن کے بارے میں اب آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"پنجاب میں ایک جگہ ہے "کھاریاں" اس کے نزدیک ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہے، جس کا نام ہے "ڈنگا" وہاں میرا جنم ہوا۔ مادری زبان پنجابی ہے اور میرے والد زمین دار تھے۔ میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی ہوں۔ میرے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں اور میں بچپن سے ہی تھوڑی سوشل تھی اور لوگوں کے مسائل حل کرنا یا ان کا دکھ بانٹنا مجھے اچھا لگتا تھا۔

تو میری امی مجھے اکثر کہا کرتی تھیں کہ "یا تو اسے سوشل ورک پڑھا دو یا نفسیات۔ مجھے لگتا ہے کہ اس میں یہ زیادہ کامیاب ہوگی۔" ایک تو اماں نے کہا پھر جب میں کالج میں آئی اور اپنی مرضی سے نفسیات کے مضمون کا انتخاب کیا اور جب اس کو پڑھا تو مجھے بہت اچھا لگا اور میری دلچسپی اس میں بڑھتی گئی۔

میں نے بنیادی تعلیم اپنے ٹاؤن سے ہی حاصل کی اور میٹرک میں میں نے ٹاپ کیا تھا تو میرے والد نے میرا داخلہ لاہور کے کوئین میری کالج میں کروادیا۔ وہاں سے میں نے انٹرمیڈیٹ کیا پھر بیچلرز کیا۔ پھر میں نے ایم ایس سی کلینکل سائیکالوجی کوئین میری لاہور سے ہی کیا۔ اور جب مزید دلچسپی بڑھی تو میں لاہور سے کراچی آگئی۔

یہاں پر ایک ڈپلومہ کورس کیا "پی ایم ڈی پوسٹ مجسٹرڈ ڈپلومہ ان کلینکل سائیکالوجی، یہ ایک سال کا ڈپلومہ ہوتا ہے جو کہ میں نے "بحریہ یونیورسٹی" سے کیا۔ پھر بحریہ یونیورسٹی سے ہی میں نے ایم فل کیا۔ اور سلور میڈلسٹ ہوں میں بحریہ یونیورسٹی کی، پھر بحریہ یونیورسٹی میں ٹیچنگ بھی کی اور بہ حیثیت اسٹوڈنٹ کاؤنسلر میں نے کام کیا کچھ عرصہ، اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اسٹارٹ کی اور انسٹی ٹیوٹ آف کلینکل سائیکالوجی سے اپنا پی ایچ ڈی مکمل کیا۔

آئیڈا ریو اسکول جو گونگے، بہرے اور نابینا بچوں کا ہے اس میں دس سال سے کام کر رہی ہوں اور اب ان کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بھی ہوں۔ سوشل ورک میں مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں روٹری کلب آف کراچی کاسموپولٹن کی ممبر ہوں اور ان کے ساتھ بہت ساری سروسز پروجیکٹ کرتی ہوں۔ فارغ اوقات میں ان ہی کے ساتھ کام کرتی ہوں۔"

"فارغ اوقات میں کام کرتی ہیں، مصروف رہتی ہیں۔ اتنا کچھ پڑھا آپ نے گھر میں کس نے ساتھ دیا؟"

"میرا اتنا سارا پڑھنے میں میرے والد کا بہت اہم رول ہے۔ میں اپنے گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جس نے بی اے کیا۔ پھر ماسٹرز کیا۔ ایم فل کیا اور پی ایچ ڈی کیا۔ والد صاحب کی بہت خواہش تھی کہ میں پی ایچ کروں، 2014 میں والد صاحب انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ان ہی کی سپورٹ، ان ہی کا دیا ہوا اعتماد، آج میں جو کچھ ہوں اپنے والد کی وجہ سے"۔

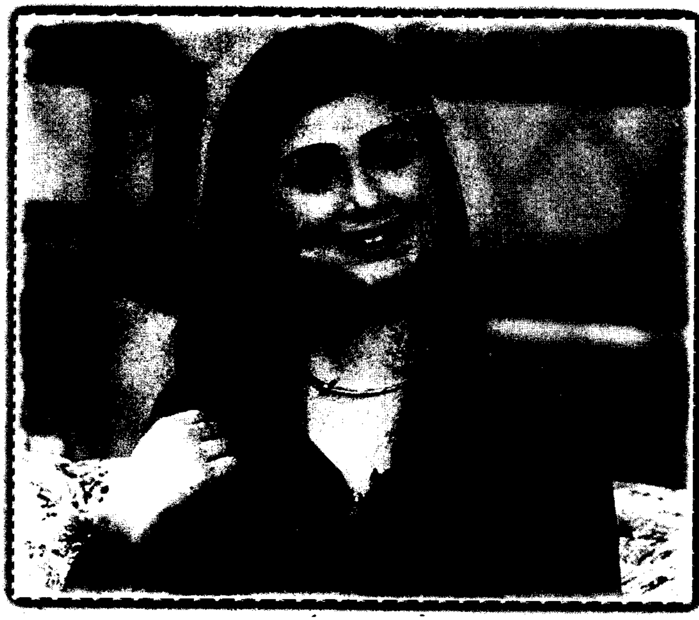
"کوکنگ سے لگاؤ ہے؟"

"کوکنگ میں مجھے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ اچھا کھانے کا بہت شوق ہے۔ کتابیں پڑھنے کا مجھے بہت شوق ہے اور میری پسندیدہ رائٹر "الف شفق" ان کے ناول میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں نے اپنے والد کے ساتھ "شہاب نامہ" پڑھا۔ جن دنوں وہ بیمار تھے میں انہیں "شہاب نامہ" پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ اگرچہ انہوں نے اسے پہلے پڑھا ہوا تھا لیکن ان کو پسند بہت تھا تو بیماری میں میں نے انہیں پڑھ کر سنایا۔"

"شادی ہوئی؟"

مسکراتے ہوئے۔ "نہیں جی۔ شادی نہیں ہوئی۔"

"چلیں جی بہت شکریہ کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت ہمیں دیا۔"



"حنا کی خوشبو" کی حنا

اداکارہ علی شامین خان سے باتیں

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''

''علی شامین خان۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''دوستوں میں شاموں بلاتے ہیں اور گھر والے مجھے پیاری کہتے ہیں۔''

3 ''تاریخ پیدائش/شہر؟''

''3 دسمبر 1993ء/کراچی۔''

4 ''ستارہ/تعلیمی قابلیت؟''

''برج قوس/بی کام بھی کیا ہے اور نیشنل اکیڈمی سے ایکٹنگ میں ڈپلوما بھی کیا ہے۔''

5 ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''

''دو بڑے بھائی اور میں۔''

6 ''شادی؟''

''نہیں جی ابھی نہیں ہوئی۔''

7 ''شوبز میں آمد؟''

''عذرا محی الدین لائیں جن سے میری ملاقات ''ناپا'' میں ہوئی تھی دوران تعلیم۔''

8 ''گھر والے خوش ہیں؟''

''جی ......بس شروع میں تھوڑی سی پرابلم ہوئی۔اب سب خوش ہیں۔''

9 ''پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟''

''پہلا پروگرام ''گوہر نایاب'' تھا اور بہت ہٹ گیا تھا اور یہ ''اے پلس'' سے آن ایئر ہوا تھا۔''

10 ''پہلی کمائی......؟''

''تھیٹر میں پہلی کمائی ہوئی تھی اور تین دن کے مجھے۔ پیسے ملے تھے اور کسی کو نہیں دیے..... خود ہی استعمال کیے۔''

11 ''صبح کب ہوتی ہے آپ کی؟''
''صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں اور اٹھتے ہی جوس پینے کو دل چاہتا ہے اور وہ بھی فریش۔''

12 ''اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟''
''مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگتا، مگر سب میری تعریف بہت کرتے ہیں''

13 ''گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟''
''مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں سکون ملتا ہے اور میں وہاں اکثر سو بھی جاتی ہوں۔''

14 ''بچپن کا ایک خواب جو ابھی تک پورا نہیں ہوا؟''
''مجھے پائلٹ بننے کا بہت شوق تھا۔ مگر یہ خواب ادھورا رہ گیا۔''

15 ''شدید بھوک کب لگتی ہے۔ دوپہر میں یا رات میں......؟''
''مجھے شدید بھوک دن میں ایک بار لگتی ہے اور جب لگتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں بریانی کھاؤں۔''

16 ''کوکنگ سے لگاؤ؟''
''بہت زیادہ ہے اور الحمد للہ سب کچھ پکا لیتی ہوں۔''

17 ''اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟''
''کسی سے نہیں بول پاتی، مجھے لگتا ہے کوئی میرے مسائل کو سمجھ نہیں پائے گا۔''

18 ''کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟''
''تو کوئی مسئلہ نہیں۔''

19 ''پہلی ملاقات میں کیا بات نوٹ کرتی ہیں؟''
''کہ سامنے والے کا بولنے کا انداز کیسا ہے۔''

20 ''آئینہ دیکھتی ہیں تو کیا خیال آتا ہے؟''
''کہ میں بڑی ہوتی جارہی ہوں۔''

22 ''زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟''
''میں آج کل اپنے ''ورک آؤٹ'' کے لیے وقت نہیں نکال پاتی۔''

23 ''دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟''
''عصر کا ٹائم مجھے اچھا لگتا ہے۔''

24 ''آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟''
''میرے خیال میں امی میرے لیے سب سے آگے کھڑی ہوں گی کہ میری جان لے لو۔''

25 ''رونا جلدی آتا ہے؟''
''بہت جلدی، آنسو تو میری پلکوں پہ رکھے ہیں۔''

26 ''اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کیا مانگتیں؟''
''مجھے اتنا قابل بنا دے کہ میں اپنی ماں کی خدمت کر سکوں۔''

27 ''گھر کے کس فرد نے آپ کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا؟''
''میری امی نے......میری امی نے اس فیلڈ کے لیے بہت سپورٹ کیا اور اگر ان کا تعاون نہ ہوتا تو میں اس فیلڈ میں نہ ہوتی۔''

28 ''کوئی غلطی جس کو سوچ کر پشیمانی محسوس کرتی ہیں؟''
''میرا تو یہ ماننا ہے کہ جو ہوتا ہے ''اچھے'' کے لیے ہی ہوتا ہے، اس لیے گلٹی محسوس نہیں کرتی۔''

29 ''کھانا کس کے ہاتھ کا پکا پسند ہے؟''
''امی کے ہاتھ کا۔''

30 ''اور ناشتہ؟''
''اپنے ہاتھ کا۔''

31 ''ناشتہ کرنا کتنا ضروری ہے؟''
''بہت ضروری ہے، بندہ فریش رہتا ہے، ایکٹو

رہتا ہے۔"

32 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

" کوئی ایسی بات جس کی توقع نہ ہو اور وہ ہو جائے تو بس پھر موڈ بہت خراب ہو جاتا ہے۔"

33 "کبھی غصے میں کھانا چھوڑا؟"

"ٹینشن میں ہوتی ہوں تو پھر کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔"

34 "موڈ کے برخلاف کوئی بات ہو جائے تو؟"

"تب مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ کوئی غلط بات کر دے، کوئی بغیر کسی معلومات کے کوئی بات کر دے تو بس......"

35 "آپ اکثر ہم کلام ہوتی ہیں؟"

"اپنے رب سے اور اپنے آپ سے۔"

36 "دکھ ہوتا ہے؟"

"جب کوئی اچھائی کا بدلہ برائی سے دیتا ہے۔ وہ رویہ جو آپ ڈیزرو نہیں کرتے، آپ کے ساتھ کوئی رکھے تو دکھ ہوتا ہے۔"

37 "زندہ رہنا چاہتی ہیں کب تک؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں سوچا اور نہ ہی ایسی کوئی خواہش ہے۔"

38 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے۔ لڑکے یا لڑکیاں......؟"

"بھروسے کے قابل ایک اچھا انسان ہوتا ہے خواہ وہ لڑکی ہو یا لڑکا۔"

39 "ایک چینج جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتی ہیں؟"

"اپنی اموشنل طبیعت کو بدلنا چاہتی ہوں۔"

40 "بور ہوتی ہیں تو کیا کرتی ہیں؟"

"میں اپنی دوستوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں چلی جاتی ہوں۔ کھانا کھاتی ہوں، انجوائے کرتی ہوں۔"

41 "فلم کی......؟"

"جی......ابھی ریلیز نہیں ہوئی، اس میں میرا لیڈ رول ہے۔ سمیع خان کے ساتھ، فلم کا نام "کم" ہے۔"

42 "آج سے چند سال بعد آپ کہاں ہوں گی؟"

"میں اگر اسی طرح کام کرتی رہوں اور محنت کرتی رہوں تو ان شاء اللہ میں بہت کامیاب رہوں گی۔"

43 "قسمت پہ کتنا یقین ہے؟"

"بہت زیادہ یقین ہے کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں بہت قابل لوگ دیکھے ہیں مگر ان کی قسمت اچھی نہیں ہے تو وہ کامیاب بھی نہیں ہیں۔"

44 "خدا سے کوئی شکوہ؟"

"نہیں اللہ پاک سے کوئی شکوہ نہیں ہے...... اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر چیز کی فراوانی دی ہوئی ہے۔"

45 "کبھی "چھٹی حس" ایکٹو ہوئی؟"

"ہمیشہ......ہمیشہ......لوگوں کی سوچ کو میں پکڑ لیتی ہوں۔ کہ کون میرے ساتھ مخلص ہوگا کون نہیں۔ کس کی مدد کرنی چاہیے اور کس کی نہیں۔"

46 "گھر آکر کیا خوش ہوتی ہیں؟"

"کہ اچھا اچھا کھانا کھاؤں امی کے ہاتھ کا......اور امی سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔"

47 "آپ کی کس عادت سے گھر والے چڑتے ہیں؟"

"رات کو دیر تک جاگنا، میرے بھائیوں کو بھی پسند نہیں اور امی کو بھی......مگر میں کیا کروں مجھے نیند نہیں آتی۔"

48 "کبھی رشوت دے کر کام کروایا؟"

"نہیں......ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

49 "کب کس پہ چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"

"نہیں، میں ایسی نہیں ہوں۔ ہاں اگر کوئی گالی دے تو پھر میں خاموش نہیں رہتی۔"

50 "کس قسم کے رول بہت پسند ہیں؟"

’’رومینٹک رول۔‘‘

51 ’’مرنے سے ڈر لگتا ہے؟‘‘
’’ہاں جی...... بہت دل گھبراتا ہے۔‘‘

52 ’’شادی کی تقریبات میں اس لیے شرکت کرتی ہیں کہ ؟‘‘
’’کہ میں وہ رسم انجوائے کر سکوں جس میں دودھ کی تھالی میں گلاب ڈال کر انگوٹھی ڈھونڈنے کی رسم اور آئینے میں جب دولہا دلہن ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔‘‘

53 ’’لیٹ نائٹ تقریبات پسند ہیں؟‘‘
’’ہاں جی...... بہت پسند ہیں۔ دوستوں کی برتھ ڈے ہو یا شادی کی تقریب...... بہت انجوائے کرتی ہوں۔‘‘

54 ’’سائنس کی بہترین ایجاد......؟‘‘
’’بہت ساری ایجادات بہترین ہیں۔ خاص طور پر فون (موبائل)۔‘‘

55 ’’آپ کو دلچسپی ہے؟‘‘
’’نئی نئی ایجادات سے اور ہر طرح کی ٹیکنالوجی سے۔‘‘

56 ’’جھوٹ کب بولتی ہیں؟‘‘
’’جب میں کہیں پھنس جاتی ہوں تو جھوٹ بول ہی دیتی ہوں۔ یا کسی بڑے جھگڑے سے بچنے کے لیے بھی جھوٹ بول دیتی ہوں۔‘‘

57 ’’وقت کی پابندی کرتی ہیں؟‘‘
’’کرتی ہوں...... ہاں کام میں پھنس جاؤں تو نہیں کر پاتی۔‘‘

58 ’’شوبز میں ایک بات جو نوٹ کی......؟‘‘
’’کہ یہاں اگر سفارش اور پسندیدگی کا عنصر کم ہو جائے تو بہت اچھا ٹیلنٹ بیکار بیٹھا ہے، اسے بھی موقع مل جائے گا۔‘‘

59 ’’اگر بازار سے خوشیاں ملتیں تو کیا خریدتیں؟‘‘
قہقہہ...... ’’اگر اچھا شوہر مل رہا ہوتا تو ضرور خرید لیتی۔‘‘

60 ’’بے بس ہو جاتی ہیں......؟‘‘
’’جب میں کسی کے لیے کچھ کر سکتی ہوں مگر کر نہ پاؤں تب۔‘‘

61 ’’انجوائے کرتی ہیں؟‘‘
’’چھٹی کا دن...... اس دن تھوڑا سو کے، موی دیکھ کر، کوکنگ کر کے۔‘‘

62 ’’موبائل سروس آف ہو تو؟‘‘
’’بہت برا لگتا ہے کیونکہ سب سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے، فون مجھے بہت عزیز ہے۔‘‘

63 ’’زندگی کب بری لگتی ہے؟‘‘
’’جب تھوڑی جیب خالی ہو۔ تو بہت بری لگتی ہے۔‘‘

64 ’’کوئی مسلسل دیکھے تو ؟‘‘
’’پوچھ لیتی ہوں کہ کوئی مسئلہ ہے یا کوئی کام ہے۔‘‘

65 ’’آپ کو جو بات بری لگتی ہے؟‘‘
’’کہ مجھے کوئی دوسروں کی مثال دے کہ دیکھو وہ ایسی ہے اور تم ایسی نہیں ہو۔‘‘

66 ’’رشتہ جس نے دکھ دیا ہو؟‘‘
’’نہیں اللہ کا شکر ہے کوئی نہیں۔‘‘

67 ’’دل کی سخی ہیں ؟‘‘
’’ہاں بہت زیادہ...... دوسروں کی مدد ضرور کرتی ہوں۔‘‘

68 ’’کن باتوں پہ کنٹرول نہیں ہے؟‘‘
’’مجھے ’’خوشی‘‘ کی کسی بھی کیفیت پہ کنٹرول نہیں ہے...... بہت ایکسائیٹڈ ہو جاتی ہوں۔‘‘

69 ’’محبت کے بارے میں آپ کی رائے؟‘‘
’’محبت ایک ہی بار ہوتی ہے۔ بار بار نہیں۔‘‘

70 ’’گفٹ دینا پسند ہے یا کیش......؟‘‘
’’مجھے گفٹ دینا پسند ہے۔ کیش دینا نہیں۔‘‘

71 ’’کبھی مانگ کر تحفہ لیا......؟‘‘
’’نہیں...... اچھا نہیں لگتا۔‘‘

72 "اپنی غلطی تسلیم کرلیتی ہیں؟"
"جی ..... فوراً۔"
73 "سفر کے لیے بہترین سواری؟"
"اپنی کار۔"
74 "ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی ہوتی ہے؟"
"ٹین ایج کی محبت میرے نزدیک نادانی ہے۔"
75 "کن چیزوں کے لیے بہت خرچ کرتی ہیں؟"
"میں اپنے کپڑوں پہ بہت خرچ کرتی ہوں۔"
76 "اپنی کمائی اپنے اوپر خرچ کرتی ہیں؟"
"ہاں جی ..... کیوں نہیں، کپڑے بناتی ہوں یا پھر گولڈ کی کوئی چیز لے لیتی ہوں۔"
77 "کس شخصیت کے بغیر زندگی ادھوری ہے؟"
"امی کے بغیر۔"
78 "کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے یا خوف زدہ رہتی ہیں؟"
"نہیں ایسا کوئی نہیں ہے۔"
79 "آپ کی اچھی عادت .....؟"
"میں سب کے ساتھ بہت کچھ کرتی ہوں اور بدلے میں کسی سے کوئی ڈیمانڈ نہیں کرتی۔"
80 "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو؟"
"تو بہت سارا میک اپ، پین، این آئی سی کارڈ، پرفیوم، ہیئر برش۔"
81 "پسندیدہ تہوار؟"
"عید، رمضان المبارک۔"
82 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟"
"ابھی تو ذہن میں کوئی نام نہیں ..... ویسے بھی قتل سے خوف آتا ہے۔"
83 "ایک شام جو اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں؟"
"کسی میچیور شخصیت کے ساتھ وقت یا شام گزارنا چاہوں گی۔"
84 "آپ کو کس قسم کے لوگ پسند ہیں؟"
"میچیور انکل آنٹی ٹائپ کے لوگ بہت پسند ہیں۔"
85 "لڑکے کب برے لگتے ہیں؟"
"جب وہ جھوٹ بولتے ہیں۔"
86 "مرد کب برے لگتے ہیں؟"
"جب وہ اپنی بیگم کی موجودگی میں لڑکیوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔"
87 "گھر میں کھانا کھانے کا کہاں مزہ آتا ہے؟"
"مجھے اپنے بیڈ پہ کھانا کھانے کا بہت مزہ آتا ہے۔"
88 "کس ملک کے لیے سوچتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"مجھے ٹورنٹو بہت پسند ہے تو میں کہتی ہوں کہ کاش ہمارا ملک ٹورنٹو جیسا ہوتا۔"
89 "پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟"
"کیش کی شکل میں ..... تاکہ بہ وقت ضرورت کام آسکے۔"
90 "ملک سے باہر جاکر کیا اچھا لگتا ہے؟"
"وہاں کی صفائی ستھرائی، قوانین اور ان پر عمل درآمد۔"
91 "نیند جلدی آجاتی ہے؟"
"منحصر ہے اس بات پہ کہ میں تھکی ہوں یا ریلیکس ہوں تو جلدی سو جاتی ہوں اور پریشان ہوتی ہوں تو نیند نہیں آتی۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"کوئی مسئلہ نہیں ..... میں ہر چیز کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتی ہوں۔"

☆

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

فرحین اظفر

خواتین، شعاع اور کرن محض تفریحی پرچے نہیں بلکہ یہ رسالے اپنے بہترین معیار اور تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاحی مواد سے معاشرے میں سانس لیتی رسمیں، اس میں رچی بسی برائیوں کی نشان دہی کرنے اور انہیں روکنے اور ختم کرنے میں بھی کہیں نہ کہیں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ تفریح طبع کا سامان بھی ہیں اور بالخصوص چھوٹی عمر کی نوخیز اور ناپختہ خیالات رکھنے والی بچیوں کی تربیت میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ آج کل جہاں الیکٹرانک میڈیا کی بے باکی اپنے عروج پر ہے، وہاں یہ حدود و قیود کے اندر سمٹی ہماری اقدار، روایات اور خصوصاً" ہمارے مذہب کو ڈیفائن کرتی تحریریں، وقت، حالات اور ہماری نوجوان نسل کی پروان چڑھتی بے سمت ذہنیت کی اشد ضرورت ہیں۔

اب آتی ہوں جوابات کی طرف۔

سوالات ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہیں۔

س : لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت سے منتقل ہوا یا گھر میں صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت سے نوازا؟

ج : لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں بالکل بھی نہیں ملا۔ تخلیقی صلاحیت یقیناً" اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے لیکن لکھائی سے پہلے میں اس صلاحیت کو ہمیشہ ڈرائنگ اور پینٹنگ، اسکیچنگ وغیرہ میں ہی استعمال کرتی تھی۔ لکھنے کا خیال کافی عرصہ اور کافی کچھ پڑھ لینے کے بعد ذہن میں آیا۔ ہاں البتہ خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق وراثتی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ گھر میں میری بڑی چچی ڈائجسٹ پڑھتی تھیں اور ان سے کھانے کی ترکیبیں پڑھنے کے بہانے ڈائجسٹ لے کر میں بہت چھوٹی عمر میں ہی کہانیاں پڑھنے لگ گئی تھی۔ گھر میں میری چچی کے علاوہ ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق اور کسی کو نہیں تھا بلکہ میرے پڑھنے پر بھی برا منایا جاتا تھا، کسی حد تک۔ بعد میں جب کالج میں قدم رکھا تو کھلی آزادی مل گئی۔

س : آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ آپ کی تحریروں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟

ج : دوسرا سوال سن کر صرف میں ہی نہیں بلکہ فون پر مجھے سروے کے سوالات ڈکٹیٹ کرواتی میری والدہ بھی ہنسنے لگیں کیوں کہ میری کہانیاں میری فیملی میں تو کوئی بھی نہیں پڑھتا۔ بہن کوئی ہے نہیں جو اس طرح کا شوق رکھتی۔ چچی پڑھنا چھوڑ چکی ہیں۔ کیوں کہ ان سے اب پڑھا نہیں جاتا۔ ہاں میرے سسرال میں ایک یا دو یا زیادہ سے زیادہ تین خواتین میری کہانیاں پڑھتی ہیں اور الحمدللہ ان کی رائے میرے ناولز کے بارے میں بہت اچھی ہے۔

س : آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا؟ اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

ج : تقریباً" دو سال پہلے کرن میں ایک افسانہ شائع ہوا تھا۔ "جانے کس جرم کی" جو کراچی کے دگرگوں حالات کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا تھا۔ وہ افسانہ لکھ کر مجھے تھوڑا سکون ملا تھا۔ کیوں کہ میں حالات حاضرہ یا کسی مذہبی اور قومی تہوار یا کسی بھی اور خاص موقع کی مناسبت سے فوری طور پر پلاٹ تیار نہیں کر پاتی۔ اسے آپ میری کمزوری سمجھ لیجئے۔ تو ان دنوں رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں جس طرح بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر بوریوں میں بند کر کے پھینکا گیا تھا۔ اس نے حساس دل رکھنے والوں کو خون کے آنسو رلایا تھا۔ عید سعید کے موقع پر ان معصوموں کے گھر والوں پر جو گزری ہوگی سو گزری ہوگی۔ تو تب میں نے ـــــ شہر قائد کی مسخ شکل کے

اور فوری طور پر افسانہ لکھا تھا۔ جس سے مجھے ذرا اطمینان حاصل ہوا تھا اور جہاں تک زیادہ پسند کی بات ہے تو لکھاری کو تو اپنی لکھی ہوئی ایک ایک سطر سے پیار ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے سب سے زیادہ یہی افسانہ پسند ہے یا پھر اپنا پہلا افسانہ "مجھ بیتی" یہ دونوں افسانے "کرن" میں شائع ہوئے۔

س : اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟

ج : خواتین، شعاع اور کرن میں شائع ہونے والی سب ہی تحریریں شوق سے پڑھتی ہوں۔ نمرہ احمد، **عمیرہ احمد**، سائرہ رضا یا سمیرا حمید کا نام اگر لوں گی تو یہ بہت روایتی سا جواب ہوگا۔ کیوں کہ ان کی تحریریں تو سب ہی شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں نے "ہما کوکب بخاری اور ساجدہ حبیب" جیسی نامور **مصنفاؤں** کے دور سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ ان کی کمی آج تک محسوس کرتی ہوں اور دور حاضر کی **مصنفاؤں** میں تنزیلہ ریاض، سحر ساجد اور ام طیفور کو بہت شوق سے پڑھ رہی ہوں۔ گمان غالب ہے کہ عنقریب ایمل رضا بھی خود کو پڑھوانے پر مجبور کردیں گی کہ تمام تحریریں چھوڑ کر انہیں پڑھا جائے۔

س : اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے۔

ج : شاعری سے بھی لگاؤ ہے اور نثری مطالعے سے بھی۔ اس لحاظ سے بہت سارے اشعار اور اقتباسات پسند ہیں۔ دونوں ہی چیزیں پیش کررہی ہوں۔

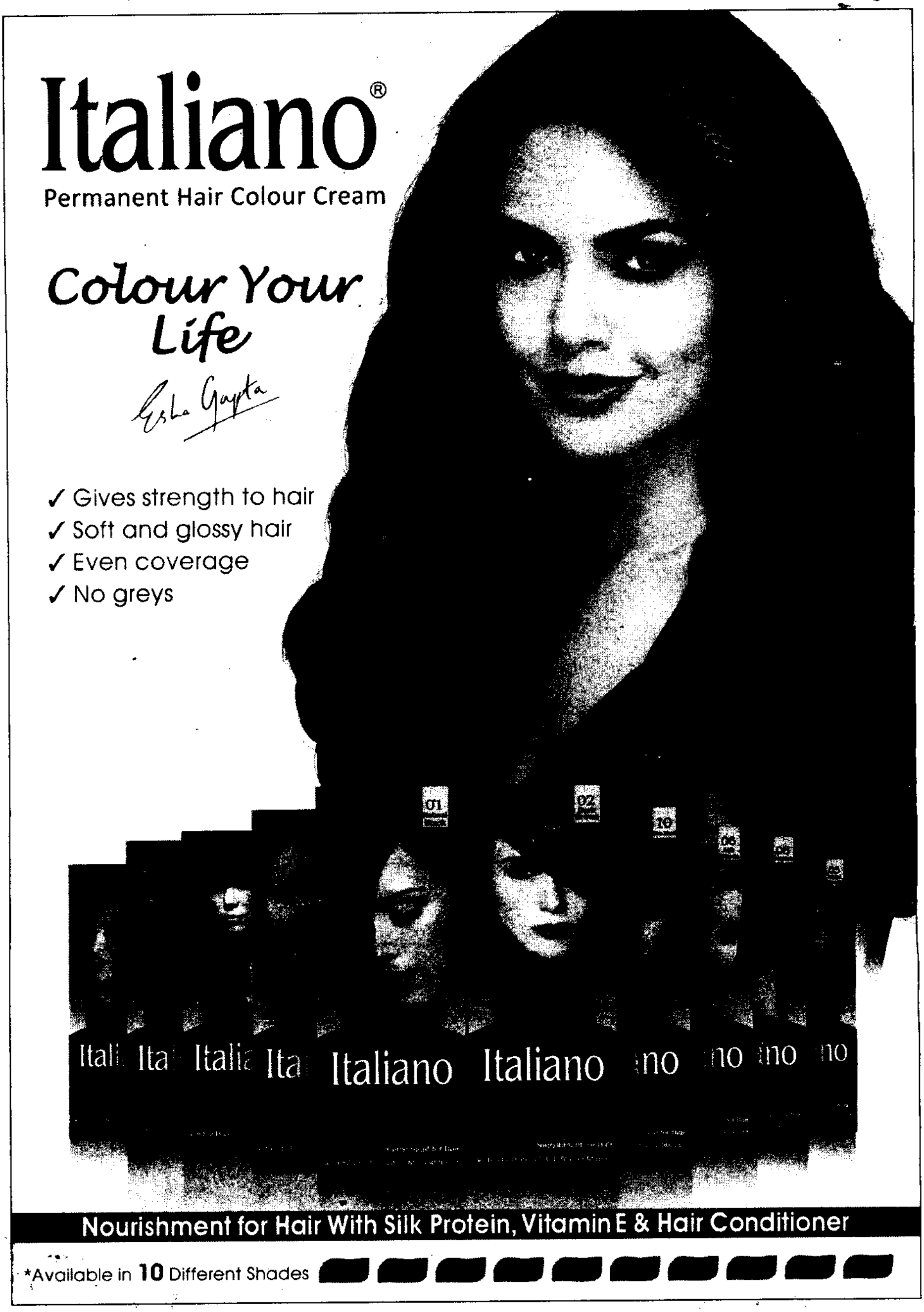
اقتباس (مصنف نامعلوم)

زندگی گزارنے کے دو سنہرے اصول۔

"معاف کردو انہیں جنہیں تم بھول نہیں سکتے اور بھول جاؤ انہیں جنہیں تم معاف نہیں کرسکتے۔"

غزل کے شاعر ہیں "احمد فراز"

کیوں کسی اور کو دکھ درد سناؤں اپنے
اپنی آنکھوں سے بھی میں زخم چھپاؤں اپنے
میں تو قائم ہوں تیرے غم کی بدولت ورنہ
یوں بکھر جاؤں کہ خود ہاتھ نہ آؤں اپنے
شعر اوروں کے بہت یاد ہیں اوروں کے لیے
تو ملے تو میں تجھے شعر سناؤں اپنے
سوچتا ہوں کہ بجھا دوں میں یہ کمرے کا دیا
اپنے سائے کو بھی کیوں ساتھ جگاؤں اپنے
اس کی تلوار نے وہ چال چلی ہے فراز
پاؤں کٹتے ہیں اگر ہاتھ بچاؤں اپنے


Italiano®
Permanent Hair Colour Cream
Colour Your Life
Esha Gupta
✓ Gives strength to hair
✓ Soft and glossy hair
✓ Even coverage
✓ No greys
01
02
10
Italiano
Italiano
Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner
*Available in 10 Different Shades

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار، وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال کا ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی





ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے' مگر وہ انکار کر کے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی' ماموں' معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں' مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کر لیتا ہے۔ کچھ رد و کد کے بعد آئے کت بھی راضی ہو جاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے' مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں' مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو وادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خود کشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے' اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خود کشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کر کے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے اس کے خیال میں کوئی انہیں ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہو جاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کر کے باہر آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شامیر پیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے' وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران' خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے فراڈیے شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران درحقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شامیر سے ٹکرایا ہے۔

شامیر کے دھمکانے پر خوش نصیب گھر میں کسی کو بھی اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں کرتی فضیلہ چچی صیام کا رشتہ شامیر اور کیف کے لیے منہا کا عندیہ دیتی ہیں۔ کیف گھر آتا ہے۔ جہاں خوش نصیب اسے شامیر کے بارے میں بتانا چاہتی ہے مگر صباحت تائی کے آنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

شامیر کو شیطان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی پیشانی پہ تل ہو۔ خوش نصیب اس کے خیالات اور دھمکیاں سن کر بہت پریشان ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کیف کو بتاتی ہے 'مگر کیف اس بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

شامیر اور صیام کی منگنی ہوتی ہے تو خوش نصیب کیف کی پسند کا بتاتی ہے 'یوں صیام کی منگنی شامیر کے بجائے کیف سے ہو جاتی ہے۔ کیف خوب غصہ کرتا ہے 'مگر خوش نصیب نے یہ سب صیام کو بچانے کے لیے کیا ہے کیوں کہ اس کی پیشانی پہ بھی تل ہے۔

شامیر خوش نصیب کو نئے سرے سے دھمکاتا ہے۔ اپنے والدین کی شادی کی سالگرہ پر منفرا کی اتفاقی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے وہ اسے سب سے ملواتی ہے۔ سب اس کے حسن اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔

بشام کے جنگل سے ایک عورت کی مسخ لاش ملتی ہے۔ اس کے جسم پر آئے کت کا عروسی جوڑا تھا 'مگر معاویہ نے اسے آئے کت ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی تلاش کا ارادہ رکھتا تھا 'مگر اردشیرازی نے اس سلسلے میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ آئے کت کے تمام اکاؤنٹس خالی پڑے تھے اور اس کا فریب کھل گیا تھا 'مگر ان سب باتوں کے باوجود معاویہ اس کی تلاش کا ہر ذریعہ اپناتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اس ناکامی نے اسے تلخ اور بد مزاج بنا دیا ہے۔

مونٹوک میں اس کی منفرا اور آدم سے ملاقات رہتی ہے۔

خوش نصیب 'عرفات ماموں کو شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ کیف کو اس کی باتوں پر ذرا یقین نہیں آتا۔ عرفات ماموں کو فالج ہو جاتا ہے۔

شامیر خوش نصیب کو دھمکاتا ہے کہ ماموں کو یہ سزا اس نے دی ہے اور آئندہ اس کے حمایتیوں کا اور وہ برا حشر کرے گا۔

ماہ نور 'شامیر سے محبت کا اعتراف کرتی ہے۔ خوش نصیب اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔

فضیلہ چچی خوش نصیب کو بہو نہیں بنانا چاہتیں مگر شفیق چچا کے سمجھانے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ خوش نصیب 'طوطے بھائی سے شادی پر معترض ہے مگر روشن امی اسے لفٹ نہیں کراتیں۔ خوش نصیب تمام سچائی عرفات ماموں کو بتاتی ہے' انہیں یقین آجاتا ہے۔ کیف بھی سن لیتا ہے مگر شش و پنج کا شکار ہوتا ہے۔

صیام 'کیف کی بے رخی سے تنگ آکر شامیر کو خود سے شادی کرنے کا عندیہ دیتی ہے۔ شامیر انکار کر دیتا ہے۔

معاویہ 'منفرا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ بات اپنے والد کو بتاتا ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے کہ یہ شادی قلعہ فلک بوس میں ہو۔ معاویہ راضی ہو جاتا ہے۔

خوش نصیب ایک شاپنگ مال میں معاویہ سے ٹکراتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کے حق میں اس کے گھر والوں کے سامنے گواہی دے، مگر معاویہ اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ خوش نصیب عرفات ماموں کے دوست مسٹر رضوی کے گھر پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہے۔ منفرا کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسز رضوی کینیڈا شفٹ ہونے والی ہیں لہٰذا وہ منفرا سے خوش نصیب کی سفارش کرتی ہیں۔ منفرا خوش نصیب سے تمام حالات سن کر اس کی مدد کرنے کی خاطر اسے آیا رکھ لیتی ہے۔ معاویہ سخت مخالفت کرتا ہے، مگر بعد میں راضی ہو جاتا ہے۔ عرفات ماموں وفات پا جاتے ہیں۔ کیف ایک فیشن میگزین سے منسلک ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کی دوستی زرگل سے ہو جاتی ہے۔ ایک روز ان کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوتی ہے جس کی بھانجی کو ایک ڈبا پیر نے ہوس کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا تھا۔ وہ انصاف کے لیے ان کے دفتر آتا ہے۔ سب اسے پولیس کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ کیف جن بھوتوں کو نہیں مانتا، مگر زرگل ان پر یقین رکھتا ہے۔ دونوں میں بحث چھڑ جاتی ہے اور زرگل کے چیلنج پر کیف، زرگل اور یاسر کے ساتھ قلعہ فلک بوس اور آیو تمتی کا سراغ لگانے بشام جاتا ہے، مگر راستے میں ایک گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔

حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی' قلعہ فلک بوس پر فلم بنانے والی ٹیم کو لے جا رہی تھی۔ ان لوگوں کی موت سے زرگل خدشات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر کیف کے اصرار پر یہ لوگ بشام پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سلطان احمد نامی شخص کے گھر

پر قیام کرتے ہیں۔ کیف فلک بوس کی تصویریں بناتا ہے مگر ایک کھائی میں گرنے کی وجہ سے کیمرے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کبیر کا بیٹا پاشا اسے کھائی میں گرنے سے بچا لیتا ہے۔

کبیر ان تینوں کو آیو کمتی کے آسیب سے ڈراتا ہے اور انہیں قلعے میں اندر داخل ہونے نہیں دیتا۔ کیف اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ صیام سے شادی سے انکار پر وہ گھر چھوڑ کر آ جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار کیف کو سمجھتی ہے۔ کیف اسلام آباد میں اس کی تعلیم وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے مگر اس سے ملتا نہیں البتہ عرفات ماموں سے رابطہ رکھتا ہے۔ عرفات ماموں کی وفات کے بعد اسے خوش نصیب کی کچھ خبر نہیں۔ وہ اسے ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

صابر تایا اور شفیق چچا میں کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ وہ گھر کا بٹوارہ کر لیتے ہیں۔ کیف کے والد اسے معاف کر دیتے ہیں۔

خوش نصیب کو معاویہ کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ وہ بچوں، منفرا اور خوش نصیب کو لے کر قلعہ فلک بوس کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

کیف کو خبر ملتی ہے کہ قلعے کے اصل مالکان آ رہے ہیں تو وہ ان کی آمد سے پہلے قلعے میں گھسنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ زرگل، کیف اور یاسر تینوں قلعے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں یاسر ایک پراسرار وجود کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

چوبیسویں قسط

اندر گھپ اندھیرا تھا۔ لیکن دائیں طرف کے ایک کونے میں روشنی کا احساس موجود تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ اندر۔۔۔ وہاں۔۔۔ اس کونے میں کوئی موجود تھا۔

قدموں کی چاپ اور روشنی کا پھیلاؤ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اندر جو کوئی بھی ہے آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھ رہا ہے۔ یاسر کی تمام حسیات اندر کمرے کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

پھر ایک وجود کی ہیولے کے عین سامنے دیوار کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ ہوا میں تیرتا ہوا ایک سفید وجود تھا۔

ساتھ ہی روشنی کا ایک تیز جھما کا ہوا تھا اور یاسر کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔

خوف کی شدت تھی یا کوئی اور احساس کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں دبے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کسی بلی کی طرح اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''کیف۔۔۔'' زرگل نے آہستہ سے پکارا تھا۔

کیف نے منہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''یار! میں ایک معصوم سا رپورٹر ہوں۔۔۔ تو کیوں مجھے چور بنانے پر تلا ہوا ہے؟'' وہ بے چارگی سے بولا۔

دیوار ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتے وہ دونوں اطراف کا جائزہ لینے میں اس قدر مگن تھے کہ یاسر کی غیر موجودگی کو محسوس بھی نہیں کر پائے تھے۔

''چوری کرنے تھوڑی آئے ہیں ہم زری۔۔۔!'' قدم روکے بغیر کیف خفگی سے بولا تھا۔ ٹارچ کی

روشنی اِدھر اُدھر ڈالتے ہوئے وہ دبے پاؤں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

آر یا پار۔۔۔ کیف نے سوچ لیا تھا کہ آج تو کچھ نہ کچھ کھوج کر ہی واپس پلٹے گا۔

''ابھی وہ چاچا جی چھڑی ٹیکتے کسی کونے سے برآمد ہو گئے نا تو کبھی یقین نہیں کریں گے کہ ہم یہاں چوری کی غرض سے نہیں آئے تھے۔'' زرگل جھنجھلایا۔

''بیٹا! تو بس دعا کر کہ اگر کوئی برآمد ہو تو وہ چاچا کبیر ہی ہوں۔۔۔ کوئی اور نہیں۔۔۔ ابھی آیو شمتی باجی آگئیں کہیں سے تو سوچ وہ کیا کریں گی۔۔۔'' کیف نے کمینی سی ہنسی ہنس کر کہا تھا۔

زرگل نے گھور کر اسے دیکھا تھا مگر وہ اس کی جانب متوجہ ہی کہاں تھا۔

''بہت مار پڑے گی کیف! میں بتا رہا ہوں پکڑے گئے تو بہت جوتے پڑیں گے۔''

''بس کر دے۔۔۔'' کیف تلملا کر اس کی جانب پلٹا تھا اور ٹارچ کی روشنی سیدھی اس کے منہ پر ڈال دی۔ ''جوتے تو تو بچپن سے کھاتا آ رہا ہے اپنے ابا جی سے۔۔۔ جوتوں سے نہیں ڈر سکتا تو۔۔۔ صاف بول آیو شمتی کا خوف تیرے حواسوں پر سوار ہے۔''

''اوئے اسے تو نیچے کرو۔۔۔'' آنکھوں میں گھستی روشنی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں ڈھانپی تھیں اور دوسرا ہاتھ کیف کے ٹارچ پکڑے ہاتھ پر مارا تھا۔

''ایک منٹ۔۔۔'' اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کرتے ہوئے کیف تیزی سے دو قدم اس راہداری میں اس طرف کو چلا تھا جہاں سے وہ دونوں چل کر یہاں تک پہنچے تھے۔ وہ تیزی سے ٹارچ کو اِدھر اُدھر گھما رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' زرگل بھی اس کی جانب مڑا تھا۔

''یاسر کہاں ہے؟'' کیف کی خوش مزاجی، چلبلا پن اور شرارت ہوا ہو گئی تھی۔

یاسر وہاں نہیں تھا۔ وہ اس راہداری میں کہیں بھی نہیں تھا۔ زرگل کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ یاسر کی غیر موجودگی ان دونوں کو دہلا کر رکھ گئی تھی۔

''کیف! میں نے تجھے بولا تھا۔ یہاں نہیں آنا چاہیے۔'' زرگل تمام احتیاط بھلائے اونچی آواز میں بولا تھا۔

کیف کی شکل پر بھی بارہ بج چکے تھے۔ ''مجھے لگتا ہے وہ کسی اور طرف مڑ گیا ہے۔''

''کیف! یاسر کو ڈھونڈنا ہو گا۔۔۔ ہمیں اسے۔۔۔''

زرگل کی بات پوری نہیں ہو سکی تھی۔ اس سے پہلے ہی فلک بوس تیز چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔

وہ دونوں ہی اپنی جگہ سے اچھل پڑے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ واپس اس ہال کی طرف مڑے تھے جہاں سے یہ راہ داری شروع ہوئی تھی۔

''یاسر۔۔۔ یاسر۔۔۔'' تمام احتیاط بالائے طاق رکھے اس وقت وہ دونوں اونچی آواز میں یاسر کو پکار رہے تھے۔

بمشکل دو منٹ میں وہ دونوں ہال میں جا پہنچے تھے۔ اِدھر دیکھتے وہ یاسر کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ زرگل تیزی سے دوسری راہ داری کی طرف بڑھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ راہداری میں داخل ہو جاتا کیف نے اسے پکارا تھا۔ کیف کی نظریں دائیں طرف فرش پر جمی تھیں۔ زرگل کی آنکھوں نے کیف کی نظر کا تعاقب کیا تھا۔

''یاسر۔۔۔!'' پھولی سانسوں کے ساتھ زرگل تیزی سے فرش پر اوندھے منہ پڑے یاسر کی طرف بڑھا تھا۔ کیف نے بھی اس کی پیروی کی۔

یاسر کو سیدھا کر کے کیف نے تیزی سے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی تھی۔

''ز۔۔زندہ ہے۔۔۔'' کیف کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ''بے ہوش ہے۔۔۔''

''یاسر۔۔۔یاسر۔۔۔'' اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے زرگل نے بے چینی سے اسے پکارا تھا۔۔۔ پھر پریشان ہو کر کیف کی طرف دیکھا تھا۔ ''اب۔۔۔اب کیا کرنا ہے؟''

''واپس جاتے ہیں۔۔۔اسے میں اٹھالوں گا کندھے پر۔۔۔بستی میں مل جائے گا ڈاکٹر۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔'' زرگل نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

کیف تیزی سے کھڑا ہوا اور جھک کر یاسر کو اٹھانے لگا۔

یہی وقت تھا جب ان دونوں نے ایک آواز سنی تھی۔

''ٹھک۔۔۔ٹھک۔۔۔ٹھک۔۔۔''

وہ لاٹھی کو فرش پر رکھ کر چلنے کی آواز تھی۔۔۔

''شٹ۔۔۔بابا کبیر۔۔۔'' زرگل نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ہر کام الٹا ہو رہا تھا۔ بھاگنے کا اب وقت نہیں تھا کیونکہ آواز بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی۔

''کون ہے؟ کون ہے وہاں۔۔۔؟'' اگلے ہی لمحے بابا کبیر اس ہال میں داخل ہوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنی لاٹھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک لالٹین پکڑی ہوئی تھی۔

اب وہ دروازے پر کھڑا حیران پریشان ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا مگر یہ تاثرات صرف چند لمحوں کے لیے تھے کیونکہ پھر حیرانی کی جگہ غضب نے لے لی تھی۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''تم لوگوں کی اتنی جرات۔۔۔ ہمت کیسے ہوئی تم لوگوں کی کہ میرے منع کرنے کے باوجود فلک بوس میں داخل ہو۔۔۔''

اپنی لاٹھی کو وہ تلوار کی طرح سونت کر ان دونوں کی طرف بڑھا تھا اور ان دونوں کو اب اپنی خیریت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔

''بابا۔۔۔بابا جی۔۔۔میری بات سنیں۔۔۔'' بچاؤ کے لیے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے کیف پیچھے ہٹا تھا۔

''ہم یہاں کسی غلط۔۔۔''

بات پوری نہیں ہو سکی تھی کیونکہ اس کے پورے ہونے سے پہلے ہی بابا کبیر کا لاٹھی والا ہاتھ حرکت میں آیا تھا اور وہ لاٹھی ٹھک سے کیف کی ٹانگ پر جا لگی تھی۔

کیف بلبلا اٹھا اور اچھل کر اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''بابا جی! ہماری بات تو سن لیں۔۔۔'' زرگل فکرمندی سے بولا تھا لیکن اس نے سننے کے بجائے زرگل کے ساتھ بھی کیف والا سلوک کیا تھا۔ زرگل کمر پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہو گیا۔

یقیناً بابا کبیر کی نظر ابھی تک یاسر پر نہیں پڑی تھی۔ وہ دوبارہ اس لاٹھی کو پکڑے ان دونوں کی طرف بڑھا تھا۔

''میں بتاتا ہوں تم لوگوں کو کہ دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل ہونے کی کیا سزا ہے۔'' اس نے کسی سورما کی طرح لاٹھی کو ہوا میں لہرایا۔ بوڑھے بابا کبیر میں فی الوقت کسی جوان روح میں بسیرا کر لیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کسی کو ایک اور ضرب کا سامنا کرنا پڑتا، کبیر کی نظر یاسر پر پڑ گئی تھی۔
''یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا ہے؟ کیا کیا ہے اس کے ساتھ تم دونوں نے؟'' اس کے چہرے پر یک دم بے تحاشا فکر مندی چھا گئی تھی۔ وہ اب کچھ پریشانی سے کیف اور زر گل کو دیکھ رہا تھا۔
''اوہ۔۔۔ بابا جی! ہمیں خود نہیں پتا۔۔۔'' کیف ٹانگ سہلاتے ہوئے چڑ کر بولا ''آپ ذرا اپنی لاٹھی پر قابو پاؤ تو دیکھ لیں ہم اسے۔''
''نا ہنجارو۔۔۔ بولا تھا تم لوگوں کو فلک بوس تم جیسے بے وقوفوں کے گھومنے کی جگہ نہیں ہے۔۔۔ مگر نہیں تم جیسے پاگل کبھی بھی بزرگوں کی نصیحتوں پر عمل نہیں کرتے۔'' کبیر بابا کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔
اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے یاسر کا کندھا جھنجھوڑا تھا۔
''لڑکے۔۔۔ اوئے لڑکے اٹھو۔۔۔ تم ٹھیک ہو؟'' یاسر کا کندھا ہلاتے ہوئے وہ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بے سود۔۔۔
''یہ اٹھ کیوں نہیں رہا؟'' کبیر نے مڑ کر ان دونوں کو گھورا۔ ''چلو اٹھاؤ اسے۔۔۔ میرے کوارٹر میں لے کر چلو۔۔۔ اللہ جانے کیا ہوا ہے اس تیسرے لفنگے کو۔۔۔''
کیف نے اس کی بات پر برا سا منہ بنایا لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔۔۔ بس اسی کہاوت پر عمل کرتے ہوئے کیف نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور آگے بڑھ کر یاسر کو اٹھانے لگا۔ زر گل بھی تیزی سے آگے بڑھا تھا اور یاسر کو اٹھانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ دائیں اور بائیں جانب سے یاسر کو سہارا دیے وہ کبیر کے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے۔
''اس کی موجودگی میں کسی اور آیو شمتی کی کیا ضرورت ہے۔۔۔'' کیف نے زر گل کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی تھی۔۔۔ آواز بس اتنی تھی کہ زر گل تک جائے۔ اونچی آواز کی صورت میں نقص امن کا خطرہ تھا۔

زر گل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اسے فی الحال صرف یاسر کی فکر تھی۔
کوارٹر میں پہنچ کر ان دونوں نے یاسر کو ایک صوفے پر لٹا دیا تھا۔ کمرے میں ایک انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے سو سردی کا احساس قدرے کم تھا۔
''مجھے یقین ہے یہ سب آیو شمتی کا کیا دھرا ہے۔۔۔ یقیناً وہ تم لوگوں کی مداخلت سے ناراض ہو کر تمہارے دوست پر حملہ آور ہوئی ہے۔۔۔'' کبیر بابا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جو اس نے کیف کی طرف بڑھا دیا۔ ''اسے پلاؤ۔۔۔ شاید ہوش آ جائے۔۔۔''
کیف نے خاموشی سے گلاس پکڑا اور یاسر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے یا زر گل نے کبیر بابا کے تجزیے پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن زر گل کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کبیر کی باتوں سے صد فیصد متفق تھا۔
اگلے دس پندرہ منٹ کی کوششوں سے وہ یاسر کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ کچھ بتا نہیں رہا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے واپس جانے کی ضد شروع کر دی تھی اور وہ کسی بھی حالت میں اپنی بات سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں تھا۔
کیف نے کسی طرح منت سماجت کر کے کبیر کو راضی کر لیا تھا کہ وہ انہیں صبح ہونے تک اپنے کوارٹر میں رہنے دے، صبح کے بعد وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ یاسر کی حالت کے پیش نظر کبیر نے انہیں اجازت دے دی تھی لیکن ساتھ ہی دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ان لوگوں نے صبح کے بعد اس طرف کا رخ بھی کیا اور کسی مصیبت کا شکار ہوئے تو وہ ان کی کسی قسم کی مدد نہیں کرے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے ان سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہ

لوگ کس طرح فلک بوس میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ موجودہ حالات سے مجبور، کیف نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا اور بدلے میں کبیر نے انہیں اپنے کوارٹر میں رات گزارنے کی اجازت دے دی تھی لیکن یاسر نے ہوش میں آنے کے بعد سے یہاں سے چلنے کی ضد پکڑ لی تھی اور کسی صورت یہاں رکنے کو تیار نہیں تھا۔

کیف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ زرگل بھی زیادہ دیر یہاں رکنے پر راضی نہیں ہے۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ ٹارچ کی روشنی میں واپسی کے لیے چل پڑے تھے۔

☆☆☆

''ہاں بھئی جوان! اب کیسی طبیعت ہے؟'' کیف نے چائے کا کپ یاسر کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔۔۔'' یاسر کے انداز سے بے دلی نمایاں تھی۔

کیف اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ زرگل بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے پاس لے آیا۔ وہ دونوں ہی یاسر سے رات کے واقعے کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے۔

رات دو بجے کے قریب وہ لوگ واپس سلمان احمد کے گھر پہنچ گئے تھے۔ گھر پہنچ کر بھی یاسر کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ گم صم تھا بلکہ کسی حد تک خوف زدہ محسوس ہوتا تھا۔ ان لوگوں نے اس وقت اس سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے نیند کی دوائی کھلا کر سلا دیا تھا۔ یاسر کے ساتھ گزرے واقعات کی تفصیل جاننے کی بے چینی دل میں چھپائے وہ دونوں بھی سونے لیٹ گئے تھے۔

یہاں تک معاملات کسی حد تک قابو میں تھے۔ مسئلہ تب شروع ہوا جب صبح اٹھنے پر انہیں یاسر کی بگڑی ہوئی حالت کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا اور نیند میں ہذیان بک رہا تھا۔ کیف اور زرگل کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سلمان احمد کی مدد سے اسی وقت ڈاکٹر کا انتظام کیا گیا جو ڈاکٹر کم ڈسپنسر زیادہ تھا۔

سارا دن گزارنے کے بعد اب آ کر یاسر کی حالت کچھ سنبھلی تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

کیف نے چائے کا انتظام کیا اور اب وہ دونوں اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔

کیف نے زرگل کی طرف دیکھ کر اسے اشارہ کیا تھا کہ بات شروع کرے۔ زرگل نے کندھے اچکا دیے۔۔۔

مگر انہیں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ یاسر نے خود ہی بات شروع کر دی تھی۔

''وہاں۔۔۔ اس کمرے میں وہاں کچھ تھا۔'' یاسر نے اٹکتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

کیف نے زرگل کی طرف دیکھا پھر خود ہی بول اٹھا۔

''ک۔۔۔ کس کمرے میں یاسر؟''

''اس ہال میں ایک ہی کمرا تھا کیف بھائی۔۔۔'' یاسر نے خفگی سے کہا۔

''تم کمرے میں گئے تھے؟'' زرگل نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔''

''پھر؟ تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہاں کوئی تھا؟''

''میں نے کی ہول سے دیکھا تھا۔۔۔'' وہ جیسے اپنی اس تانکا جھانکی پر شرمندہ ہوا تھا۔

''اور تم نے کیا دیکھا تھا؟'' اب کی بار کیف بولا تھا۔

یاسر ایک لمحے کے لیے جیسے سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں تمام واقعے کو دہرایا اور اس کی

آنکھوں میں ایک بے نام سا خوف لہرا گیا تھا۔

پھر وہ اٹک اٹک کر سب کچھ بتاتا چلا گیا تھا۔ شروع سے آخر تک سب کچھ۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے تمام واقعات کسی فلم کی مانند چل رہے تھے۔

''یاسر! ضروری تھوڑی۔۔۔'' کیف نے اسے سمجھانا چاہا تھا لیکن زرگل نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''ٹھیک ہے یاسر۔۔۔! کوئی بات نہیں۔۔۔ تم بھول جاؤ جو بھی ہوا۔'' اس کے چہرے پر بے انتہا سنجیدگی تھی۔

''مجھے واپس جانا ہے۔'' یاسر نے کسی چھوٹے بچے کے سے انداز میں کہا تو کیف نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ زرگل کیف کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کیف نے نفی میں سر ہلا کر اسے منع کر دیا تھا۔ زرگل کے چہرے پر خفگی چھا گئی۔

''ابھی کیسے جا سکتے ہیں یاسر۔۔۔ تم بلا وجہ ڈر رہے ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جو کچھ بھی تم نے دیکھا' وہ تمہاری نظر کا دھوکا ہو۔''

''نہیں۔۔۔ نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ تھا وہاں پر کچھ۔۔۔'' یاسر جیسے بے بسی کی حد پر جا کر دبی آواز میں چیخا تھا۔

''جسٹ ریلیکس یاسر! ہم ایک دو دن میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم بالکل فکر مت کرو۔'' زرگل نے کیف کو گھورتے ہوئے یاسر کو تسلی دی تھی اور اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

''مجھے ایک دو دن نہیں رکنا۔۔۔ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔'' وہ رو دینے کو تھا۔

''یار! میں کوشش کرتا ہوں نا۔۔۔ جتنی جلدی ہو سکے گا' ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' زرگل اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تم لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔''

اس نے یاسر کو زبردستی لٹا کر کمبل اوڑھا دیا اور کیف کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

''زرگل! یار کیا کر رہے ہو؟ ایسے کیسے جا سکتے ہیں ہم یہاں سے۔۔۔'' کیف نے گھر سے باہر نکلتے ہی زرگل کو بازو سے پکڑ کر روکا تھا۔

''بس کر دو کیف۔۔۔! بہت ہو چکا۔ تم نے یاسر کی حالت دیکھی ہے۔۔۔ چھوٹا اور سب سے لاڈلا بیٹا ہے وہ اپنے ماں باپ کا۔۔۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو کون جواب دہ ہوگا سب کے سامنے؟ بتاؤ۔۔۔؟'' زرگل نے دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

کیف نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''یاسر کو وہم ہوا ہے۔۔۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آ رہی زرگل؟ جن بھوت ٹائپ کوئی چیز نہیں ہوتی ہے اس دنیا میں۔۔۔''

''بھائی ...... ! کوئی ثبوت ہے تیرے پاس کہ وہ اس کا وہم تھا؟ پروف کر سکتا ہے اس بات کو؟ سب لوگ۔۔۔ بشام کے بچے بچے سے پوچھو وہ یہی کہے گا کہ فلک بوس آسیب زدہ ہے۔۔۔ پھر میں کیسے مان لوں کہ یاسر کو وہم ہوا تھا۔ اور وہ بھی اتنا شدید کہ وہ خوف سے بے ہوش ہو گیا۔''

کیف خاموش ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا سر پیٹے یا زرگل کا۔۔۔

تھک کر وہ گھر کو گلی سے ملانے والی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں خاموش اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے تھے۔

تب ہی بچوں کا ایک چھوٹا سا گروہ شور مچاتا ہوا پاس سے گزرا تھا اور ان دونوں کو ہی چونکا گیا تھا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو؟'' کیف نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

''دیکھ یار۔۔۔!'' زرگل، کیف کے ساتھ آکر بیٹھ گیا تھا۔ ''یاسر کی حالت تیرے سامنے ہے۔۔۔ میں اس کی جان سے نہیں کھیل سکتا' ایک شرارت کے چکر میں۔ تجھ سے میری جو بھی بات ہوئی تھی۔ وہ ہم دونوں کا ایک مذاق تھا۔ تم بھول جاؤ اس بات کو۔۔۔ میں تجھ سے معافی مانگ لیتا ہوں اس بات کے لیے۔۔۔ لیکن پلیز۔۔۔ ختم کر اس ساری بکواس کو اور واپس چل۔۔۔'' زرگل نے منت کی تھی۔

''زرگل! اب یہ مسئلہ شرط کا نہیں ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس ساری اسٹوری کی حقیقت کیا ہے۔۔۔ فلک بوس میں ایسا کیا راز چھپا ہے' جس کی پردہ داری ہے۔''

''اور تمہیں اس سے کیا ملے گا؟ کم آن کیف۔۔۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ یقین کرو' مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے آخر کیوں اس بارے میں تم سے بات کی۔۔۔ تمہیں کیوں چیلنج کیا۔۔۔ میں ایسا نہ کرتا تو نہ ہم یہاں آتے نہ ہی یاسر کے ساتھ یہ سب ہوتا۔۔۔''

''یار! کمال کرتے ہو تم۔۔۔'' کیف نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تم نے کیا کہا اور کیوں کہا۔۔۔ میں بڑے سیریس نوٹ پر سچ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ سخت جھنجھلا کر بولا۔

''اچھا اور یاسر؟ اس کا کیا کرو گے؟''

''یار! یاسر کو کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا وہ۔''

''خدا کا خوف کرو کیف! کیوں اس بچے کی زندگی سے کھیل رہے ہو۔ اتنے بے حس کیوں ہو رہے ہو؟''

''او کے۔ ٹھیک ہے۔۔۔ تم اسے واپس چھوڑ آؤ۔۔۔ میں تب تک یہاں رک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلک بوس میں کیا ہو رہا ہے۔'' کیف نے ایک اور حل پیش کیا۔

''میرا دماغ ابھی اتنا خراب نہیں ہوا کہ تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر جاؤں۔ مجھے کیا معلوم نہیں ہے کہ تم پیچھے کیا کرتے پھرو گے۔'' زرگل نے فوراً ہی یہ حل بھی رد کر دیا تھا۔

''یار۔۔۔ وہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور مجھے ایک بات بتاؤ اگر وہاں آیوشمتی کا کوئی وجود ہے تو وہ کبیر خان کو کیوں کچھ نہیں کہتی؟ پاشا بھی وہاں موجود ہے۔ یہ آیوشمتی صاحبہ ان دونوں کو کچھ نہیں بولتیں اور اگر وہ جگہ سچ میں آسیب زدہ ہے تو معاویہ اردشیر ازی اپنی فیملی سمیت یہاں کیا کرنے آ رہا ہے؟ کون اتنا بے وقوف ہے کہ سب جانتے بوجھتے بھی اپنی اور اپنی فیملی کی جان خطرے میں ڈالے گا۔'' اس نے ایسے فاتح کی طرح بات پوری کی جو پہلی ہی چال میں مقابل کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔

''ہوتے ہیں کچھ ایسے پاگل جو جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایسے کام کرتے ہیں۔۔۔ ایک مثال تو میرے سامنے بیٹھی ہے۔ جانتے تو بیٹا۔ بھی سب کچھ ہو۔ پھر بھی زندگی خطرے میں ڈالنا چاہتے ہو۔'' زرگل برا سا منہ بنا کر بولا تھا۔ ''اور کبیر خان اور پاشا خان اپنے مسئلے خود حل کریں۔۔۔ آیوشمتی انہیں کچھ کہتی ہے کہ نہیں یہ وہ ہی جانیں۔ مجھے ان میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔ میرا واحد انٹرسٹ فی الحال صرف تمہیں اور یاسر کو باحفاظت یہاں سے واپس لے کر جانا ہے اور وہ میں کر کے رہوں گا۔''

''او کے ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ بھول جاؤ فلک بوس کو۔۔۔ بھول جاؤ آیوشمتی کو۔۔۔ بھول جاؤ کبیر خان اور پاشا کو مگر اس رپورٹ کا کیا جس کا علوی صاحب کو بول کر چھٹی لی تھی۔ جان کو آ جائیں گے وہ اگر رپورٹ کے بغیر یہاں سے گئے تو۔۔۔'' کیف نے ایک اور پوائنٹ اٹھایا تھا۔

''میں کچھ نہیں جانتا نہ ہی میں فی الحال کچھ سننا چاہتا ہوں۔ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ ہم واپس جا رہے ہیں۔۔۔ اور رپورٹ واپس جا کر تیار ہو جائے گی۔ بشام ہم دیکھ چکے ہیں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا رپورٹ کا۔۔۔

اگر کچھ رہ گیا تو سلمان احمد سے مدد لے لیں گے۔"

"یار۔۔۔" کیف نے بے چارگی سے کچھ کہنا چاہا' مگر زرگل فی الحال کچھ سننے کو راضی نہیں تھا۔

"کیف پلیز۔۔۔" زرگل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ہم کل صبح واپسی کے لیے نکلیں گے اور تم ہمارے ساتھ ہی واپس جاؤ گے۔" اپنی بات پوری کر کے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا تھا جب کہ کیف وہاں اکیلا بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"تم لیلیٰ مجنوں ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کرو۔" وسامہ کو آئے کت کی طرف دیکھتا پا کر اس نے جو بھی مطلب اخذ کیا تھا' اس کا اظہار اسی طرح کیا تھا۔

وہ تینوں ہی اس بات پر ہنس پڑے تھے اور وہ وسامہ کے گلے لگ گیا تھا۔

"یا اللہ۔۔۔ تم پہلے سے زیادہ منہ پھٹ ہو گئے ہو۔" آئے کت نے ہنس کر کہا تھا۔

"اور تم پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔" اس نے بھی دوبدو کہا تھا۔

"لیکن یہ تعریف ہے اور میں اس بات پر خوش ہوں۔"

"دنیا کی کون سی بے وقوف عورت ہے جو ایسی باتوں پر خوش نہیں ہوتی ہو گی۔"

اس بات پر وہ تینوں ایک بار پھر ہنسے تھے۔ پھر معاویہ نے وسامہ کو دیکھا' بغور دیکھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے دور نہیں ہوئی لیکن آنکھوں میں الجھن کا عکس پھیل گیا۔

"کیا بات ہے؟۔۔۔ اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو؟۔۔۔ تم نے میرے بھائی کا خیال نہیں رکھا۔" اس نے آئے کت کو دیکھا۔

آئے کت بوکھلا گئی تو وسامہ نے جلدی سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آئے کت میرا بہت خیال رکھتی ہے۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔ کتنا خیال رکھتی ہے۔" اس نے سر جھٹک کر کہا تھا۔ "خیال رکھتی تو تمہارا یہ حال نہ ہوتا۔" اس نے خشمگیں نظروں سے آئے کت کو دیکھا تھا۔

"تم بالکل مڈل کلاس ساسوں کی طرح ری ایکٹ کر رہے ہو۔" آئے کت نے ناک چڑھا کر کہا تو

وہ جھینپ سا گیا اور اس نے ناراضی سے آئے کت کو دیکھا۔ وسامہ البتہ ہنس پڑا۔ چند سیکنڈ بعد وہ تینوں ہنس رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھے اسٹیرنگ وہیل کو مضبوطی سے تھامے معاویہ کی نظریں اس پوائنٹ پر ٹکی تھیں جہاں آج سے کئی سال پہلے وہ کھڑے تھے اور دماغ ان باتوں میں اٹک گیا تھا جو ان تینوں نے وہاں کھڑے ہو کر کی تھیں۔ وہ ملاقات وسامہ سے اس کی چند آخری ملاقاتوں میں سے ایک تھی۔۔ صرف کچھ عرصے بعد اس نے اپنے بھائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔

"آہ وسامہ۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش میں اس وقت تمہارے مسئلے کو سمجھ پایا ہوتا۔۔۔ کاش میں اس وقت حقیقت سمجھ جاتا تو شاید۔۔۔ ہاں شاید تب تم آج میرے ساتھ ہوتے۔۔۔" وسامہ نے کرب سے آنکھیں موند کر سوچا تھا۔

"معاویہ۔۔۔" منفرا نے نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا تھا۔ "آپ ٹھیک ہیں؟"

وہ اس کے دکھ اور تکلیف کو سمجھ رہی تھی۔ فلک بوس میں آ کر معاویہ اسی طرح افسردہ ہو جاتا تھا۔ اس کے

باوجود وہ یہاں آنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔۔۔شاید اس لیے کہ یہ جگہ منفرا کو پسند تھی یا شاید کچھ یادیں تازہ کرنے کے لیے۔

اس نے سر اٹھا کر منفرا کی جانب دیکھا اور بمشکل مسکرایا۔

''ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ چلو آؤ۔۔۔'' اس نے اپنی جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

''سلام صاحب۔۔۔'' کبیر نے جلدی سے آگے آکر معاویہ کو سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو بابا؟''

اب وہ بیک ڈور کھول کر احتیاط سے وسامہ اور ہدیٰ کی کاٹ کی بیلٹ کھول رہا تھا۔

خوش نصیب پہلے ہی گاڑی سے اتر چکی تھی اور۔۔۔ حیران پریشان پھٹی پھٹی آنکھوں سے فلک بوس کو تک رہی تھی۔۔۔

منفرا نے اس کے یہ تاثرات دیکھے تو مسکراتے ہوئے اس کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ دونوں میں اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ منفرا کو جو ہر وقت تنہائی کا احساس گھیرے رکھتا تھا' خوش نصیب کے آنے سے وہ کچھ کم ہو گیا تھا تو دوسری طرف خوش نصیب بھی اپنے خول سے باہر آگئی تھی۔

''کیسا ہے؟'' منفرا نے مزے سے پوچھا۔

''یا اللہ...... میں نے اس سے زیادہ خوبصورتی آج تک نہیں دیکھی۔'' خوش نصیب نے جیسے خود کو یقین دلانے کی سعی کرتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

منفرا سر جھٹک کر ہنس دی۔

''کوئی بات نہیں۔۔۔ جب میں پہلی بار یہاں آئی تھی تو میرے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔ آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی۔'' اس نے خوش نصیب کا کندھا تھپتھپا کر تسلی دی تھی۔

''یہ کس کا محل ہے؟'' خوش نصیب منہ اٹھائے فلک بوس کی بلندیوں کو تک رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ منفرا اسے کوئی جواب دیتی' اسے معاویہ نے پکار لیا تھا۔

''منفرا۔۔۔ ہدیٰ کو پکڑو۔''

''ہاں آرہی ہوں۔۔۔'' وہ مڑ کر معاویہ کے پاس چلی گئی۔

خوش نصیب نے بھی مزید متاثر ہونے کا ارادہ کچھ دیر کے لیے ملتوی کیا اور جلدی سے مڑ کر منفرا کے پاس آگئی تھی تاکہ بچوں کو پکڑ سکے۔

بچوں کو پکڑا کر معاویہ کبیر کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

''اور کبیر بابا! سب ٹھیک ٹھاک تو ہے؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟'' اس نے سرسری لہجے میں پوچھا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ کبیر کچھ بولتا، پاشا تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے پاس آگیا تھا۔

''السلام علیکم سر!'' اس نے آتے ہی معاویہ کو سلام کیا تھا اور معاویہ چونک کر پاشا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''پاشا۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں حیرانی کا ہلکا سا تاثر ابھرا۔ ''تم یہاں۔۔۔؟ کب آئے پاکستان؟''

''تین چار دن ہی ہوئے ہیں سر! بابا سے ملنے آیا تھا۔ چند دن میں واپسی ہے۔۔۔''

''گڈ۔۔۔! کوئی مسئلہ تو نہیں ہے وہاں تمہیں؟ اگر کوئی ایشو ہو تو بتانا مجھے۔''

''نہیں سر! سب بہت اچھا چل رہا ہے۔ اور یہ سب آپ کی وجہ۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔'' معاویہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''ایسا کرو پاشا! ذرا گاڑی سے سامان نکال کر کمرے میں پہنچاؤ اور بی بی کو کمرے تک پہنچاؤ۔۔۔ میں تب تک ذرا کبیر بابا سے بات کرلوں۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ اپنی بات پوری کر کے کبیر کی جانب مڑ گیا تھا۔ پاشا نے تابعداری سے سر ہلایا اور منفرا اور خوش نصیب کو لے کر اندر کی جانب چلا گیا۔

''ہاں بابا! اب بتائیں؟ یہاں سب ٹھیک رہا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں صاحب! کوئی خاص مسئلہ تو نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے بس ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ بھی حل ہو گیا ہے۔''

''مسئلہ؟'' معاویہ چونکا تھا۔ ''کیا ہوا تھا؟'' لہجے کی نرمی یک دم زائل ہو گئی۔

''صاحب! وادی میں کچھ لڑکے آئے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی آئے تھے۔ کہتے تھے یہاں کی تصویریں لے کر کسی مقابلے میں دیں گے۔''

''آپ نے انہیں تصویریں لینے دیں؟''

''نہیں صاحب! بھلا میں ایسا کیوں کرنے دوں گا۔ میں نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا۔ مگر صاحب! ان لڑکوں نے چھپ کر فلک بوس میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔۔۔ بلکہ کوشش کیا وہ اندر پہنچ گئے تھے۔۔۔ آخری کمرے تک۔۔۔''

''کیا بول رہے ہیں آپ؟ کچھ لوگ فلک بوس کے اندر تک چلے گئے اور آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔ کیا کر رہے تھے آپ اس وقت۔۔۔'' معاویہ کا غصہ آسمان پر جا پہنچا۔

اس نے اپنا ہاتھ بہت زور سے گاڑی کے بونٹ پر مارا تھا۔ چند گہری سانسیں لے کر اس نے اپنا غصہ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ کبیر شرمندہ سا کھڑا تھا۔

''اور کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟''

''نہیں صاحب! میں وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔'' معاویہ کا غصہ اسے یاسر کے بارے میں بتانے سے روک گیا تھا۔

''پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دینا تھا۔۔۔ ہمت کیسے کی انہوں نے بغیر اجازت اندر جانے کی۔ دو دن پولیس کے ڈنڈے کھاتے تو عقل آ جاتی۔''

''صاحب! پولیس کے حوالے تو نہیں کیا مگر میں نے انہیں ڈرا ضرور دیا ہے۔ دوبارہ ہمت نہیں کریں گے ادھر آنے کی۔۔۔ میں نے انہیں آیو قسمتی کا حوالہ دیا تھا۔ ان میں جو سب سے چھوٹا تھا' وہ تو بہت ڈرا ہوا لگ رہا تھا۔ دوسرا پٹھان ہے وہ بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔۔۔ صرف ایک ہی تھا جو شکل سے تھوڑا زیادہ تیز لگ رہا تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اب ادھر نہیں آئیں گے وہ۔۔۔''

''ہم م م م۔۔۔'' معاویہ نے ہنکارا بھرا۔ ''ذرا وادی سے پتا کریں کہ وہ لوگ یہاں ہی ہیں یا جا چکے ہیں۔۔۔ اگر یہاں ہی ہیں تو آپ کو زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کی حفاظت کا ذمہ آپ کے سر ہے کبیر بابا! کسی بھی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ بھروسا رکھیں صاحب! دوبارہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔'' کبیر نے اسے تسلی دی تھی۔

''اینٹر کہاں سے ہوئے تھے وہ لوگ؟ مین گیٹ سے؟''

''نہیں صاحب! پیچھے ایک جگہ سے گرل ٹوٹی ہوئی تھی بس وہاں سے ہی فائدہ اٹھایا انہوں نے۔''

''صحیح کروائیں اس جگہ کو جلد از جلد۔۔۔ اور کمرے لاک کر دیے ہیں آپ نے پیچھے کے سب؟''

''جی صاحب! سب کچھ ہو چکا ہے۔ سارے کمرے بند ہیں۔'' کبیر نے بتایا تھا۔

معاویہ اسے کچھ مزید ہدایات دیتے ہوئے اندر کی جانب بڑھا تھا۔
اور فلک بوس کی اوپری منزل کے کمرے کی ایک کھڑکی سے معاویہ کو تکتی دو آنکھیں پردے کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں۔۔۔

☆☆☆

آج بشام میں مطلع صاف تھا۔ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی سو ان دونوں کو فلک بوس سے نکل کر گھومنے پھرنے کا موقع مل گیا۔ منفرا تو خیر پہلے بھی بشام آ چکی تھی مگر خوش نصیب کو زندگی نے پہلی بار موقع دیا تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ آئی تھی جہاں پہاڑ تھے، درخت تھے، برف تھی اور پھر جب سورج کی روشنی سفید برف پڑتی تھی تو برف کسی ہیرے کی طرح چمکنے لگتی تھی۔

خوش نصیب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ زندگی کی مجبوریاں اور در بدر کی ٹھوکریں ایک طرف۔۔۔ لیکن فطرت کہاں بدلتی ہے۔ سو اس وقت خوش نصیب بھی اپنے تمام غم اور مسائل بھلائے اس وقت کو انجوائے کر رہی تھی۔

لنچ کے بعد وہ دونوں بشام کے دورے پر نکل پڑی تھیں۔ منفرا چاہتی تھی معاویہ بھی ان کے ساتھ چلے لیکن وہ گھر میں ہی رک کر کچھ اہم کام نبٹانا چاہتا تھا۔ شاید کوئی پریزنٹیشن تیار کرنی تھی سو معاویہ نے سہولت سے منع کر دیا بلکہ دونوں بچوں کو بھی اپنے پاس گھر پر رکھ لیا تھا۔ ہاں احتیاط کے طور پر پاشا کو ان دونوں کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ وہ ان دونوں کو وادی میں گھما لائے۔

وہ لوگ وادی میں پھرتے رہے اور وادی کی مارکیٹ میں بے سبب دکانیں چھانتے ہوئے انہوں نے کچھ وقت گزارا۔ پاشا چونکہ گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا سو ساتھ ساتھ انہیں بشام کی خاص خاص باتیں بتاتا جا رہا تھا۔

اور خوش نصیب۔۔۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر جا کھڑی ہو اور خود کو کسی پریوں کی کہانی کی شہزادی سمجھ کر اپنے ٹخنوں تک جاتے فراک کو دائیں بائیں سے پکڑ کر گول گول گھومنا شروع کر دے۔

"واپس جانے سے پہلے ایک بار تو یہ شوق ضرور پورا کروں گی۔" اس نے دل میں تہیہ کیا تھا۔
سچ ہے نا فطرت نہیں بدلتی۔۔۔

وہ لوگ کافی دیر ادھر ادھر گھومتے رہے تھے، پھر اچانک ہی موسم نے کروٹ لی تھی۔ ہوا میں شدت آئی اور وہ کہیں سے بادلوں کے ٹکڑے اڑا لائی۔ سورج نے جو ہوا کو شرارت پر آمادہ دیکھا تو اس نے بھی اپنی کرنوں کے کمبل کو سمیٹا اور بادلوں کے پیچھے یہ جا وہ جا۔۔۔ منٹوں کا کھیل تھا اور ہوا کے ہی زور سے شروع ہونے والی بوندا باندی موسلا دھار بارش کا روپ دھار گئی تھی۔

منفرا تو خیر ایسے موسموں کی عادی تھی لیکن خوش نصیب کا برا حال ہونے لگا۔ دونوں نے جلدی سے چھتری کھول کر سر پر تان لی لیکن سردی کی شدت سے خوش نصیب کے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر منفرا نے فیصلہ کیا کہ کہیں بیٹھ کر سکون سے چائے پی لی جائے۔ ویسے بھی بارش رکنے سے پہلے وہ واپس نہیں جا سکتے تھے۔ جب تک وہ لوگ چائے پیتے، امید کی جا سکتی تھی کہ تب تک بارش بھی رک جائے گی۔

وہ دونوں ایک ٹی اسٹال کے سامنے بنے چھپر کے نیچے پڑی کرسیوں پر جا بیٹھیں۔ پاشا نے ان کے لیے چائے تیار کروائی' ساتھ کچھ اسنیکس بھی اور اپنی نگرانی میں وہاں ایک انگیٹھی میں کوئلے سلگا کر ان کے پاس رکھوا دیا۔ سردی کا احساس کچھ کم ہوا۔

کچھ دیر میں بارش کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ ڈھلوانی سڑک بھیگ کر اپنا اصل رنگ کھو چکی تھی اور صبح کی

تر وتازہ روشنیوں کو بادلوں کے مٹیالے پن نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا مگر بادل ابھی بھی گرج رہے تھے اور بجلی کی کڑک سے وقفے وقفے سے بشام گونج اٹھتا تھا۔

ان کی گاڑی بہت دھیمی رفتار سے بشام کے اکلوتے بازار کی سڑک سے گزر رہی تھی جب اچانک کیف سیدھا ہوا۔ اس کی نظریں کھڑکی سے باہر ایک ڈھابے نما ہوٹل کے باہر پڑی کرسیوں پر جمی ہوئی تھیں جہاں دو لڑکیاں بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

''زرگل۔۔۔زرگل۔۔۔گاڑی روکو۔'' گاڑی نے جیسے ہی اس ٹی اسپاٹ کو کراس کیا تھا' کیف نے تیزی سے کہا تھا۔

زرگل نے تیزی سے بریک لگائے تھے۔ بارش کی وجہ سے پہلے ہی ڈرائیونگ مشکل ہو رہی تھی' کیف کے یک دم کہنے پر جو اس نے تیزی سے بریک لگائے تو پیچھے سے آتی ہوئی گاڑی ان کی گاڑی کو لگتے لگتے بچی۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا؟ زرگل نے غصے سے کہا۔ ''کیوں چلّا رہے ہو؟''

''ایک منٹ رکنا۔۔۔'' وہ تیزی سے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' پچھلی سیٹ پر لیٹا یاسر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''پتا نہیں یار' کیا ہوا ہے۔ تم بیٹھو اندر ہی' میں دیکھتا ہوں۔'' زرگل نے دروازہ کھولتے ہوئے اسے جواب دیا اور گاڑی سے اتر گیا۔

کیف گاڑی کی بیک سائٹ پر کچھ فاصلے پر کھڑا اسی ٹی اسپاٹ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''اوئے۔۔۔'' زرگل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا ہوا ہے؟ کیا ہے وہاں؟''

''زرگل! میں واپس نہیں جا سکتا؟''

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے سے وہ چونکا اور زرگل کی جانب مڑ کر بے چینی سے بولا تھا۔

''کیوں؟ اب کیا دورہ پڑا ہے؟''

زرگل نے چڑ کر پوچھا لیکن پھر اس کی نظر کیف کی آنکھوں پر پڑی تھی جن میں ہلکی سی نمی نمایاں تھی۔

''کیا ہوا ہے کیف؟ سب ٹھیک تو ہے؟'' اس کی حیرت حد سے سوا تھی۔

''زرگل میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔'' وہ ساتھ ساتھ مڑ کر بھی دیکھ رہا تھا۔

''او بھائی! کوئی وجہ بھی تو ہو گی نہ جانے کی؟''

''زر!۔۔۔خوش نصیب۔۔۔وہ یہاں ہے۔۔۔بشام میں۔۔۔'' کیف کی آواز خوشی سے لبریز تھی۔

''کیا۔۔۔یہ کیسے ممکن ہے کیف؟ تم نے دیکھا ہے انہیں یہاں؟''

''ہاں' وہ سامنے جو ٹی اسپاٹ ہے۔۔۔وہ دیکھو' سامنے دو لڑکیاں بیٹھی ہیں۔۔۔رائٹ سائیڈ پر خوش نصیب ہی تو ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں اس معاملے میں۔۔۔''

''اللہ خیر۔۔۔'' زرگل نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''یہ یہاں تک کیسے پہنچ گئیں اور کن کے ساتھ؟ او بھائی! کنفرم کر لو۔۔۔ آیو شمتی ہی تو خوش نصیب بہن کا روپ دھارے نہیں بیٹھی تجھے روکنے کے لیے۔۔۔''

اس نے کیف کو اسلام آباد میں پریشان ہوتے دیکھا تھا۔ خوش نصیب کی تلاش میں پھرتے دیکھا تھا۔ اب اسے خوش دیکھ کر اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ چند منٹوں میں تمام ٹینشن بھول کر اپنے اصل روپ میں واپس آیا تھا۔

کیف ہنس دیا۔

''بکواس نہ کرو۔۔۔'' پھر ایک گہری سانس بھر کر بولا۔ ''یار! مجھے خود یقین نہیں آ رہا کہ میں اسے دوبارہ سے دیکھ رہا ہوں۔''

''کیف! جا کر بات کرو ان سے۔۔۔ ان سے پوچھو وہ یہاں کس کے ساتھ آئی ہیں اور کیوں؟''

''ہاں' ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔'' کیف نے اثبات میں سر ہلایا پھر تین چار قدم چل کر رک گیا۔ ''زرگل۔۔۔ یار تو میرے ساتھ چل پلیز۔۔۔''

''ہیں؟ میں جا کر کیا کروں گا؟'' زرگل نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ''میرے بھائی! تم اسے پروپوز کرنے نہیں جا رہے ہو جو جوتے پڑنے کے خوف سے جان نکل رہی ہے تمہاری۔''

''ہاہاہا۔۔۔ زرگل صاحب آپ جانتے نہیں ہیں ابھی خوش نصیب کو۔۔۔ وہ صرف جوتے نہیں مارتی اس کا دل چاہے تو سر بھی پھاڑ سکتی ہے۔''

''چچ۔۔۔ چچ۔۔۔ چچ۔۔۔ بہت ہی شرم کا مقام ہے بھئی کہ کیف صاحب اپنی کزن سے ڈرے کھڑے ہیں۔ چلو بھئی میں ساتھ چلتا ہوں جوتے کھانے۔۔۔ میرا مطلب تھا سلام کرنے۔'' زرگل اسے چڑا رہا تھا۔

کیف نے اس کی باتوں پر دھیان دینا ضروری نہیں سمجھا اور اس کے ساتھ تیزی سے خوش نصیب کی جانب بڑھ گیا تھا۔

خوش نصیب منفرا کے ساتھ محوِ گفتگو تھی جب کوئی اچانک اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور پھر اس نے اپنے عقب میں اپنے نام کی پکار سنی تھی

''خوش نصیب۔۔۔!''

اور اس آواز کو سن کر اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔۔۔

تین سال۔۔۔ تین سال بعد وہ اس آواز کو سن رہی تھی۔

دل ہی دل میں اپنا اندازہ غلط ہونے۔۔۔ کی دعا کرتے ہوئے وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی اور آہستہ سے مڑی تھی۔ اس کا اندازہ صد فیصد درست نکلا تھا۔

ہاں۔۔۔ یہ وہی تھا۔

تین سال۔۔۔ تین سال بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

ایک لمبے عرصے بعد وہ کسی 'اپنے' کو دیکھ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ خوش نصیب کی پتھرائی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ گرم جوشی سے بولا تھا۔

''کیسی ہو خوش نصیب؟'' کیف کے انداز میں نرمی ہی نرمی تھی۔

اور ایک ہی لمحے میں خوش نصیب جیسے ہوش میں آئی تھی۔

''معاف کیجیے گا۔۔۔ آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔'' خوش نصیب کے انداز میں سختی ہی سختی تھی۔

بشام کی تمام برف جیسے کیف کی گرم جوشی پر آ گری تھی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

''خوش نصیب! میں جانتا ہوں' تم ناراض ہو لیکن۔۔۔''

''ایک منٹ سر! میں آپ کو نہیں جانتی۔ براہ مہربانی یہاں سے تشریف لے جائیں۔'' اس کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے آرام سے سن لی تھی اور اب سب ان کی جانب متوجہ تھے۔ زرگل کو حالات کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر کیف کو وہاں سے لے جاتا، پاشا

وہاں آگیا تھا۔

"کیا بات ہے بی بی؟ سب خیریت تو ہے؟" اس نے شاید دور سے سب دیکھا تھا۔ وہ کیف کی جانب مڑا تھا اور چونک گیا۔ "بھائی! کیا بات ہے؟"

کیف نے ایک نظر پاشا پر ڈالی اور جھٹکے سے مڑا تھا۔

"چلو یہاں سے۔۔۔" زرگل کے پاس ایک سیکنڈ کے لیے رکتے ہوئے اس نے کہا تھا اور گاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ زرگل بھی تیزی سے اس کے پیچھے گیا تھا۔

"یہ کون تھا خوش نصیب؟" منفرا نے پوچھا تھا۔

"یہ کیف تھا۔" خوش نصیب نے اجنبی سے انداز میں بتایا اور منفرا کے کچھ بھی کہنے سے پہلے بولی تھی۔ "منفرا! بارش کافی ہلکی ہوگئی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو واپس چلتے ہیں' اس سے پہلے کہ بارش پھر سے تیز ہو جائے۔"

منفرا اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیف۔۔۔ کیف۔۔۔ ریلیکس یار۔۔۔" زرگل نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا تھا۔ "اتنا غصہ مت کرو۔"

"غصہ نہیں کر رہا یار۔۔۔" کیف نے دانت نکال کر کہا۔ "سارے پٹھان بیٹھے ہوئے تھے وہاں۔ میں نے سوچا ان کی غیرت نہ جاگ جائے اور یہاں بیچ میں جوتے پڑ جائیں۔"

زرگل نے گھور کر دیکھا تھا اسے۔۔۔

"اب کیا کرنا ہے؟ واپسی کا کیا پلان ہے؟ وہ تو تجھے گھاس بھی نہیں ڈال رہی۔"

"زرگل! میں واپس نہیں جاؤں گا۔" کیف نے کسی بچے کے سے انداز میں ضد کی تھی۔

"تمہارے سامنے ہے ساری سچویشن۔۔۔ میں تمہیں یہاں چھوڑ نہیں سکتا۔۔۔ مجھے ذرا بھی بھروسا نہیں تم پر اس معاملے میں اور نہ ہی میں یاسر کو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک دو دن یہاں رک جائے۔۔۔ اس کی طبیعت تمہارے سامنے ہے۔" وہ بے چارگی سے بولا تھا۔

"میں خوش نصیب کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔ وہ یہاں کھو گئی تو دوبارہ نہیں ملے گی مجھے زرگل۔۔۔! تم جانتے ہو' میں نے اسلام آباد میں اسے کتنا ڈھونڈا ہے۔۔۔ اور تم تو سب جانتے ہو نا۔۔۔ گھر پر انتظار ہو رہا ہے اس کا۔۔۔ اب کیسے میں اسے یہاں چھوڑ جاؤں۔ مجھے اسے ہر حال میں واپس لے کر جانا ہے۔"

زرگل نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خود پریشان ہو گیا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔

"زرگل! مجھے یہاں چھوڑ جاؤ۔۔۔ میں جلد واپس آجاؤں گا۔ پریشان نہ ہو تم۔ بچہ نہیں ہوں میں۔۔۔ مینج کر سکتا ہوں اکیلا بھی۔۔۔"

"ٹھیک ہے یار۔۔۔ اب مجبوری ہے تو کیا کر سکتے ہیں۔ میں جاتا ہوں' یاسر کو چھوڑ کر جتنی جلدی ہو سکا میں واپس آجاؤں گا۔ اور تم۔۔۔ تم کسی الٹے کام میں نہیں پڑو گے کیف۔۔۔ اگر تم نے ایسا کچھ کیا یا تم دوبارہ فلک بوس یا آیو متی کے چکر میں انوالو ہوئے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم بس خوش نصیب کو راضی کرو میرے آنے تک۔۔۔ پھر ہم واپس چلے جائیں گے۔"

"بالکل۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ جیسا تم چاہو گے بالکل ویسا ہی ہوگا۔" کیف نے فرماں برداری سے سر ہلایا تھا۔

اور پھر پندرہ منٹ بعد بہت سی ہدایات دے کر زرگل' یاسر کے ساتھ اسلام آباد کی جانب روانہ ہو گیا تھا

اور کیف اپنا سفری بیگ کندھے پر لٹکائے تیزی سے سلمان احمد کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

فلک بوس سے کافی دور جنگل سے ذرا ہٹ کر بشام کا قبرستان ہے۔

پائن کے برف سے ڈھکے قد آور درختوں میں گھرا۔ خاموش چپ چاپ سا قبرستان۔

یہاں خاموشی بھی ہے، وحشت بھی ہے لیکن فلک بوس سا اسرار نہیں ہے۔

اونچی نیچی ڈھلوان پر قدم جماتے ہوئے اگر سیدھ میں چلتے جائیں تو ایک مقام آتا ہے جہاں سے قبرستان کی حد بندی کے لیے باڑھ دکھائی دینا شروع ہو جاتی ہے۔

اس مقام سے فلک بوس دکھائی نہیں دیتا سو وہ عمارت جو اپنے اندر اتنا اسرار رکھتی ہے کہ انسانوں کو بھی اپنے حصار میں لے لیتی ہے، اس کا اسرار یہاں آکر دم توڑ دیتا ہے۔

قبرستان کے اندر چھوٹی بڑی کچی پکی قبروں پر اجل کا فرشتہ اپنا سایہ پھیلا کر جا چکا تھا۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو کہیں پیچھے دم توڑ گئی تھی اور قبرستان کی حدود میں ایک سرد سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

بشام کے پہاڑ سے کئی میل دریائے کنہار کے دوسرے کنارے پر جو پہاڑ تھے ان کے عقب سے بیدار ہوتے سورج کی کرنیں سر نکال رہی تھیں اور ایسا ملگجا اجالا پھیل رہا تھا کہ نظر بدقت دور تک دیکھ سکتی تھی۔

اسی اندھیرے میں کچھ فاصلہ پر وسامہ کی قبر کے کنارے معاویہ بیٹھا ہوا تھا۔

ٹھنڈی برف سے اٹی ہوئی زمین پر اپنی ٹانگوں کو موڑ کر پیٹ سے لگائے ۔۔۔ بازو ٹانگوں کے گرد باندھے ۔۔۔ وہ گٹھڑی بنا چپ چاپ بیٹھا تھا۔

اس نے ابھی ابھی قبر کی صفائی کی تھی۔ برف کو ہٹایا تھا۔ اور پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ قبر کے پاس رکھ دیا تھا۔

وہ ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کیے دعا مانگ رہا تھا۔ دعا پوری کر کے اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں کے کنارے نمی تیر رہی تھی۔

اس کی حسرت بھری آنکھیں قبر پر جمی تھیں۔

''کاش وسامہ! ۔۔۔ کاش میں سمجھ جاتا کہ تم کس اذیت سے گزر رہے ہو ۔۔۔ کاش میں تمہاری تکلیف سمجھ سکتا ۔۔۔ کاش میں سمجھ پاتا کہ تم کیا محسوس کرتے ہو ۔۔۔ اگر میں سب سمجھ گیا ہوتا تو شاید آج تم میرے ساتھ ہوتے ۔۔۔'' اس نے دائیں ہاتھ سے آنکھوں کو صاف کیا۔

''میری زندگی میں تمہارے حوالے سے اتنے سارے کاش جمع ہو گئے ہیں وسامہ! کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ۔۔۔'' وہ سرگوشی کے انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

بشام ہمیشہ اسے نوسٹیلجک کر دیتا تھا۔ اور یہ نوسٹیلجیا اچھی یادوں کے ساتھ بہت سی بری یادیں بھی تازہ کر دیتا تھا۔ اس کا دل بھرا ہوا تھا اور وسامہ سے بہتر کون ہو سکتا تھا جو اس کی بات سنتا۔

''میرا دل بہت بھرا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اب بھی نہیں بولوں گا تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ میری زندگی مکمل ہے۔ فیملی مکمل ہے ۔۔۔ میری بیوی بچے ۔۔۔ مگر وسامہ! اتنا سکون کیوں نہیں جتنا ہونا چاہیے۔ اتنا اطمینان کیوں نہیں ہے بھائی ۔۔۔ تم تو سب جانتے ہو وسامہ ۔۔۔ سب کچھ ۔۔۔ ایک ایک بات ۔۔۔''

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

کچھ دور قبروں کی حدود سے کوئی ساٹھ قدم آگے پہاڑ کا سینہ بے آب و گیاہ پڑا تھا۔ یہ جگہ غالباً مزید انسانوں کی آخری آرام گاہ کے طور پر چھوڑی گئی تھی۔ ذرا آگے پہاڑ کی آخری حد تھی۔

اسے یاد آیا تھا کہ وہ ایک بار آئے کت کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور اس کا انتظار کرتے کرتے اس مقام پر سو گیا تھا۔

''امید کرتی ہوں، تم اچھی نیند سوئے ہو گے۔'' آئے کت نے آہستہ سے مسکرا کر کہا تھا۔

''پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی۔۔۔ یہ زمین کافی سخت ہے۔'' معاویہ نے قدرے شرمندگی سے کہا تھا۔

قبرستان کے پاس اسے سونا تو نہیں چاہیے تھا۔ یہ غلط کر دیا تھا اس نے۔

''اس سخت زمین پر بھی تم کافی دیر سے سوئے ہوئے ہو۔''

''ہاں۔۔۔ وہی ناں۔۔۔ پتا نہیں کیسے سو گیا میں۔''

''رات کو تمہیں بھی پرسکون نیند نہیں آئی ہو گی۔۔۔ میں بھی نہیں سو سکی۔۔۔'' آئے کت نے ایک بار پھر گردن سامنے کی طرف موڑتے ہوئے کہا تھا۔

''آہ۔۔۔ آئے کت۔۔۔'' اس کو آئے کت شدت سے یاد آئی تھی اور اس کا دل نفرت سے لبالب بھر گیا تھا۔

آئے کت جو اس کی پہلی محبت تھی یا شاید انسیت تھی، وہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ اس کی زندگی کی دوسری نفرت ضرور تھی۔

ہاں دوسری نفرت۔۔۔ کیوں کہ اپنی زندگی میں نفرت کا پہلا احساس اس نے فلک بوس اور آیو شمتی کے لیے محسوس کیا تھا۔۔۔ جس نے اس سے اس کا بھائی چھین لیا تھا۔

اور بلاشبہ۔۔۔ نفرت زندگی میں ملنے والا سب سے اذیت ناک عذاب ہے۔۔۔

اس نے منہ موڑ لیا اور پھر سے قبر کو دیکھنے لگا۔

''تم جانتے ہو وسامہ! کہ میں نے تمہاری موت کا بدلہ لینے کی پوری کوشش کی۔۔۔ میں نے فلک بوس کو بے آباد کر دیا۔۔۔ یہاں کی واحد مکین کو تنہا کر دیا۔ یہ صرف تب آباد ہوتا ہے جب میں یہاں آتا ہوں۔۔۔ اور میں بھی تو صرف یہی بتانے آتا ہوں یہاں کہ اسے پتا چل جائے کہ تمہیں مجھ سے دور کر کے اس نے اپنے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے۔'' وہ بے خودی کے عالم میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ ''مگر وسامہ! سکون تو پھر بھی نہیں ملتا مجھے۔۔۔ تم اپنے ساتھ میرا سکون بھی لے گئے ہو۔''

اس نے تھک کر سر اپنے گھٹنوں پر رکھ دیا تھا۔

وہاں سے گزرتی ہوا اور اونچے پائن کے درخت پر بیٹھے جنگلی پرندوں نے معاویہ کی باتوں کو سنا تھا پھر ایک دوسرے کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

''صاحب! آپ نے مجھے بلایا تھا؟''

معاویہ ابھی ابھی تیار ہو کر بیڈ روم سے باہر آیا تھا جب کبیر بابا نے آ کر پوچھا تھا۔

''جی ہاں۔۔۔ آپ کو کل ایک کام کہا تھا۔۔۔ پتا کیا آپ نے ان لڑکوں کا؟''

''جی صاحب! میں نے پتا کیا تھا وہ لوگ واپس چلے گئے ہیں۔ سنا ہے ان میں سے ایک لڑکے کی طبیعت کافی خراب رہی ہے۔ اس لیے جلدی چلے گئے۔''

غالباً کبیر کو ابھی تک کیف کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ بشام میں ہی موجود ہے۔

''چلیں، یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ پاشا کو کہیں، میری گاڑی نکال کر صاف کر دے۔ مجھے ابھی ایبٹ آباد کے لیے نکلنا ہے۔''

''صاحب! ساری رات برف باری ہوتی رہی ہے اور ابھی بھی ہو رہی ہے۔ ایسے موسم میں سفر کرنا مشکل ہو گا۔''

''جانتا ہوں بابا! مگر مجبوری ہے۔ کام ضروری ہے ورنہ منع کر دیتا۔''

''ٹھیک ہے صاحب! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' کبیر نے تابع داری سے کہا۔

''رات تک واپس آ جاؤں گا میں۔ آپ بی بی اور بچوں کا خیال رکھیے گا۔ دھیان رکھیے گا کہ دوبارہ ایسا کوئی واقعہ نہ ہو کہ کوئی فلک بوس میں داخل ہو سکے نہ ہی بی بی لوگ ہر طرف اکیلے جائیں۔۔۔ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟'' معاویہ نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

''جی صاحب! آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔ میں پورا دھیان رکھوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب آپ جائیں اور گاڑی نکلوا دیں۔'' وہ واپس کمرے کی طرف چل دیا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایک نظر بیڈ پر ڈالی تھی جہاں منفرا گہری نیند سو رہی تھی۔

وہ بچوں کے کاٹ کی جانب بڑھ گیا جو اس کی ضد پر ابھی تک ان کے ہی کمرے میں موجود تھا۔ بچوں کو رات میں خوش نصیب کے کمرے میں سلانے کے بجائے ان کے کمرے میں ہی رکھا گیا تھا۔ کاٹ پر نظر ڈالتے ہی اس کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ ہدیٰ جاگ رہی تھی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے وہ کاٹ کے اوپر لگے چھوٹے چھوٹے کھلونوں کو تکتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ہی کھیل رہی تھی۔

''میری جان!'' معاویہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے بازوؤں میں اٹھا کر سینے سے لگایا پھر اس کے سر پر جمی ننھی سی ٹوپی کو چوم لیا۔

''میری گڑیا۔۔۔ ابھی سے سمجھ دار ہو گئی ہے۔۔۔ بھائی جیسی گندی بچی نہیں ہے۔۔۔ جاگ جاتی ہے تو مما کو ڈسٹرب نہیں کرتی۔ شور بھی نہیں مچاتی۔ روتی بھی نہیں ہے۔ میرے بچے کو پتا ہے' بابا اس سے کتنا پیار کرتے ہیں۔''

وہ کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے ہدیٰ سے باتیں کر رہا تھا جیسے وہ اس کی سب باتیں سمجھ رہی ہے۔

منفرا کی آنکھ معاویہ کی باتوں سے ہی کھلی تھی۔ چند لمحے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکی کہ ہو کیا رہا ہے۔ جب تیار کھڑے معاویہ پر نظر پڑی تو گھڑی کو دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی۔ بال سمیٹتے ہوئے وہ بستر سے نکل آئی۔

''معاویہ۔۔۔!'' اس نے سوئی سوئی آواز میں پکارا۔ ''کدھر کی تیاری ہے؟''

معاویہ کی اس کی جانب پشت تھی۔ اس کی آواز پر وہ مسکراتا ہوا پلٹا پھر شرارت سے بولا۔

'' گڈ مارننگ ماما۔۔۔ دیکھو' ہم باپ بیٹی تم سے پہلے جاگ گئے ہیں۔'' وہ ہدیٰ کو جھلاتے ہوئے بولا۔

منفرا کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی پھر معاویہ کی گود میں ہی ہدیٰ کے سر پر پیار کیا تھا۔

''منفرا! سردی ہے۔ تم شال لو یا سویٹر پہن لو۔ پہلے ہی تمہیں زکام ہے۔'' معاویہ نے اسے ٹوکا تھا۔ وہ ایسا ہی فکر مند رہتا تھا اس کے لیے۔

''وہ تو میں لے لیتی ہوں مگر تم اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''یار! رات بابا کی کال آئی تھی۔ مجھے ایبٹ آباد جانا ہو گا۔ وہاں کچھ ایشو ہو گیا ہے۔ جانا ضروری ہے۔''

''زیادہ بڑا مسئلہ ہے کیا؟''

''ارے نہیں۔۔۔ تم کیوں فکر کر رہی ہو۔ میں ہوں نا' سنبھال لوں گا۔ فکر مت کرو۔'' اس نے محبت سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔

''اور واپس کب آؤ گے؟''

''آج ہی رات تک واپس آ جاؤں گا۔ تم بالکل بھی پریشان مت ہونا۔ امید ہے آٹھ نو بجے تک تمہارے

ساتھ یہاں موجود ہوں گا۔"

"دھیان سے جانا۔۔۔اس موسم میں ڈرائیونگ بھی خطرناک ہے۔"

"جو حکم۔۔۔" معاویہ نے مسکرا کر کہا اور آگے بڑھ کر ہدیٰ کو واپس کاٹ میں لٹا دیا تھا۔

"ادھر آؤ۔۔۔تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔"

وہ منفرا کا ہاتھ تھام کر کھڑکی تک لے گیا۔

"باہر دیکھو۔۔۔" اس نے اشارے سے کہا تھا۔

منفرا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور مبہوت ہو کر رہ گئی۔

اس کھڑکی سے پوری وادی نظر آرہی تھی۔ کھڑکی سے آگے فلک بوس کا لان تھا جس کے وسط میں تالاب تھا اور سفید پری تھی۔۔۔اور پھر دور بشام کی وادی۔۔۔اونچے نیچے گھر۔۔۔پائن کے درخت۔۔۔سب سفید برف سے ڈھکا ہوا تھا۔۔۔

معاویہ اس کی محویت پر مسکرا دیا۔

"منفرا۔۔۔" اس نے پکارا۔

وہ کچھ نہ بولی بس خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"مجھے پانچ منٹ میں نکلنا ہے۔تم بچوں کا دھیان رکھنا۔اور ہاں۔۔۔پلیز' فلک بوس میں زیادہ گھومنے کی ضرورت نہیں ہے۔اکیلے تو بالکل بھی نہیں۔تم یہاں کے بہت سے رستوں سے واقف نہیں ہو۔ایسا نہ ہو کہ فلک بوس میں ہی کہیں بھٹک جاؤ۔۔۔تم لوگ بس یہاں اگلے حصے میں ہی رہنا جب تک میں واپس نہ آجاؤں۔ٹھیک ہے نا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" منفرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اور ہاں' یہ اپنی سہیلی کو کہنا ادھر ادھر پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔موسم خطرناک ہے' ایسا نہ ہو واپس جانے سے پہلے اسے کسی کھائی سے نکالنا پڑے۔" اس نے ناک چڑھائی۔منفرا ہنس دی۔

"پتا نہیں تمہیں وہ اتنی بری کیوں لگتی ہے۔بے چاری' اتنی اچھی تو ہے۔"

"ہاں جی۔۔۔بہت ہی زیادہ۔۔۔چلو اب میں نکلتا ہوں۔تم میری ساری باتیں یاد رکھنا۔بچوں کا اور اپنا دھیان رکھنا ہے۔۔۔بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑنا ہے بالکل بھی۔۔۔"

وہ سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اور والٹ اٹھانے لگا۔

"ہاں ہاں پتا ہے۔۔۔پورا دھیان رکھنا ہے' کہیں مجھے اور بچوں کو آیو شمتی پکڑ نہ لے۔" منفرا اسے چڑا رہی تھی۔

"فضول مت بولو۔" معاویہ خفگی سے بولا۔

منفرا کھلکھلا کر ہنس دی۔

"کم آن معاویہ! تم ان چیزوں سے مجھے ڈرا رہے ہو جن پر خود بھی بلیو نہیں کرتے۔۔۔ہاہاہا۔۔۔کچھ نہیں ہوگا مجھے یا بچوں کو۔۔۔ویسے بھی تم صرف چند گھنٹوں کے لیے جا رہے ہو اور رات تک واپس آجاؤ گے، ان شاء اللہ۔"

معاویہ بھی ہنس پڑا۔"صحیح کہہ رہی ہو تم۔۔۔مگر تم اسے جو بھی سمجھو یار! میں باپ بننے کے بعد بہت وہمی ہو گیا ہوں۔ ہر وقت تمہاری اور بچوں کی فکر رہتی ہے۔اب تو مجھے کوئی کہے کہ آیو شمتی کا وجود ہے جو میرے بچوں یا بیوی کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو میں تو یقین کر لوں۔" وہ اپنا ہی مذاق اڑا رہا تھا۔

منفرا اسے مسکرا کر دیکھتی رہی تھی۔

''اچھا سنو۔۔۔اگر تمہیں زیادہ ٹینشن ہو رہی ہے تو ہم لوگ تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ ورنہ تمہارا دھیان اس طرف ہی لگا رہے گا۔'' اس نے معاویہ کی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

''نہیں۔۔۔تمہاری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے ورنہ میں ضرور ایسا کرنے کا سوچتا۔ مسلسل سفر سے تھک جاؤ گی تم۔ تم گھر پر رہو اور آج آرام کرو۔۔۔ میں آج اپنا کام ختم کرتا ہوں اور اس کے بعد بس۔۔۔ میں مزید کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے والا۔ اس کے بعد سارا ٹائم صرف میری بیوی اور بچوں کے لیے ہوگا۔'' اس نے منٹوں میں اس کا مشورہ رد کر دیا تھا۔

''آر یو شیور؟''

''ہنڈرڈ پرسنٹ۔۔۔'' معاویہ نے کہا۔ ''اب میں جاؤں۔۔۔؟''

منفرا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

وہ اسے اللہ حافظ کہنے کے لیے دروازے تک جانا چاہتی تھی لیکن اسی وقت وسامہ جاگ گیا اور رونے لگا۔ معاویہ نے اسے وسامہ کو سنبھالنے کو کہا اور کمرے میں ہی انہیں خدا حافظ کہہ کر تیز تیز چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

برآمدے میں کبیر اور پاشا اس کے منتظر تھے۔ پاشا نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

''صاحب۔۔۔'' کبیر نے پکارا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو پاشا کو ساتھ لے جائیں۔ اسے پہاڑوں میں گاڑی چلانے کا تجربہ ہے۔ آپ کو سہولت رہے گی۔''

مشورہ اچھا تھا۔ معاویہ کو پسند آیا۔

''اچھا آئیڈیا ہے۔ چلو پاشا خان۔۔۔ ساتھ چلو میرے۔۔۔''

اس نے گاڑی کی چابی پھر سے پاشا کے حوالے کر دی تھی۔ تینوں چلتے ہوئے گاڑی تک آ گئے تھے۔ پاشا نے جلدی سے آگے بڑھ کر بیک ڈور کھول دیا۔ پاشا کو ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جانے کا اشارہ کر کے وہ کبیر کی طرف مڑا تھا۔

''کبیر بابا! دھیان رہے کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں منفرا بی بی کو آپ کی حفاظت میں دے کر جا رہا ہوں۔ مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی بھی نہ جاتا۔ ان کا پورا خیال رکھیے گا اور ہاں۔۔۔ اس دوسری لڑکی پر نظر رکھیے گا۔ مجھے اس پر زیادہ بھروسا نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو وہ پورے فلک بوس میں پھرتی رہے۔ دوسری منزل پر اکیلے تو کسی کو جانے۔ نہیں دینا ہے۔''

اس نے بات مکمل کرتے سر اٹھا کر دوسری منزل کی کھڑکیوں پر نظر ڈالی تھی۔۔۔

''آپ نے بیک سائیڈ سے گرل ٹھیک کروائی ہے؟'' اس کو اچانک ہی یاد آیا تھا۔

''جی صاحب! یہ کام تو میں نے کل ہی کروا دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔''

وہ گاڑی کی جانب بڑھ گیا تھا۔ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں فکرمندی لیے وہ گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

''چلو پاشا خان۔۔۔!'' اس نے حکم دیا

خود اس نے آنکھیں موند کر سیٹ سے سر ٹکا لیا تھا۔

☆☆☆

پورا دن اور رات گزار کر اور اپنا کیس لڑنے کے لیے سارے دلائل جمع کر کے اگلے دن شام میں وہ خوش

نصیب سے ملنے کے لیے ایک بار پھر سے فلک بوس جا پہنچا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی تھی کہ اس نے خوش نصیب کی رہائش کے بارے میں کیسے پتا کیا تھا۔ ڈھائی دو سو کی آبادی میں یہ جاننا قطعاً مشکل نہ تھا کہ معاویہ اردشیر ازی فلک بوس پہنچ چکا ہے۔ اس کی بیوی کو وہاں لوگ پہچانتے تھے۔ پھر اسے ۔۔۔۔۔ یاد تھا کہ پاشا نے خوش نصیب کے لیے بی بی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یعنی وہ بازار میں پاشا کے ساتھ آئی تھی اور پاشا کی رہائش فلک بوس میں تھی۔ کڑی سے کڑی ملاتے ُوہ جان گیا تھا کہ خوش نصیب فلک بوس میں موجود ہے۔

اور جب اس نے یہ جان لیا تو دل ہی دل میں آیوشمتی کی خیریت کی دعا بھی مانگ ڈالی تھی۔

مگر جلد ہی اسے احساس ہوا تھا کہ خوش نصیب ان دیکھے خطرے میں گھر گئی ہے۔ اسے یقین تھا کہ شیرازی خاندان فلک بوس اور آیوشمتی کی آڑ میں کوئی بڑا کھیل کھیل رہے تھے۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ جلد از جلد خوش نصیب سے مل کر اسے سب کچھ بتا دے گا اور اسے ساتھ چلنے کے لیے کہے گا۔ وہ بہت دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا تھا پھر یک دم اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اس ساری پہیلی کو حل کرنے کے لیے خوش نصیب کی مدد لی جا سکتی ہے۔ شیرازی خاندان کے ساتھ خوش نصیب کی موجودگی اور معاویہ اردشیرازی کی بیوی کے ساتھ اس کا دوستانہ انداز ظاہر کرتا تھا کہ خوش نصیب ان کے خاندان سے گھل مل چکی ہے۔

اسے خوش نصیب کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ اگر وہ اس کی مدد کو راضی ہو جاتی تو وہ یقیناً بہت جلد سچ کو جان لیتا۔

''وہ فضل منزل کی آیوشمتی ہے اور فلک بوس کی سو آیوشمتیاں بھی اس کے سامنے آ جائیں تو بھی میری ایک نصیبن ان پر بھاری پڑے گی۔''

اس نے شرارت سے سوچا تھا۔

اگر یہ معمہ حل ہو جاتا تو کیف کے فیوچر کو ضرور چمکا دیتا۔ تھا تو یہ قدرے خود غرضی والا معاملہ ۔۔۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی حل بھی نہ تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خوش نصیب کو سب سچ بتا کر اسے منائے گا کہ وہ اس کی مدد کرے۔

اب وہ پھر فلک بوس کے بڑے سے پھاٹک کے سامنے کھڑا تھا۔

''یا اللہ مدد۔۔۔ آیوشمتی سے تو بچالیا اب پلیز نصیب متی سے بھی بچالینا۔''

دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرتا وہ آگے بڑھا تھا اور اطلاعی گھنٹی ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ تھوڑی تلاش کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ جس لوہے کی وزنی گھنٹی کو، جیسی کہ مندروں میں لٹکائی جانے والی گھنٹی ہوتی ہے، آرائشی سمجھ رہا تھا وہی اطلاعی گھنٹی تھی۔۔۔ اپنی عقل پر سات توپوں کی سلامتی بھیجتے ہوئے اس نے رسی کو تھاما اور زور سے ہلایا تھا۔

ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔

پرسکون فضا میں یکدم ہلچل سی مچ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اسے سامنے سے اپنی جان کا دشمن بابا کبیر لاٹھی ٹیکتا ہوا آتا دکھائی دیا تھا۔

''تم۔۔۔ تم پھر آ گئے؟'' اس نے سامنے آتے ہوئے کچھ حیرانی سے پوچھا تھا۔

اس کے چہرے پر کچھ فکر مندی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ جہاں تک جانتا تھا' یہ لوگ کل بشام سے چلے گئے تھے لیکن اب اسے کیف پھر اپنے سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سچ میں پریشانی کا مقام تھا۔

''جی۔ میں پھر آ گیا۔۔۔'' کیف نے بتیس دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بتایا تھا۔

لو جی۔۔۔ بابا جی مائنڈ ہی کر گئے۔ ہاتھ میں پکڑی لاٹھی اس کی طرف سیدھی کی اور اس سے پہلے کہ وہ

کیف کی ٹانگوں کا نشانہ باندھتے' کیف بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔

''او بابا جی! نیچے کریں اسے۔۔۔ آپ تو نہ آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ۔۔۔ بس لاٹھی لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔آپ کے ہیرے چوری کرنے نہیں آیا یہاں جو مار رہے ہیں۔نہ ہی تصویریں لینے آیا ہوں۔''

''یہاں لنگر نہیں بٹ رہا۔۔۔ بھاگو یہاں سے۔۔۔'' بابا جی نے جواباً حملہ کیا تھا۔

کیف اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''خوش نصیب کو بلائیں۔۔۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔''اس نے منہ پھلا کر کہا تھا۔

کبیر بابا نے سر سے پاؤں تک اسے گھور کر دیکھا۔

''کیوں ملنا ہے؟''

''بابا جی! یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ خوش نصیب کو بلا دیں۔۔۔ مہربانی آپ کی۔'' وہ سوال در سوال سے کچھ چڑ کر بولا تھا۔

''تم ہو کون بھئی؟ کیوں ملنا ہے اس بچی سے؟ جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں' میں تو نہیں بلاؤں گا اسے۔''

کبیر کی ہٹ دھرمی عروج پر تھی۔

کیف سمجھ گیا کہ بابا جی ایسے جان نہیں چھوڑیں گے۔

''کزن ہے وہ میری۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ بشام میں ہے۔کل ہی معلوم ہوا ہے'اس لیے ملنے آیا ہوں۔اب آپ کی تسلی ہو گئی ہو تو اسے بلا دیں گے؟''

کبیر چند لمحے اسے مشکوک انداز میں گھورتا رہا تھا پھر اسے ''یہاں ہی رکو۔۔۔'' کہہ کر اندر کی جانب مڑ گیا۔

کیف رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

قلعہ فلک بوس کے مین گیٹ کے عین سامنے ایک ڈھلوانی سڑک تھی اور اس سے آگے بشام کا جنگل۔۔۔

کیف غیر ارادی طور پر جنگل کی جانب دیکھتا جا رہا تھا۔دل ہی دل میں وہ خود کو خوش نصیب کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا اور ان تمام دلائل کو دہرا رہا تھا جو اسے دینے تھے۔وہ فی الحال اس کی آخری امید تھی اور وہ اس امید سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔

اسے وہاں کھڑے تقریباً دس منٹ ہوئے تھے جب خوش نصیب شال لپیٹے، روش پر تیز تیز قدم اٹھاتی اسے گیٹ کی جانب آتی دکھائی دی تھی۔

وہ ٹکٹکی باندھے اس کے قدم گنتا رہا تھا۔وہ پہلے سے کمزور ہو گئی تھی۔ انداز میں کچھ سنجیدگی سی آ گئی تھی۔ رنگت بھی پہلے سے کچھ ماند پڑ گئی تھی۔کیف کو دکھ ہوا تھا۔اس لڑکی کو برباد کرنے میں کچھ ہاتھ تو اس کا بھی تھا۔

''جی فرمایئے؟'' لٹھ مار انداز۔۔۔

خوش نصیب گیٹ کے اس پار آ کھڑی ہوئی تھی۔اس نے گیٹ کھول کر اسے اندر بلانے یا خود باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

کیف نے اس کا انداز بغور دیکھا پھر نرمی سے بولا۔

''خوش نصیب! باہر آ جاؤ تا کہ ہم آرام سے بات کر لیں۔''

''میں اجنبی لوگوں سے ایسے ہی بات کرتی ہوں۔آپ کو جو کہنا ہے' جلدی کہیے' میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

اب کی بار اسے خوش نصیب کا انداز کچھ برا لگا تھا مگر یہ ناراضی دکھانے کا وقت نہیں تھا۔

"تم باہر آجاؤ یا کم از کم اس گیٹ کو ہی کھول لو۔۔۔ کھا نہیں جاؤں گا میں تمہیں۔۔۔ آدم خور نہیں ہوں۔"

"بالکل آپ آدم خور نہیں ہیں۔۔۔ آپ لوگ انسان نہیں کھاتے۔۔۔ آپ لوگ تو بس دوسروں کی خوشیاں اور سکون کھاتے ہیں۔ یا دوسروں کا حق کھاتے ہیں۔" اس نے کاری ضرب لگائی تھی لیکن گیٹ کھول دیا تھا۔

کیف دو قدم بڑھا کر اندر آگیا۔

"تم صحیح کہتی ہو خوش نصیب! مگر کم از کم مجھے صفائی کا ایک موقع تو دو۔"

"تم لوگ یہ موقع تین سال پہلے کھو چکے ہو کیف۔۔۔! اگر اس کے علاوہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو ورنہ واپس لوٹ جاؤ۔" اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ کیف کچھ بھی بول نہیں سکا تھا۔ تمام دلائل اپنی موت آپ ہی مر گئے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ اس بارے میں ہم ابھی بات نہیں کرتے۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو خوش نصیب؟"

"نہیں۔۔۔" دو ٹوک جواب آیا تھا۔

کیف اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"کیوں؟" اس نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔

"کیوں کہ میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔"

"ہمم م م۔۔۔ صحیح۔۔۔ تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں اس جگہ کے بارے میں جہاں تم رہ رہی ہو۔۔۔ قلعہ فلک بوس کے بارے میں۔۔۔"

خوش نصیب نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ۔۔۔ جو کہنا ہے کہو اور دفع ہو جاؤ۔

"یہ تم جس فیملی کے ساتھ رہ رہی ہو۔۔۔ ان کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ قابلِ اعتبار نہیں ہے معاویہ شیرازی۔۔۔"

"میں ان کے بارے میں سب جانتی ہوں جو جاننا ضروری ہے۔۔۔ کم از کم یہ لوگ دوسروں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔۔۔ دوسروں کے مال پر قبضہ نہیں کرتے۔۔۔ اور جو بھی ہیں، میرے حق میں بہت اچھے ہیں۔ تم مجھے ان سے متنفر نہیں کر سکتے۔" خوش نصیب نے کیف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سختی سے کہا تھا۔

"تم دو منٹ کے لیے سب کچھ بھول کر میری بات نہیں سن سکتیں؟" اب کے کیف بھی چڑ کر بولا تھا۔

"اس میں کچھ بھی بھولنے لائق ہے؟ میری بات کان کھول کر سن لو کیف! میں ابھی یا کبھی بھی کچھ نہیں بھولنے والی۔۔۔ میں کبھی نہیں بھولوں گی کہ تمہاری ایک غلطی نے میری ماں مجھ سے چھین لی اور تم لوگوں کی وجہ سے مجھے دربدر ہونا پڑا۔ ٹکے ٹکے کی جابز کے لیے ترسنا پڑا ہے مجھے۔۔۔ کچھ بھی نہیں بھولوں گی میں۔" اس کے غصے کا گراف لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔

"یار! اگر تم نے یہ سب بھگتا ہے تو میں بھی سکون میں نہیں رہا۔۔۔ اور کون سا کوئی اور سکون میں رہ پایا ہے۔ ہر کوئی اپنی جگہ اپنی غلطیوں کی سزا بھگت رہا ہے۔۔۔ تمہیں پتا ہے ماہ۔۔۔"

خوش نصیب نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ درمیان میں ہی بات کاٹ دی تھی۔

"اور سب سے زیادہ ان غلطیوں کی سزا مجھے دی گئی ہے جو میں نے کبھی کی ہی نہیں۔۔۔ مجھے کچھ بھی نہیں سننا ہے کیف۔۔۔! جو کرنا تھا، تم لوگوں نے وہ کر چکے ہو۔۔۔ اب خدا کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ اور دوبارہ

کبھی میرے سامنے مت آنا۔"

"بے وقوف لڑکی! مجھے ایک موقع تو دو بات پوری کرنے کا۔ میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔ شروع سے آخر تک۔ اب حالات ویسے نہیں ہیں جیسے تمہیں نظر آرہے تھے۔ مگر اس سے بھی پہلے تمہیں یہاں کے حالات کے بارے میں جاننا ہوگا۔"

وہ چپ چاپ اس کی بات سنتی رہی تھی۔ سپاٹ چہرہ، آنکھوں میں سختی۔۔۔

کیف نے بہتر سمجھا کہ ۔۔۔ جلدی جلدی اپنی بات پوری کرلے۔

"تمہیں پتا ہے اس قلعے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک آیو شمتی نامی بدروح کا سایہ ہے۔۔۔ جو یہاں رہنے والوں کو خوش نہیں رہنے دیتی۔۔۔ اور مجھے یقین ہے خوش نصیب یہ صرف کور اسٹوری ہے۔۔۔ آیو شمتی اور فلک بوس کی آڑ میں یہاں کوئی اور کھیل کھیلا جارہا ہے۔"

اس کی نظریں خوش نصیب سے ہٹ کر فلک بوس پر جا ٹھہری تھیں۔

"ہوگیا؟" خوش نصیب نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

"کیا؟" کیف نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس سے بہتر کوئی اسٹوری تیار نہیں کرسکے تم؟ میں تمہیں بتاؤں اصلیت کیا ہے؟"

خوش نصیب نے سپاٹ سے انداز میں کہا تھا۔

"سچ تو یہ ہے کیف صابر۔۔۔ کہ کور اسٹوری تو تم نے تیار کی ہے۔ تالیاں بجانے کو دل کرتا ہے تمہارے ان ہتھکنڈوں پر۔۔۔"

کیف ہکا بکا اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اسے اس قسم کے الزام کی امید نہیں تھی۔

"کیا بول رہی ہو خوش نصیب۔۔۔ زبان سنبھال کر بات کرو۔" کیف غرایا تھا۔

"صحیح بول رہی ہوں۔۔۔" اس کی آواز کیف سے زیادہ بلند تھی۔ "بات صرف یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہوچکا ہے کہ معاویہ اردشیر ازی ہی وہ انسان ہے جس نے مجھے شامیر کے گھر میں بچایا تھا۔ یہی وہ انسان ہے جو سب کے سامنے میرے حق میں بول سکتا ہے اور جوسب کو شامیر کی سچائی بتا سکتا ہے۔ اور تم لوگوں کو کیسے برداشت ہوگا کہ میں سچ ثابت کرکے دوبارہ سے اس گھر میں پہنچ جاؤں۔ اب تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔"

بالکل غیر ارادی طور پر اس نے کیف کو پیچھے کو دھکیلا تھا۔ کیف اس عمل کے لیے تیار نہیں تھا سو دو قدم پیچھے ہوگیا۔

"جنگلی کی جنگلی ہی رہنا تم۔۔۔ مجھے امید تھی کہ کچھ بہتری آگئی ہوگی مگر نہیں۔۔۔ ابھی بھی اتنی ہی جاہل ہو جو دوسروں کو بلاوجہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔"

"تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں کاٹ لوں۔" خوش نصیب دانت کچکچا کر بولی۔

"جہنم میں جاؤ میری بلا سے۔۔۔ جب اس فلک بوس اور آیو شمتی کی آڑ میں تمہارے ساتھ کچھ الٹا سیدھا ہوجائے گا تو بیٹھ کر پچھتاتی رہنا۔۔۔ ویسے بھی یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے وقت کے بعد پچھتانا۔" وہ تیزی سے پھاٹک کراس کرگیا تھا۔

☆☆☆

خوش نصیب تھکے تھکے قدموں سے اندر آگئی تھی۔ کھوما کھویا سا انداز تھا اس کا۔۔۔

منفرا جو صوفے پر بیٹھی سیل فون سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ اس نے چند لمحے فون کان سے لگائے رکھا پھر مایوس ہو کر سیل فون سائیڈ پر رکھ کر خوش نصیب کی جانب متوجہ ہو گئی۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

خوش نصیب چپ چاپ آ کر منفرا سے ذرا دور بیٹھ گئی تھی۔

''خوش نصیب۔۔۔''

منفرا نے اسے دو تین بار پکارا مگر وہ اس قدر غائب دماغی سے بیٹھی تھی کہ منفرا کی آواز سماعت کی حد سے دور رہی تھی۔

منفرا کو جب کوئی رسپانس نہیں ملا تو اس نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

خوش نصیب چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

''سب خیریت ہے؟ کدھر گم ہو؟'' منفرا نے کہا۔

''جی جی۔ سب خیریت ہے۔'' خوش نصیب بڑی مشکل سے اپنا دماغ حاضر کر پائی تھی۔

''کیف آیا تھا؟''

''ہم م م م۔۔۔'' وہ ہنکارا بھر کر رہ گئی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟ اگر ڈسکس کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔'' منفرا نے نرمی سے کہا۔

وہ خوش نصیب کے ماضی سے واقف تھی' اس لیے اس کے حالت سمجھ رہی تھی۔

''کچھ خاص نہیں۔۔۔ بس وہی باتیں۔۔۔ جو وہ لوگ ہمیشہ کرتے آئے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ دوسرے ہمیشہ بے وقوف ہی رہیں گے۔'' خوش نصیب نے زہر خند لہجے میں جواب دیا تھا۔

''اتنا بدگمان نہ ہو خوش نصیب۔۔۔! کم از کم ایک موقع تو اسے دو کہ وہ اپنی صفائی پیش کر سکے۔''

''منفرا! آپ میرے خاندان سے واقف نہیں ہیں۔ جو لوگ حق چھیننا پسند کر لیتے ہیں' وہ انہیں صفائیاں کہاں دیتے ہیں۔ ابھی بھی یہ کوئی چال ہی ہوگی۔''

''تم بہتر جانتی ہو کہ کیا کرنا چاہیے لیکن میں یہی کہوں گی کہ تم ایک بار کیف کی بات سن لو۔ بعض اوقات جو نظر آ رہا ہوتا ہے' ضروری نہیں ہے کہ ویسا ہو بھی۔۔۔''

خوش نصیب چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں منفرا۔۔۔! دراصل میں کوشش کروں تب بھی ان لوگوں کی جانب سے اپنا دل صاف نہیں کر پاتی مگر آپ کے کہنے پر میں ایک موقع ضرور دوں گی کیف کو۔ اگر اب وہ دوبارہ آیا تو میں بات سن لوں گی۔''

''کیف بشام میں کیا کر رہا ہے؟''

''پتا نہیں۔۔۔ میں نے پوچھا نہیں۔ خیر صحافی ہے وہ۔۔۔ کسی آفیشل کام کے لیے ہی آیا ہوا ہوگا۔''

منفرا نے مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

''آپ چھوڑیں کیف کو۔۔۔ آپ پریشان لگ رہی ہیں' کوئی مسئلہ ہے؟''

''معاویہ کو کال کر رہی تھی اور یہاں پر سگنلز۔۔۔ ماشاءاللہ۔۔۔'' منفرا نے بیزاری سے کہا۔

''اوہ۔۔۔ اگر یہاں سے کال نہیں مل رہی تو کبیر بابا سے کہیں' وہ نیچے بستی میں جا کر کال کر لیں۔۔۔ کم از کم خیریت پتا چل جائے گی۔''

''ہاں۔ دیکھتی ہوں۔۔۔ ایسا ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' منفرا بولی۔ ''بچے سو رہے ہیں؟''

''جی۔۔۔ میں نے کچھ دیر پہلے۔۔۔''

خوش نصیب کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ ایک دم کچن کی جانب سے شور بلند ہوا تھا۔ دونوں چونک کر کچن کی جانب متوجہ ہوئی تھیں جو اس ہال سے باہر نکل کر راہداری میں دائیں جانب تھا۔

''یا اللہ خیر۔۔۔'' خوش نصیب کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' منفرا نے حیرت سے کہا تھا۔

خوش نصیب نے کندھے اچکا دیے۔ ''پتا نہیں۔۔۔ کبیر بابا کچن میں ہیں؟''

''نہیں۔ وہ تو اپنے کوارٹر میں ہیں نا۔۔۔''

دونوں اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھیں۔

''آؤ دیکھتے ہیں۔۔۔'' منفرا نے اسے کہا تھا۔

دونوں محتاط انداز میں چلتی ہوئی راہداری میں آئی تھیں۔ پھر آہستہ سے کچن میں داخل ہوئیں۔

اور کچن کے دروازے پر کھڑے دونوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

منفرا نے ایبٹ آباد میں شیشے کا ایک ڈنر سیٹ لیا تھا اور بشام آکر اسے کبیر بابا کے حوالے کیا تھا کہ اسے الماری میں سنبھال کر رکھ دے۔ تاکہ واپس جاتے ہوئے وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

برتنوں کا وہ ڈبہ دو دن سے شیلف پر پڑا تھا لیکن اس وقت وہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ کچن میں ہر طرف شیشے کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ برتنوں کو ڈبے سے نکال کر زمین پر گرایا گیا ہے۔ اگر ڈبہ گرتا بھی تو شیشے کو فرش پر بکھرنا نہیں چاہیے تھا۔

وہ دونوں سُن کھڑی تھیں۔

کچن کا ایک دروازہ اس کوارٹر کی طرف کھلتا تھا جہاں کبیر اور پاشا کی رہائش تھی۔ اسی وقت کبیر وہ دروازہ کھول کر کچن میں آیا تھا۔ غالباً وہ بھی شور سے ہی متوجہ ہوا تھا۔ کچن میں آکر جو اس نے یہ حال دیکھا تو وہ بھی ہکا بکا رہ گیا تھا۔

منفرا سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے کبیر بابا؟'' منفرا نے صدمے سے پوچھا تھا۔

''بی بی۔۔۔ یہ۔۔۔'' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا بولے۔

''یہ آپ سے ٹوٹا ہے؟'' منفرا نے نرمی پوچھا تھا۔

''میری غلطی ہے بی بی! میں دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔۔۔ یہ شاید ہوا سے گرا ہے یا شاید کوئی بلی اندر گھس آئی ہو۔'' اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا تھا۔

منفرا ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔۔۔ سمیٹیں اس سب کچرے کو۔۔۔ احتیاط سے کیجیے گا۔'' وہ بے دلی سے بولتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔

خوش نصیب ابھی بھی وہاں کھڑی ٹوٹے ہوئے برتنوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنا بھاری ڈبہ ہوا سے حتیٰ کہ کسی بلی کی شرارت سے بھی کیسے گر سکتا ہے۔۔۔

منفرا اسے آواز دے رہی تھی، سو وہ بھی اندر کی جانب چلی گئی تھی۔

''منفرا! یہ ہوا یا بلی کا کیا ہوا کام نہیں لگ رہا۔۔۔'' خوش نصیب نے منفرا کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی۔۔۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ کبیر بابا کی غلطی سے ٹوٹا ہے اور معاویہ کے ڈر سے یہ بہانہ کیا ہے۔''

''ہاں۔ شاید یہی بات ہوگی۔۔۔'' خوش نصیب نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔ منفرا دوبارہ سے سیل پکڑ کر معاویہ کو کال ملانے لگی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

''منفرا۔۔۔ایک بات پوچھوں آپ سے۔۔۔''

منفرا نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''یہ آیوشمتی کا کیا چکر ہے؟''

منفرا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ''کہاں سے سن لیا تم نے آیوشمتی کے بارے میں؟''

''کیف سے۔۔۔'' اس نے چھپانا مناسب نہ سمجھا لیکن پوری بات بتانے کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ کیف ان پر شک کر رہا ہے۔

''سب فرضی کہانیاں ہیں۔۔۔ اکثر جب گھر خالی رہتے ہیں تو ایسی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔۔۔ قلعہ فلک بوس تو نہ صرف زیادہ تر خالی رہتا ہے بلکہ اس کی تعمیر بھی بہت پرانی ہے۔ معاویہ کے دادا کو یہاں کے نواب نے تحفتاً دیا تھا یہ اور انہوں نے معاویہ کو۔۔۔ یہاں کے لوگوں کا ماننا ہے کہ یہاں بہت سال پہلے ایک آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔۔۔ جس کی روح یہاں چکراتی ہے۔ پھر کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ لوگوں کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا۔۔۔''

خوش نصیب بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔ ''کیسے واقعات؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یار! معاویہ کے کزن کی ڈیتھ ہوئی تھی یہاں۔۔۔ اس سے پہلے فلک بوس کی پہرے داری پر مامور ایک پولیس آفیسر کو بھی قتل کیا گیا تھا یہاں۔۔۔ اب ہوا تو یہ تھا کہ معاویہ کے کزن کے کچھ سائیکالوجیکل ایشوز تھے اور انہوں نے خودکشی کر لی تھی اور پولیس آفیسر پر جنگلی کتوں نے حملہ کر کے اسے مار دیا تھا۔ مگر ان لوگوں نے سب الزام آیوشمتی پر لگا دیا۔۔۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔ روک نہیں سکتے انہیں۔۔۔ میری شادی یہاں ہوئی تھی۔۔۔ اس کے بعد بھی میں تین چار بار یہاں آ کر رہ چکی ہوں۔ مجھے آج تک کوئی آیوشمتی نہیں ملی یہاں۔۔۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

اور تب ہی، بچوں کے رونے کی آواز آئی تھی۔ ٹاپک کو ادھورا چھوڑ کر دونوں کمرے کی جانب چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

رات کے دس بج چکے تھے مگر معاویہ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ منفرا کا فکر کے مارے برا حال تھا۔

کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹتے ہوئے وہ مسلسل موبائل پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اس نے کبیر بابا سے اس سلسلے میں مدد مانگی تھی اور اسے بستی سے معاویہ کو فون کرنے کے لیے بھیجا تھا تاکہ اس کی خیریت اور واپسی کے بارے میں معلوم کیا جا سکے۔

خوش نصیب ہدیٰ کو گود میں اٹھائے جھولے کے پاس کھڑی سلا رہی تھی۔ اس کی نظریں منفرا پر ٹکی تھیں۔ اس کی پریشانی دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہو رہی تھی مگر اس معاملے میں اس کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھی۔

ابھی ہدیٰ سوئی نہیں تھی کہ وسامہ جاگ گیا اور زور و شور سے رونے لگا۔ منفرا نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ نہ ہی کبیر خان کی واپسی ہوئی تھی اور نہ ہی معاویہ کی کوئی خیر خبر آئی تھی۔ منفرا ایک منٹ کے لیے بھی سکون سے بیٹھ نہیں پائی تھی۔ ابھی بھی موبائل ہاتھ میں لیے وہ بار بار معاویہ کو کال ملانے کی کوشش کر رہی تھی مگر رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور کبیر خان اجازت لے کر اندر آ گیا۔

"بابا! کچھ معلوم ہوا؟ بات ہوئی آپ کی معاویہ سے؟" منفرا نے اسے دیکھتے ہی بے چینی سے پوچھا۔
"نہیں بی بی! صاحب سے تو بات نہیں ہو سکی لیکن مجھے راستے میں بستی کا ہی ایک بندہ ملا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ کہیں لینڈ سلائیڈنگ ہوگئی ہے۔ راستے بند ہوگئے ہیں۔"
"اونو۔۔۔" منفرا نے سر پکڑ لیا۔ "یہ تو برا ہوا۔۔۔"
وہ پریشان لگ رہی تھی۔
"اب کیا ہوگا؟" خوش نصیب بھی پریشان ہوگئی تھی۔
"بیٹا! مشکل ہے کہ صاحب دو تین دن سے پہلے اب بشام پہنچ سکیں۔۔۔ راستہ صاف ہونے میں وقت تو لگے گا۔ برف باری ابھی تو رکی ہوئی ہے لیکن موسم کے تیور بتاتے ہیں کہ طوفان آئے گا۔ یہ جو سگنلز کا مسئلہ ہے یہ بھی شاید موسم کی خرابی کی وجہ سے ہی ہے۔ حتمی طور پر تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔" کبیر خان نے بتایا تھا۔
"ٹھیک ہے بابا۔۔۔ آپ جائیں۔ آرام کریں۔" منفرا نے کہا تھا۔
"بیٹا! اگر آپ لوگوں کو ڈر لگتا ہے تو میں کوارٹر میں نہیں جاتا۔۔۔ کچن میں بستر بچھا لیتا ہوں۔"
"نہیں بابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ جائیں کوارٹر میں۔" منفرا نے نرمی سے منع کر دیا تھا۔
"مگر بیٹا! آپ لوگ یہاں اکیلے ہو اور صاحب نے آپ لوگوں کا خیال رکھنے کو بولا تھا۔" وہ تذبذب کا شکار تھا اور کوارٹر میں واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔
"کبیر بابا! میں نے کہا نا ہم مینج کر لیں گے۔ آپ جائیں اور آرام کریں۔" منفرا کا حتمی انداز کبیر کو خاموش کروا گیا تھا۔
وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
منفرا صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔
"پتا نہیں کیوں۔۔۔ مگر مجھے ان بابا جی کا رویہ بہت مشکوک لگتا ہے۔" منفرا نے خود کلامی کی۔
"شک مت کریں۔۔۔ وہ صرف ہماری وجہ سے ہی تو کہہ رہے تھے۔" خوش نصیب نے اسے مسکرا کر تسلی دی۔ "اچھا ٹرپ رہا ہے یہ تو۔۔۔ سارے پلانز پر ٹھنڈا پانی بلکہ برف گر گئی ہے۔" اس نے افسوس سے کہا۔
"آپ پریشان نہ ہوں منفرا۔۔۔! اللہ نے چاہا تو معاویہ سر صبح تک واپس آجائیں گے۔"
"مشکل ہے یار۔۔۔ یہ جیسا ایریا ہے نا' یہاں راستے اتنی جلدی کلیئر نہیں ہوتے۔۔۔ اور پھر اگر کبیر بابا کہہ رہے ہیں کہ راستے دو تین دن سے پہلے کلیئر نہیں ہوں گے تو اس کا مطلب ہے سچویشن زیادہ ہی خراب ہے۔" وہ بددلی سے بتا رہی تھی۔
"پھر اب کیا کیا جائے؟ ہم تو واپس بھی نہیں جا سکتے۔۔۔ اول تو یہ کہ شاید واپس جانے کا بھی راستہ کلیئر نہ ہو اور دوسرا گاڑی بھی موجود نہیں ہے۔"
"ہاں۔ واپس جانے والی تو سچویشن ہے نہیں۔۔۔ یہاں ہی ویٹ کرنا ہوگا معاویہ کا۔۔۔" منفرا نے پریشان سے انداز میں کہا۔
"منفرا! اللہ بہتر کرے گا۔ اور اگر ضرورت پڑی تو۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔
منفرا سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔
"اگر ضرورت پڑی تو میں کیف کو بلوا لوں گی یہاں۔۔۔ ویسے بھی ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی۔۔۔ سمجھ رہی ہیں نا۔۔۔" اس نے منفرا کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے شرارت سے کہا۔ منفرا مسکرا دی تھی۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ دیکھتے ہیں' کیا ہوتا ہے۔۔۔ گدّے کی ضرورت پڑتی ہے یا نہیں۔۔۔ ابھی تو سونے کی تیاری کرو۔ تم اسی کمرے میں آجاؤ آج۔'' منفرا نے اس کی شرارت کا جواب اسی کے انداز میں دیا تھا۔

سارا فلک بوس رات کی خاموشی اور اسرار میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات موسم کو جو ذرا سکون نصیب ہوا تھا وہ اس وقت شدید طوفان کی صورت سامنے آیا تھا۔ غالباً رات رک جانے والی برف باری طوفان سے پہلے کی خاموشی کو ظاہر کرتی تھی۔

وہ گہری نیند سو رہی تھی جب اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کے بیڈ کے پاس سے گزرا ہے اور گزرتے گزرتے اس کے کندھے کو ہاتھ لگا کر گیا ہے۔ منفرا کی نیند میں خلل پڑ گیا ویسے بھی وہ رات اتنی پریشانی میں سوئی تھی کہ ساری رات جاگتی سوئی کیفیت رہی تھی۔ ذرا گہری نیند ہوتی تو اسے عجیب عجیب خواب نظر آنے لگتے تھے۔ اسے نظر آتا تھا کہ وہ فلک بوس میں ہے اور معاویہ کو تلاش کر رہی ہے لیکن معاویہ کہیں مل نہیں رہا۔

وہ ذرا سا کسمسائی اور پھر پرسکون ہو گئی۔ مگر صرف چند لمحوں بعد منفرا کی آنکھ اسی عجیب سے احساس سے کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی اسے ایسا لگا جیسے کمرے کے دروازے کے پاس ہلچل سی ہوئی ہے۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور اس اندھیرے کا احساس کم کرنے کے لیے زیرو والٹ کا بلب روشن کیا گیا تھا جس کی ہلکی سی روشنی اندھیرے کا مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ آنکھیں اس روشنی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ خوش نصیب سامنے کاٹ کے پاس رکھے صوفہ کم بیڈ پر سو رہی تھی۔ بچے بھی خاموش تھے یعنی گہری نیند سو رہے تھے۔ ادھر ادھر نظر دوڑا کر اس نے تسلی کی تھی۔ کمرہ خالی تھا۔

اس نے سر پکڑ لیا۔ معاویہ کے سلسلے میں کل سے وہ جس پریشانی کا شکار ہوئی تھی وہ اس کے حواسوں پر پوری طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔

''مسز معاویہ۔۔۔! آپ اتنے کمزور اعصاب کی مالک تو کبھی بھی نہیں رہیں۔۔۔'' اس نے سرگوشی میں خود کو ہی ڈپٹا تھا۔

کھڑکی کے اوپر پردے پڑے تھے سو موسم کی خرابی کا ابھی تک اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر اس نے ٹائم دیکھا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔

باہر بجلی چمکی تھی جس کا عکس کھڑکی کے پردوں پر پڑا تھا۔ کمرہ یک دم روشن ہو کر پھر سے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ منفرا نے ذرا سا آگے ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔

''یا اللہ خیر۔۔۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''لگتا ہے کبیر بابا کی بات صحیح ثابت ہو رہی ہے۔''

اس نے ایک بار پھر معاویہ کو کال ملانے کی کوشش کی تھی لیکن ناکامی ہوئی۔ اس نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دوبارہ لیٹ گئی۔ معاویہ کو سوچتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لی تھیں لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلی تھیں۔

باریک سی۔۔۔ بالکل باریک سی آواز تھی رونے کی جس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھی۔ اس نے کاٹ کی طرف دیکھا تھا لیکن آواز وہاں سے نہیں آ رہی تھی پھر بھی وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے کاٹ کی طرف آ گئی تھی۔

کاٹ کے پاس خاموشی تھی لیکن رونے کی آواز ابھی بھی آ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راشدہ رفعت

جیون ساتھی

امی نے اپیا اور بجو کو میرے لیے آئے ہوئے رشتے کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے بلوایا تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ وہ دونوں اپنے شوہر صاحبان کے ساتھ دوپہر کے کھانے سے پہلے پہنچ گئی تھیں۔ رشتے پر تو خاک بات چیت ہونا تھی، ابھی تو خاطر تواضع کے دور ہی چل رہے تھے۔

انوار بھائی کو آم کا شیک بنا کر دیا تو آصف بھائی کو فالسوں کا ٹھنڈا ٹھنڈا کھٹا میٹھا شربت چاہیے تھا۔ حالانکہ وہ انوار بھائی کے ساتھ دو گلاس ملک شیک پی چکے تھے، لیکن چونکہ اپیا نے فریج میں فالسے رکھے دیکھ لیے تھے تو انہیں یاد آ گیا کہ آصف بھائی کا فیورٹ مشروب تو فالسے کا شربت ہے، سو اب امی جلدی جلدی آصف بھائی کے لیے فالسے کا شربت بنانے لگیں۔

میں پر تکلف لنچ کے اہتمام میں جتی ہوئی تھی، ورنہ امی کے بجائے شربت خود بنا دیتی۔ مجھے امی کی نسبت اپنے دونوں بہنوئیوں کے ''ٹیسٹ'' کا زیادہ اندازہ تھا۔ امی سے شربت میں میٹھا کچھ تیز ہو گیا تھا۔ آصف بھائی نے شربت کا صرف ایک ہی گلاس پیا۔ اپیا ان سے ایک اور گلاس لینے کا اصرار کرتی رہیں۔

''شربت میں میٹھا تیز ہے صدف! مجھ سے اور نہیں پیا جائے گا۔'' انہوں نے جھنجلا کر بیوی کو منع کیا تھا۔ امی بے چاری بلاوجہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

''جب سے ثانیہ نے کچن سنبھالا ہے، میرے تو اندازے ہی غلط ہونے لگ گئے ہیں۔ یہ مجھے کچن میں گھسنے ہی کب دیتی ہے۔ میں تو بھول بھال گئی سب۔ دکھاؤ بیٹا! جگ دو مجھے۔ تھوڑی سی برف اور ڈال دیتی ہوں۔ چینی کا تناسب کم ہو جائے گا۔'' امی نے اپیا سے جگ مانگا تھا۔

''رہنے دیں امی! ابھی آصف بھائی نے دو گلاس ملک شیک بھی تو پیا ہے، اب مزید شربت پینے کی گنجائش ہی کہاں ہوگی۔'' میں جھوٹے گلاس اٹھانے لاؤنج میں آئی تو مداخلت کیے بنا نہ رہ پائی۔

آصف بھائی کے چہرے پر غصہ جھلکا۔ اپیا نے شاکی نگاہوں سے امی کو دیکھا اور امی نے خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورا تھا۔

''اور آپ لوگوں نے صرف شربت پلا پلا کر آصف بھائی کا پیٹ بھرنا ہے کیا۔ میں نے اتنی محنت سے آصف بھائی کی فیورٹ چکن ملکھنی ہانڈی بنائی ہے۔ پھر وہ کون کھائے گا۔''

لہجے میں حتی المقدور اپنائیت کی چاشنی شامل کر کے اس بار آصف بھائی کو مخاطب کیا تو جہاں ان کے چہرے کے بگڑے زاویے درست ہوئے، وہاں امی اور اپیا کے تنے اعصاب بھی ڈھیلے ہوئے، اسی لمحے میری نگاہ انوار بھائی پر پڑی، جو آصف بھائی کو ملنے والی اتنی امپورٹنس پر کچھ بے چین سے لگ رہے تھے۔

''انوار بھائی! میں نے آج آپ کے لیے بریانی کی بھی ایک نئی ریسپی ٹرائی کی ہے۔ بہت اسپائسی بریانی ہے، اللہ کرے آپ کو پسند آ جائے تو میری محنت وصول ہو جائے گی۔'' اس بار مسکرا کر انوار بھائی کو مخاطب کیا۔ انوار بھائی مسکرا دیے تھے۔

''کیوں نہیں پسند آئے گی، ضرور پسند آئے گی۔ تمہارے بھائی کو تو تمہارے ہاتھ کا کھانا ویسے ہی بہت پسند ہے۔'' شوہر کی مسکراہٹ پر نثار ہو کر



جواب بجو نے دیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر انوار بھائی دن میں دوسری مرتبہ بھی مسکرا دیے۔ گویا بیگم کی بات کی تائید کی ہو۔

ایک دن میں دو مسکراہٹیں انوار بھائی کا موڈ تو آج واقعی خاصا خوش گوار تھا۔ میں اپنی حیرت چھپاتی واپس کچن میں مڑ گئی۔ پر تکلف لنچ کے بعد امی، ابا نے دونوں دامادوں سے میرے لیے آنے والا پروپوزل ڈسکس کیا تھا۔

"دیکھ لیں ماموں! بالکل اجنبی لوگ ہیں۔ اعتبار کرنے کا رسک لینے کی ہمت ہے تو ہاں کر دیں، پھر میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اچھی طرح چھان پھٹک کر لیں۔ جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں۔"

بہت مدبر بن کر یہ مشورہ دینے والے انوار بھائی تھے۔ ابا نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ شاید انہیں توقع تھی کہ انوار بھائی رشتے کی چھان پھٹک کی ذمہ داری اٹھانے کی پیش کش کریں گے۔ ان کا جواب سن کر ابا کی مایوسی فطری تھی۔ آصف بھائی کا جواب بھی ان سے مختلف نہ تھا۔ دونوں کے لہجے اور انداز سے ہی اس معاملے سے ان کی عدم دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

میٹنگ برخاست ہو گئی۔ شام کی پر تکلف چائے پینے کے بعد اپیا اور بجو نے اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ واپسی کی راہ لی۔ اپیا اور بجو کو بہر حال رشتہ بہت پسند آیا تھا اور دونوں نے امی، ابا کو کہا تھا کہ تمام خدشات ذہن سے جھٹک کر اللہ کا نام لے کر لڑکے والوں کو ہاں کر دیں۔ مجھے بھی پتا تھا کہ امی، ابا نے ہاں ہی کرنی ہے، بظاہر یہ ایک آئیڈیل رشتہ تھا۔

امی، ابا ایک عرصے سے میرے رشتے کے لیے بہت پریشان تھے۔ مجھے تعلیم مکمل کر کے گھر بیٹھے چار سال ہونے کو آ رہے تھے۔ خاندان، برادری میں میرے جوڑ کا کوئی لڑکا بچا ہی نہ تھا۔ غیروں میں رشتہ کرتے ہوئے امی کا دل ڈرتا تھا۔ اپیا اور بجو کی شادیاں اپنوں میں ہوئی تھیں اور شادیوں کے بعد ان اپنوں کی طرف سے اپنائیت کا کم ہی مظاہرہ کیا گیا تھا۔ پھر بھی امی کی خواہش تھی کہ کسی بھی طرح میری شادی بھی اپنوں میں ہی انجام پا جائے۔

امی کی خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ خاندان کے گنے چنے لڑکے پسند کی شادیوں کے نتیجے میں گھر بار والے ہو گئے تو امی کو یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ اگر میری شادی کرنی ہے تو وہ غیروں میں ہی کرنا ہو گی اور پھر غیروں میں سے ایسا رشتہ آ گیا جس پر امی، ابا دونوں کا دل ٹک گیا۔

رامین میرے پاس ٹیوشن پڑھتی تھی۔ اس کی امی کے توسط سے یہ رشتہ طے پایا۔ موصوف کا نام حمزہ تھا۔ رامین کی چچی کے بھانجے تھے۔ اعلا تعلیم یافتہ، برسر روزگار، پرکشش شخصیت، امی، ابا کو اس کے علاوہ

کیا چاہیے تھا۔ مناسب سی سوچ بچار کے بعد انہیں ہاں کردی گئی، لیکن میرا دل اس رشتے پر مطمئن نہیں ہورہا تھا۔ ساس، نندیں تو دیکھنے میں معقول لگی تھیں، لیکن اپنے ہونے والے موصوف کی تصویر دیکھ کر دل کو دھڑکا سا لگ گیا تھا۔

تیکھے نقوش والا یہ شخص شکل سے ہی اتنا اکھڑ اور مغرور لگ رہا تھا۔ میرے دونوں بہنوئی ''آفٹر آل میں داماد ہوں۔'' والی ٹائپ سے تعلق رکھتے تھے۔ امی، ابا ان کی آمد پر بچھ بچھ جاتے، انہیں خوب پروٹوکول دیا جاتا، خاطر تواضع میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی، پھر بھی کسی نہ کسی بات پر انوار بھائی اور آصف بھائی کو شکوہ کرنے یا روٹھنے کا موقع مل ہی جاتا۔

امی، ابا کی زندگی کا مقصد ان دامادوں کے نخرے اٹھانا ہی رہ گیا تھا۔ اللہ نے میرے ماں، باپ کو تین بیٹیوں سے ہی نوازا تھا۔ ان بے چاروں کی حسرت ہی رہی کہ انہیں چاہے داماد کے روپ میں ہی سہی پر ایک بیٹا مل جائے۔ انوار بھائی تو ابا کے سگے بھانجے تھے۔ بجو سے شادی کے بعد انہوں نے بیٹا تو کیا بن کر دکھانا تھا، وہ تو بھانجے بھی نہ رہے، اب وہ صرف ''آفٹر آل داماد'' تھے۔ آصف بھائی کا حال بھی ان سے مختلف نہ تھا، میں اللہ سے یہ ہی دعا کرتی تھی کہ کاش میری شادی ایسے شخص سے ہوجائے جو میرے ماں، باپ کے لیے ٹینشن فری داماد ثابت ہو۔

حمزہ کی تصویر دیکھ کر لگ رہا تھا کہ دعا نے قبولیت کا درجہ نہیں پایا تھا۔ حمزہ کی بہنوں اور بھانجیوں کی باتوں نے میرے اندیشے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ وہ شرارتی انداز میں مجھے حمزہ کے حوالے سے چھیڑتیں، تو اس چھیڑ چھاڑ میں زیادہ باتیں موصوف کے غصے کے متعلق ہوتیں۔ میں بظاہر مسکراتی، مگر دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا رہتا اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب میں اندیشوں سے لرزتا، کانپتا وجود لے کر حمزہ احمد کے سنگ رخصت ہوکر

سسرال کی اجنبی سرزمین پر پہنچ گئی۔ رسموں کے دوران بھی موصوف کی بے زاری عروج پر تھی۔

''آپ لوگوں نے شادی کو ایک تھکا دینے والا عمل بنا دیا ہے۔ دو، چار روایتی سی رسمیں ہوتیں تو قابل برداشت تھا، لیکن آپ لوگوں کے دماغ میں تو جانے کہاں سے رسمیں آئے جارہی ہیں۔ یہ سب کچھ بہت فلمی ہوگیا، پلیز بس کریں اب۔'' میری بڑی نند واقعی ایک اوٹ پٹانگ سی رسم کروانے پر مصر تھیں۔ جب حمزہ نے اکتا کر انہیں ٹوکا۔ ویسے تو یہ میرے بھی دل کی آواز تھی، اس کے باوجود حمزہ کا بیزار لہجہ مجھے کھلا۔

''بھائی میرے، رسمیں تو ساری ہوں گی۔ یہ یادگار موقع انسان کی زندگی میں بار بار تھوڑی آتا ہے۔'' آپا مسکرائی تھیں۔

''خیر، اب ایسی بھی بات نہیں، ایک مسلمان کی زندگی میں تو یہ موقع چار بار آ سکتا ہے۔'' اس بار محترم مسکراتے ہوئے شرارتی لہجے میں مخاطب ہوئے تھے اور میری جان جل کر خاک ہوگئی۔

رسموں کا اختتام ہوا تو مجھے نندوں نے بیڈ روم میں پہنچا دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ حمزہ کی منتظر تھی۔ حمزہ تو نہ آئے، تھوڑی دیر میں باہر سے تیز تیز آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ سب سے بلند آواز تو شاید حمزہ کی ہی تھی۔ گفتگو کا سیاق و سباق میری سمجھ سے بالاتر تھا، لیکن یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ حمزہ کسی بات پر جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ عجلت بھرے انداز میں بیڈ روم میں داخل ہوئے۔

''سوری ثانیہ! مجھے کہیں جانا ہے، آپ پلیز

ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔ میں گھنٹے، آدھے گھنٹے تک واپس آتا ہوں۔''

دراز میں سے گاڑی کی چابیاں اٹھا کر وہ واپس مڑ گئے تھے۔ میں اس صورت حال پر حیران، پریشان سی تھی، پھر عارفہ آپا میری بڑی نند میرے پاس آئی تھیں۔

''چندا! تم پریشان مت ہو۔ حمزہ ابھی آتا ہے۔ دراصل ہمارے منجھلے بہنوئی صاحب ہیں، وہ روٹھ کر اپنے گھر بیٹھے ہیں۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ بارات سے واپسی پر وہ اپنے گھر اس لیے چلے گئے ہیں کہ یہاں مہمانوں کے شور شرابے میں بے آرام ہوں گے، لیکن اب ندا کے پاس ان کا فون آیا ہے، کہہ رہے ہیں بچوں کو ساتھ لے کر صبح سویرے گھر واپس پہنچ جاؤ۔ ولیمہ اٹینڈ کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وہ بے چاری شوہر کا فرمان سن کر رو، رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ اب حمزہ گیا ہے جنید کو منانے۔ بس ابھی ذرا دیر میں آجائے گا۔ ندا کا سسرال زیادہ دور نہیں ہے۔'' شرمندہ، شرمندہ سی آپا مجھے وضاحت دے رہی تھیں۔

''جنید بھائی کیوں ناراض ہو گئے؟'' میں نے دھیرے سے نندوئی کی ناراضی کے بارے میں استفسار کیا۔

''بس کیا بتائیں' اس کی نیچر ہی ایسی ہے۔ پروٹوکول میں کوئی کسر رہ جائے تو کڑک مرغی کی طرح منہ پھلا کر بیٹھ جاتا ہے۔'' عارفہ آپا بے زاری سے بولی تھیں۔ میں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ بڑی مشکل سے چھپائی۔

''حالانکہ ہم سب گھر والے جنید کا مزاج اچھی طرح جانتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی ایسی بات نہ کریں جو اس کی طبیعت کو ناگوار گزارے۔ ندا بھی شوہر کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔ حمزہ ندا پر بھی اسی لیے ناراض ہو رہا تھا کہ میاں کو بگاڑنے میں سب سے بڑا ہاتھ ندا کا ہی ہے، لیکن ندا بے چاری بھی کیا کرے، جب شوہر ہی ایسے ٹیڑھے مزاج کا ملا ہے۔'' آپا ٹھنڈی سانس بھر کر بولی تھیں۔

''حمزہ ہمارا اکلوتا بھائی ہے اور تم ہماری اکلوتی بھابھی۔ گھر کے حالات تم سے چھپانے سے کیا حاصل ہوتا، بس اسی لیے تمہیں ساری بات کھول کر بتا دی۔ اس گھر میں تمہیں نہ تو ساس، سسر کی طرف سے کوئی ٹینشن ملے گی، نہ ہم بہنیں روایتی نندیں ثابت ہوں گی۔ تمہارے باقی تین نندوئی بھی بھلے مانس ہیں، بس ایک جنید میاں کے مزاج کا خیال رکھنا پڑے گا تمہیں۔ ان کا گھر قریب ہے۔ سسرال آنا جانا بھی بہت ہے اور ناراض ہونے کے لیے چھوٹا سا بہانہ ہی کافی ہوتا ہے۔ حمزہ بے چارہ ہمارے سامنے تو دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے، لیکن جنید کے نخرے سب سے زیادہ اسی کو اٹھانے پڑتے ہیں اور اب یقیناً تمہیں بھی اٹھانے پڑیں گے۔ اکلوتی بھاوج جو ٹھہریں۔''

بے چاری عارفہ آپا شرمندہ، شرمندہ سے انداز میں مجھے اپنے گھریلو مسئلے سے آگاہ کر رہی تھیں۔

''آپا! آپ بالکل فکر نہ کریں، مجھے جنید بھائی جیسے دامادوں کو ٹیکل کرنا آتا ہے۔ میرے دونوں بہنوئی بھی یہ ہی مزاج رکھتے ہیں۔'' میں نے عارفہ آپا کو تسلی دی تھی۔

''خوش رہو۔'' وہ میری طرف سے تسلی کے دو بول سن کر ہی نہال ہو گئی تھیں۔ اور پھر سوا گھنٹے بعد حمزہ کی واپسی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''معذرت چاہتا ہوں بھئی، دراصل مجھے اپنے روٹھے بہنوئی کو منانے جانا پڑ گیا تھا۔ سہرا بندی کی رسم میں انہیں مناسب پروٹوکول نہیں ملا تو روٹھ کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔'' حمزہ نے مجھے مختصراً بتایا تھا۔

''مجھے عارفہ آپا سب بتا چکی ہیں۔'' میں نظریں جھکائے دھیرے سے بولی تھی۔

''میں سہاگ رات تمہیں لمبی چوڑی نصیحتیں

نہیں کروں گا ثانیہ! بس اتنا ہی کہوں گا کہ تم اس گھر کے ہر معاملے، ہر مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھ کر اسے سلجھانے میں میری مدد کرو گی اور یقین کرو جنید بھائی کے سوا اس گھر کا کوئی ایسا قابل ذکر مسئلہ ہے بھی نہیں۔"

"میں آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گی حمزہ، لیکن بدلے میں مجھے بھی صرف ایک یقین دہانی چاہیے۔" میں نے موقع غنیمت جان کر جھجکتے ہوئے اپنے دل کی بات کہنا چاہی۔

"کیسی یقین دہانی۔" حمزہ اس بار مسکرائے تھے۔

"آپ لوگ ایک "آفٹر آل میں داماد ہوں۔" ٹائپ کے شخص کو بھگت رہے ہیں، میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ میرے گھر والوں کے لیے آفٹر آل ٹائپ والے داماد ثابت نہ ہوں۔ میرے بوڑھے والدین اس طرح کے دو دامادوں کے ناز نخرے اٹھا اٹھا کر بہت تھک چکے ہیں۔" میں دھیرے سے بولی تھی۔

"تمہیں لگتا ہے میں امی، ابا کے لیے آفٹر آل ٹائپ والا داماد ثابت ہوں گا۔" حمزہ نے میری ٹھوڑی اوپر اٹھا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے ایسا ہرگز نہیں لگتا۔" انہوں نے جتنی محبت سے میرے ماں، باپ کے لیے امی، ابا کا لفظ استعمال کیا تھا میرے سارے اندیشے پل بھر میں ختم ہو گئے تھے۔

"اور کوئی گارنٹی چاہیے تو وہ بھی ابھی لے لو، کیوں کہ تم اتنی خوب صورت لگ رہی ہو کہ میں بنا سوچے سمجھے کوئی بھی یقین دہانی کروانے کو تیار ہوں اور ویسے بھی یہ یادگار رات انسان کی زندگی میں بار بار تھوڑی آتی ہے۔" وہ شرارتی انداز میں بولے۔

"خیر، ایک مسلمان کی زندگی میں تو چار بار آ سکتی ہے۔" میں نے اس بار نروٹھے انداز میں ان ہی کی بات یاد دلائی تھی۔ حمزہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ میں جھینپ کر رہ گئی۔

☆☆☆

اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ شادی سے پہلے حمزہ سے متعلق میرے سارے اندیشے بالکل بے بنیاد تھے۔ ٹھیک ہے، وہ غصے کے تیز تھے۔ روزمرہ کے کاموں میں میری کوئی چھوٹی سی کوتاہی یا لاپروائی انہیں بہت کھلتی تھی۔ وہ مجھ سے خفا ہوتے تھے۔ ناراض ہوتے، کبھی کبھار مجھ پر بگڑ بھی جاتے تھے، لیکن مجھے ان کے مزاج کی یہ سختی، نرمی بخوشی قبول تھی، صرف اس لیے کہ وہ میرے والدین کے آفٹر آل ٹائپ کے داماد تو کیا سرے سے داماد ہی نہ ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے بیٹا بننے کا دعویٰ کرنے کے بجائے عملی طور پر ان کا بیٹا بن کر دکھایا تھا۔ حالانکہ شروع میں امی، ابا اپنے پچھلے دامادوں والے تجربے سے خائف ہو کر انہیں بھی روایتی دامادوں والا پروٹوکول دینے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر حمزہ کی اپنائیت، محبت اور تابعداری نے امی، ابا کے سارے خدشات ختم کر دیے۔ حمزہ کو اب دو گھروں کا اکلوتا بیٹا ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ وہ گھریلو ذمہ داریاں جو بڑھاپے کی وجہ سے ابا کے لیے نبھانا مشکل تھیں۔ وہ بغیر کہے حمزہ نے اپنے سر لے لی تھیں۔

ہمارے گھر کا یو پی ایس خراب ہو، پانی کی موٹر کا کوئی مسئلہ ہو، ابا کو کسی اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے چیک اپ کروانا ہو، امی کی آنکھ کا آپریشن ماہر ڈاکٹر کی زیر نگرانی کروانا ہو یا ایسا کوئی بھی چھوٹا بڑا مسئلہ ہوتا، حمزہ ایک بیٹے کی طرح میرے ماں، باپ کے کام آتے۔ میں تشکر کے جذبے سے مغلوب ہو کر کبھی ان کا شکریہ ادا کرتی تو وہ الٹا خفا ہو جاتے۔

"تم میرے امی، ابو کی خدمت کرتی ہو تو کیا کبھی میں نے تمہارا شکریہ ادا کیا۔ میاں، بیوی کے لیے تو دونوں کے ماں، باپ سانجھے ہوتے ہیں یار!" میرے سرتاج محترم نے کیا فلسفہ جھاڑا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

"ایسے کیوں ہنسیں۔ میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے کیا۔" وہ پل بھر میں بگڑ جاتے۔

"بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں، یہ تو سنا تھا، آپ نے، تو محاورہ ہی بدل دیا۔" میں لطف لیتے ہوئے بولی۔

"بالکل ٹھیک کیا میں نے جو یہ محاورہ بدل دیا۔ کیا اسٹوپڈ محاورہ ہے۔ بیٹیاں سب کی سانجھی کیسے ہوسکتی ہیں۔ تم اپنے ماں، باپ کی بیٹی ہو تو میری بیوی۔ بتاؤ یہ محاورہ یکسر الٹ گیا نا۔"

وہ تائید طلب انداز میں پوچھ رہے تھے۔ میرے لیے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہوگیا اور اگلے روز جب ہم دونوں امی، ابا سے ملنے گئے تو حمزہ نے جھٹ میری شکایت لگائی تھی۔

"یہ میری ہر بات پر ایسے ہنستی ہے جیسے میں نے کوئی بہت احمقانہ بات کردی ہو۔ اس نے میرا ادب، احترام کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

میرے ہی گھر میں بیٹھ کر کس مزے سے میری امی سے میری شکایت لگائی گئی تھی۔ امی نے خفگی بھرے انداز میں مجھے سرزنش کی تو موصوف کو سکون مل گیا۔ میں پھر بھی مسکراتی ہی رہی۔ مسکراہٹ کو بریک جب لگی جب کھانے کے لیے دستر خوان پر آکر بیٹھی۔

ماش کی دال اور بھنڈی گوشت کا سالن مجھے ان دونوں ڈشز سے جتنی چڑ تھی، حمزہ کو یہ اتنی ہی مرغوب تھیں۔ اب بھی انہوں نے چٹخارے لے کر کھانا شروع کردیا تھا۔ میں نروٹھے سے انداز میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔ کل ہی تو فون پر امی سے کہا تھا کہ چنوں والا پلاؤ کھانے کا بہت جی کررہا ہے۔ سوچا تھا امی کو میری فرمائش یاد ہوگی اور آج امی نے پلاؤ بنایا ہوگا، لیکن امی کو تو صرف اپنے چہیتے داماد کی فرمائشیں یاد رہتی تھی۔ یہ مسلسل تیسری بار ہورہا تھا کہ امی نے کھانا پکانے میں صرف حمزہ کی پسند کو مدنظر رکھا تھا۔

مجھے رونا سا آنے لگا اور اسی لمحے حمزہ کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی۔ میرا مزاج شناس شوہر جھٹ معاملے کی تہ تک جا پہنچا تھا۔ امی، ابا کی موجودگی کے باعث کچھ بولے تو نہیں، لیکن ان سے ہنسی روکنا دوبھر ہوگیا تھا۔

میں نے انہیں تیکھے تیوروں سے گھورا تھا۔ پھر خاموشی سے پلیٹ میں ذرا سی دال نکال کر روٹی کھانا شروع کردی تھی۔ کھانے کے بعد امی اپنے لاڈلے کی فرمائش پر سوجی کا حلوہ بنانے کچن میں چلی گئیں۔ تب حمزہ نے مسکراتے ہوئے مجھے چھیڑا تھا۔

"تم یہ حقیقت تسلیم کیوں نہیں کرلیتیں کہ اب میں اس گھر کا بیٹا ہوں اور ہمارے معاشرے میں بیٹوں کی موجودگی میں بیٹیوں سے امتیازی سلوک ہی روا رکھا جاتا ہے۔ اگر امی کھانا بنانے میں میری پسند کو اہمیت دیتی ہیں تو تمہیں جل بھن کر کباب بننے کی ضرورت نہیں۔"

حمزہ شرارتی انداز میں مجھ سے مخاطب تھے۔ میں نے انہیں گھورنا چاہا، مگر میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ سامنے بیٹھا شخص میری صدق دل سے کی گئی دعا کی قبولیت کا نتیجہ تھا۔ میرے لیے میرے رب کی طرف سے عطا کردہ عظیم ترین نعمت، اس شخص کی ہمراہی میری زندگی کا سب سے خوب صورت احساس تھا۔ تشکر کے جذبے سے میری پلکیں بھیگی چلی جارہی تھیں اور اب حمزہ میری آنکھوں میں پھیلتی نمی دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔

"اتنی سی بات پر رونے کی ضرورت؛ میں امی سے کہہ دوں گا کہ اگلی بار تمہاری پسند کا کھانا بنائیں اور اب واپسی میں تمہیں تمہاری پسند کا برگر بھی کھلا دوں گا۔ چلو شاباش، آنسو پونچھ لو۔ اچھا چلو واپسی پر آئس کریم بھی کھائیں گے۔" حمزہ مجھے بچوں کی طرح بہلا رہے تھے۔ اس بار میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ "پل میں تولہ، پل میں ماشہ، مجھے تمہارے لیے کسی سائیکاٹرسٹ سے اپائنٹمنٹ لینی پڑے گی۔"

وہ اب مجھے تشویش سے دیکھ رہے تھے۔ میں ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔

☆

روزینہ معرفت شاہ

عمل

"کام اور کام بس کام ہی کام ہے، ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔" کچن میں زرینہ زور، زور سے خود سے ہی ہم کلام تھی اور جب کچن کا کام ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں گئی تو عاشر سو چکے تھے۔ صبح تو کام ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیں گے، کیوں کہ اس کی اکلوتی نند آنے والی تھی۔

"کتنا دل تھا میرا کہ آپ سے باتیں کروں، مگر آپ سو گئے۔ کل تو آفس کی چھٹی تھی، پھر بھی......"

سوچتے سوچتے کب زرینہ کو نیند آ گئی، اسے پتا ہی نہیں چلا۔

★ ★ ★

"بھابھی آپ کیسی ہیں؟" فرینہ اپنی بھابھی سے گلے مل رہی تھی، جو کہ اس کی کزن اور ایک اچھی دوست بھی تھی۔

"ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟ گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں۔" ہنس کر جواب دیا۔

کچھ سال پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی، مگر خوشی ابھی تک اس کے چہرے پر دلہنوں والی تھی۔

"میں آپ سب کے لیے چائے لاتی ہوں۔" زرینہ جلدی سے اٹھ گئی۔ بات یہ نہیں تھی کہ زرینہ کو اپنی نند پسند نہ تھی، بلکہ اسے تو اپنی دوستوں، کزنوں میں سب سے عزیز تھی۔ مگر اب جو مسئلہ تھا وہ یہ تھا کہ چار سال ہو گئے تھے اس کی شادی کو اور وہ اپنے گھر والوں سے خوب گھل مل گئی تھی اور بہت اچھی طرح سے اپنا گھر سنبھال لیا اور اب ان سے عید ملنے یعنی ان کے ساتھ عید گزارنے آئی تھی۔

ایک زرینہ تھی کہ اتنے سال ہونے کے باوجود اب جب کہ وہ دو بچوں کی ماں تھی، اسے گھر سنبھالنے میں بہت مشکل ہو رہی تھی، خاص کر کچن سے تو وہ رات دس بجے سے پہلے فارغ ہی نہیں ہوتی تھی۔ اب جب کہ نند عید منانے آئی تھی، تو وہ تو بس ان کی مہمان نوازی میں ہی لگی رہے گی۔ یہ سوچ سوچ کر اسے غصہ آ رہا تھا۔

"بھابھی!" فرینہ کے اس طرح اچانک آنے پر وہ گھبرا گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو بھابھی۔"

"کچھ نہیں، بس شام کو کیا بناؤں، یہ ہی سوچ رہی تھی۔"

"کچھ بھی بنا دیں، میں مہمان تھوڑی ہوں۔" فرینہ نے پیار سے جواب دیا۔

"بھابھی یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔" ایک قیمتی سوٹ ساتھ میں پرفیوم، جیولری اس نے بھابھی کو پیش کی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔" زرینہ نے شرمندہ ہو کر یہ سامان لیا۔

"کیوں بھابھی! میں سب کے لیے لائی ہوں، تو آپ کو کیسے بھول جاتی۔" فرینہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بھابھی دیکھیے نا' بھائی اپنے عشقیہ کارنامے بتا رہے ہیں، جو انہوں نے آپ سے شادی سے پہلے کیے تھے۔" فرینہ نے کمرے سے آواز لگا کر بھابھی کو آگاہ کیا۔

"آتی ہوں۔" کہہ کر وہ دوبارہ کچن میں مصروف ہو گئی۔



"اپنی بھابھی کو چھوڑو، یہ کچن سے دس بجے سے پہلے نکلنے والی نہیں ہے۔" بھائی نے فرینہ کو پیار سے جواب دیا۔

"مگر کیوں۔" فرینہ سوچ میں پڑ گئی۔ اتنے اچھے خوش گوار ماحول میں بھابھی نہیں ہوتیں۔ وہ ایک ہفتے سے یہ ہی دیکھ رہی تھی، مگر وجہ سمجھ میں نہیں آئی اور وہاں کچن میں کام کرتے کرتے زرینہ کے آنسو نکل گئے۔

سب اتنا انجوائے کر رہے ہیں، مگر میں اس ماحول کا حصہ نہیں۔ دکھ سے سوچ کر اس نے گھور کے گندے برتنوں کا ڈھیر دیکھا، جو کہ اسے منہ چڑا رہا تھا کہ ہمیں جلدی صاف کرو، تب ہی تم یہاں سے نکل سکتی ہوں۔

فرینہ نے سوچ لیا تھا، بھابھی سے وہ ضرور بات کرے گی۔

وہ کچن میں آئی۔ "بھابھی! آپ بھی ہمارے ساتھ چائے پئیں۔ کام تو ہوتا رہے گا۔"

"نہیں فرینہ، برتن اگر نہیں دھوئے تو صبح تک اور ڈھیر لگ جائے گا۔" زرینہ نے پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔

فرینہ نے ایک نظر کچن میں رکھے برتنوں پر ڈالی۔ آدھے سے زیادہ برتن گندے تھے۔ جس میں صبح کے چائے کے برتن، دوپہر کے کھانے کے برتن، بچوں کے اسکول باکس، رات کے کھانے کے برتن اور ابھی جو چائے بنائی اس کی پتیلی، فرینہ کی سمجھ میں ساری بات ایک پل میں آ گئی اور بھابھی کا مسئلہ بھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر چپ رہی، کیوں کہ زبان سے کچھ کہتی تو شاید بھابھی کو اچھا نہ لگتا کہ ان کے کام میں نقص نکال رہی ہے، اس لیے فرینہ نے سوچ لیا تھا۔ وہ زبان سے نہیں عمل سے بھابھی کو سمجھائے گی۔ ان کا مسئلہ حل کرے گی۔

☆☆☆

"بھابھی!" ناشتے کی ٹیبل پر فرینہ نے موقع دیکھ کر بھابھی سے بات کی۔

"ہاں۔" زرینہ کسی سوچ میں گم تھی، جواب دیا۔

"اگر آپ کو برا نہ لگے تو آج کا کھانا میں بنا دوں، بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں۔" زرینہ کے جواب دینے سے پہلے پہلے عاشر بول پڑے۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے، جتنا گھر زرینہ کا ہے، اتنا تمہارا بھی ہے۔"

"بھائی ایسی بات نہیں ہے۔ بھابھی سے اس لیے پوچھا کہ وہ پورا پورا دن کچن کا کام کرتی ہیں۔ انہیں بھی آرام کا موقع مل جائے گا۔"

زرینہ نے فرینہ کو غور سے دیکھا، وہ دل سے اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ زرینہ کو ایک سکون ملا کہ کوئی تو ہے جسے اس کا کام نظر آ رہا ہے۔

''بھابھی جواب دیں۔'' فرینہ نے زرینہ کو چپ دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے، مگر صرف آج کے لیے، کیوں کہ میں نہیں چاہتی تم کام کرکے اپنا میکے اور سسرال کا فرق ختم کردو۔ میکہ صرف آرام کے لیے ہوتا ہے، سمجھیں۔''

''جی بھابھی۔'' فرینہ نے خوش ہوکر جواب دیا۔

عاشر نے پیار بھرے انداز سے زرینہ کو دیکھا، جوکہ فرینہ کو اتنا مان دے رہی تھی۔

''بیٹا!''

''جی امی!'' عاشر نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''مجھے بہت خوش کیا ہے بہو نے، میری بیٹی کو اتنا آرام اور پیار دیا۔ مجھے خوشی ہے کہ زرینہ میری بہو ہے۔''

اتنا پیار، اتنی تعریف، زرینہ کو لگا آج وہ خوشی کے مارے کہیں اڑ نہ جائے۔ اس نے فرینہ کو دل سے دعا دی، جوکہ ان سب خوشیوں کی وجہ تھی۔

☆☆☆

''بھابھی آپ یہاں۔''

''ہاں فرینہ، میں نے سوچا تمہاری مدد کردوں، کھانا پکانے میں۔''

''نہیں بھابھی! میں ٹھیک ہوں۔ ہاں آپ مجھ سے باتیں کرسکتی ہیں، مگر کام نہیں۔''

زرینہ مسکرادی اور ایک نظر کچن پر ڈالی، جوکہ صاف ستھرا تھا۔

''وہ صبح کے گندے برتن کہاں ہیں۔'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''وہ تو میں نے دھو دیے۔'' فرینہ نے جلدی سے جواب دیا۔

زرینہ سوچ میں پڑگئی۔ ''ویسے بنا کیا رہی ہوں فرینہ۔''

''حلیم۔'' فرینہ نے ہانڈی میں چمچہ چلاتے ہوئے بتایا۔

''خوب برتن گندے ہوں گے۔'' زرینہ نے اداسی سے سوچا۔

مگر یہ کیا ...... فرینہ نے بڑے سے تھال میں ایک ایک چیز رکھی تھی۔ ایک طرف دالیں، ایک طرف مسالے اور باقی سامان ایک چھوٹی پلیٹ جس میں حلیم کا گوشت تھا۔ سرخ کی ہوئی پیاز، لہسن کا پیسٹ، جیسے جیسے ایک ایک چیز ہانڈی میں ڈالی گئی ویسے ویسے برتن بھی دھلتے گئے۔ گندا برتن کوئی نہیں تھا۔

فرینہ بڑی صفائی سے کھانا بنارہی تھی اور ساتھ ساتھ برتن بھی دھوتی جارہی تھی۔ ایک پل ہی لگا زرینہ کو سمجھنے میں، جیسے کہ وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔

''امی!'' اسکول سے آتے ہی بچوں نے زرینہ کو پکارنا شروع کردیا۔

''میں ابھی آئی۔'' زرینہ کو جاتا دیکھ کر فرینہ کے چہرے پر ایک چمک آئی۔

''بھابھی، بچوں کے لنچ باکس لادیں، تاکہ میں دھودوں۔'' فرینہ بھابھی کو آج ساری بات صحیح طرح سے سمجھانا چاہتی تھی۔

رات کو سب چائے پی رہے تھے۔ اتنے خوش گوار ماحول میں آج زرینہ بھی شامل تھی اور وہ آج اس ماحول کا حصہ صرف فرینہ کی وجہ سے تھی۔ اس نے پیار سے فرینہ کو دیکھا اسی وقت فرینہ نے بھی انہیں دیکھا، دونوں کی نظر ملی، ایک دوسرے کو شکریہ اور ویلکم کہتے ہوئے دونوں ہنس دیں۔

زرینہ نے چائے کا کپ کچن میں رکھتے ہوئے اچانک سنک میں نل کے نیچے دھولیا اور باقی سارے کپ بھی اور ہنستے ہوئے خود سے کہا۔ ''آج سے برتن جمع کرنا ختم۔ فرینہ جوکہ اپنا چائے کا کپ رکھنے آئی تھی۔ بھابھی کا یہ جملہ سن کر مسکرادی۔



نعیمہ ناز

جھوٹی

ایک ہفتے میں ہی پری کی حرکتوں سے نہیں بلکہ باتوں سے گھر والے عاجز آچکے تھے، سب کے سب، ماں، باپ بھی، بہن بھائی بھی۔ روز آنے والی پھوپھی اماں بھی اور ہر دوسرے دن آنے والے تایا اوران کے بچے بھی۔

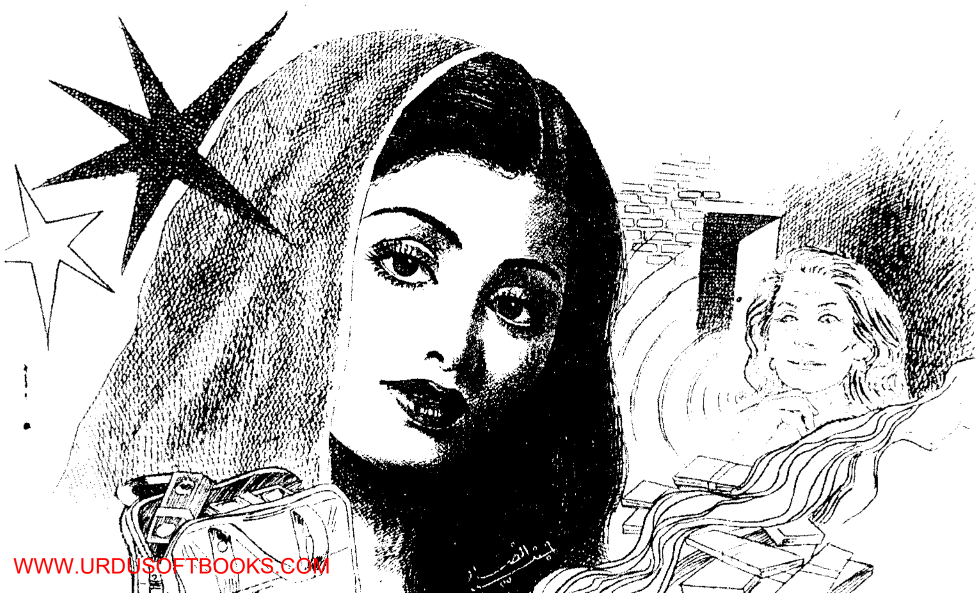
بولنا کوئی اچھنبے کی بات تو نہیں، یہاں کون ہے جو نہیں بولتا۔ سیاست میں، صحافت میں، عدالت میں قیادت میں، مخالفت میں، حمایت میں محبت میں، نفرت میں، سبھی کچھ نہ کچھ بولتے ہیں، بولتے ہی رہتے ہیں بلکہ بول رہے ہیں پھر پری کے بولنے پر اتنا واویلا کیوں؟

دراصل پری وہ بول دیتی تھی جسے شاذ ہی کوئی کوئی بولتا تھا، یعنی سچ۔ بے چاری پری بنیادی طور پر بھولی بھالی سیدھی سادی لڑکی تھی، آج کل ایسی لڑکیاں ذرا کم ہی ہوتی ہیں اس لیے شاید کسی کو یقین نہ آئے مگر وہ ان ہی کمیاب اور نایاب لڑکیوں میں سے تھی۔ ابھی فقط گیارہ جماعتیں پاس کی تھیں۔ بارہویں کے امتحان کے لیے تیاریاں کررہی تھی۔ مگر گھر والوں کے لیے خود ایک امتحان بن گئی تھی۔ ایسے امتحان سے پہلے کسی کا اتنا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

☆☆☆

دراصل پری کو شیر خوارگی میں ہی نانی اپنے

مکمل ناول





ساتھ لے گئی تھیں، پری اور اس کا بھائی جڑواں تھے۔ ان دونوں سے پہلے چار بچے اور تھے' دو بیٹے، دو بیٹیاں، سب اوپر تلے کے، پھر یہ جڑواں بہن بھائی۔ امی پریشان ہو گئیں' پہلے ہی جیسے تیسے گھر اور گرہستی سنبھال رہی تھیں' اب ذمہ داریاں اور بڑھ گئی تھیں، بیٹی کی پریشانی کا حل ان کی اماں نے نکالا' وہ پری کو اپنے ساتھ لے گئیں، امی تو بیٹا بھی دینے کو تیار تھیں کہ نانی کے گھر پل جائے گا، مگر وہ نہیں مانیں۔

"بھنو! لڑکے تو پریشان بہت کرتے ہیں، لڑکی اتنا تنگ نہیں کرے گی، آرام سے پل جائے گی۔

یہ نانی کی خوش فہمی نہیں تجربہ تھا۔ اپنے دو لڑکوں نے انہیں بچپن میں تگنی کا ناچ نچا دیا تھا مگر چار لڑکیاں آرام اور سکون سے پل گئیں، پس قصہ مختصر وہ پرسا کو اپنے گھر لے گئیں جہاں وہ پری بن گئی۔

نانی نے چھ بچے پیدا کیے' پال پوس کر بڑے کیے پھر یوں ہوا کہ لڑکوں کو لے گئیں چڑیلیں، لڑکیوں کو لے گئے بھوت' ہم رہے اوت کے اوت، تو وہ اکیلی تھیں، بیٹے دیار غیر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مست تھے، بیٹیاں اپنی اپنی گھر گرہستی میں ناک تک ڈوبی ہوئی تھیں، پھر بھی بے چاریاں انہیں اپنے اپنے گھر بلاتیں، اپنے ساتھ رہنے کی فرمائش کرتیں مگر وہ ایک آدھ دن سے زیادہ کسی کے گھر رکنے کی روادار نہیں تھیں۔

ان کا دل ہی نہیں لگتا تھا پھر کچھ یہ کہ ان کی عادت اس قسم کی تھی کہ ایک دن سے زیادہ انہیں کوئی اور برداشت نہیں کرسکتا تھا سوائے بیٹیوں کے۔ جی ہاں وہی عادت جواب نواسی میں بھی آ گئی تھی کہ بے دھڑک ہو کر ہر سچ بیان کر دینا، دوسروں کے بارے میں ہی نہیں' اپنے بارے میں بھی، تو جہاں اکثریت جھوٹ بولنے کی اور اپنے بارے میں بھی جھوٹ سننے کی عادی ہو جائے کہ سچ نہ برداشت ہوتا ہے نہ ہضم وہاں سچ بولنے والے کا حشر نشر ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔

تو نانی کے انتقال کے بعد جب پری اپنے والدین کے گھر واپس آئی تو پہلے پہل تو گھر والے خوش تھے پھر حیران ہوئے پھر پریشان ہو گئے۔

فرحت آنٹی آئی تھیں انہوں نے امی کے بالوں کا بہت خوب صورت براؤن شیڈ دیکھا تو بے اختیار تعریف کر بیٹھیں۔

"پارلر سے ڈائی کروائے ہیں۔" امی نے بے نیازی سے بتایا۔

"مگر امی! پرسوں تو آپ نے آپی سے مہندی لگوائی تھی، اس میں کیا کیا ملایا تھا انڈا، کافی اور ۔۔۔ اور کیا تھا؟" پری یاد کرنے لگی۔ فرحت آنٹی کی دبی دبی ہنسی نکل گئی۔ امی کی کرکری ہو گئی۔ ان کے جانے کے بعد امی سے پری کو خوب ڈانٹ پڑی۔

"میں سمجھی، آپ بھول گئی ہیں اس لیے یاد دلا رہی تھی۔" پری منمنائی۔

مگر یہ تو آغاز تھا۔ اگلے روز ابو لاؤنج میں صوفے میں دھنسے ٹی وی کے آگے براجمان تھے، ان کا موبائل بجا، نمبر دیکھ کر انہوں نے قریب بیٹھی پری کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"کہہ دو ابو گھر پر نہیں ہیں، کہیں گئے ہوئے ہیں' موبائل گھر پہ بھول گئے ہیں۔"

انہوں نے پورا آموختہ یاد کروایا جلدی جلدی' پری اتنی کند ذہن تو نہ تھی تین فقرے ہی تو بولنے تھے' بول دیے۔

"کہاں گئے ہیں؟" ایک دم سے سوال آیا۔

اس سوال کا جواب تو بتایا ہی نہیں تھا اس لیے اپنی عقل اور عادت کے مطابق جھٹ بول پڑی۔

"کہیں نہیں، یہیں صوفے پہ بیٹھے ہیں۔" آگے بھی شاید' اس پروگرام کا نام بھی بتا دیتی جو وہ ٹی وی پہ دیکھ رہے تھے مگر ابو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے موبائل لیا اور آف کر دیا۔

"حد ہوتی ہے بے وقوفی کی۔" خشمگیں نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑائے۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" پری روہانسی ہوگئی۔

"بتانا چاہیے تھا، کہاں گئے ہیں۔"

"اپنی عقل سے کام نہیں لے سکتی تھیں۔" وہ ڈپٹ کر بولے۔

"عقل کیا جھوٹ بولنا سکھاتی ہے؟"

پری سوچنے لگی۔ اگر وہ اقبال شناس ہوتی تو شاید خود ہی سمجھ جاتی کہ اقبال نے ایسے ہی تو عشق کو عقل پہ فوقیت اور فضیلت نہیں دی۔ عقل عیار و مکار ہوتی ہے۔ حیلے، بہانے، حربے تراش لیتی ہے، تلاش کر لیتی ہے، عشق بے خوف و خطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے اور یہ عقل محو تماشائے لب بام ہوتی ہے، تبھی تو اقبال نے نصیحت کی تھی۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پہ اعمال کی بنیاد رکھ

بے چاری پری یہ سب نہیں جانتی تھی، اس کی تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات بے بات گھر میں ہر کوئی اسے یہ جو نصیحت کرتا رہتا ہے کہ "عقل سے کام لو" تو اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ بے وقوف ہے؟

☆☆☆

پھوپھی اماں آئی تھیں عاشر بھائی کے پاس،

"بیٹا! میری دوائیاں لے آئے تھے؟" وہ بیوہ بھی تھیں اور بے اولاد بھی' اوپری منزل پہ ایک کمرہ انہیں دیا ہوا تھا، ان کے باہر کے سب کاموں کے لیے ابو نے عاشر بھائی کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی اور دیر سویر سے ہی سہی' کبھی خوشی سے' کبھی منہ بنا کر وہ یہ سب کام کر بھی دیتے تھے، ابھی پھوپھی اماں نے دوائیوں کا پوچھا تو وہ اک دم سٹ پٹا گئے، پرسوں سے ابو نے پیسے دیے ہوئے تھے، اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ دوائیاں ابھی تک نہیں لائے تو ان کی خیر نہیں تھی۔

"کل رات سے مجھے بہت تیز بخار ہے' سر میں شدید درد ہے' ابھی تو سو کر اٹھا ہوں، شام میں ضرور لادوں گا۔" عاشر بھائی نے گڑبڑاتے ہوئے، امتحانوں میں آنے والی چھٹی کی درخواست جیسا بہانہ بنایا۔

"ایک دن بھی دوائی نہ کھاؤں تو طبیعت خراب ہونے لگتی ہے' موئی دوائیاں تو کھانے سے بھی زیادہ ضروری ہوگئی ہیں۔" پھوپھی اماں ذرا مایوس سی ہوگئی تھیں۔ "چلو خیر' شام میں یاد سے لادینا۔"

"بھائی! آپ کو اتنا تیز بخار اور سر میں درد تھا تو صبح ہی صبح کرکٹ کھیلنے کیوں چلے گئے تھے۔ آرام کر لیتے۔"

پری نے تو بھائی کی ہمدردی اور محبت میں یہ سب کہا تھا مگر یہ ہمدردی بڑی مہنگی پڑ گئی' محبت الٹی گلے پڑ گئی، پھوپھی اماں نے ابو سے شکایت کی کہ عاشر نے ایک تو دوائیاں نہیں لاکر دیں پھر جھوٹ بھی بولا۔

ابو نے عاشر کی کلاس لے لی۔ دوائیاں نہ لانے پر بھی اور جھوٹ بولنے پر بھی، سارے والدین

چاہتے ہیں کہ ان کے بچے دنیا کے سب سے اچھے بچے ہوں، وہ کبھی جھوٹ نہ بولیں، مگر والدین نہ خود سب سے اچھا بننے کی کوشش کرتے ہیں نہ جھوٹ بولنا ترک کرتے ہیں، اولاد کیسے سیکھے گی؟

عاشر بھائی کا کبھار پہ تو بس نہیں چلا گدھی یعنی پری کے کان مروڑ ڈالے، سچ مچ تو نہیں محاورتاً مگر خوب خوب خوب ڈانٹ پڑی پری صاحبہ کو،

ٹیپ ٹیپ بھر کر یہی تھا کہ عقل کب آئے گی تمہیں۔

یعنی جھوٹ بولنا کب سیکھو گی یا کم از کم دوسروں کے جھوٹ کا دفاع کرنا کب سیکھو گی۔

پری کو اگر ٹی وی سے تھوڑی بہت دلچسپی ہوتی یا سیاست سے، تو وہ سیکھ ہی لیتی کہ لوگ جھوٹ کیسے بولتے ہیں اور دوسروں کے جھوٹ کی کیسے حمایت اور دفاع کرتے ہیں، مگر پر یزا تو وہی کچھ کر رہی تھی جو نانی سے سیکھا تھا، نانی نے سکھایا تھا کہ نبی کریمؐ کے فرمان کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ انسان مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا نام کا ذبوں میں لکھ دیا جاتا ہے اور ایک انسان مسلسل سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا نام صدیقوں میں لکھ دیا جاتا ہے''۔

مسئلہ یہ تھا کہ نانی نے یہ نہیں سکھایا تھا کہ سچ کب بولنا چاہیے کتنا بولنا چاہیے اور سب سے اہم یہ کہ صرف اپنے متعلق ہی بولنا چاہیے

یا دوسروں کے متعلق بھی؟

پری انجانے میں یا اپنے بھولپن میں، دوسروں کے متعلق بھی بے دھڑک بول جاتی تھی، کسی پر طنز کرنے، عاجز کرنے یا زچ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان کی تصحیح کرنے کے لیے، بھولی بھالی پریسا سمجھتی تھی کہ کوئی اگر غلط بیانی کر رہا ہے تو اس لیے کہ وہ شاید بھول گیا ہے، اس لیے وہ صحیح بات یاد دلاتی تھی۔

☆☆☆

ایسا نہیں ہے کہ یہاں سب جھوٹے ہی لوگ بستے تھے اور وہ یہاں اکیلی تھی، جی نہیں اس بستی میں ایک اور تھا جو اسی جیسا تھا۔ابو کا بھتیجا اُس کا چچا زاد، والدین کے گزر جانے کے بعد وہ اسی گھر میں پلا بڑھا تھا، پتا نہیں کہاں سے یہ عادت اس کے اندر آئی۔ وہ غلط بیانی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر بات بے دھڑک ہو کر صاف بول دیتا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کوئی بہت ہائی فائی قسم کا لڑکا تھا جو معاشرے کی اصلاح کے لیے سچ کا علم اٹھا کر نکلا ہے۔ (جب آج ہر کوئی معاشرے کی اصلاح کے درپے ہے، حالانکہ فرد اپنی اصلاح خود کر لے تو معاشرہ تھوڑا بہت سدھر ہی جائے)

بے چارہ علی بڑا مرنجان مرنج سا لڑکا تھا، کسی حد تک سیدھا اور سب کی نظروں میں اور لفظوں میں بدھو، تو علی کو بچپن سے ہی شوق تھا کھلونے، مختلف الیکٹرونکس آئٹم جو خراب یا ناکارہ ہوتے، کھول کھول کر دیکھتا رہتا، تجسس اور شوق کے مارے، کہ وہ کیسے بنے ہیں، کیسے کام کرتے ہیں،

ابو نے سوچا انجینئر بنے گا، اسے اچھے اور مہنگے اسکول میں پڑھایا مگر رو پیٹ کر بڑی مشکلوں سے اس نے میٹرک کیا، انہوں نے ٹیوٹر بھی لگوایا، نصیحتیں بھی کرتے رہے کہ دل لگا کر پڑھو مگر نصیحت ہی غلط تھی، کام کیسے آتی، پڑھائی میں دل نہیں، دماغ لگایا جاتا ہے تب ہی اچھے نتائج آتے ہیں۔ کالج میں ایڈمیشن ہوا تو پہلے ہی سال دو مضامین میں فیل بڑے جتن کر کے اسے انٹر کروایا پھر ایک ٹیکنیکل ادارے سے ایئر کنڈیشن فریج کی مرمت کا کام سیکھنے پر لگا دیا۔

یہ کام اس نے شوق سے کیا اور ڈپلوما لے لیا، کام بھی سیکھ لیا۔ جاب کے لیے ایک کمپنی کی ویکنسی آئی تھی، تنخواہ اچھی تھی بس ایک مسئلہ تھا کہ انہیں ڈپلومے کے ساتھ گریجویشن کی ڈگری چاہیے تھی، ابو چاہ رہے تھے کہ علی کو یہ جاب ضرور مل جائے کہ ٹھیک ٹھاک تنخواہ کے ساتھ فیسیلٹیز بھی تھیں، پھر جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ وطن عزیز میں ڈگری کا حصول کوئی مشکل نہیں، بغیر پڑھے اصلی ڈگری بھی مل جاتی ہے

(نقل کے ذریعے) اور اس سے بڑھ کر پڑھنے اور نقل کرنے کی ضرورت بھی نہیں، فقط رقم خرچ کر کے ڈگری حاصل کر لیں، جعلی تو ہوتی ہے مگر کیا ہوا، اسپ سیاست کے ایک سوار کا یہ قول زریں جو آب زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ ''ڈگری ڈگری ہوتی ہے اصلی ہو یا جعلی'' تو علی کے لیے ایسی ہی ایک ڈگری حاصل کر لی گئی۔

انٹرویو دینے پہنچے تو بڑے آسان آسان سوال تھے پھر انٹرویو تسلی بخش ہو گیا، آخر میں انٹرویو لینے والے کو جانے کیا سوجھی اس کی سی وی الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے فرمانے لگے، آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ نے گریجویشن پرائیویٹ کیا ہے یا ریگولر؟''

''کیا ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے انٹر کیا ہے۔''

''سی وی میں تو گریجویشن لکھا ہے۔''

''جاب کے لیے لکھا ہے۔''

''جاب مل جاتی تو ڈگری جمع کرانی پڑتی، کہاں سے لاتے؟''

''بنوالی ہے۔''

''جعلی؟''

''جی۔''

''آپ نے بنوائی ہے؟''

''نہیں، میرے بھائی نے بنوائی ہے۔''

''جاب آپ کو چاہیے یا بھائی کو؟''

''ابو چاہتے ہیں کہ یہ جاب مجھے ضرور مل جائے، اس لیے انہوں نے بھائی کے ذریعے ڈگری خرید لی۔''

''آپ کو علم ہے کہ جعلی ڈگری کے کیس میں آپ کو سزا بھی مل سکتی ہے؟''

''آج تک کسی کو ملی تو نہیں، مجھے کیوں ملے گی؟'' علی روزانہ اخبار کی ہیڈ لائنز پڑھتا تھا اور ٹی وی پہ پرائم ٹائم میں خبریں ضرور سنتا تھا، سیدھا تھا مگر بے خبر تو نہیں تھا۔

''آپ پالیٹیشن نہیں ہیں، خوش فہمی کی دنیا سے باہر نکلیں۔''

''جی اچھا!'' علی فوراً سیدھا ہو گیا۔

''ہوں۔'' وہ صاحب اپنی تیز چمکیلی نظروں سے علی کو گھورنے لگے۔

''میں تمہارے سچ بولنے سے امپریس ہو رہا تھا مگر میں اتنی جلدی تو کیا بہت دیر میں بھی کسی پر بھروسا نہیں کرتا، ینگ بوائے، جاب حاصل کرنے کے لیے یہ تمہاری کوئی چال بھی ہو سکتی ہے، کیوں؟''

''نو سر۔ میں چال باز نہیں ہوں۔'' علی نے صفائی پیش کی۔

''مگر یہ جاب پھر بھی آپ کو نہیں مل سکتی، آپ ہماری ریکوائرمنٹ پہ پورے نہیں اترتے۔''

انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا اور علی فٹے منہ لے کر گھر واپس آ گیا۔ زندگی کا پہلا انٹریو تھا سبھی اس کے انتظار میں بیٹھے تھے خصوصاً ابو اور عاشر، ڈگری بنوانے کے لیے ابو کی اچھی خاصی رقم خرچ ہوئی تھی اور ساری بھاگ دوڑ عاشر نے کی تھی۔

علی نے گھر آ کر بھی وہی بے وقوفی کی جو انٹرویو کے دوران کی تھی یعنی کہ سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

''اف!'' ابو سچ میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے اُن کے ہزاروں روپے ضائع ہو گئے تھے۔ عاشر الگ کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، بے چارے کی کئی دنوں کی دوڑ دھوپ، محنت اکارت گئی تھی، رقم خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ کئی افراد کی خوشامد بھی کی تب کہیں جا کر کام بنا تھا، علی نے ذرا سی دیر میں سب کچھ ملیا میٹ کر دیا تھا۔

''کیا ضرورت تھی وہاں جا کر سب کچھ اگلنے کی۔ کوئی بات اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکتے تم؟'' ابو کے اوسان ذرا بحال ہوئے اور ڈوبی ہوئی رقم کا صدمہ ذرا کم ہوا تو وہ علی کی کلاس لینے لگے، بن بادل برسات کی مانند برس پڑے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پہلے خوب گرجے پھر اتنا ہی برسے۔

''انہوں نے سوال ہی ایسا کیا تھا میں کیا جواب دیتا؟''

''بول دیتے پرائیویٹ کیا ہے۔'' ابو

جھنجھلائے۔ ''کچھ اور پوچھ لیتے تو، اس کا جواب کہاں سے دیتا؟''

''ارے آج کل بچہ بچہ جواب دینا جانتا ہے۔ تو بھی بنالیتا کوئی بات۔''

''کیا بات بناتا؟'' علی ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے آزردہ ہو رہا تھا۔ ''ایک جھوٹ چھپانے کے لیے ستر جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، جھوٹ پھر بھی نہیں چھپتا' کبھی نہ کبھی کھل ہی جاتا ہے۔''

''سچ بولنے کا نتیجہ دیکھ لیا' اچھی بھلی ہاتھ آتی نوکری ہاتھ سے نکل گئی۔ سچ کا صلہ آج کل صرف کہانیوں' ڈراموں اور فلموں میں ملتا ہے، اور کہیں نہیں۔ اسی طرح زندگی گزاردو گے تو تمہارا اللہ ہی حافظ ہے، تھوڑی دنیاداری بھی سیکھ لو اب۔''

گرجنے برسنے کے بعد انہوں نے لگے ہاتھوں نصیحت بھی کرڈالی۔

تو سچ بولنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاب ملی نہیں البتہ ڈانٹ اور ڈھیروں باتیں سننے کو ضرور ملیں۔

پھر ابو نے کچھ غور وخوض کے بعد ایک جاننے والی کی دکان پر لگوایا' وہ یہی کام کرتے تھے یعنی ان کے پاس بڑی تعداد میں فریج اور ایئر کنڈیشن کی خرابی ٹھیک کرنے کے آرڈرز آتے تھے، کئی لڑکے اور بھی تھے جو ان کے پاس کام کرتے تھے' اب ان میں علی بھی شامل ہوگیا، ابو کا خیال تھا کہ سال چھ مہینے یہاں کام کرکے وہ کچھ تجربہ حاصل کرلے تو اپنی دکان کھول لے، چھ مہینے تو کیا چھ ہفتے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ وہ صاحب، ابو کے پاس آکر ہاتھ جوڑنے لگے۔

''بھائی صاحب! اپنے بیٹے کو اپنے پاس ہی رکھیے، یہ خود تو کچھ کمائے گا نہیں، دوسروں کو بھی کمانے نہیں دے گا، میرا تو سارا دھندا چوپٹ کرکے رکھ دیا ہے۔''

''ہوا کیا ہے؟'' وہ چلے گئے تو علی کی شامت آگئی۔

''غلط کام کررہے ہیں سب، دو نمبر پرزے ڈال کر چیز بنادیتے ہیں' سال کے اندر اندر مشین پھر سے خراب ہوجاتی ہے، میں نے دو تین گاہکوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ نیا پرزہ خرید کر لگوالیں، کئی سالوں کی چھٹی ہوجائے گی، پتا نہیں کیوں فیض انکل ناراض ہوگئے۔'' علی نے صفائی پیش کی۔

''تم سے کس نے کہا تھا مشورے دینے کو، جیسے وہ کام کروار ہے تھے ایسے ہی کرتے رہتے۔'' ابو نے جی بھر کے بدمزہ ہوکر اس کوڑھ مغز بھتیجے کو دیکھا۔

''وہ تو بے ایمانی ہے، سارا دن کسٹمرز سے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔''

بے چارہ علی اور اس کی آئیڈیالوجی۔۔۔ ابو تو اب سچ مچ اس سے تنگ ہو رہے تھے۔

''آج کل بے ایمانی اور جھوٹ کے بغیر کامیابی ملتی ہے؟'' ابو نے اپنی دانست میں ایک مشکل سوال پوچھا تھا اس سے، مگر علی نے بڑے آرام سے سیدھا سا جواب دیا تھا۔

''بے ایمانی اور جھوٹ سے فقط بے برکتی ملتی ہے، زندگی میں بھی رزق میں بھی۔''

ابو لاجواب ہوگئے تو جھنجلا کے فقط اسے گیٹ آؤٹ ہی کرسکے۔

''ٹھیک ہے، جو دل چاہے کرو، جاؤ۔''

علی نے ان کے حکم پہ جو انہوں نے غصے میں دیا تھا دل و جان سے عمل کرڈالا اور اپنی دکان کھول کر بیٹھ گیا، دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ اس کا کام چل ہی پڑا تھا۔

☆☆☆

علیزا کو دیکھنے ایک فیملی آئی تھی، گھر میں بڑی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ لڑکا ڈاکٹر تھا، والد کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پہ فائز تھے۔ والدہ کسی کالج میں لیکچرار تھیں، ایک بہن اور ایک بھائی شادی شدہ تھے' یہ آخری تھے، کم تو خیر علیزہ بھی نہیں تھی، اپلائیڈ فزکس میں ماسٹرز کرکے اسی کالج میں پڑھا رہی تھی جہاں اس کی متوقع ساس بھی ٹیچر تھیں۔

علیزہ کا دوسرا بڑا یا شاید سب سے بڑا پلس پوائنٹ اس کی بے تحاشا خوب صورتی تھی جو گھر بھر

میں اور کسی کے پاس اتنی وافر مقدار میں نہیں تھی تو اب جب کہ سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوشگوار ماحول اور موڈ میں باتیں کر رہے تھے، سینٹر ٹیبل مشروبات، لوازمات سے لبالب بھری ہوئی تھی، امی ان کی خاطر واری کرتے ہوئے وہی روایتی جملے بول رہی تھیں جو عموماً مائیں بولتی ہیں۔

''یہ کباب لیجیے نا، علیزہ نے خود بنائے ہیں''۔

پری کا دماغ اور زبان دونوں ہی کنٹرول سے باہر، جھٹ سے بول پڑی۔

''نہیں امی! آپ پھر بھول گئیں۔ کباب تو عنیزہ آپی نے بنائے تھے۔

علیزہ آپی تو کچن میں جاتی ہی نہیں، کہتی ہیں اسکن خراب ہو جائے گی''۔

پری اپنی بہنوں جیسی بے تحاشا خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کی آنکھوں میں، چہرے پہ بڑا پیارا سا بھولا پن تھا بچوں جیسا، لہجے میں بھی وہی بھولا پن اور سادگی تھی۔ اس کے یوں پٹاخ سے بولنے پر امی تو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں، مہمانوں کے آنے سے پہلے ایک مفصل اور پر مغز لیکچر دیا تھا اسے مگر کوئی اثر نہیں ہوا، مہمان اعلیٰ ظرف بھی تھیں اور باذوق بھی، ہنس پڑیں، اس سے پہلے کہ امی کوئی وضاحت یا صفائی دیتیں وہ خود ہی بول پڑیں۔

''بھئی، سچی بات ہے کہ کچن میں گھسنے کا ہمیں بھی کوئی خاص شوق نہیں ہے، مجبوری کی بات الگ ہے۔ پہلے تعلیمی سرگرمیوں نے، پھر ملازمت کی مصروفیت نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ کچن میں جانے کا شوق پالتے، ویسے علیزا نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ اسے کچن سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے، ہمارے گھر کک ہے۔''

وہ خوش مزاجی سے کہتی رہیں اور امی شرم سے پانی پانی ہوتی رہیں، وہ اپنے جھوٹ بولنے پر نادم نہیں تھیں بلکہ پری کے سچ بولنے پر شرمندہ ہو رہی تھیں۔

''بڑی سادی بچی ہے آپ کی۔'' انہوں نے پری کے کاندھے کو تھپکا جو امی کے تاثرات دیکھ کر سراسیمہ ہو رہی تھی۔

''ایسے ہی لوگوں سے ہمارے اس خرابے کا نظام چل رہا ہے۔'' وہ تو اپنے اقوال زرین سنا کر اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر چل دیں، پیچھے پری کی شامت آ گئی۔

''تم سے اپنا منہ بند نہیں رکھا جاتا، ہر ایک کے سامنے کیوں بول پڑتی ہو''۔

''نہ گھر والوں کے سامنے بولو نہ باہر والوں کے سامنے، پھر کہاں بولوں، کس کے سامنے؟'' پری روہانسی ہو گئی۔

''اپنی زبان کو ذرا کم ہی زحمت دیا کرو۔'' سب ہی اس کے پیچھے پڑ گئے تھے، اسے شرمندہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

''جھٹ سے منہ کھول دیتی ہے، بولتے وقت کچھ سوچتی ہی نہیں، بتاؤ ذرا، ''وہ'' کیا سوچ رہی ہوں گی میرے بارے میں؟'' امی کو بہت قلق ہو رہا تھا۔

''ایک ذرا سے سچ بولنے پر سب لوگ اتنا واویلا کیوں مچانے لگتے ہیں؟'' یہ علی ہی تھا جو اس کی حمایت میں میدان میں کودا، دونوں متاثرین کا درد مشترک جو تھا۔

''سچ بولنا ہے تو اپنے بارے میں بولیں، دوسروں کے بارے میں نہیں۔'' علیزا نے فتویٰ اور فیصلہ دونوں صادر کیے، علی اور پری خاموش ہو گئے اور باقی سب بھی۔

امی نے پکا پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ ''لڑکا'' دیکھنے جائیں گے تو صرف بڑے بڑے، بچہ کوئی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ پری کو ساتھ نہ لے جانے کی وجہ سے کیا گیا تھا جو نئے نویلے اور ہونے والے دولہا بھائی کو دیکھنے اور ملنے کے لیے پر جوش تھی۔

''پگلی ہے، خدا جانے وہاں کسی کے سامنے کیا بول دے۔'' امی نے علیزا اور عنیزہ کے سامنے کہا جو پہلے ہی ان کے فیصلے سے متفق تھیں مگر بھلا ہو مسز خان کا، جنہوں نے فون پر امی سے فرمائش کر دی۔

"پریزا کو ہمارے گھر ضرور لائیے گا۔"

"لو، وہ تو فدا ہی ہوگئیں پری پہ۔" امی بدمزہ سی ہورہی تھیں۔

یہ بات نہیں کہ وہ پری سے خدانخواستہ کم پیار کرتی تھیں یا اس سے خار کھانے لگی تھیں، ایسا معاملہ ہرگز نہیں تھا وہ تو پری سے بھی اتنی ہی محبت کرتی تھیں جتنا کہ اپنے اور بچوں سے۔ بس یہ تھا کہ بہت سے اور لوگوں کی طرح ان کا خیال بھی یہی تھا کہ آج کے دور میں یوں بے دھڑک ہوکر ہر سچ اگل دینا، انسان کے مفاد میں نہیں اور لڑکیوں کے تو خاص طور پر نہیں۔

خیر پھر یوں ہوا کہ بہت سے وسوسوں اور خدشات سمیت وہ پری کو بھی اپنے ہمراہ لے گئیں۔ میزبان خوش مزاج بھی تھے اور مہمان نواز بھی، فقط باتوں سے ہی پیٹ نہیں بھرا بلکہ انواع واقسام کے لوازمات سے میز بھی بھر دی لڑکے سے بھی ملوایا، جس کا بر دکھوا تھا، امی کے ذہن میں کچھ اور ہی تصویر بنی تھی مسز خان کو دیکھ کر، مگر ڈاکٹر صاحب امی کے تصور سے ذرا ہٹ کر تھے۔

علیزہ سے تقریباً سات، آٹھ سال کا فرق تو ہوگا، سر پہ بال کچھ کم تھے اور چہرے پہ سنجیدگی تھوڑی زیادہ مگر یہ تو محض فرسٹ امپریشن تھا جو محاورے کے مطابق تو لاسٹ ہوتا ہے مگر اصل زندگی میں کبھی کبھی یہ محاورہ غلط بھی ثابت ہوجاتا ہے، انسان کا اندازہ تو تب ہی ہوتا ہے۔ جب وہ منہ کھولتا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے جب بات کرنی شروع کی تو پتہ چلا کہ وہ بہت شائستہ اور نرم لب ولہجے کے مالک ہیں، چہرے سے بے شک بہت سنجیدہ لگتے ہیں مگر خاصے خوش مزاج ہیں۔ ایک گھنٹے میں اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا۔

باقی یہ کہ کچھ معاملات میں امی نے خود کو اور علیزہ کو تسلی دے دی کہ سر پر بال کم ہونا بنک بیلنس زیادہ ہونے کی علامت ہے اور رہی بات ایج ڈفرنس کی تو پاکستانی معاشرے میں اتنا فرق تو عام ہے۔ ویسے بھی میاں بیوی کے دماغوں میں فرق زیادہ نہیں ہونا چاہیے عمر کے فرق کی خیر ہے تو خیر کی نیت کے ساتھ علیزہ کا رشتہ طے ہوگیا خیر وخوبی کے ساتھ۔

☆☆☆

لسوڑھے کی طرح چپکے موسم گرما نے شہر اور شہریوں کی جان ذرا چھوڑی تو کراچی کے باشندے سردیوں کی آمد کا سوچ سوچ کر ہی ٹھنڈ اور ٹھنڈ میں کھانے پینے والی گرم چیزوں کے مزے دل ہی دل میں لینے لگے، گوکہ ابھی صرف گرمی رخصت ہوئی تھی، سردی کہیں راستے میں تھی، ابھی تک یہاں پہنچی نہیں تھی، پہنچے گی کیسے؟ ابھی کوئٹہ میں نہ بارش ہوئی تھی، نہ برف باری، وہاں منفی ٹمپریچر ہو تو تھوڑی سی سردی اور ٹھنڈی ہوائیں کراچی کے حصے میں بھی آجاتی ہیں۔ بقدر اشک بلبل ہی سہی، بے چارے اہلیان کراچی اسی کو ہی غنیمت سمجھ کر خوش ہوجاتے ہیں۔

یہ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے جیسے ہمارے سرکاری معاملات میں ہر ٹھیکے یا امداد کے لیے منظور ہونے والی رقم کی بالائی تو بالا ہی بالا ہضم اور ختم ہوجاتی ہے اور عوام کے حصے میں تلچھٹ آتی ہے۔ کوئٹہ کی شدید سردی کے تلچھٹ کراچی میں آئے تو سب اسی میں ہی اتاؤلے، باؤلے ہوجاتے ہیں، ایئر کنڈیشن چلا کر، لحاف اوڑھ کر سردی سردی کرتے ہیں اور سرشام ہی موٹی موٹی جیکیٹیں اور فیشن ایبل سوئٹر پہن کر کھابوں، ڈھابوں کی رونق بڑھانے گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔

ملک کے بالائی علاقوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا اور بارش وبرف باری کی پیشن گوئی کا مژدہ سن کر امی جھٹ پٹ کمبل، رضائیاں اور سوئٹرز، جیکیٹیں نکال کر انہیں بڑے اہتمام سے دھوپ لگانے لگیں۔

بچے پرجوش ہورہے تھے، امی سے گاجر کے حلوے کی فرمائش ہورہی تھی، ابو کو گجریلا اور گجک بہت یاد آرہے تھے، جو گھر میں فقط تین افراد شوق سے کھاتے تھے، امی، ابو اور پھوپھی یا پھر تایا اور تائی کے ایک ڈش بھر کے جاتی تھی، ان ہی دونوں کے لیے۔

اور ایسے ہی نرم گرم دنوں میں اور دیس کے پردیسی مہمانوں کی آمد کا غلغلہ اٹھا، پردیس بھی وہ جو سب کے خوابوں کا دیس ہے، چاہے وہاں ٹرمپ کی نحوست ہی کیوں نہ ہو اور زبان سے سب اسے اپنا دشمن ہی کیوں نہ کہتے رہیں، مگر وہاں جانے، رہنے اور بسنے کی خواہش پہ کم و بیش ہر کسی کا دم نکلتا ہے، تو ایسے دیس سے قریبی عزیزوں کی آمد، جو اپنے بچوں کا گھر بسانے کی خواہش پہ یہاں آ رہے ہوں۔ سب کے دلوں میں گدگدیاں مچانے لگی تھی۔

ابو کی سب سے بڑی بہن جگت آپا جان اور بچوں کی پھوپھی اماں نے اپنے ایک بیٹا ایک بیٹی اور مختصر سے اسباب کے ساتھ قائد اعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر لینڈ کیا تو میزبان بڑی گرم جوشی کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہنے وہاں موجود تھے۔

آپا جان گوری چٹی اور موزوں ناک نقشے والی بھاری بھرکم خاتون تھیں، ان کے بچے بھی ان ہی کی طرح تھے، گورے گورے اور تھوڑے سے فربہی مائل، مزاج میں پتا نہیں کس پر تھے، راستے میں فقط آدھ گھنٹے میں کیسے اندازہ ہوتا، بس رسمی علیک سلیک ہوئی، دیسی بچوں کی پردیسی بچوں سے، پھر پورے راستے گاڑی میں ابو تھے اور آپا جان، دونوں کی شاید یہ ہی کوشش تھی کہ اگلے پچھلے سارے سالوں کی باتوں کی کسر گھر تک کے سفر میں ہی نکال لیں۔ گھر آ کر بھی دونوں کا منہ اس وقت بند ہوا جب کھانے کے لیے بڑے سے لاؤنج میں دستر خوان لگا۔

خیر منہ تو اس وقت بھی کھلتا رہا کہ صرف بولنے کے لیے ہی نہیں، بلکہ کھانے کے لیے بھی منہ کھولنا ضروری ہے، تو وہ دونوں کام بڑی فراخ دلی سے کر رہی تھیں، یعنی کھانا بھی اور اس کھانے کی تعریف بھی، حالات و معاملات خوش گوار انداز میں چل رہے تھے، انہیں امی کا پکایا ہوا کھانا ہضم ہو گیا تھا اور امی کو ان کی تعریف۔

کھانے کے بعد بچوں کی پسند پر انہیں آئس کریم اور پھوپھی کی فرمائش پر کافی پیش کی گئی وہ لوگ آئس کریم اور کافی سے اور گھر میں کچھ لوگ انہیں دیکھ دیکھ اور مستقبل بلکہ سنہرے مستقبل کا سوچ سوچ کر ہی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

بری امتحانوں کی مصروفیات میں گھر گئی تھی، جب دیکھو کتابوں میں منہ دیے، نوٹس میں بری طرح غرق، عنیزہ اور عاشر بے چارے ہی رہ گئے تھے، پردیسی مہمانوں کو کمپنی دیتے دیتے تھک سے گئے، بلکہ عاجز آ گئے تھے، کیسے نہ تھکتے اور کیسے نہ آتے، جب مہمان ان کی کمپنی لینے میں کچھ زیادہ دلچسپی ہی نہیں دکھا رہے تھے تو؟

''اونہہ! کھڑوس، بددماغ، ہوں گے امریکہ والے، تو ہوں گے، ہمیں کیا، ہمارا ملک کسی امریکہ سے کم ہے کیا؟''

عنیزہ مکسڈ ویجی ٹیبل رائس بنانے کے لیے کٹنگ بورڈ پہ کھٹا کھٹ سبزیاں کاٹ رہی تھی، یوں لگ رہا تھا کہ سارا غصہ اور جھنجلاہٹ سبزیوں پہ اتار رہی ہو۔

بے چاری کا قصور کیا تھا، امی کی باتوں نے ہی سبز باغ دکھائے تھے کہ اچھا ہے، اگر پھوپھی اسی گھر میں ہی اپنے دونوں بچوں کا فیصلہ کر لیں، مستقبل سنور جائے گا۔ پتا نہیں کس کا اپنے بچوں کا یا ان کے بچوں کا۔ عنیزہ کوئی چیپ یا گری پڑی تو نہیں تھی جو کسی کے یوں آگے پیچھے گھومتی، چاہے وہ لفٹ کرائے نہ کرائے، مروت میں آ کر مہمان داری نبھا رہی تھی۔ سو ماتھے پہ لکھا نو لفٹ کا بورڈ دیکھ کر وہ مروت بھی ایک طرف رکھ دی۔

☆☆☆

علی کو اب اکثر رات میں دیر ہی ہو جاتی تھی۔ اپنے کام میں جتنی محنت اور وقت دیا جائے۔ کامیابی اتنی ہی قریبی اور یقینی ہوتی ہے۔ کبھی اتفاق سے جلدی گھر آ جاتا تو سب کے ساتھ کھانا کھا لیتا، ورنہ جب بھی واپس آتا۔ کچن میں جا کر کھانا گرم کر کے خود ہی کھا لیتا۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر میں کسی کو اس کی پروا نہیں تھی یا اس کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اسے

خود ہی اچھا نہیں لگتا تھا کہ امی یا عنیزہ یا پری کوئی بھی اس کے لیے بے آرام ہو، اس لیے خندہ پیشانی سے وہ اپنے لیے خود ہی یہ خدمت بجا لاتا۔ اس دن بھی رات گئے گھر پہنچا تو کچن میں پری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''یہاں بیٹھ کر پڑھ رہی ہو؟'' کچن میں رکھی چھوٹی سی گول میز پہ اس کے نوٹس اور رجسٹر، کتابیں، قلم وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔

''پھر کہاں پڑھوں؟'' پری بے چارگی سے بولی۔

پھوپھی اور ان کے بچوں کے تصرف میں دو کمرے دیے گئے تھے، ایک اماں بیٹی کو، دوسرا اکیلے بیٹے کو، وہ زیادہ نواب زادہ بن رہا تھا، اسے اکیلا کمرہ چاہیے تھا، وہ تو عنیزہ کو بعد میں معلوم ہوا کہ نیویارک میں، مین ہٹن کے علاقے میں پھوپھو کا پانچ افراد کا کنبہ فقط دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں رہتا ہے، وہ بھی کرائے پہ، تو بہرحال دو کمرے ان کی فیملی میں بٹ جانے کے بعد، پری اور عنیزہ کو امی، ابو کے کمرے میں بسیرا کرنا پڑا تھا۔ پری دن بھر کہیں بھی بیٹھ کر یاد کرتی رہتی اور رات میں اسے دہرانی اور لکھتی، دہرانے کا معاملہ بھی خوب تھا۔ دھیمی دھیمی آواز میں جب اس نے دہرانا شروع کیا تو عنیزہ نے کانوں پہ پہلے ہاتھ، پھر تکیہ رکھ لیا۔

''خدا کے واسطے اپنی یہ بھن بھن کہیں اور جا کر کرو اور لائٹ بھی آف کرو، ایسے تو مجھے صبح تک نیند نہیں آئے گی۔''

امی، ابو کی خاموشی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ بھی عنیزہ کے ہم نوا ہیں، چنانچہ پری کو اپنا بوریا بستر تو نہیں، مگر سارے کاغذات گول کر کے کچن میں ڈیرہ ڈالنا پڑا۔ صبح تک کے لیے نہیں، بلکہ دو، چار گھنٹوں کے لیے، ان ہی دو، چار گھنٹوں کے دوران علی آتا، معمول کے مطابق کھانا، گرم کرتا اور کھالیتا، ہاں فرق صرف یہ پڑا کہ اب وہ کھانا پہلے کی طرح خاموشی سے نہیں کھاتا تھا، بلکہ دو، چار باتیں پری سے بھی ہو جاتیں، سارا دن پڑھ پڑھ کر یاد کر کر کے پری کا دماغ بھی پکی ہو جاتا تھا، اس وقت ہوا کے تازے جھونکے کی طرح باتیں اسے ذرا ریلیکس کر دیتی تھیں، ابتدا میں اس نے زحمت کرنے کی کوشش کی کہ علی کو کھانا گرم کر کے دے دے، مگر وہ بے چارا بوکھلا سا گیا۔

''نہیں، نہیں تم رہنے دو، میں خود لے لوں گا۔'' اس نے آگے بڑھ کر جلدی سے سالن کی ڈش پری کے ہاتھ سے لے لی۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ واپس اپنی جگہ پہ بیٹھ گئی۔

''تو ایگزام کی تیاری ہو رہی ہے آج کل؟'' بڑی رغبت سے کھانا کھاتے کھاتے علی نے کہا۔

''ہاں! اب جلدی سے شروع ہو جائیں، تاکہ ختم ہونے کا آسرا ہو، ٹینشن ختم ہو جائے گی میری۔'' پریشان پریشان پری کے چہرے پر ٹینشن تو واقعی تھی، مگر صرف امتحانوں کی۔

''ابھی پیپرز شروع بھی نہیں ہوئے اور ابھی سے یہ حال تیاری کا بھی اور پریشانی کا بھی۔'' علی واقعی اتنا حیران ہوا کہ نرگسی کوفتے کا نوالہ منہ میں لے جانا بھی بھول گیا۔

''امتحان کی تیاری تو امتحان سے پہلے ہی کی جاتی ہے نا۔'' علی کی حیرانی پر پری نے جیسے سمجھایا تھا۔ سمجھاتے ہوئے کسی استاد کی طرح سمجھ دار اور تجربہ کار لگنے کے بجائے وہ اور بھی بھولی بھالی لگ رہی تھی۔ علی نے شاید پہلی بار اس کی سادگی اور بھولپن کا نظارا کیا تھا۔ چند لمحے نظارے میں گم ہونے کے بعد وہ یکا یک ہوش میں آیا تھا، جلدی جلدی آنکھیں جھپک کر سر جھٹکا اور پھر سے نرگسی کوفتوں سے نبرد آزما ہو گیا۔

ماہا اچانک ہی اندر آئی تھی۔

''ہیلو...... کیا میٹنگ چل رہی ہے؟'' فریج سے پانی کی بوتل نکال کر وہ گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

''اس موسم میں اتنا ٹھنڈا پانی کیسے پی لیتی ہو تم؟'' پری نے اسے غٹا غٹ گلاس خالی کرتے دیکھا تو جھرجھری سی آ گئی۔

''کون سے موسم میں؟'' اس کا لہجہ سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔

''سردی ہو رہی ہے نا۔'' پری نے جیسے اسے بتایا اور اس ''اطلاع'' پر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

''وہاں اس موسم میں عوام کے کپڑے آدھے ہو جاتے ہیں۔ (ویسے صنف نازک کا لباس ہر موسم میں آدھا پونا ہی ہوتا ہے۔) تم وہاں اسنو فالنگ کے بعد کا ایک سیزن گزار لو نا تو شاید فوت ہی ہو جاؤ۔''

پری کو اندازا ہو رہا تھا کہ مذاق اڑانا یا کم از کم مذاق اڑانے والے لہجے میں بات کرنا اس کا شوق کم، عادت زیادہ تھی۔

''کمبائنڈ اسٹڈی ہو رہی ہے؟'' وہ پانی پینے آئی تھی، مگر بڑی فرصت سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس بار وہ مذاق اڑا نہیں رہی تھی، کر رہی تھی۔

''میں اپنے ایگزام کی تیاری کر رہی ہوں، علی کھانا کھا رہا ہے۔'' پری نے بڑے رسان سے اس ''اندھی'' کو آگاہ کیا تھا۔

''دونوں کے کام ایک ساتھ ہو رہے ہیں، انٹرسٹنگ۔'' آگ لگانے والے انداز میں اس نے ہونٹ سکوڑے۔

''ایک عام سی بات آپ کے لیے اتنی انٹرسٹنگ؟'' علی کا لہجہ نہ طنزیہ تھا، نہ چبھتا ہوا، سادہ سا تھا، اس کے مزاج اور شخصیت کی طرح۔

''کبھی کبھی عام سی باتیں اور عام سے لوگ بھی انٹرسٹنگ لگنے لگتے ہیں۔'' ماہا نے کندھے اچکائے، خالص امریکی انداز میں، یہ اور بات کہ اس کے دماغ میں اس وقت بالکل پاکستانی انداز کی کھچڑی پک رہی تھی۔

''بائی دا وے، تمہارے آگے کے کیا پلان ہیں، آئی مین، فیوچر پلاننگ۔''

وہ بڑے آرام سے علی سے مخاطب تھی، جیسے موسم کا حال پوچھ رہی ہو۔ پتا نہیں پچھلے ہفتہ دس دن کے دوران اجنبیت سے آپ اور آپ سے تم تک کے مراحل کب طے ہوئے۔ پری تو ان سے لاپروا اور بے نیاز سی نظر آ رہی تھی، مگر علی ضرور پہلے حیران، پھر پریشان ہو گیا تھا۔

''میری فیوچر پلاننگ؟'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا، پھر سیدھا ہو بیٹھا۔ ''جو کر رہا ہوں شاید وہی کرتا رہوں۔'' علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ ہی؟ اور یہیں؟''

ماہا کا انداز معنی خیز تھا اور دونوں الفاظ بھی، علی نے ٹھٹک کر پہلے اسے پھر پری کو دیکھا جو آنکھیں بند کیے ہوئے تھی اور ہونٹ ہل رہے تھے، یعنی رٹا جاری تھا۔

''مستقبل کا کسے پتا، کیسا ہو؟ جانے کون کہاں ہو؟'' علی نے فلسفے کی آڑ لے کر جواب گول کر دیا۔

''ایک تو یہاں یہ بڑا مسئلہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت سب کچھ قسمت اور تقدیر پہ ڈال دیتی ہے اور خود ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جاتی ہے۔'' ماہا نے یوں جھنجلا کر ''یہاں'' کا لفظ استعمال کیا جیسے جدی پشتی امریکن ہو، حالانکہ اسے وہاں گئے فقط آٹھ برس ہی تو ہوئے تھے۔ تب ہی تو منہ ٹیڑھا کر کے ہی سہی، مگر سب سے، بآسانی اردو میں بات کر لیتی تھی۔

''انسانی منصوبے اگر خدا کے ارادوں اور مرضی سے میل نہ کھائیں تو ناکامی ہی ان کا مقدر بنتی ہے۔'' علی کو اس وقت خوب خوب فلسفہ سوجھ رہا تھا۔

''اچھی امید بھی تو کوئی شے ہے۔'' ماہا تو بحث پر اتر آئی تھی۔

''وہ تو ہر وقت ہی رب سے رہتی ہے۔''

''ویری گڈ! کبھی ملک سے باہر سیٹل ہونے کے بارے میں سوچا؟'' ماہا کے سوالات جاری تھے۔

''نہیں...... کبھی سوچا تو نہیں۔''

''ریئلی؟'' ماہا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''اس ملک میں ننانوے فیصد پیپل ملک سے باہر سیٹل ہونے کے خواب دیکھتے ہیں۔'' اس نے

جتایا، تو علی مسکرایا۔

''ہوسکتا ہے میرا اشارا ایک فیصد میں ہوتا ہو۔''

''اگر چانس ملا تو؟'' جرح ابھی باقی تھی۔

''تو...... دیکھیں گے۔'' علی کندھے اچکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا کھانا جو ختم ہوگیا تھا۔ اب ماہا بی بی کی جرح یا انٹرویو ادھورا رہ جائے تو رہ جائے، اس کی بلا سے۔

ماہا کی بڑی بڑی سرمئی آنکھوں میں ناگواری کی لہریں ڈولنے لگیں۔

پری بدستور اسی پوز میں تھی، یعنی نوٹس ہاتھ میں، آنکھیں بند اور لب تسلسل ہل رہے تھے۔

☆☆☆

بڑے تایا اور تائی امی نے مہمانوں کو یعنی پردیسی مہمانوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ وہ تو طعام کے ساتھ ساتھ قیام کی پیش کش کے چکر میں تھیں، مگر پھر اپنے گھر کی وسعت اور پہلے سے موجود آبادی کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔ ان کے گھر میں اوپر نیچے ملا جلا کر کمرے تو آٹھ تھے، مگر دیورانی اور اپنے کنبے کے علاوہ ساس، سسر، سمیت سولہ افراد پہلے ہی گھر میں پورے نہیں آرہے تھے، تو مہمانوں وہ بھی نخریلے مہمانوں کے لیے الگ سے، دو تین کمرے کہاں سے لاتیں، سو انہیں کھلانے پر ہی اکتفا کیا۔ ویسے بھی صرف مرد حضرات پر ہی موقوف نہیں، تمام پیٹو افراد کے دل کا راستہ معدے سے ہی گزر کر جاتا ہے۔

دعوت ہوئی اور بہت خوب ہوئی بلکہ دوبار ہوئی۔ ایک دن تایا، تائی نے کی، اگلے دن ان کی دیورانی نے، یعنی چھوٹے تایا نے دعوت کے بعد انس کا پیٹ ایسا خراب ہوا کہ وہ واش روم کے چکر لگا لگا کر نڈھال ہوگیا اور ہر تھوڑی دیر بعد دہائی دیتا۔

''یہاں کھانوں میں اتنی مرچیں کیوں ڈالتے ہیں لوگ؟''

''کیوں کہ یہاں کے لوگ خود چٹ پٹے ہیں۔ اس لیے اپنے کھانوں کو بھی ایسا ہی چٹ پٹا بناتے ہیں۔'' عاشر نے لقمہ دیا۔

''سوائے سوئٹ ڈش اور کولڈ ڈرنک کے، ہر ڈش مرچوں سے بنائی تھی۔'' انس لاؤنج میں پڑے کاؤچ پہ ڈھے سا گیا۔

''بڑی بھابھی کے گھر میں تو سدا سے ہی تیز مرچیں کھانے کا دستور ہے۔'' امی نے تبصرہ کیا۔

''اور مرچیں چبانے کا بھی۔'' پھوپھی نے امی کے تبصرہ میں کلی پھندنے ٹانکے، امی کے علاوہ باقی بھابھیوں سے ان کی کم ہی بنی تھی۔

امی بے اختیار مسکرادیں۔ ان کا محاذ مضبوط تھا اور بچوں کا مستقبل محفوظ۔

دونوں بہنیں سر جوڑے بچوں کے رشتے جوڑ رہی تھیں، مگر صرف باتوں کی حد تک، پردیسی پھپھو اپنے بچوں کے لیے جب رشتے داروں کی ہر لڑکی اور ہر لڑکے کو منتخب کر چکیں تو خود ہی آخر میں بڑی بے چارگی سے کہنے لگیں۔

''بچے ہماری سنتے کہاں ہیں۔ اپنی مرضی چلائیں گے۔ خدا جانے کوئی رشتہ سمجھ میں آیا بھی یا ایسے ہی واپس جائیں گے جیسے آئے تھے۔''

''پریشان کیوں ہورہی ہو، ابھی تو کئی دن ہیں واپسی میں، ہوسکتا ہے کوئی بات بن جائے۔'' دیسی پھپھو سے بہن کا اداس اور لٹکا ہوا منہ دیکھا نہ گیا، تسلی دینے لگیں۔

''اللہ کرے کہ بات بن جائے، مجھے تو بس یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کسی کالے گورے کے چکر میں نہ پھنس جائیں بچے، وہاں ہماری طرف ایک پاکستانی فیملی ہے، ان کی بیٹی نے ایک نیگرو سے بیاہ رچا لیا، کلاس فیلو تھا اللہ مارا، جی بھر کے بدشکل، خدا جانے لڑکی کو اس میں کیا نظر آیا۔ اماں، ابا نے اپنی جھینپ مٹانے کو مشہور کردیا کہ مسلمان کر کے شادی کی ہے، ثواب کمایا ہے بیٹی نے۔'' پردیسی پھپھو جب سے آئی تھیں ایسے کئی قصے ''اپنی طرف'' کے سنا چکی تھیں، ہر قصے کے آخر میں دعائیہ فقرہ ضرور جوڑتیں۔ ''اللہ میرے بچوں کو ان آفتوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھے۔''

سب سننے والے بڑے زوروشور سے آمین کہتے۔

☆☆☆

علیزہ کے سسرال میں بدیسی مہمانوں کی دعوت تھی، وجہ دعوت تو وہی تھے، مگر مدعوئین کی فہرست میں ان کے علاوہ گھر کے سارے ہی افراد شامل تھے۔

علیزہ کے ساس، سسر نے بہت اچھی آؤ بھگت کی تھی، کھانے بہت مزے دار تھے اور مزے کی بات یہ کہ کھانے والوں کے ذوق اور ذائقے کے مطابق تھے، نہ بہت چٹ پٹے کہ نوالہ منہ میں رکھتے ہی زبان دہائیاں دینے لگے، نہ اتنے پھیکے کہ کھانے والے ہی بدمزا ہو جائیں۔

باتوں کی محفل کھانے کے دوران بھی جمی رہی اور کھانے کے بعد بھی جب چائے کافی کا دور چلا تو ماحول اور باتوں میں اور بھی نرمی اور گرمی رچ بس گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی اپنے مخصوص انداز میں محو گفتگو تھے۔ باتوں ہی باتوں میں گفتگو کا رخ رشتوں اور شادیوں کی طرف مڑ گیا۔

''بھئی پری کو ڈاکٹر پسند ہیں یا انجینئر یا کچھ اور؟'' اچانک ہی توپوں کا رخ پریسا کی طرف ہو گیا۔

''مجھے......'' وہ سوچنے لگی۔ ''پہلے ڈاکٹر اچھے لگتے تھے، مگر جب سے ہڑتالیں کرنے لگے ہیں، اب اچھے نہیں لگتے۔'' پریسا نے اپنی ازلی سادگی سے جواب دیا۔

''کیوں بھئی، سب ڈاکٹرز تو ہڑتالی نہیں ہوتے، کچھ ہی ہوتے ہیں، وہ بھی اس لیے کہ جب اتنے سالوں کی اتنی کڑی محنت کے بعد بھی اپنا حق نہ ملے تو کوئی نہ کوئی قدم تو اٹھانا پڑتا ہے نا، سوئی سرکار کو جگانے کے لیے اپنا حق لینے کے لیے۔''

ڈاکٹر صاحب اپنی برادری کے دفاع کے لیے فوراً میدان میں آ گئے۔

''میں زیادہ کتابی باتیں تو نہیں جانتی، مگر یہ بات جانتی ہوں کہ میڈیکل اور ٹیچنگ دو خاص ایسے شعبے ہیں جن میں ان لوگوں کو آنا چاہیے جو اپنا حق لینے سے زیادہ فرائض کی ادائیگی میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ قناعت پسند، سیر چشم اور فراخ دل افراد ہی ان شعبوں کا حق ادا کر سکتے ہیں کہ لوگوں کی زندگیوں اور نسلوں کی بہتری کا دارومدار ان پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹرز مریضوں کو اسپتال میں تڑپتا چھوڑ کر اسپتال کے باہر ہڑتالی کیمپ لگا کر بیٹھے ہوں اور اساتذہ درس گاہوں میں بیٹھے طلبہ کو چھوڑ کر درس گاہوں سے باہر اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے نعرے لگا رہے ہوں، یہ بےحسی کی انتہا ہے، اخلاقی گراوٹ ہے۔ یہ شعبے قربانی مانگتے ہیں، جو قربانی نہیں دے سکتا وہ اس طرف نہ آئے۔''

''تم نے تو پوری تقریر کر ڈالی۔'' ڈاکٹر صاحب مسکرائے، چہرا بتا رہا تھا کہ متاثر ہوئے یہ سب سن کر۔

☆☆☆

جینز پہ ہاف آستین کی ٹی شرٹ پہنے، کورین ہیئر اسٹائل، اسمارٹ فون ہاتھ میں صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے وہ فون پر باتیں کر رہا تھا، بلکہ باتیں کیا کر رہا تھا، لمبی لمبی چھوڑ رہا تھا۔

''ہاں...... ہاں دیکھ لیا، شانزے لیزے بھی، ایفل ٹاور بھی، ریورسین کے کنارے آئس کریم بھی کھالی اور وہ......'' بات کرتے کرتے ہنسا۔

''واقعی پریاں ہی، ڈونٹ بی جیلیسی، مجھے چڑیلیں پسند ہیں، تم جیسی۔''

فون آف کرکے بھی وہ مسکرا ہی رہا تھا۔

''کیا کر رہی ہو فیری!'' وہ سامنے بیٹھی مٹر چھیلتی پری سے مخاطب ہوا۔

''یہ......'' اس نے مٹر کی پھلی بلند کرکے لہرائی۔

''آپ تو اس وقت شانزے لیزے کے ایک کیفے میں بیٹھے ہیں؟''

وہ زور سے ہنسا۔

''یہ جو ہماری فرینڈ ہے نا، یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہمیں بتایا کہ سوئٹزر لینڈ جا رہی ہے گھومنے، وہاں سے تصویریں بھیج بھیج کر امپریس کرتی رہی، بلکہ جیلیس کرتی رہی، بعد میں پتا چلا کہ اپنی دادی کے

گھر تو یہ ٹیک سنگھ آئی ہوئی تھی۔"

"میں تو سمجھتی تھی کہ وہاں کے لوگ بہت صاف گو ہوتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے۔" پری نے بڑی سادگی سے اپنی حیرانی بلکہ معصومیت کا اظہار کیا اور شیراز لوٹ پوٹ گیا۔

"اگر تم واقعی اتنی معصوم نہیں ہو جتنی کہ دکھائی دیتی ہو، تو ضرور بہت بڑی ایکٹریس ہو، آسکر نہیں تو گریمی تو ضرور ہی ملنا چاہیے تمہیں۔"

"میں ایکٹنگ نہیں کرتی۔"

"ہوں!" شیراز نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا تم ٹرمپ کو نہیں جانتیں۔ وہاں چھوٹے موٹے اور عوامی سطح پر جھوٹ کی روایت ہے، وہ لوگ بین الاقوامی اور بڑے بڑے جھوٹ بولتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً فلاں ملک ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے، فلاں جگہ ایٹمی اور کیمیکل ویپن (ہتھیار) موجود ہیں۔ ہم دنیا میں امن قائم کریں گے۔ یہ اور بات کہ سب کو ہتھیار بیچ کر، ہم جھگڑے نپٹائیں گے۔ یہ اور بات کہ شعلوں کو ہوا دے کر۔"

"آپ کو دلچسپی ہے پالیٹکس میں، بہت معلومات ہیں آپ کو۔" پری متاثر ہو رہی تھی سن کر۔

"ہرگز نہیں، لعنت بھیجتا ہوں میں دنیا بھر کے سیاست دانوں پہ بھی اور سیاست پہ بھی۔ یہ تو میرا ایک دوست ہے، اسے شوق ہے اس طرح کی باتیں کرنے اور ساری معلومات رکھنے کا۔"

"اچھا!" پری نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"رہی بات جھوٹ کی تو دنیا میں ہر جگہ کم یا زیادہ جھوٹ ضرور بولا جاتا ہے۔" شیراز اسی طرح ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا اسے بتا رہا تھا یا جتا رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟" پری مٹر چھیلتے چھیلتے بڑبڑائی۔ "تا کہ تم جیسے لوگ یہ ہی سوچ سوچ کر پریشان ہوں۔"

"آپ بھی جھوٹ بولتے ہیں؟"

"ہاں! اکثر بولنا پڑتا ہے، کبھی ضرورت کے تحت، کبھی مصلحت کے تحت، کبھی کسی فائدے کے لیے، کبھی کسی نقصان سے بچنے کے لیے۔" شیراز نے کندھے اچکائے۔

"مگر جھوٹ بولنے سے انسان کو فائدہ نہیں ہوتا، نہ ہی وہ نقصان سے بچ سکتا ہے۔" پری اس کی منطق سے متفق نہیں تھی، حالانکہ یہ اصول تو ساری دنیا میں چل رہا ہے۔

"جھوٹ کے اوپر ہی ہمارا اور ہماری دنیا کا نظام چل رہا ہے بی بی۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو مجھے ڈر ہے کہ کسی دن دھڑام سے سب کچھ گر نہ پڑے۔" پری مٹر چھیل چکی تھی، اب چھلکے شاپر میں ڈال کر کھڑی ہوگئی۔

"کچھ گرے نہ گرے، میں ضرور گر رہا ہوں۔" شیراز بڑبڑایا۔

☆☆☆

رات میں وہ ماں کے ساتھ بحث میں لگا ہوا تھا۔

"مجھے وہی اچھی لگی ہے، اسی سے شادی کروں گا۔"

"مگر وہ تو چھوٹی ہے، اپنی بہن سے" اف...... امی کا اعتراض۔

"بہن کہاں سے آگئی ہے بیچ میں۔" وہ جھنجلایا۔

"وہی تو ہے بیچ میں، وہ بڑی ہے، پہلے اس کی ہوگی، پھر چھوٹی کی ہوگی۔" امی نے انوکھے لاڈلے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ بات تو کریں، اتنے دقیانوسی لگتے نہیں ہیں۔"

"بات تو میں کرلوں گی، مگر...... یہ چھوٹی والی کچھ سیدھی نہیں ہے؟ کیسے گزارا کرو گے؟" امی نے سوال اٹھایا۔

"گزارا وہ کرلے گی میرے ساتھ، سب مینج ہو جائے گا، آپ بات تو کریں۔"

"اچھا...... بات کرتی ہوں پھر بھابھی سے،

پری کے لیے۔" امی نیم رضامند تو ہوگئی تھیں۔

"ہوں!" شیراز آنے والے وقت کا سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

موقع اور موڈ غنیمت جان کر اس نے آخر ایک دن بات کرنے کی ہمت کر ہی ڈالی۔ ایک، دو رسمی باتوں کے بعد وہ انٹرویو کے سوالات ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگا۔

"تمہاری فیورٹ ڈش کیا ہے؟"

"جو بغیر محنت اور رقم خرچ کیے مل جائے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔

"بائی داوے تمہیں کیا، کیا بنانا آتا ہے؟"

"مجھے......؟" وہ حیران ہو کر اچھل پڑا، وہ تو پہلے منگیتر، پھر شوہر کے درجے پہ فائز ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے، یہ تو شیف کا عہدہ دینے پہ غور کر رہی ہے۔

"ہاں...... ہاں تمہیں؟" شان بے نیازی عروج پر تھی۔

"مجھے تو کبھی کچھ بنانا ہی نہیں پڑا۔ سب کچھ پکا پکایا مل جاتا ہے۔" بوکھلا کر جواب دیا۔

"اب بھی وقت ہے، سیکھ لو۔" مشورہ ملا۔

"کیا؟" (حالانکہ اسے پوچھنا چاہیے تھا، کیا کیا؟)

"یہی کوئی آٹھ، دس ٹائپ کے پیزا، برگر، چکن کی دس بیس ڈشز، دو چار طرح کے چاول اور سوئٹ؟۔۔ چلو چھوڑو میں آئسکریم اور بیکری آئٹمز پر گزارا کر لوں گی۔" اس پر احسان عظیم کیا گیا۔

"کر لو گے یہ سب؟"

"پتا نہیں۔" بے چارے کی جان مصیبت میں آ گئی، انٹرویو کے پہلے سوال کے جواب میں یہ حال ہوا تھا تو آگے کے سوالات کے جوابات میں کیا ہوتا تھا، عاشر بے چارہ سر پر ہاتھ رکھے خیالات میں غرق تھا، مایا بائے کر کے چل دی۔

"یہ مایا بھی نا۔"

"ہاں یہ مایا ہی تو۔۔۔"

☆☆☆

دیسی پھوپھی کی جان مصیبت میں آ گئی تھی، پردیسی بھانجی نے اپنی مرضی اور پسند بتا دی تھی اب فریق ثانی سے بات کرنا بلکہ، اسے راضی کرنے کا کام پھوپھی کے ذمے لگا دیا گیا تھا، وہ پہلے تو سٹ پٹا گئیں۔

"اے لو، میں۔۔۔ کیسے بات کروں گی بھلا اس لڑکے سے آدھی رات کو تو وہ گھر آتا ہے جب میں سو جاتی ہوں صبح میرے اٹھنے سے پہلے گھر سے نکل جاتا ہے، بات کب کروں؟" انہوں نے معصوم سا بہانہ بنایا۔

"چھٹی کے دن کر لینا۔"

"ہفتے کے ساتوں دن تو کام پر جاتا ہے، چھٹی کرتا کب ہے چھٹی کے دن بات کر لوں۔"

"اچھا تو رات میں ذرا دیر تک جاگ لینا۔"

"اچھا!" انہوں نے ایک گہری سانس لی، اب تو فرار کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ "اس میں کیا نظر آ گیا مایا کو، اس سے تو عاشر میں چٹک مٹک ہے، ہوشیار بھی ہے، بلکہ تیار بھی، مایا سے شادی کے لیے۔" پھوپھو نے دو چار جملوں میں ہی پوری کہانی لپیٹ دی۔

"بس، جو بچوں کی مرضی، اب ہماری کہاں چلتی ہے، پھر وہی مثل ہے کہ دل آئے گدھی پہ تو پری کیا چیز ہے" پردیسی پھوپھو نے یونہی بات بنا دی۔

اگر پری کی طرح ہوتیں تو بے دھڑک ہو کر اپنی بہن سے بیان کر دیتیں کہ بیٹی جب یہاں سے گئی تو میٹرک کیا تھا وہاں جا کر نہ کچھ پڑھا نہ کچھ سیکھا، چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے ٹائم پاس اور رشتے تلاش کرنے کا مشغلہ تھا مگر یہاں کی طرح بلکہ یہاں سے زیادہ وہاں رشتوں کے مسائل ہیں، دور کے ڈھول سہانے، قریب بجے تو ڈھب ڈھب بجتے ہیں، مایا کا انتخاب صحیح تھا ایسا محنتی اور شریف لڑکا وہاں تو وہاں، یہاں بھی مشکل سے ہی ملتا۔

مگر وہ چونکہ پری نہیں تھیں اس لیے اپنا منہ بند

کر کے رہ گئیں۔

☆☆☆

سردی آنے کا پہلے تو غلغلہ ہی اٹھتا ہے کراچی والے کوئٹہ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں، وہاں ٹھنڈ ہو گئی ہے۔۔۔وہاں بارش ہو رہی ہے۔۔۔وہاں برف باری ہو رہی ہے۔۔۔پھر یہاں سردی آ نہیں رہی، سردی آ گئی ہے، اور سچ مچ سردی آ گئی تھی، امی نے ابو کا پسندیدہ شینل کا لحاف نکال لیا تھا جس میں دو کلو روئی بھری ہوئی تھی، اسی لحاف کو پیروں پہ ڈالے گرم بستر میں بیٹھے وہ گرم گرم کافی کے مزے لے رہے تھے جب امی نے موقع غنیمت جان کر ضروری ذکر چھیڑ دیا۔

''پری کے لیے کہہ رہی ہیں آپا۔''

''ہاں، مجھ سے بھی بات کی تھی انہوں نے۔'' ابو پہلے ہی باخبر تھے۔

''پھر کیا سوچا آپ نے؟''

''تم نے کیا سوچا؟'' ابو نے گیند بیگم کے کورٹ میں ڈال دی۔

''میں تو یہ سوچ رہی تھی عنیزہ بڑی ہے، پہلے اس کی ہونی چاہیے، پری کا رشتہ پہلے کر دیا تو وہ کیا سوچے گی، زبان سے کچھ نہ بولے دل میں تو احساس کرے گی۔''

''نہ میں کچھ سوچ رہی ہوں نہ کوئی احساس کروں گی۔'' عنیزہ نے لحاف سے منہ نکالا اور بولنے لگی۔

''آپ پری کا رشتہ کرنا چاہتی ہیں، شوق سے کریں اپنی بہن کی خوشی میں خوش ہوں۔''

اپنے ڈائیلاگز بول کر اس نے دوبارہ سے لحاف میں منہ گھسا لیا، باقی باتیں وہ دل میں سوچ رہی تھی وہ کون سالاٹ صاحب ہے کہیں کا، جو اپنی مرضی سے ہنستا ہے اپنی مرضی سے بولتا ہے ایسے سر پھرے بندے میں کوئی پاگل ہی ہو گی جو دلچسپی لے گی اور امریکہ میں ہے تو کیا ہوا ہے تو ٹرک ڈرائیور، ہونہہ، اب میرا ٹیسٹ اتنا بھی خراب نہیں کہ ٹرک ڈرائیور سے شادی کر لوں، بھلے سے وہ ٹرک امریکہ کی سپر ہائی ویز پر چلتا ہو مگر اللہ معاف کرے، ٹرک ڈرائیور کے لفظ سے ہی تصور میں عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے گانے، رنگ برنگا سجا سجایا ٹرک اور بڑی بڑی مونچھوں اور نیند سے بھری آنکھوں والے درشت چہرے ناچنے لگتے ہیں۔

علیزہ نے تو اپنی رائے کا اظہار کر کے منہ دوبارہ غڑاپ سے لحاف میں گھسا لیا تھا۔ امی، ابو خاموش تھے، کچھ سوچ رہے تھے، پھر ابو نے انہیں مخاطب کیا۔

''آپا کو جواب دینے سے پہلے پری سے بھی بات کر لینا'' ابو نے تاکید کی۔

گرم جیکٹ، موٹی جینز سر پر ٹوپا، اونی جرابیں اور جوتے علی کو اس حلیے میں پھوپھی نے آج دیکھا تھا، وجہ یہ تھی کہ وہ آج اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں، علی خود انہیں دیکھ کر چونک گیا تھا۔

''آپ ابھی تک سوئیں نہیں؟'' جیکٹ اتارتے ہوئے وہ پھوپھی سے مخاطب ہوا۔

''تمہارے انتظار میں جاگ رہی تھی۔'' پھوپھی نے بولتے بولتے جمائی لی تو منہ پہ ہاتھ رکھا۔

''خیریت؟'' علی پورا کا پورا ان کی طرف گھوم گیا۔

''ہاں، بس خیریت ہی ہے۔'' پھوپھی بات کرنے سے پہلے تجسس کو ہوا دے رہی تھیں

''ہوں۔۔'' وہ جوتے موزے اتار کر کمبل میں گھس گیا اور سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب تو خیر سے کمانے لگ گئے ہو، شادی وادی کا بھی کچھ سوچا؟''

پھوپھو نے بات کا آغاز کیا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں سوچا۔'' علی نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو کب سوچو گے؟''

''آج سے ہی سوچنا شروع کر دیتا ہوں۔'' علی

نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اب سوچنا وچنا کیا، بس شادی کر ہی ڈالو۔"
پھوپھو نے یوں مشورہ دیا جیسے بازار سے گاجر کا حلوہ لانے کو کہہ رہی ہوں۔

"اتنی ایمرجنسی میں کون ملے گی مجھے؟" وہ بدستور مسکرا دیا تھا۔

"تمہارے لیے کوئی کمی ہے کیا لڑکیوں کی، ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔ تم ہاں تو کرو، میں خود کرواؤں گی تمہاری شادی، ایک اچھی سی لڑکی سے۔"
پھوپھو شروع ہو گئیں۔

"اور وہ اچھی لڑکی کون ہے؟" علی فقط سچ ہی تو بولتا تھا، کوئی گھاس تھوڑی کھاتا تھا کہ موم کا پتلا سمجھ کر جہاں چاہے رخ موڑ دو۔

"ایسا رشتہ اور ایسی لڑکی تو نصیب والوں کو ملتی ہے، گوری چٹی، خوب صورت، گرین کارڈ ہولڈر پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی ہے، دیکھی بھالی ہے۔"
پھوپھو نے بس صوم وصلوٰۃ کا ذکر نہیں کیا باقی سب آموختہ وہی تھا جو اخبار میں شائع "ضرورت رشتہ" کے اشتہار میں ہوتا ہے۔

"آپ سے کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"مایا اچھی لڑکی ہے، سب سے بڑھ کر اس کی بھی مرضی اور خوشی ہے اس رشتے میں۔" پھوپھو نے تھیلے سے بلی نکال ہی دی۔ یہ اور بات کہ بند تھیلے میں بلی کی میاؤں میاؤں علی کو پہلے ہی سنائی دے رہی تھی۔

"مگر میری مرضی اور خوشی اس رشتے میں نہیں۔" علی نے فقط چند لمحے ہی سوچنے کا تکلف کیا تھا اور پھر انکار کر دیا۔

"اے وہ کیوں بھلا؟ کیا کمی ہے میری بھانجی میں۔" پھوپھو کی خالہ والی محبت جاگ اٹھی، گھورتی نظروں سے بھتیجے کو دیکھا۔

"کمی تو خیر کوئی نہیں، زیادتی ہی زیادتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ گوری بہت ہے، موٹی بہت ہے، کھاتی بہت ہے، بولتی بہت ہے اور۔۔۔"

گرین کارڈ ہے اس کے پاس اور باپ کے پاس امریکن نیشنلٹی ہے، امریکی پاسپورٹ پر سفر کرتا ہے، بیوی بچوں کو بھی وہاں کی شہریت مل جائے گی، کب سے کاغذات جمع کرائے ہوئے ہیں، لوگ تو ایسے رشتوں کے لیے چلے کاٹتے ہیں، وظیفے پڑھتے ہیں۔ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں اور تو یہاں بیٹھا نخرے دکھا رہا ہے۔" پھوپھو سے بھانجی کی ہتک برداشت نہ ہوئی، جلال میں آ گئیں۔
علی سر جھکائے ان کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

"عاشر تو تیار بیٹھا ہے، ابھی اسے کہوں تو ابھی سہرا باندھ لے مگر ہماری بہن کو ہی ہمدردی آ رہی تھی کہ بن ماں، باپ کا بچہ ہے۔ کل کو یہ نہ سوچے کہ کسی نے میرا خیال نہیں کیا۔" پھوپھو نے ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ایموشنل بلیک میلنگ کا سہارا لیا۔

"عاشر کی پسند اور مرضی ہے تو اس کی کر دیں۔"
علی نے مشورہ دے کر اپنی جان چھڑانی چاہی۔

"لڑکی کی پسند اور مرضی بھی تو ہو۔" وہ جھنجھلائیں۔ "کوئی گائے بکری تھوڑی ہے جو زبردستی کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیں۔"

"تو میں کوئی بکرا یا بیل ہوں جو مجھے زبردستی باندھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔" علی غصے میں تو نہیں تھا مگر چڑ گیا تھا۔

"کوئی اور پسند ہے کیا؟" علی کے لہجے پر انہوں نے جانچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اونہوں۔" علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کمبل سر تک تانا۔

"پھر کیا مسئلہ ہے؟" پھوپھو نے ابھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا، وہ زچ ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"مایا اچھی لڑکی ہے مگر میرے ٹائپ کی نہیں، میری کزن ہے، عزت کرتا ہوں اس کی، بات کر سکتا ہوں اس سے مگر شادی نہیں کر سکتا، میرے طرف سے پھوپھو سے معذرت کر لیں۔" علی نے ٹھہرے ٹھہرے الفاظ میں سنجیدگی سے انہیں سمجھایا۔

"یوں کہو میاں، اس نے گھاس ڈال دی نہیں، تو تم نخرے دکھا رہے ہو، اچھا بھئی مرضی ہے تمہاری' میں عاشر کی کروا دیتی ہوں، چاہت سے کرے گا بیاہ اور محبت قدر کے ساتھ رکھے گا مایا کو۔" پھوپھو نے بھی اپنا لحاف منہ تک تان لیا۔

"اچھی بات ہے، یہ گھاس عاشر کو ہی کھلا دیں، جو خوش خوش کھانے کو تیار ہے۔" علی نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے کروٹ لے لی۔

☆☆☆

"اف اف ...۔" غصے اور احساس توہین کے مارے چہرہ سرخ ٹماٹر بلکہ تربوز بن گیا، ٹماٹر تو چھوٹا ہوتا ہے۔

"اس ٹٹ پونجیے کی یہ مجال، ڈفر، اسٹوپڈ!"

دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر وہ شدید غصے کا اظہار کرنا چاہ رہی تھی مگر الفاظ تھے کہ اندر ہی اندر آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے، سارے ایک ساتھ باہر نہیں آ رہے تھے، ہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آدھ لفظ لڑھکتا ہوا نوک زبان پہ آ جاتا اور پھر باہر۔

دیسی پھوپھو نے علی سے ہوئی گفتگو حرف بہ حرف مایا کو بتا دی تھی، ویسے تو انہوں نے مختصر سے الفاظ میں اس کا انکار مایا کو بتایا تھا مگر وہ شیر بچی خود ہی ان کے پیچھے پڑ گئی تھی، آ بیل مجھے مار، "بتائیں نا، اس نے کہا کیا ہے؟ کہا کیا ہے آخر؟" مایا کے اصرار پر انہیں بتانا ہی پڑ گیا کہ "اس نے کہا کیا ہے آخر۔"

اور تب سے وہ زخمی شیرنی بنی ان کے سامنے فوں فاں کر رہی تھی۔

"ایک نمبر کا کھامڑ ہے، بے وقوف۔" وہ بولی۔

"ہاں وہ تو ہے۔" دیسی پھوپھو بھانجی کی رائے سے متفق تھیں۔

"خوش نصیبی بار بار دروازے پہ دستک نہیں دیتی، پہلی دستک میں ہی دروازہ فوراً کھول دینا چاہیے۔" بھانجی کے فلسفے پر بھی انہوں نے آمنّا وصدّقنا کہا۔

"آخر وہ ایسا کیسے کرسکتا ہے، کیسے کہہ سکتا ہے۔" مایا نے پھر جوش اور غصے کے عالم میں مٹھیاں بھینچیں، ایسی گوری چمکتی دمکتی رنگت جو اس معاشرے میں خوب صورتی کی علامت بلکہ سب سے پکی ضمانت سمجھی جاتی ہے، اسے خاطر میں نہیں لایا۔ جس دیس میں جانے رہنے اور بسنے کی خواہش، ہزاروں خواہشوں میں سب سے اولین خواہش ہے، وہاں کی باسی کو ایسے نظر انداز کر رہا جیسے وہ ٹنڈو دین محمد یا چک 32 سے آئی ہے۔ یہ انسان ہے یا... یا...۔" کوئی مثال اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، میری طرف سے بھاڑ میں جائے، مجھے کیا، میرے لیے کیا رشتوں کی کمی ہے۔" ایک جھٹکے سے اس نے گردن اٹھا کر سامنے پھوپھو کو دیکھا اور اس جھٹکے سے باہر نکل آئی جو علی کے جواب سے اسے لگا تھا۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں، علی تو اندھا ہے عقل کا بھی' آنکھ کا بھی' آٹھوں گانٹھ پورا، لوگ تو ایسی لڑکی اور ایسے رشتوں کے لیے آنکھیں بچھائے منتظر ہیں۔" پھوپھو کے لہجے میں بھانجی کی محبت ہی نہیں بلکہ ان قیمتی تحائف کا چاؤ بھی تھا جو ان کے لیے سات سمندر پار سے آئے تھے۔

کچھ دیر وہ منتظر نگاہوں سے مایا کو دیکھتی رہیں جو کسی کشمکش میں لگ رہی تھی۔

"شادی تو اسی سے کرنی چاہیے جو عزت دے' محبت دے' قدر کرے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" مایا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"عاشر تو پلکیں بچھائے بیٹھا ہے، تم نے ہی نگاہ نہ کی اس کی طرف۔"

پھوپھو اب خالہ سے سکھی سہیلی بن گئیں۔

"اب بھی کون سا وقت گزرا ہے، سیکنڈ آپشن تو وہی ہے۔" مایا خود پہ جبر کر کے مسکرانے لگی، پھوپھو بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

☆☆☆

گاجر کا حلوہ، کباب، چکن نگٹس' سموسے اور

گلاب جامن۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی والدہ یونہی ملنے آئے تھے، امی نے شام کی چائے پر جھٹ پٹ اہتمام کرلیا تھا، امی رات کے کھانے کے لیے روک رہی تھیں مگر انہوں نے معذرت کرلی تھی۔

"رات میں شادی میں جانا ہے، اور اتنا کچھ یہاں کھالیا ہے، اب تو مجھ سے رات کا کھانا مشکل ہی ہے کہ کھایا جائے گا۔"

ڈاکٹر صاحب بھی اپنی فٹنس کا خیال رکھتے تھے، چیزیں سب کھائیں مگر بس چکھنے کی حد تک، تھوڑی تھوڑی۔ پری کے رشتے کے بارے میں بتایا تو دونوں بہت خوش ہوئے، پری ٹیبل سے برتن اٹھا رہی تھی تو اسے اپنے پاس بٹھا کر گرم جوشی سے مبارک باد دی۔

"اچھی ہے تمہاری پھپھو، خوش مزاج ہیں، ان کا بیٹا بھی اچھا ہے جاب بھی ٹھیک ٹھاک ہے تمہاری پھپھو بتا رہی تھیں کہ بہت جلد ترقی ہونے والی ہے شیراز کی اپنی کمپنی میں۔" پروفیسر صاحبہ کو پھپھو صاحبہ نے جانے کیا کیا بتایا تھا، وہ بے چاری بڑے خلوص کے ساتھ خوش ہو رہی تھیں۔

"کیسی ترقی؟ کیا ٹرک کی جگہ ٹرالر چلانے کو مل جائے گا؟"

"ہیں؟" ڈاکٹر صاحب اور ان کی امی نے بیک وقت حیران ہو کر پری کو دیکھا اور پری کی امی نے متوحش ہو کر، جملہ حاضرین کو دیکھا۔

"وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔" امی نے تھوک نگل کر خشک گلے کو تر کیا۔ "جب سے وہاں "ٹرمپ" آیا ہے' بس سمجھو غیر ملکیوں خصوصاً مسلمانوں پہ برا وقت آ گیا' اچھی بھلی نوکری تھی بچے کی ختم ہو گئی، اب خالی بیٹھنے سے کچھ نہ کچھ کرنا تو اچھا ہے، جو کام ملا وہ کرنے لگا، آخر گھر بھی تو چلانا ہے، ذمہ داری کا احساس ہے۔ محنت میں عیب نہیں سمجھتا ویسے تو پڑھا لکھا ہے، کئی جگہ اپلائی کیا ہوا ہے، ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا، محنت کا صلہ لوگ دیں نہ دیں' اللہ تو دیتا ہی ہے۔"

امی نے بات بتانی شروع کی تو ایسی رواں ہوئیں کہ تقریر ہی کر ڈالی، جملہ حاضرین متاثر ہوئے

سن کر، سوائے پری کے جو جانے کیوں، زیادہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔ دل اداس اداس ہو رہا تھا۔ اپنی کیفیت اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

شاید اتنی دور جانے کے تصور سے وحشت سی ہو رہی تھی حالانکہ ابھی تو صرف منگنی ہونی تھی، رخصتی اگلے سال۔

پڑھائی کا پتا نہیں کیا ہوگا، اپنے خیالات میں گم وہ برتن دھو رہی تھی، جب علی کچن میں آیا۔

"تم آج جلدی آ گئے؟" پری چونکی، عموماً وہ اس وقت گھر میں نہیں ہوتا تھا۔

"ہاں، آج جلدی گھر آ گیا ہوں کبھی جلدی بھی آ جانا چاہیے، ہمیشہ ہی مجھے دیر ہو جاتی ہے۔" پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پہ لیے وہ سالن گرم کر رہا تھا۔

"عجیب عجیب باتیں کر رہا ہے۔" برتن دھوتے دھوتے پری نے سوچا۔

"کافی پیو گے؟" برتن دھو کر فارغ ہوئی تو ازراہ ہمدردی اس سے پوچھ بیٹھی۔

"اگر اپنے لیے بھی بنا رہی ہو تو بنا لو۔" علی کا مطلب تھا کہ خاص طور پر صرف میرے لیے زحمت نہ کرنا، وہ شروع سے ہی ایسا تھا، بہت پر تکلف یا پھر یہ کہ وہ اپنے کاموں کے لیے کسی کو زحمت نہیں دیتا تھا' نہ ہی دینا چاہتا تھا۔

آندھی طوفان کی طرح وہ اندر آیا تھا اور آتے ہی شروع ہو گیا۔

"کب سے ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں، یہاں چھپ کر بیٹھی ہو۔"

کافی پھینٹتی پری چونک پڑی۔

"ہیلو!" شیراز کی نظریں بالآخر علی پر بھی پڑ گئیں۔

علی پانی پی رہا تھا، اخلاقاً سر ہلا دیا۔

"تم اپنا سیل فون بھی اپنے ساتھ نہیں رکھتی ہو، میں ٹرائی کر رہا تھا۔" وہ اب پھر پری سے مخاطب ہوا۔

"کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟" ایک اچٹتی نظر اس پر ڈال کر وہ مگوں میں کافی ڈالنے لگی۔

"میں نے امی سے کہہ دیا ہے، رنگ تمہاری پسند کی ہوگی کل تیار رہنا۔"

علی کے آگے کافی کا مگ رکھتی پری نے ہونٹ بھینچ لیے، علی نے ایک نظر پری کو پھر شیراز کو دیکھا اور ایکسکیوزمی کہہ کر نکلتا چلا گیا ان دونوں کے درمیان سے۔

"تم چھپتی کیوں پھر رہی ہو مجھ سے' کیا شرما رہی ہو؟" بڑی بے تکلفی سے سوال ہوا تھا اور ساتھ میں ایک کپ کافی کی فرمائش بھی، بڑی فرصت سے وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تھا۔

"میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی، نہ چھپنے کی، نہ شرمانے کی۔" اپنی کافی کا مگ اس کے آگے رکھتے ہوئے پری نے سنجیدگی سے کہا اور کچن سے باہر نکل گئی۔

شیراز کچھ دیر کافی کا مگ گھورتا رہا پھر یکا یک مسکرا دیا۔

☆☆☆

امی حسب معمول دن بھر کی روداد رات میں ابو کے گوش گزار رہی تھیں۔

"یہ لڑکی تو بالکل ہی عقل سے پیدل ہے۔" کے عنوان سے انہوں نے شروعات کی اور فرفر سارا سبق سنا دیا۔

"کیا ضرورت تھی بھلا بتانے کی کہ شیراز ٹرک ڈرائیور ہے۔" اختتامی جملے پر انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو، کیسے منگیتر اور سسرال والوں کی شان میں قصیدے پڑھتی ہیں، یہ تو بس اللہ میاں کی گائے ہے۔ کیسے گزارا کرے گی وہاں۔" امی کو فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔

"آپ کن سوچوں میں گم ہیں؟" ابو کی غیر متوقع خاموشی پہ وہ کھٹک گئیں۔

"میں ۔۔۔!" ابو نے ایک نظر بیگم کو دیکھا "میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک داماد ہمارا ماشاءاللہ ڈاکٹر دوسرا" ابو گہری سوچ میں بولتے بولتے رک گئے۔

"ڈرائیور ہے تو کیا ہوا، ہے بھی تو امریکہ میں' اس کا نام ہی بڑا ہے۔ یہاں کا ڈاکٹر اور وہاں کا ڈرائیور، برابر ہی سمجھو جس کے آگے لفظ امریکہ لگ جائے اس کی ویلیو تو خود بخود بڑھ جاتی ہے۔" امی کی باتوں میں تھوڑا تھوڑا سب کچھ تھا، حقیقت بھی، مرعوبیت بھی کچھ سچائی اور کچھ مبالغہ آرائی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" ابو نے نہ چاہتے ہوئے بھی امی سے اتفاق کیا اور امریکہ کے معاملے میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے۔

☆☆☆

بھاپ اڑاتی کافی کا مگ لے کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا، پھپھو جاگ رہی تھیں "ارے، آج جلدی آ گئے تم یا مجھے سونے میں دیر ہو گئی؟" پھپھو بھی اسے اس وقت بلکہ بے وقت گھر میں دیکھ کر چونک پڑیں۔

"میں جلدی آ گیا ہوں، کام ختم ہو گیا تھا تو دکان بند کر دی، پئیں گی؟" علی نے مگ ان کی طرف بڑھایا۔

"نہیں بھئی، میرے حلق میں ویسے ہی خشکی ہو رہی ہے ابھی جوشاندہ پیا ہے۔"

"اچھا!" علی نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

"لو بتاؤ، یہ سال بھی ختم ہونے کو ہے، کل کی سی بات لگتی ہے جب شروع ہوا تھا، کتنی جلدی وقت گزر جاتا ہے' پتا ہی نہیں چلتا۔"

"ہاں، وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔" علی بڑبڑایا۔

"قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے یہ' وقت بہت تیزی سے گزرے گا۔"

پھپھو اپنی دھن میں بول رہی تھیں۔

"قیامت ۔۔۔ ہاں قیامت بھی شاید' قریب ہی ہے۔" علی نے خالی مگ تپائی پہ رکھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے بیٹا؟" پھپھو نے علی کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

"جی!"

''تھکے تھکے لگ رہے ہو، جلدی آجایا کرو، محنت اتنی ہی کرو جو صحت پر بار نہ بنے۔'' پھپھو نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے لگے ہاتھوں نصیحت بھی کرڈالی۔

''مایا کو تو خود ہی انکار کیا تھا اب کیوں پریشان ہو رہا ہے؟'' علی کا چہرہ دیکھتے ہوئے انہیں کچھ اور بھی احساس ہوا اس چہرے پر تھکن کے علاوہ کچھ اور بھی رقم تھا، وہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں، افسردگی اداسی پشیمانی، کیا تھا وہاں؟ مگر ان کی ریڈنگ ادھوری رہ گئی تھی علی اب لیٹ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کمبل منہ پر تان لیا۔

''اے لو، اس نے تو منہ ہی چھپا لیا۔'' پھپھو بدمزہ ہو کر خود بھی اپنا لحاف ٹھیک سے اوڑھنے لگیں۔

''توبہ توبہ اس ٹھنڈ نے تو پیچھا ہی پکڑ لیا، جانے کب جائے گی بوڑھی کمزور ہڈیاں کہاں تک مقابلہ کریں گی۔'' آنکھیں بند کرتے ہوئے پھپھو بڑبڑائیں۔

بے چاری سردی، کراچی کے سارے جوان اس کے آنے کی چاہت میں مرے جاتے ہیں اور سارے بوڑھے اس کی آمد کے دو دن بعد ہی اسے بھگانے چکر میں رہتے ہیں حالانکہ بے چاری خود احتیاطاً چار دن کے لیے ہی تو آتی ہے۔

''خوش رہو اہلیان کراچی، جانے والے ہیں ہم۔'' ان کی بڑبڑاہٹ سن کر سردی مسکرائی شریف تھی بے چاری اس لیے نرم الفاظ بول گئی ورنہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ

گرمی ولوڈ شیڈنگ کو بھگتتے رہو اہلیان کراچی، ہم تو چلے۔

☆☆☆

اف۔۔۔ف سپنے یوں بھی سچ ہو سکتے ہیں، خواب ایسے بھی پورے ہوتے ہیں؟'' وہ خوشی کے مارے بے حال ہو رہا تھا، خوش شکل اور اسمارٹ تو پہلے ہی تھا اندرونی خوشی ۔۔۔ چہرے پر اور بھی روشنی بن کر چھلک اٹھی تھی۔

پہلی فرصت میں ہی اس دشمن جاں کو جالیا جو چھت پہ بیٹھی دھوپ کھا رہی تھی۔

''یوں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟''

''یونہی!'' دشمن جان نے کندھے اچکائے۔

وہ اس مختصر جواب اور ادا پر بھی نثار ہو گیا۔

''خوش ہو؟'' بڑا خوش ہو کر یہ سوال کیا تھا، اپنے دانت تو خوشی کے مارے ایسے باہر نکلے تھے کہ جیسے جیل سے چھوٹے قیدی اندر جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''ناخوش ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں، ظاہر ہے خوش ہی ہوں۔''

''میں بھی بہت خوش ہوں۔''

''لگ رہے ہو۔'' گردن ہلا کر اس ''خوش'' کو غور سے دیکھا گیا۔ ''بائی دا وے اتنی بے تحاشا خوشی کی وجہ؟'' وہ بھی بلاوجہ سوال کر بیٹھی۔

''وجہ؟'' خوش نے آنکھیں پھاڑیں؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ خواب پورے ہو جائیں، سپنے سچ ہو جائیں، تو خوشی تو ہوتی ہے نا؟''

''ہاں، خوشی تو ہوتی ہے اگر خواب پورے ہو جائیں سپنے سچ ہو جائیں تو۔'' ایک گہری سانس لے کر اس سے اتفاق کیا گیا۔

''تم مجھے ۔۔۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔ میں تمہیں اچھا تو لگتا ہوں۔''

''اچھے ہو، تب ہی تو تمہارے لیے ''یس'' کہا۔'' گول مول جواب ملا۔

''صرف زبان سے کہا یا دل سے؟'' وہ بھی بال کی کھال نکال رہا تھا یا پھر ڈائیلاگ بولنے اور سننے کا شوق آرہا تھا، آخر نیا نیا معاملہ تھا۔

''زبان پہ وہی بات تو آتی ہے جو دل میں ہوتی ہے۔'' دشمن جان کے جواب نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے میں تمہارے دل میں ہوں؟'' سوچ سمجھ کر ایک نکتہ نکالا گیا۔

''اپنی مرضی کا مطلب نکال سکتے ہو، کیا حرج

ہے" حادثاً کاندھے اچکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
"بائی داوے، تم نے کوکنگ کی ٹریننگ لینی شروع کردی؟" مسکراہٹ دبا کر مایا نے سوال کیا۔
"مذاق کر رہی ہو؟" عاشر نے بے یقینی سے اسے دیکھا جو مسکراتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔
"آئی ایم سیریس"۔ آخری سیڑھی پہ کھڑے ہو کر اس نے پیچھے آتے عاشر کو پلٹ کر جواب دیا، اور آگے بڑھ گئی۔
وہ بے چارہ حق دق وہیں کھڑا تھا۔
اف یہ عشق کے امتحان؟؟؟

☆☆☆

منگنی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں پھر بڑوں کی باہم مشاورت سے اس تقریب کو نکاح کی تقریب میں بدل دیا گیا تھا کہ نکاح کے بعد کاغذات ایمبیسی میں جمع کرا دیے جاتے تو رخصتی کا وقت آنے تک ویزا مل ہی جاتا، منگنی سے نکاح ہوا تو شاپنگ بھی بڑھ گئی انگوٹھی کی جگہ سیٹ، منگنی کے جوڑے کی جگہ نکاح کے جوڑے اور اسی طرح کی متعلقہ چیزیں، مہمان بھی بڑھ گئے پہلے قریبی رشتے داروں میں سے بڑوں بڑوں کو بلایا تھا اب پوری پوری فیملی مدعو کی جارہی تھی۔ ان سب کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی آگے بڑھ گئی تھی، اب تاریخ ہال والوں کو دینی تھی جس کی بکنگ کے لیے عاشر مارا مارا پھر رہا تھا، خدا خدا کر کے مراد بر آئی اور نئے سال کے دوسرے ہفتے میں ایک ہال مل ہی گیا۔
وہ سب لوگ جو دوسروں کی خوشی میں دل سے خوش ہوتے ہیں انہوں نے بڑے خلوص سے مبارکباد اور دعائیں دیں، اور جن کے دل چھوٹے اور ظرف کم تھے انہوں نے خوش ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے مبارکباد تو دے دی۔ ساتھ ساتھ سوالات اور تبصروں کی بھرمار بھی کر دی۔
"ارے بھئی یہ تو وٹہ سٹہ نہیں ہو گیا؟ بڑوں سے سنا ہے کہ ایسے رشتہ کرنا ٹھیک نہیں ایک جوڑے کے معاملات دوسرے جوڑے پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔"
امی نے سارا معاملہ نصیبوں کا کھیل قرار دے دیا۔
"اوہو، لوگ بیٹی کو رخصت کرتے ہیں، تم بیٹی کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی رخصت کرو گی!"
"بی بی! یہ چانس تم کو ملتا تو تم بھی بیٹا رخصت کر دیتیں۔" امی نے دل ہی دل میں جواب دے کر بخشمگین نگاہوں سے گھورنے پر اکتفا کیا۔
"وہاں کون سی آسان زندگی ہے، گھر کے سب لوگ نوکری کریں تب جا کر پورا پڑتا ہے۔" کسی نے ڈریم ورلڈ کی اصلیت بیان کی۔
"یہاں بھی اب وہ زمانے گئے جب ایک کماتا تھا اور پورا کنبہ کھاتا تھا اب تو مہنگائی کا حال یہ کہ گھر کے سب افراد کماتے ہیں پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔" بولنے والے کا منہ دیسی پھپھو نے بند کیا تھا۔
پردیسی پھپھو کی نند کا فون آیا تھا وہ اسلام آباد میں رہتی تھیں، تقریب میں ان کا آنا مشکل تھا۔ معذرت کے ساتھ امی کو مبارکباد دی عاشر اور پری سے بھی بات کی۔
"ارے بھئی کہاں تم انجینئر کہاں وہ ڈرائیور، تمہارے اماں ابا نے کچھ دیکھا بھالا نہیں، تم نے بھی کچھ نہیں سوچا؟" تو فون کرنے کا اصل مقصد یہ تھا، اکسانا، بھڑکانا، پری کو یہ سب تو سمجھ میں نہیں آیا وہ ان کے پہلے فقرے پر اٹکی ہوئی تھی۔
"میں انجینئر تو نہیں ہوں، آرٹس کے مضامین ہیں میرے پاس۔" وہ کچھ حیران پریشان سی انہیں بتا رہی تھی، اب حیران پریشان ہونے کی باری ان کی تھی۔
"لو، ایویں ہی لمبی لمبی چھوڑ رہی تھیں بھابھی جان بہو انجینئر، داماد ویسے تمہارا بھائی کیا کرتا ہے؟" حالانکہ عاشر سے بات کر چکی تھیں مگر اب پری سے تفتیش کر رہی تھیں۔
"وہ۔۔۔" پری نے بے بسی سے امی کو دیکھا جو فون کاٹنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔
"اللہ حافظ!" امی کی گھورتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا کر پری نے جلدی سے اللہ حافظ کہا اور لائن کاٹ دی۔

''پڑھائی کی کیا بات کر رہی تھیں ان سے؟''

''وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں انجینئر ہوں، تو وہی بتا رہی تھی کہ میرے پاس آرٹس کے مضامین ہیں۔''

''کیا ضرورت تھی اتنی تفصیلات بیان کرنے کی۔'' حسب توقع امی شروع ہو گئیں۔

''تمہاری پھپھو نے ہی انہیں بتایا تھا کہ تم انجینئرنگ پڑھ رہی ہو، وہ جو کچھ سمجھ رہی تھیں سمجھنے دیتیں۔''

''اف، ایک اور نیا امتحان، خود بھی جھوٹ بولو۔ اور دوسرے کے بولے ہوئے جھوٹ بھی نبھاؤ۔'' پری دل گرفتہ سی وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

پری زیتون کا تیل نیم گرم کر کے دیسی پھپھو کے کمرے میں لے گئی، سردیوں میں ان کا معمول تھا، گھٹنوں پر تیل کی مالش کرنا، کبھی کوئی لڑکی اصرار کر کے کر دیتی ورنہ انہیں کسی سے بھی یہ خدمت لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ دعائیں دے کر رخصت کر دیتیں، مگر آج پری نے مالش کا کہا تو جھٹ سے مان گئیں۔

''سنا ہے بارش بھی ہونے والی ہے۔'' دھیرے دھیرے مساج کرتی پری سے مخاطب ہوئیں۔

''جی پھپھو! خبروں میں بتایا تھا۔'' اپنے خیالات میں گم پری نے سنبھل کر جواب دیا۔

''اللہ خیر کرے پھر تو ٹھنڈ اور بڑھ جائے گی۔''

''تھوڑے دن کی بات ہے پھر تو گرمیاں آجائیں گی، سردی ہوتی ہی کتنے دنوں کی ہے۔'' پری نے شاید انہیں تسلی دینی چاہی تھی۔

''ارے ان ہی تھوڑے سے دنوں میں ہم بڈھوں کا کباڑا ہو جاتا ہے۔'' پھپھو بلبلائیں۔ ''کھڑکی، دروازے سب بند ہیں پھر بھی پتا نہیں کہاں سے ہوا اندر گھسی آ رہی ہے، گرمیوں میں اسی ہوا کو ترس جاتے ہیں جانے نگوڑ ماری کہاں غائب ہو جاتی ہے۔''

''ہوں'' پری سنجیدگی اور خاموشی سے اپنے کام میں منہمک تھی۔

''کیا بات ہے بیٹی، اتنی چپ کیوں ہو؟'' پھپھو نے اس کا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔''

''اب تو خیر سے زندگی میں ایک نئی شروعات ہونے والی ہے خوش کیوں نہیں ہو۔'' ان کی تجربہ کار بوڑھی نظریں پری کو اندر تک ٹٹول رہی تھیں۔

''خوش تو ہوں۔'' پری ان کی گھورتی نگاہوں سے گڑبڑا گئی۔

''لگ تو نہیں رہیں۔'' پھپھو نے نفی میں سر ہلایا۔

پری خاموش رہی۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے، سچ بولنا منع ہے۔

''دور بہت ہے۔'' بالآخر پری نے کہا۔ (وضاحت نہیں کی کہ کیا دور ہے، جگہ یا ''وہ شخص'')

''بس جہاں رہو، خوش رہو، والدین بھی اولاد کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ دور، قریب سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بس یہی بات ہے؟ اور تو کوئی بات نہیں؟''

''اور کیا بات ہو گی؟'' پری مالش کے بعد ان کی ٹانگ پر گرم پٹی لپیٹ رہی تھی۔

''بات کا کیا ہے کوئی بھی ہو سکتی ہے۔'' پھپھو کے لہجے میں لاپروائی تھی۔ پری نے چونک کر انہیں دیکھا اور اندر آتا علی، اسے دیکھ کر چونکا تھا مگر کچھ کہے بغیر اپنے جوتے اتارنے لگا۔

پری نے پٹی باندھ دی تھی، اب جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

''ذرا دیر بیٹھ تو لڑکی کہاں بھاگی جا رہی ہے۔'' پھپھو کی باتیں شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ پری کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے لگیں۔

''جی!'' وہ متذبذب سی بیٹھ گئی۔

''بات یہ ہے بیٹا! کہ زندگی کا یہ موڑ ایسا ہے کہ بہت سے خدشات اور وسوسے دل و دماغ میں آتے ہی ہیں، ویسے تو دیکھے بھالے لوگ ہیں مگر رشتوں ناتوں کے ایسے کام اللہ کے بھروسے پہ ہی کیے جاتے ہیں۔''

''جی!'' پری نے دھیرے سے جواب دیا تھا۔
''بس تم سے یہ کہنا ہے کہ ذرا خود کو بدلنے کی کوشش کرو، ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر وقت، ہر بات میں جھوٹ بولو مگر کبھی کبھی، کہیں کہیں مصلحت سے بھی کام لینا پڑتا ہے، سچ بولنا اچھی بات ہے مگر سچ زندگی میں آزمائشیں بھی لاتا ہے۔ سچ بولنے والے کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''
پری چند لمحوں تک ان کا چہرہ دیکھتی رہی پھر رسان سے کہنے لگی۔
''پھپھو! سچ بولنے والوں کے ساتھ ہمیشہ اللہ رہتا ہے، آزمائشیں آئیں بھی تو اللہ مدد کے لیے کافی ہوتا ہے۔''
''یہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر، دنیا، دین سے بھاری ہے، دنیا داری نبھانی پڑتی ہے، شادی کے بعد تو کچھ زیادہ ہی نبھانی پڑتی ہے، کوئی کوئی سچ منہ میں دبا کر رکھنے کا ہوتا ہے، پٹاخ سے بولنے کا نہیں۔'' پھپھو کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں پھر دوبارہ کہنے لگیں۔
''اس لڑکے (علی) کو بھی میں یہی سمجھاتی ہوں' دنیا سے الگ بننے کی کوشش نہ کرو ورنہ دنیا سے الگ ہو جاؤ گے۔''
''جی!'' پری نے سر جھکایا، ''میں اب جاؤں؟''
''ہاں جاؤ، سونے کی تیاری کرو، اللہ تمہیں خوش رکھے۔''
پری آکر اپنے بستر میں لیٹ گئی تھی، کمبل منہ تک تان لیا تھا۔
''کاش کبھی ہمارے بڑے سمجھانے کے بجائے ہمیں سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔'' پری کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔
مصلحت اور جھوٹ کا فرق ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا اسے تو بس یہی معلوم تھا کہ یا تو سچ ہوتا ہے یا جھوٹ، ان دونوں کے درمیان اور کچھ نہیں ہوتا۔
''ہم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھوٹ بولتے ہیں۔ عمر میں کچھ سال گھٹا کے بتاتے ہیں۔ کپڑوں' جوتوں کی قیمت بڑھا کر بتاتے ہیں۔ میک اپ محلے کے پارلر سے کروا کر، شہر کے کسی بھی مشہور پارلر کا نام لگا دیتے ہیں۔ جہاں جانے کی ہماری اوقات بھی نہیں ہوتی۔ علاقے کے فوڈ اسپاٹ پہ کچھ کھا کر آتے ہیں اور نام اس جگہ کا بتاتے ہیں جہاں کے ایک بل میں پورے مہینے کا گھر کا راشن آ جائے۔ ہم اپنی عزت اور شان بڑھانے کے لیے بلاوجہ کے جھوٹ بولتے ہیں اور سننے والوں کو بھی معلوم ہوتا ہے ہمارے جھوٹ کا، پیٹھ پیچھے سب اپنے اپنے الفاظ سے جھوٹ بولنے والے کی عزت افزائی کرتے ہیں۔ عزت اور شان بڑھنے کے بجائے گھٹتی ہی ہے، پھر بھی ہم باز نہیں آتے۔'' پری کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اب اس کے خیالات کی رو دوسری طرف مڑ گئی تھی۔
اچھا رشتہ اور شادی ان دونوں کا ملاپ کیا ہمیشہ خوشیاں لے کر آتا ہے؟ یا پھر خوشی وہ ہے جو ہمارے اندر سے پھوٹتی ہے' وہ جو دل سے شروع ہوتی ہے۔ سب مجھے خوش نصیب قرار دے رہے ہیں پھر بھی مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ خوشی ابھی تک میرے قریب نہیں آئی، ابھی تک وہ مجھ سے دور کیوں ہے؟''
سوچتے سوچتے پری کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں، پتا نہیں کیوں اتنا رونا آ رہا تھا۔
''ٹھیک ہی تو کہتے ہیں لوگ اپنے بارے میں سچ بولنا آسان نہیں' اپنے لیے سچ بولنا بھی بہت مشکل ہے۔''

☆☆☆

نکاح کی تقریب میں فقط دس دن رہ گئے تھے، امی ابو مہمانوں کی لسٹ فائنل کر کے یہ طے کر رہے تھے کہ کسے ٹیلی فون پر دعوت دی جائے اور کن نخریلے لوگوں کو بہ نفس نفیس ان کے گھر جا کر مدعو کیا جائے کہ ٹیلی فونک دعوت کو وہ دعوت ہی نہیں مانتے تھے۔
''کارڈز چھپوا لیتے تو یہ سب جھنجھٹ نہیں ہوتا، کسی کے ہاتھ بھی بھجوا دیتے' اب زبانی کہنا ہے تو ہم دونوں میں سے ہی کسی کو جانا پڑے گا۔'' امی جھنجھلائیں۔

اتنے سارے کام سر پر اچانک پڑ گئے تھے۔ جھنجلانے کے ساتھ وہ بوکھلا بھی گئی تھیں۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ منگنی کی تقریب نکاح میں بدل جائے گی، پھر ہال کی تاریخ پہلے کچھ اور ملی تھی، پھر وہ بھی آگے بڑھ گئی، کارڈز کیسے بھجواتا کوئی ڈیٹ تو کنفرم ہوئی نہیں۔" ابو نے اپنا چشمہ ناک کی پھننگ پہ بیلنس کرتے ہوئے رسان سے جواب دیا۔ وہ اپنی بیگم کے مقابلے میں نسبتاً پرسکون اور دھیمے مزاج کے تھے، سہج سہج ایک ایک کر کے کام نمٹا ہی لیتے۔

"شاپنگ بھی کتنی باقی رہ گئی ہے۔" خدا جانے کتنے چکر اور لگیں گے ابھی بازار کے امی نے خود کلامی کی۔

"عورتوں کی شاپنگ کبھی پوری ہوتی ہے؟ ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے۔"

"ابو نے ٹھنڈے لہجے میں بڑا تپا ہوا تبصرہ کیا تھا امی گرم ہو گئیں۔

میری شاپنگ نہیں ہے، آپ کے بچوں کی ہی ہے، اور بہو، داماد کی آپا کہہ رہی تھیں کہ سب ایک ساتھ چلتے ہیں اور خریداری کر آتے ـــ مجھے تو مشکل ہی لگ رہا ہے، عام دنوں میں ہی ایک ایک چیز خریدنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں، یہ تو پھر اتنا اہم موقع ہے، تین چار دن تو لازمی لگیں گے۔"

"تم پانچ دن لے لو، پانچ دنوں میں سب کی شاپنگ مکمل ہو جانی چاہیے پھر دو دن میں ہم دونوں دعوتیں دے آئیں گے سب کے گھر۔" ابو نے جھٹ پٹ منصوبہ بنا کر فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے، میں آج ہی ان سب کو بتا دیتی ہوں، خریداری تو مکمل کریں اپنی۔" امی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

☆☆☆

"ہیلو۔ کیا ہو رہا ہے؟" اندر آ کر وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

کپڑے تہ کرتی ہوئی پری نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"کپڑے تہ کر رہی ہوں۔"

"ہر وقت ہی خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتی ہو۔"

"تو؟"

"تو یہ کہ تمہارے اندر کیا چل رہا ہے، جانتی ہوں سب، تم حقیقت سے نظریں چرائے خود کو کاموں میں الجھا کر رکھتی ہو مگر اس سے حقیقت تو تبدیل نہیں ہو گی۔"

"ان سب باتوں کا مقصد؟"

"کچھ نہیں، بس یونہی۔" اپنے مخصوص انداز میں کندھے اچکاتی مایا ہنس پڑی، چڑانے والی ہنسی،

"یو نو، کبھی کبھی یہ بات بھی بڑا مزہ دیتی ہے کہ اگر ہم کچھ حاصل نہیں کر سکے تو دوسرا بھی محروم رہا۔" اس نے پری کے چہرے پہ نظریں جما کر کہا۔ جہاں ایک رنگ آ رہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا۔

"اس کیفیت کے کئی نام ہیں حسد اور کینہ بھی، کم ظرفی اور خود غرضی بھی۔"

پری نے اس پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کیا ہاں لفظوں کی مار ضرور ماری۔

"تم کچھ بھی کہو، میں مائنڈ نہیں کروں گی۔" مایا کھلکھلا دی۔ پری کی بے بسی اسے بڑا لطف دے رہی تھی۔

"تو پھر میں یہ کہنا پسند کروں گی کہ اپنی شکل مجھے نہ دکھایا کرو۔"

"اب بھی مجھے اپنا رقیب سمجھتی ہو؟" مایا کا انداز بھی بس۔۔۔

"مجھے تو محبت کا احساس ہی اب سمجھ میں آیا ہے۔ رقابت کا احساس تو اس کے بعد کی بات ہے۔"

پری نے اٹھ کر تہ شدہ کپڑے الماری میں رکھنے شروع کر دیے۔

پری کے پرسکون آواز و انداز پہ وہ ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی، پھر سنبھل کر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"تم جھوٹ نہیں بولتی ہو، مگر کچھ دن بعد اپنی نئی زندگی کا آغاز ایک جھوٹ کے ساتھ کرو گی اور اس

کے بعد ساری عمر ایک جھوٹی زندگی گزاروں گی میرے بھائی کے ساتھ، دل کہیں، انسان خود کہیں، اس سے بڑا جھوٹ اور اس سے بڑی منافقت دنیا میں اور کوئی نہیں نہ۔"

"اوہ، تو تھوڑی بہت مورل ویلیوز تم بھی جانتی ہو۔ خیر، میری فکر نہ کرو، دنیا جھوٹے اور منافق لوگوں سے بھری پڑی ہے، ایک میں بھی سہی۔"

"تم نے دیکھا، سچ بولنا بھی کتنا مشکل ہوتا ہے، اسپیشلی اپنے بارے میں سچ کہنا، چاہتے ہوئے بھی انسان کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"کم از کم ایک سچ تو اپنے بارے میں یہ بول سکتی ہوں کہ تم اور تمہاری باتیں زہر لگ رہی ہیں مجھے اگر تم یہاں سے چلی جاؤ تو بہت خوشی ملے گی مجھے۔"

پری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

مایا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر فوراً ہی ہونٹ بھینچ لیے۔ کمرے میں امی (پری کی) داخل ہو رہی تھیں۔ مایا نے ایک مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی اور باہر نکل گئی۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں سہیلیوں میں؟" امی نے ایک خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ بیٹی کو دیکھا۔

"لڑائی کی۔" پری نے آخری سوٹ بھی الماری میں رکھا اور پٹ بند کیا۔

"ہیں؟ ابھی سے، نند بھاوج کی لڑائی تو شادی کے بعد ہوتی ہے۔"

پری کی بات کو مذاق سمجھ کر امی نے بھی مذاق کے انداز میں ہی جواب دیا۔

"یہاں تو شادی سے پہلے ہی شروعات ہو گئی ہے آگے اللہ خیر کرے۔" پری بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کوشش تو پوری یہی تھی کہ شیراز سے سامنا نہ ہو مگر ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ کہاں تک چھپتی اور اسے تو وجہ بھی نہیں معلوم تھی کہ آخر وہ کیوں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی، گاڑی بھر کر سب شاپنگ پہ جا رہے تھے، پردیسی پھپھو نے اعلان کر دیا تھا کہ دونوں دولہا اور دونوں دلہنیں اپنی اپنی پسند کی شاپنگ کریں گی۔

مال میں گھستے ہی سب تتر بتر ہو گئے، کوئی ادھر کوئی ادھر، پری امی اور عنیزہ کے ساتھ کھڑی تھی، علیزہ نے آکر اس کا بازو پکڑا۔

"ادھر آؤ ایک چیز دکھاؤں تمہیں۔"

"میں کیا کروں گی دیکھ کر، آپ پسند کر کے خرید لیں، مجھے پسند آجائے گی۔" اس کے ساتھ ساتھ چلتی وہ بے چارگی سے بول رہی تھی۔

"ارے واہ، تقریب تمہاری، تو پسند بھی تمہاری ہونی چاہیے" لفٹ میں سوار ہو کر وہ اوپر آگئیں، یہ فوڈ کورٹ تھا۔

"یہاں کہاں آگئیں، مجھے کھانا پینا نہیں ہے کچھ بھی۔"

"اچھا، تو نیند کے ساتھ ساتھ بھوک بھی اڑ گئی ہے؟" وہ پتا نہیں کہاں سے نکل کر آیا تھا، اس وقت سامنے کھڑا تھا۔

"یہ کیا؟؟" پری نے بے بسی سے بہن کو دیکھا۔

"بس آدھا گھنٹہ" علیزہ بائے کر کے چل دی۔

"بیٹھ جاؤ، کھڑے کھڑے تو میں آدھا گھنٹہ نہیں گزار سکتا" شیراز اسے ساتھ لیے قریبی میز پر بیٹھ گیا۔

"بات کرنی تھی تم سے، گھر پر تو موقع نہیں ملتا، ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی آس پاس ہوتا ہے۔" شیراز بولنے لگا۔

پری نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پہلے یہ بتاؤ تم۔۔۔ تم خوش کیوں نہیں ہو؟"

پری نے متوحش ہو کر اس کا چہرہ دیکھا، ڈائریکٹ وجہ ہی پوچھ لی۔

"بہت شفاف چہرہ ہے تمہارا، آئینے کی طرح، جو کچھ دل میں ہوتا ہے چہرے پہ عکس آجاتا ہے، تم خوش نظر آنے کی کوشش کرتی ہو مگر دل سے خوش نہیں ہو۔"

بات کرنا چاہتے تھے موصوف یا تفتیش۔ پری اندر ہی اندر جز بز ہو رہی تھی۔

"کچھ نہیں بولوگی؟"

پری خاموش رہی۔

"او کے نیکسٹ کوئسچن۔۔۔ڈو یو لائک می؟"

"آپ اچھے لڑکے ہیں، ناپسند نہیں ہیں مجھے۔"

پری کب تک خاموش رہتی کچھ تو بولنا ہی تھا اسے مگر بہر حال اپنی عادت کے مطابق اس نے جو کچھ کہا سچ ہی کہا تھا۔

"ہوں، سمجھداری سے جواب دیا ہے۔" شیراز مسکرایا۔

"ڈو یو لو می؟" اس نے اچانک ہی پری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

پری نے بے ساختہ ہی اس سے نظریں چرائیں۔

"میں ہمیشہ سے اپنی لو میرج چاہتا تھا، میری طرف سے اس میرج میں لو شامل ہے مگر تمہاری طرف سے یہ صرف "میرج" ہے۔ ودآؤٹ لو۔"

"میں نے ٹھیک کہا یا غلط؟" پھر ایک اور سوال، یہ فیصلہ کن سوال تھا، پری جھوٹ کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات نہیں کرنا چاہتی تھی وہ ایک جھوٹی زندگی بھی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔

"آپ نے ٹھیک کہا ہے۔" شیراز کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا۔

شیراز نے ایک گہری سانس لی۔

"تم نے اسی وقت انکار کیوں نہیں کیا جب اس بات کی شروعات ہوئی تھی؟"

"میری مرضی کسی نے پوچھی ہی نہیں کیسے انکار کرتی؟"

"وہاٹ۔" شیراز جیسے اچھلا تھا۔ "تم سے پوچھے بغیر، تمہاری مرضی جانے بنا رشتہ طے کر دیا ماموں ممانی نے۔"

"مجھ سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا نہ امی نے، نہ ابو نے سب نے یہی سمجھ لیا کہ امریکہ کا نام ہی کافی ہے۔"

"اگر وہ تمہاری مرضی پوچھتے تو تم منع کر دیتیں؟"

"ہاں!" زبان سے کچھ کہے بغیر پری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے صرف اندازہ تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اتنے ٹھیک اندازے لگاتا ہوں۔" پھیکی سی مسکراہٹ شیراز کے لبوں پہ آگئی۔

"کیسا اندازہ"؟ پری چونکی۔

وہ چند لمحے خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ پری بے چین ہونے لگی۔

"چھوڑو کچھ نہیں"۔

اس کی نظروں کا ارتکاز ٹوٹا تو پری بھی کچھ پرسکون ہوگئی مگر اگلے ہی لمحے وہ پریشان نظر آرہی تھی۔ شیراز کے سوالوں کے جوابات صحیح صحیح دے دیے تھے۔ اللہ جانے اس کا انجام کیا ہوتا اب؟

☆☆☆

ڈرائنگ روم کانفرنس روم بنا ہوا تھا، امی، ابو، دیسی پھپھو، پردیسی پھپھو چاروں سر جوڑ کر بیٹھے تھے پردیسی پھپھو نے شیراز کی بات سے بڑوں کو آگاہ کر دیا تھا۔

"میں یہ شادی نہیں کرسکتا۔" نکاح سے نو دن پہلے اس اچانک اعلان پر وہ ہکا بکا ہو گئیں۔

"کیا ہوا؟"

"وہ مجھے پسند کرتی ہے مگر محبت نہیں کرتی۔"

"ارے، محبت کا کیا ہے شادی کے بعد ہو ہی جائے گی۔ ویسے بھی لڑکیاں پہلے سے پہلے ایسے اعتراف تھوڑی کرتی ہیں۔ پری تو پھر ہے بھی سیدھی سادی مشرقی لڑکی۔"

"سیدھی سادی مشرقی لڑکی کو شادی کے بعد بھی مجھ سے محبت نہیں ہوگی، مجھے معلوم ہے۔"

"ارے کیسے معلوم ہے کسی نے کچھ کہا ہے یا پری نے کچھ کہا ہے اب اس وقت ایسی باتیں کرنے کی کیا تک ہے۔ میں اپنے بھائی بھاوج کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" وہ تو جیسے جلتے توے پہ بیٹھ گئیں۔

"افوہ امی ایموشنل ڈائیلاگز نہ جھاڑیں۔

ماموں سے میں خود بات کرلوں گا۔"

شیراز نے ماموں سے خود بات کرلی تھی اور اس طرح کی تھی کہ ان کی سمجھ میں بات آگئی تھی مگر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ یہاں موجود تینوں خواتین کو یہ بات کیسے سمجھائیں۔

"دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔" انہوں نے کہنا شروع کیا اور پھر بولتے ہی چلے گئے۔

☆☆☆

دوپٹا بار بار ٹھیک کرنے پر بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ابو کے چہرے پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"پری! میں تمہارا باپ ہوں، میں نے تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے یا باتیں سنانے کے لیے نہیں بلایا، تم گھبراؤ مت۔" انہوں نے پری کے سر پر ہاتھ رکھا اس ہاتھ میں نرمی اور گرمی تھی اور شفقت بھی۔

اس کا دل بھر آیا' گلے میں کوئی گولہ سا اٹک رہا تھا'بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا اور ابو کی طرف توجہ کی جو کہہ رہے تھے۔

"غلطی شاید ہماری بھی ہے'ہمیں پہلے ہی اس رشتے کے لیے تمہاری مرضی پوچھنی چاہیے تھی مگر میں نے تمہاری امی پہ یہ معاملہ چھوڑ دیا اور انہوں نے خود ہی یہ سمجھ لیا کہ تمہاری مرضی بھی یہی ہوگی، تم خاموش رہیں، تمہاری بھی غلطی ہے۔بیٹا! اس رشتے میں تمہاری مرضی نہیں تھی، تمہیں بولنا چاہیے تھا۔اپنی امی کو بتاتیں یا آپی کے ذریعے کہلواتیں، اتنی محبت تو کرتے ہیں تم سے کہ تمہاری مرضی اور خوشی کو فوقیت دیتے۔"

وہ دھیرے دھیرے بول رہے تھے اور پری کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

"ایسی بات نہیں ہے ابو!" بمشکل اس نے گلو گیر آواز میں کہا۔

"پھر کیسی بات ہے'بتادو، تمہاری مرضی کیا ہے؟"

پری کا چڑیا سا دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"میں آپ سب کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں۔ اسی گھر میں۔" روتی ہوئی آواز میں اس سے بس یہی کہا گیا۔

☆☆☆

رشتہ داروں میں، احباب میں پھر چہ مہ گوئیاں شروع ہوگئیں۔

"پہلے تو شیراز کے ساتھ نکاح کی خبر سنی تھی اب نئی خبر سننے میں آگئی۔خدا جانے اندر ہی اندر اب کیا کھچڑی پک گئی، لو بھئی نیویارک کی جگہ کراچی جیت گیا۔"

گھر والے وہی کر رہے تھے جو اس موقع پہ انہیں کرنا چاہیے تھا یعنی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنا۔ویسے بھی کوئی بھی ڈائریکٹ تو ان سے کچھ کہہ نہیں رہا تھا، سب لوگ معاشرے کے عمومی رواج کے مطابق پیٹھ پیچھے ہی باتیں بنا رہے تھے۔

جیسا کہ ابو نے طے کیا تھا، تقریب سے چار پانچ دن پہلے سب کو دعوت دے دی گئی، پھر وہ روز سعید بھی آن پہنچا، دونوں دلہنیں ایک ہی پارلر سے تیار ہو کر ڈریسنگ روم میں بیٹھی تھیں۔

مایا کافی دیر سے آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھی پھر اچانک مڑ کر پری سے مخاطب ہوئی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"

"اتنی دیر سے آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھیں یا میرا؟" پری نے دل میں سوچا مگر مسکرا کر تعریف کا شکریہ ادا کیا۔

"تو تم جیت گئیں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے مقابل بیٹھ گئی۔لہجے میں یاسیت تھی۔

"اس جیت میں تمہارے بھائی کا بڑا ہاتھ ہے میں اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" پری کے دل کی خوشی' روشنی بن کر اس کے چہرے پہ دمک رہی تھی۔

میرا بھائی بے وقوف ہے۔" وہ نخوت سے بولی۔

"تمہارا بھائی عظیم ہے۔" پری نے انکساری

کے ساتھ جواب دیا۔

''تمہیں اونچی ہواؤں میں، کھلی فضاؤں میں اڑنے کا چانس ملا تھا تم نے مس کر دیا، خیر، اگر تم کنویں کی مینڈک بنے رہنے پر ہی خوش ہو تو میری طرف سے وش یو بیسٹ آف لک۔''

پری بے اختیار کھلکھلا اٹھی، اسے آج نہ مایا بری لگ رہی تھی نہ اس کی باتیں۔

''میری بھی دعا ہے تم ہمیشہ خوش رہو۔'' پری نے خلوص دل سے دعا دی تھی۔

نکاح کے وقت پری کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''اے، رونا مت۔'' عنیزہ نے اسے گھورا۔ ''اتنا مہنگا میک اپ کروایا ہے۔ خراب ہو جائے گا اب تو لڑکیاں اپنی رخصتی پر بھی نہیں روتیں، تمہاری کون سی رخصتی ہو رہی ہے۔''

''ہو گی بھی تو کون سا دور جانا ہے، نیچے کے پورشن سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے جانا ہے۔'' علیزہ نے لقمہ دیا۔

نکاح کے بعد تصاویر بننے لگیں، دونوں جوڑوں کے لیے اسٹیج الگ الگ لگائے گئے تھے، کھانا کھلا تو ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ سب کے سب کرسی میز، پلیٹ اور چمچہ سنبھال کر بیٹھ گئے، دونوں نئے نویلے جوڑے اپنے اپنے اسٹیج پر اب اکیلے بیٹھے تھے فوٹو گرافر بھی کیمرہ ایک طرف رکھے پیٹ پوجا میں لگے تھے۔

عنیزہ بھاگتی دوڑتی ان دونوں کے پاس آئی تھی۔

''کھانا کھالو تم لوگ، لاؤں؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔'' علی نے منع کیا۔

''چلو بعد میں کھا لینا آرام سے اتنے تام جھام کے ساتھ پری سے بھی نہیں کھایا جائے گا۔'' عنیزہ بولتے بولتے رکی اور علی کو غور سے دیکھا۔

''بہت اچھے لگ رہے ہو۔''

''شکریہ!'' وہ مسکرایا۔

''اور بہت خوش بھی۔'' عنیزہ نے مزید کہا۔

''اچھا!'' اب کے وہ ذرا شرماسا گیا۔

بہت خوش تو عاشر بھی تھا بس ذرا کوکنگ ٹریننگ کی ہیبت اس پر طاری تھی۔

''اچھا۔ میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں۔'' اپنا دوپٹا سنبھالتی وہ وہاں سے چل دی۔

پری سر جھکائے اپنے دل کی دھڑکنیں سن رہی تھی جب اس کی سماعت نے علی کی بڑبڑاہٹ سنی۔

''میں تو اب تک اسی حیرت میں ہوں کہ یہ سب ہوا کیسے؟''

جھکے سر والی پری مسکرا دی۔

''تم نے شیراز کو انکار کیوں کیا؟'' واضح طور پر سوال اس سے ہوا تھا۔

اب ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس نے علی کو دیکھا۔ علی کی نظریں اسی پر تھیں، ان نظروں میں محبت بھی تھی، شوق بھی اور سوال بھی۔ پری نے لمحوں میں سب کچھ پڑھ لیا۔

''بتاؤ، کیوں انکار کیا اسے؟''

''تمہارے لیے۔'' وہ علی کے ہر سوال کا جواب دینا چاہتی تھی، سو جواب دے دیا۔

''میرے لیے؟'' حیرت بھرا لہجہ اسے تک رہا تھا۔

''ہاں!'' پری نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میرے لیے؟'' وہ شاید ابھی بھی بے یقین تھا۔ بار بار اصرار میں اسے لطف آ رہا تھا۔

''ہاں۔'' پری کے جواب نے اسے حیرت و مسرت کے آسمان پر بٹھا دیا تھا، بے خود سادہ پری کو دیکھ رہا تھا اور اسی بے خودی و سرشاری کے عالم میں بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''چل جھوٹی۔''

حیا بخاری

شبنم کا سفر

"عبدالرحیم...... میری مان لے' تو شادی کر لے دوسری۔"

تھپ تھپ روٹی بناتی ماسی زہرہ نے چارپائی پہ بیٹھے، کھانا کھاتے عبدالرحیم کو مشورہ دیا۔ اسے زور کا اچھو لگا تھا۔

اندر الماری سنبھالتی چودہ سالہ بانی نے حیرت سے ماسی کی بات سنی تھی اور تہ شدہ کپڑا تھامے دھیرے دھیرے چلتی دروازے میں آرکی تھی۔

کھلے باورچی خانے میں توے پہ روٹیاں ڈالتی اس کی سگی خالہ اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ اسے شک گزرا، کیا واقعی اس کی سگی خالہ تھی؟

"یہ کیا کہہ رہی ہے زہرہ؟" عبدالرحیم نے حیرت سے سوال کیا۔

"لے...... اس میں اتنا حیران ہونے والی بھلا کیا بات ہے...... سیدھی بات ہی کر رہی ہوں۔" اس نے گرما گرم روٹی توے سے اتار کر کندوے میں لپیٹی۔

"ابھی بانی کی اماں کو' تیری سگی بہن کو مرے ایک مہینہ نہیں ہوا اور تو یہ پٹی پڑھانے لگی ہے مجھے۔" وہ چڑ گیا تھا اور ناراض بھی ہو گیا تھا۔ تب ہی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کھانا بھی خود سے دور کر دیا۔ زہرہ تاسف سے سر ہلانے لگی۔

"نہ...... اس میں اتنا ناراض ہونے والی کون سی بات ہے بھرا۔" وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کر اس کے قریب ہی آبیٹھی۔

"زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ ہمارا اس میں کیا دخل۔" وہ بڑی بوڑھیوں کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔ عبدالرحیم کی آنکھوں میں ابھی تک ناراضی رقم تھی۔

"لیکن مر جانے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ شانو اتنی یہ ہی زندگی لکھوا کے لائی تھی۔ تیرے ساتھ کس قدر خوشی خوشی جی...... وقت آیا تو چل دی۔" اس کی آنکھوں میں جیسے یادوں کے کتنے دیے جل اٹھے تھے۔

"لیکن تو ابھی زندہ ہے بھرا...... اس کے بغیر ہی سہی مگر تجھے جینا ہے۔" وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

"تو جی لوں گا نا۔" وہ غصے سے کہتا اٹھ گیا۔ "میں نے کب کہا کہ جان دے دوں گا، کچھ کھا پی کے۔" تار پہ لٹکی سفید چادر جھٹک کے اتاری اور کاندھے پہ ڈال دی۔

"او میری پوری بات تو سنتا جا۔" دروازے کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔ کمرے میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی بانی منہ بنا کے دوبارہ کام میں جُت گئی۔ کان البتہ ابھی بھی اسی طرف تھے۔

"تیری بات تو اب رہی نہیں بھرا...... ورنہ تو خود سوچ، بہن کے مرنے کے چند دن بعد ہی میں تجھے ویاہ کا کہتی۔" اس کی آنکھیں، لہجہ بھرّانے لگا تھا۔ وہ اپنے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔ عبدالرحیم فوراً نرم پڑا تھا۔ واپس آ کے تحمل سے بیٹھ گیا۔

"اچھا بول...... کیا کہنا چاہ رہی ہے؟" اس کی نرم آواز پہ وہ بھی دوبارہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"میں تو صرف بانی کے لیے کہہ رہی تھی۔"

"بانی کے لیے......؟" اس کے چہرے پہ پریشانی دکھائی دینے لگی۔

"ہاں اپنی دھی کے لیے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تو، تو سارا دن گھر سے باہر رہتا ہے۔ شام گئے گھر لوٹتا ہے۔ میں تو ایک دو دن مزید رہ لوں گی۔ پھر میرا اپنا گھر، بچے، روز روز کہاں آ سکتی ہوں کہ بانی کا خیال رکھ سکوں۔ پھر تیرا اتنا بڑا گھرانہ، یہ بڑا خاندان...... ایک قدم باہر نکالتا ہے۔ دوسرا اندر آ جاتا ہے، حال احوال لینے...... ایسے میں جوان جہان اکیلی لڑکی کیسے سب کو ٹالے یا خاطر داری کرے۔ اس معصوم کو تو ابھی خود کو برتنا نہیں آتا، کہاں اتنے مہمانوں کو...... پھر زمانے کا حال تجھے خود پتا ہے ایسے میں اس معصوم، خوب صورت پری کا اکیلا ہونا...... یوں اکیلے چھوڑ کے گئی نا تو سچ کہہ رہی ہوں ایک پل چین نہ ملے گا۔ دل یہیں اٹکا رہے گا۔" وہ واقعی فکر مند تھی۔

اب کی بار عبدالرحیم بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اندر کپڑے تہ کرتی بانی نے سارے کپڑے ایک



ساتھ اٹھا کر دور کونے میں پھینک دیے تھے۔ ''لیکن زہرہ..... تو جانتی ہے نا، سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے؟'' عبدالرحیم کے لہجے میں خوف بہت واضح تھا۔

''میری بانی میں تو میری جان ہے۔ میں نے اور شانو نے اسے ہی ہمیشہ اپنی حیات سمجھا ہے اور اگر میرے پیچھے اس نے میری بیٹی کا جینا ہی حرام کر دیا تو.....'' اس کے خدشات سن کر زہرہ کچھ بول نہ سکی۔

''تو، تو اچھی طرح جانتی ہے اپنی بانی کو..... یہ سب سہہ لے گی۔ منہ سے اف تک نہ کرے گی۔ وہ بھلے کتنا ہی پریشان نہ کیوں کر دے۔ اب خود بتا، کیسے کرلوں میں دوسری شادی..... کیسے اپنی بیٹی کے سر پہ سوتیلی ماں لے آؤں۔''

اسے لگا اب زہرہ کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ زہرہ خاموشی سے اٹھی تھی اور صحن میں بالکل بیچوں بیچ لگے ننھے سے نیم کے پودے کے قریب آ کے رک گئی۔

یہ پودا شانو نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ کڑوے نیم کی چھاؤں بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ موسم کی ساری دھوپ اور تپش اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اس کے پتے خوب صورت لوگوں کی خوب صورتی کو مزید نکھار دیتے ہیں۔ کئی بیماریوں کی شفا ہیں۔ تب ہی اس نے بڑی خوشی خوشی یہ پودا لگایا تھا۔

''کیوں نہ بھرا! اس نیم کے پودے کو اب اکھاڑ لیں۔'' وہ غور سے اس پودے کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

بانی دوڑتی ہوئی کھڑکی میں آ ٹھہری۔
عبدالرحیم بھی حیران ہوا۔

''وہ کیوں؟'' اس کی اچانک بات پہ وہ محض اتنا ہی کہہ سکا۔

''کڑوا جو ہے' اس لیے۔'' اس نے دلیل دی۔

''لے..... جھلی نہ ہو تو..... کڑوا ہے تو کیا ہوا؟ ہے تو درخت نا..... چھاؤں دیتا ہے۔ دھوپ سے تو بچاتا ہے۔'' عبدالرحیم اس کی بے تکی دلیل پہ مسکرا دیا تھا اور زہرہ اس کے جواب پہ۔

''یہ ہی تو میں تجھے سمجھا رہی ہوں بھرا..... درخت تو درخت ہی ہوتا ہے..... سایہ دار..... چاہے کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔''

''کیا مطلب زہرہ؟'' وہ حیران ہوا۔

''اللہ ہی سمجھائے اب تجھے..... میں نے مشورہ دینا تھا۔ دے دیا..... اب آگے تیری سوچ..... تیری مرضی۔'' اس نے بات ختم کی اور برتن اٹھانے لگی۔

عبدالرحیم وہیں بیٹھا اس کی بات پہ غور کرتا رہا۔''

☆☆☆

لمبی' کچے پکے گھروں سے گھری پتلی سی گلی اس وقت تقریباً ویران تھی۔ عبدالرحیم، جب سے شانو نے دنیا چھوڑی تھی' کام پہ ذرا لیٹ ہی جانے لگا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ویسے بھی اوقات کار کم ہو گئے تھے۔ اوپر سے گھر سے نکلتے نکلتے بھی تو، نو آرام سے بج جاتے تھے۔ اس وقت بھی وہ جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس ایک سال کے عرصے میں بانی بھی کافی ہوشیار ہو گئی تھی۔ بھاگ بھاگ کے باپ کا ہر کام یوں کر دیتی کہ اسے شانو کی کمی محسوس نہ ہوتی۔ اسی کی طرح ہر چیز تیار رکھتی۔

''اور میں سوچتا تھا کہ اب شانو کے بعد میرا کی ہوگا.....؟ تیرا خیال کون کرے گا؟'' وہ مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا۔

''ہاں..... ہاں ابا..... میں سب سنبھال لوں گی.....بس تو دوسری شادی نہ کرنا۔''

ایک سال پہلے خالہ کی کہی بات گویا اس نے پلو سے باندھ لی تھی۔ اسی دن اس نے خود سے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی نوبت نہ آنے دے گی کہ ابا کو دوسری شادی کی ضرورت محسوس ہو۔ اس نے تیزی سے نہ

صرف خود کو سنبھالا تھا بلکہ اس قدر سلیقے سے گھر سنبھالا تھا کہ سب حیران ہوئے تھے۔ اس قدر سگھڑاپے کے باوجود بھی وہ بار بار ابا کو دوسری شادی نہ کرنے کی ہدایت کرنا نہ بھولتی تھی۔ اب بھی ہمیشہ کی طرح اس نے کہا تھا۔ عبدالرحیم مسکرا دیا تھا۔

"پگلی...... شادی کیوں کروں گا؟ مجھے نہیں پتا کہ سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے اسے ڈھارس دی۔

"بالکل ابا...... بہت گندی ہوتی ہے سوتیلی ماں۔" اس کی ڈھلی ڈھلائی چادر ان کے کاندھے پہ سجاتی بولتی۔

"ظالم بھی......" وہ مسکراتے ہوئے لقمہ دیتا۔ بانی منہ بناتی۔

"اور نہیں تو کیا؟" اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا باہر نکل جاتا۔

وہ چادر سر پہ لے کر دروازے کے پھٹے (تختے) سے لٹک جاتی۔ لمبی گلی کے تیسرے دروازے تک ابا کے پہنچتے ہی اچانک ہی سبز آنچل سا لہرا جاتا۔ ابا کی رفتار میں تیزی آ جاتی۔

"الو کی پٹھی زلیخا۔" وہ بڑبڑا کے گالی دیتی۔

"روز میرے ابا پہ ڈورے ڈالنے کھڑی ہوتی ہے چوکھٹ تھامے۔ مجال ہے جو چوک جائے۔" وہ غصے سے کف اڑاتی' دروازہ بند کرتی۔

☆☆☆

کچے صحن کے بیچوں بیچ لگا نیم کا پودا بھی درخت بنتا جا رہا تھا۔ چھاؤں نہ گھنی تھی، نہ زیادہ ہلکی...... لیکن اس سردی کے موسم میں بھی نہ جانے کیوں وہ بانی کو مزا دیتی۔ دھوپ سے تنگ آتے ہی وہ چارپائی کڑوے درخت کی میٹھی چھاؤں تلے کھینچ لیتی۔

دروازہ اس قدر زور سے دھڑ دھڑایا گیا تھا کہ اس کا کمزور سا دل سینے کے پنجرے میں پھڑ پھڑا کے رہ گیا تھا۔ لسی کا گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر سارے کپڑے خراب کر گیا تھا۔

"کہیں پھر وہی نہ ہو۔" دل دھڑکا تھا۔

ابا کے ایک چچیرے بھائی دوسرے ملک سے واپس آ گئے تھے۔ اماں کے افسوس کے لیے آئے تھے اور چائے دیتی بانی کو نہ جانے کیوں پہلی ملاقات میں ہی ان کی گہری سبز آنکھوں سے خوف سا آیا تھا۔ انہوں نے بہت محبت سے اسے اپنے پاس بٹھایا تھا۔ بار بار اس کے کمر کو چھوتے بال سہلاتے رہے تھے۔ بانی کو ان سے عجیب سی کراہت آتی رہی۔ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتی رہی۔

"بیٹھی رہ دھی رانی۔" وہ ہاتھ سے پکڑ کے بٹھا دیتے۔ ابا مسکرا دیتے۔

"سگا چاچا ہی سمجھ۔" اور وہ چاہ کر بھی نہ سمجھ سکی۔ یا تو وہ سیانی ہو گئی تھی یا جھلی...... لیکن اسے اپنا آپ سیانا ہی لگا تھا۔ تب ہی اگلی دفعہ جب بھی وہ آئے تو اس نے خود کو بڑی سی چادر میں ڈھانپ کے رکھا تھا۔ ان کے لاکھ پکارنے پر بھی ان کے سامنے کم ہی گئی تھی اور بہانہ بنا کے واپس اندر چلی گئی تھی۔

اور اب...... لگا تار تیسرا دن تھا...... وہ ابا کے بعد آنے لگے تھے۔ وہ دروازہ کھولنے سے منع کرتی تو

غصے سے دروازہ توڑنے پہ آجاتے۔ دو دن تو یا ہر زلیخا کی موجودگی نے اسے بچالیا تھا۔ اکیلی عورت تھی...... سارا دن ادھر ادھر گھروں میں جھانکتی رہتی تھی۔ سو مشتاق پہ بھی نظر پڑی تو اسے عبدالرحیم کے گھر پہ نہ ہونے کا کہہ کر وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ مگر آج...... دروازہ ایک مرتبہ پھر زور سے دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ وہ کانپتی لرزتی دروازے تک آئی۔

''کون ہے؟'' اس کی آواز میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

''دروازہ کھول دے بانی...... ورنہ میں اندر دیوار پھلانگ کے آجاؤں گا۔ تب کون بچائے گا تجھے۔'' ان کی کرخت آواز سن کر وہ تیزی سے پیچھے ہوتی نیم کے تنے سے جالگی۔

''بانی...... ذرا دروازہ کھول دھی۔'' اور بالکل اس وقت اس نے زلیخا کی آواز سنی تھی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا اور مشتاق کے سامنے کھڑی زلیخا میں سما گئی تھی۔

''چل...... اب اندر آجا مشتاقیا......'' بانی کی کمر سہلاتی' اندر آتی زلیخا نے مشتاق کو مخاطب کیا۔

''ذرا میں بھی تو دیکھوں' تجھے عبدالرحیم کے جانے کے بعد کون سا کام یاد آجاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں کڑواہٹ بھری تھی۔

''وہ...... وہ...... میں...... تو......'' ان کے بدرنگ چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''لے...... یہ کیا بات ہوئی بھلا...... کوئی کام تو ہوگا نہ جو تو روز ادھر آمرتا ہے۔'' زلیخا کی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔

''وہ...... میں...... تو......'' ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کرتے وہ ہکلائے۔ زلیخا بالکل اس کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔

''یاد رکھیں مشتاقیا! دھیاں سب سانجھی ہوندیاں نیں ۔۔۔۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے واپس مڑ گئے۔ بانی نے دیکھا تھا...... نیم کی چھاؤں اس سے بہت دور تھی...... زلیخا کے سائے نے اسے ہر دھوپ سے بچالیا تھا۔

☆☆☆

''ابا...... تو دوسری شادی کرلے۔'' اس رات طاقچے میں دیا جلاتے ہوئے اس نے فرمائش کی۔ عبدالرحیم چونک گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟ جھلی تو نئیں ہوگئی۔'' وہ حیران ہوا۔

''مجھے زلیخا باجی بہت اچھی لگتی ہیں ابا۔ بس تو ان سے شادی کرلے۔''

عبدالرحیم کا دل ڈوب کے ابھرا تھا۔ کبھی اس نے کیسی چاہ کی تھی زلیخا کی۔ لیکن برادری کے فرق سے اس کے ابا، اماں نے اس کی شادی کہیں اور کردی۔ وہ بس گئی۔ عبدالرحیم کی زندگی کا خلا شانو نے مکمل کردیا تھا۔ اور اب جب وہ اُجڑ کے کئی سال سے اماں کے در پہ واپس پڑی تھی، تو نہ جانے کیوں شانو کے بعد خود بہ خود پھر اس کی راہ میں آنے لگی تھی اور اس طرح آج بانی......

''تو، تو کام پہ چلا جاتا ہے ابا...... پیچھے میں اکیلی رہ جاتی ہوں۔ ذرا سی دستک پہ دل کانپ جاتا ہے۔'' وہ بیٹی تھی، حیا کے پردے میں لپیٹ کر باپ کو سمجھانے لگی۔ وہ تو کچھ بول ہی نہ سکا۔ وہ آکر اس کی برابر والی چارپائی پہ لیٹ گئی۔

''بول ابا...... کرے گا نا دوسری شادی۔'' اسے سکون نہ تھا۔

''جیسے میری بیٹی بولے گی، میں ویسا ہی کروں گا۔'' پریشان سا جواب آیا تھا۔

بانی کے اندر تک سکون اُتر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دنوں بعد پُرسکون نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ دیر سے سہی ابا نہ سہی، مگر وہ خالہ کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ایک سال پہلے کہی گئی بات کا مطلب...... بھلے ہی کچھ خوف بھی تھے، لیکن وہ سمجھ گئی تھی۔

''درخت تو درخت ہوتا ہے نا...... ہوادار...... سایہ دار...... چاہے کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔'' ☆



English®
تیرا روپ
بہت خوب
English
UBTAN TURMERIC CREAM
SnScares
@SnScare

بشریٰ احمد

محبت تیرے رنگ

"یقین کریں بھائی صاحب! جب سے یہ خبر پڑھی ہے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ دشمنوں کی حویلی میں خوشیاں منائی جا رہی ہوں گی۔ خانم بی بی کو ہم پر ایک اور برتری حاصل ہوگئی۔"

شہباز علی خان نے دکھ بھرے لہجے میں بڑے بھائی کو مخاطب کیا۔ قاسم علی خان نے ہنکارا بھرا تھا، جیسے چھوٹے بھائی کی تائید کی ہو، پھر دوبارہ سامنے میز پر دھرا اخبار اٹھا کر خبر تفصیل سے پڑھی۔

"اگر دونوں ہم جماعت نہ ہوتے تو اور بات تھی اور زیادہ غصہ مجھے اس بات کا ہے کہ عفان نے یہ خبر ہم سے کیوں چھپائی۔ اسے تو یقیناً ہم سے پہلے پتا لگ گیا ہوگا۔ اخبار میں خبر تو ذرا تاخیر سے لگتی ہے۔"

شہباز علی خان خفگی بھرے لہجے میں مخاطب ہوئے۔ قاسم علی خان نے اپنے تندخو بھائی پر ایک نگاہ ڈالی۔ اگلے پل انہوں نے اپنے ذاتی ملازم کو بلند آواز میں پکارا تھا۔ نوازش بوتل کے جن کی طرح فوراً حاضر ہوا تھا۔

"کہاں ہے وہ گدھا۔ دس منٹ پہلے تمہیں کہا تھا کہ اسے بلا کر لاؤ۔" انہوں نے دھاڑ کر پوچھا تھا۔

"گدھا، گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے خان صاحب۔" نوازش بے ساختہ بول اٹھا تھا، مگر دونوں خانوں کی قہر بار نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اگلے ہی پل وہ منمنایا تھا۔

"چھوٹے صاحب گہری نیند سو رہے ہیں۔ میں بہت دیر دروازہ بجا کر آیا ہوں۔"

"دو منٹ کے اندر اگر اسے جگا کر نہ لائے تو اس کا تو جو حشر کروں گا سو کروں گا، تمہارا بھی کم برا حشر نہیں ہوگا۔" قاسم علی خان کے کہنے پر نوازش الٹے پاؤں باہر بھاگا تھا۔

پانچ منٹ بعد سوئی ہوئی کیفیت میں جمائیاں لیتا عفان باپ کی خواب گاہ میں داخل ہوا، مگر باپ اور چچا کی غصیلی نگاہوں کا احساس ہوتے ہی جمائی کے لیے کھلا منہ فوراً بند کر لیا تھا۔

"خیریت بابا جان! آپ نے صبح صبح کیسے یاد



ناولٹ



کیا۔" سلام کے بعد اس نے نہایت ادب سے دریافت کیا تھا۔ قاسم علی خان نے طنزیہ نگاہوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا تھا۔ عفان نے ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ گھڑی ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔

"وہ دراصل رات کو دیر تک پڑھتا رہا تھا نا۔ اسی لیے صبح وقت پر آنکھ نہیں کھلی۔" اس نے کھسیا کر وضاحت دی تھی۔

"اوہ خوب، تو گویا آپ رات کو دیر تک اسٹڈی کرتے ہیں۔" قاسم خان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"جی بابا جان!" وہ ان کے لہجے کا طنز نہ بھانپ پایا تھا، جب ہی مؤدب انداز میں جواب دیا۔

"آج کا اخبار پڑھا آپ نے عفان خان....." اس بار چاچا جان نے اسے مخاطب کیا تھا۔"

"جی وہ تو رات کو ہی پڑھ لیا تھا۔" بہت مگن انداز میں جواب دیا، مگر باپ اور چچا کی طنزیہ نگاہوں سے فوراً غلطی کا احساس ہو گیا۔

"میں ابھی سو کر اٹھا ہوں۔ آج کا نیوز پیپر خواب میں تو پڑھنے سے رہا۔" کچھ نروٹھے سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ اب پڑھ لیں۔" قاسم علی خان نے اخبار اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

عفان نے ناسمجھی کے عالم میں ان کے ہاتھ سے اخبار لیا تھا۔ سرسری سے انداز میں اخبار پر نگاہیں دوڑائیں، پھر دوبارہ الجھ کر باپ کو دیکھا، وہ ان کا مقصد سمجھ نہ پایا تھا۔ قاسم علی خان نے اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر ایک خبر پر انگلی رکھی۔ عفان نے آگے جھک کر خبر پڑھی۔

"واؤ! تیمور کی پوزیشن کی خبر اخبار میں بھی آ گئی۔" اس نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا، مگر اس اظہار کے بعد احساس ہوا کہ کس سنگین غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا ہے۔

"تو تیمور کی پوزیشن کی خبر اخبار میں بھی آ گئی، یہ اتنی خاص خبر تو نہ تھی۔" اس بار لہجے میں مصنوعی غصہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

"ساری رات پڑھائی تم کرتے ہو اور ہر بار پوزیشن لے اڑتا ہے تیمور خان۔" بابا جان نے بیٹے کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔ باپ کی خفگی اور چچا کی غضب ناک نگاہوں سے خائف ہو کر عفان نے خاموشی سے سر جھکانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

"خانم بی بی کی حویلی میں جشن منایا جا رہا ہوگا۔ تم نے ہمارا شملہ نیچے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی عفان۔" شہباز خان کورہ رہ کر یہ ہی قلق ستا رہا تھا۔

"تیمور صرف بڑی حویلی والوں کا جانشین تو نہیں۔ آپ سے بھی بڑی قریبی رشتہ داری نکلتی ہے اس کی۔" بہت مشکل سے یہ فقرہ عفان کی نوک زبان سے واپس پلٹا تھا۔ اتنے میں خیر ہوئی نوازش نے اندر آ کر دونوں خانوں کو مؤدب انداز میں یاد کروایا تھا کہ گاڑی کب سے تیار ہے۔

"ہم زمینوں کا دورہ کرنے جا رہے ہیں اور اگر تمہاری نالائقی برقرار رہی تو تمہیں شہر سے بلوا کر زمینوں کا سارا انتظام تمہیں سونپ دیں گے۔" قاسم علی خان نے کڑے تیوروں سے بیٹے کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

"جی بابا جان!" عفان نے چہرے پر مزید شرمندگی بھرے تاثرات سجانے کی کوشش کی تھی۔

"چلیں جانے دیں بھائی صاحب! بچہ ہی تو ہے۔" آخر شہباز خان کو ہی بھتیجے پر ترس آیا تھا۔ وہ انہیں کم پیارا تو نہ تھا۔

قاسم خان نے بھی مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔ دونوں خان صاحبان کے جانے کے بعد عفان نے پھر سے اخبار اٹھا لیا تھا۔ فرصت سے خبر دوبارہ پڑھی۔ پھر مسکراتے لبوں سے موبائل پر تیمور خان کو مبارک باد کا پیغام ٹائپ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

''تو پھر یہ طے ہے امو جان کہ آپ میرے اور عفاف کے لیے بابا جان اور آ کا جان کے سامنے کوئی اسٹینڈ نہیں لیں گی۔'' وریشہ نے بے حد دکھ بھرے لہجے میں عائشہ بیگم کو مخاطب کیا تھا۔

''تم چچی جان سے یہ توقع لگائے بیٹھی ہو کہ وہ، وہ دو تند خو اور ظالم جابر ٹائپ بندوں کے سامنے تمہارے لیے اسٹینڈ لیں۔ چچی جان کی گردن اتنی پتلی نظر آ رہی ہے تمہیں؟'' عفان نے بے حد افسوس کے عالم میں وریشہ کو مخاطب کیا۔ وہ سب اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔ قاسم علی خان اور شہباز علی خان کا انتظار تھا۔ وریشہ نے ماں کو مخاطب کیا تھا، مگر جواب عفان کی طرف سے آیا تھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ بابا اور آ کا جان ہرگز ظالم، جابر نہیں اور دوسری بات یہ کہ جب آپ ایک انتہائی جائز مقصد کے لیے بہنوں کو سپورٹ نہیں کریں گے تو پھر مجبوری کے عالم میں مدد کے لیے امو جان کی طرف ہی دیکھنا ہوگا۔'' وریشہ تنک کر بولی تھی۔

''خود کو بہنوں کی کیٹیگری میں شامل کر رہی ہے اور پھر چاہ رہی ہے کہ سپورٹ بھی کروں۔''

عفان کا تو حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ اتنے میں شہباز خان اور قاسم خان ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تھے۔ فی الوقت بحث اختتام پذیر ہو گئی، لیکن کھانے کے بعد عفاف اور وریشہ ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بات چھیڑنے کے اشارے کرنے لگیں۔

''کیا بات ہے وریشہ! تم بابا جان سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو کیا؟'' آخر عفان سے ضبط نہ ہو سکا تو مسکراتے ہوئے وریشہ کو خاطب کیا۔ قاسم علی خان نے چونک کر بھتیجی کو دیکھا۔

''ہاں بیٹا! کہو، کیا بات ہے؟'' انہوں نے پرشفقت انداز میں وریشہ کو مخاطب کیا۔ وریشہ یک دم مخاطب کیے جانے پر سٹپٹا ہی تو گئی۔

''جی......وہ......آ کا جان......وہ میں کہہ رہی تھی......'' اس نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ تھوک نگلا، پھر مدد طلب نگاہوں سے عفاف کو دیکھا، جو نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کچھ بولنے پر اکسا رہی تھی۔

''کیا بات ہے وریشہ! بولتیں کیوں نہیں۔'' اس بار شہباز خان نے بارعب انداز میں بیٹی کو مخاطب کیا۔ اس بار وریشہ کی صحیح معنوں میں سٹی گم ہوئی تھی۔

''وہ بابا......! عفاف آپ سے اور آ کا جان سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔''

اس نے بال عفاف کے کورٹ کی طرف لڑھکا دی۔ عفان نے ہمت کے اس مظاہرے پر بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

''میں نہیں تو...... میں تو کچھ کہنا نہیں چاہ رہی۔'' عفاف نے پہلے کھا جانے والی نگاہوں سے وریشہ کو دیکھا تھا اور پھر کچھ کہنے سے ہی انکاری ہو گئی۔

''وریشہ! بابا جان اور چاچا جان کا وقت کتنا قیمتی ہے۔ وقت کیوں ضائع کر رہی ہو، بتاتی کیوں نہیں، کیا بات ہے۔'' عفان نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ معاملے سے قطعی لاعلم ہو اور واقعی بات جاننا چاہتا ہو۔

''آ کا جان! میں اور عفاف شہر جا کر آگے پڑھنا چاہتے ہیں۔'' وریشہ آخر بول ہی پڑی تھی۔ ڈائننگ ہال میں یکلخت خاموشی چھا گئی۔

''اگر آپ اجازت نہیں دیتے تو خیر ہے۔ کوئی بات نہیں بابا جان!'' ہمیشہ کی بزدل عفاف نے لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈالنا چاہے۔

''تعلیم ہمارا بنیادی حق ہے۔ آ کا جان ہمیں کیوں منع کرنے لگے عفاف!'' وریشہ نے لہجہ خوشامدی سا بنایا۔

''بچیاں کیا کہہ رہی ہیں شہباز...... تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد قاسم علی خان نے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا۔

''انہوں نے جتنا پڑھ لیا، وہ بہت ہے۔ ہم بچیوں کو شہر جا کر پڑھنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں بھائی صاحب!'' شہباز علی خان کا لہجہ بے لچک تھا۔ عفاف اور وریشہ کے منہ لٹک گئے تھے۔ عائشہ بیگم کے چہرے پر بھی بڑی بے بس سی آزردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ پہلے ہی جانتی تھیں کہ شوہر کا کیا جواب ہوگا۔

''لیکن چاچا جان! آخر شہر جا کر پڑھنے میں کیا قباحت ہے۔ آخر میں بھی تو وہاں پڑھ رہا ہوں۔ وہاں بھی اپنا گھر ہے، نوکر چاکر ہیں۔'' عفان اس بار پوری سنجیدگی سے لڑکیوں کی مدد کو آیا تھا، لیکن شہباز خان نے جھلا کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''سرداروں کی بچیاں مخلوط تعلیمی اداروں میں کیسے پڑھ سکتی ہیں بابا۔''

''جیسے سرداروں کے بچے پڑھتے ہیں۔'' عفان کا جواب بے ساختہ تھا۔

''عفان! اپنی حد میں رہو۔'' قاسم علی خان کو اس کا یوں دوبدو جواب دینا پسند نہ آیا تھا، سو ناگواری سے اسے ٹوکا۔

''گستاخی معاف بابا جان! آپ لوگ جب ان علاقوں سے بڑے بڑے ایوانوں میں جاتے ہیں تو وہاں عورتوں کے حقوق کی خوب بات کرتے ہیں، لیکن آپ کے اپنے گھر کی عورتیں تمام حقوق سے محروم رہتی ہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

''بیٹا جی! ہم نے انہیں کس حق سے محروم رکھا ہے۔ اچھا کھاتی ہیں۔ من پسند پہنتی ہیں، مرضی سے سوتی ہیں۔ جب جی چاہے اٹھتی ہیں۔ باپ، بھائیوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتی ہیں۔ ماضی میں اس حویلی میں عورتوں کو اتنی بھی آزادی نہ تھی۔'' شہباز علی خان نے عفان کو جتانے والے انداز میں مخاطب کیا تھا۔

''آپ کی سب باتیں بجا بابا! اس حویلی میں ہماری پرورش بہت ناز و نعم سے ہوئی۔ ہمیں ہمیشہ آپ لوگوں کی محبت اور شفقت کی چھاؤں میسر آئی اور اسی محبت نے ہمیں حوصلہ دیا ہے کہ ہم آپ سے اپنا یہ بے ضرر سا مطالبہ اور معصوم سی خواہش پوری کروا سکیں۔ بہرطور ہمیں آپ کا ہر فیصلہ قبول ہوگا۔'' وریشہ نے کتنے سلیقے اور سبھاؤ سے بات کی تھی۔ عفاف نے بہت متاثر ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''وریشہ بالکل صحیح کہہ رہی بابا جان! اور جو بات ہمارے دشمنوں کو اتنے برس قبل سمجھ میں آ گئی تھی، وہ جانے ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔ خانم بی بی اپنے علاقے کے لوگوں کے دلوں پر راج کر رہی ہیں، کس خوبی سے انہوں نے اپنی جاگیر کا انتظام سنبھالا ہے، یہ یقیناً تعلیم کا بخشا ہوا شعور ہی ہے اور اگر......''

''عفان!'' قاسم علی خان اس بار دھاڑے تھے۔ عفان خاموشی سے سر جھکا گیا تھا۔

''تم حد درجہ نالائق اولاد ہو۔ تم سے اچھی ہماری بیٹیاں ہیں، انہیں جہاں تک پڑھنے کا موقع ملا، انہوں نے اپنی تعلیمی قابلیت کے جھنڈے گاڑ کر ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا اور اگر اس بار تم کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دے لیتے، جیسا تیمور خان نے انجام دیا ہے، تو ہم شاید ان بچیوں کو مقابلے کی دوڑ میں شریک نہ ہونے دیتے۔ اب ہمیں انہیں آگے تعلیم جاری رکھنے کا موقع دینا ہی پڑے گا۔'' قاسم علی خان کی بات سب کے لیے اتنی غیر متوقع تھی کہ چند لمحوں کے لیے سب ہی ہکا بکا رہ گئے تھے۔

''یعنی کہ...... یعنی کہ ہم آگے پڑھ سکتے ہیں؟'' خوشی کے مارے عفاف کی آواز کپکپا گئی تھی، وریشہ کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ عفان مسکرا رہا تھا۔

عائشہ بیگم کے لبوں پر بھی آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی، صرف شہباز علی خان تھے جو کرسی پر بے اطمینانی سے پہلو بدل رہے تھے۔ بڑے بھائی کا یہ فیصلہ ان کے من کو قطعاً نہ بھایا تھا۔ لیکن انہیں اس فیصلے کا احترام کرنا تھا۔ بخوشی نہ سہی، طوعاً، کرہاً ہی سہی۔ کیوں کہ اس حویلی میں حتمی فیصلے کا اختیار قاسم علی خان کے پاس ہی تھا۔

☆☆☆

"مجھے پتا تھا آ کا جان ہمیں آرام سے اجازت دے دیں گے۔" یہ وریشہ تھی جو بہت خوشی کے عالم میں عفاف سے مخاطب تھی۔ دونوں ہمجولیاں ٹیرس پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ طمانیت اور خوشی کا عجب ہی عالم تھا۔

"سچ کہوں تو مجھے ایک فیصد بھی امید نہ تھی اور جب بھائی، چاچا جان سے بحث کر رہے تھے اور بابا جان نے انہیں دھاڑ کر چپ کروایا تو میری روح ہی فنا ہو گئی تھی۔" عفاف نے اس وقت کی دلی کیفیت بیان کی۔

"ارے......تم تو ہو ڈرپوک...... پتا ہے آ کا جان اندر سے بالکل ویسے نہیں جیسے باہر سے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بالکل اخروٹ کی مانند ہیں، باہر سے سخت اور اندر سے......"

"شرم نہیں آتی۔ میرے بابا جان کو اخروٹ سے تشبیہہ دیتے ہوئے۔" عفان اچانک وہاں آ نکلا تھا۔

"بھائی! آپ کا بھی بہت شکریہ۔ آج آپ نے ہمارے لیے بہت اسٹینڈ لیا۔" وریشہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عفاف نے بہت ممنونیت سے عفان کو مخاطب کیا۔

"اگر انہوں نے بہنوں کی حمایت میں دو چار فقرے بول دیے تو یہ ان کا اخلاقی فرض تھا۔ شکریہ ادا کرنے والی کون سی بات ہے۔" وریشہ بے نیازی بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اس کی بے نیازی سے زیادہ بہنوں والی بات عفان کو کھلی تھی۔

"مائنڈ اٹ! میں نے جو کچھ بھی کیا اپنی بہن کے لیے کیا۔" عفان چبا چبا کر بولا تھا۔

"تو میں نے کب کہا کہ میرے لیے کیا۔" وریشہ خفگی کو چھپا نہ پائی تھی۔

"ایک تو آپ دونوں ہر وقت لڑائی کے موڈ میں رہتے ہیں۔ خوشی کے موقع پر تو ہنس کر بات کر لیں۔" عفاف نے دونوں کو رسانیت بھرے لہجے

میں مخاطب کیا۔ عفان نے وریشہ کے پھولے منہ کو دیکھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وریشہ بھی منہ پھیر کر ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

تیمور ہلکی سی دستک دینے کے بعد ماں کے بیڈ روم میں داخل ہوا تھا۔ زہرہ بیگم بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ بیٹے کے قدموں کی چاپ پر آنکھیں کھول کر دیکھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے امی۔'' وہ بیڈ کی پائینتی پر بیٹھ گیا۔ زہرہ بیگم اٹھ بیٹھی تھیں۔

''ٹھیک ہوں میرے چاند! تم بلاوجہ پریشان ہوجاتے ہو۔'' انہوں نے بیٹے کو ممتا لٹاتی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''میں بلاوجہ پریشان نہیں ہوتا امی۔ ایک مہینے میں تیسری بار آپ کا بی پی شوٹ کیا ہے۔ ضد چھوڑیں اور میرے ساتھ شہر جا کر تفصیلی چیک اپ کروائیں۔ بی بی جان بھی یہ ہی کہہ رہی ہیں کہ میں آپ کو زبردستی شہر لے جا کر آپ کا تفصیلی چیک اپ کرواؤں۔''

''تمہاری طرح تمہاری بی بی جان بھی خواہ مخواہ پریشان ہوجاتی ہیں۔ میں ذرا سی بد پرہیزی کرلوں تو بی پی گڑبڑ کرنے لگتا ہے بس اور کوئی بات نہیں۔ اب سختی سے پرہیز کروں گی، تم فکر مت کرو۔'' انہوں نے بیٹے کو تسلی دی۔ وہ بس انہیں خفگی سے دیکھ کر رہ گیا۔

''واپسی کب کی ہے تیمور؟'' زہرہ بیگم نے استفسار کیا۔

''ان شاء اللہ کل صبح چلا جاؤں گا امی۔ ویسے میرا ارادہ یہ ہی تھا کہ اس بار آپ کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں، لیکن آپ مانتی ہی نہیں۔''

''اگلی بار چل پڑوں گی تمہارے ساتھ۔ تفصیلی چیک اپ بھی کروالوں گی، اب خوش۔'' وہ مسکرائیں۔ وہ کوئی جواب دیے بنا ماں کے ہاتھ چوم کر مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

شہر آ کر عفاف کا دل بالکل نہ لگ رہا تھا۔ وریشہ البتہ بہت پرجوش تھی۔ کلاسز شروع ہونے میں دو، چار دن باقی تھے۔ آج کل وہ دونوں عفان کے ساتھ جا کر ضروری اشیا کی خریداری کررہی تھیں۔

''میں وہ احمق ہوں جس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری اور بابا جان سے تم لوگوں کے آگے پڑھنے کی بات کی۔ میری تو آزادی ہی سلب ہوکر رہ گئی ہے۔ رات دیر تک دوستوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔ دوستوں کو گھر نہیں بلوا سکتا۔ ذرا سی فرصت ملے تو تم دونوں شاپنگ کی لسٹ لے کر سر پر سوار ہوجاتی ہو۔ کیا مصیبت ہے یار۔'' عفان آج جھنجلا ہی تو گیا تھا۔

''آپ کا موڈ نہیں ہے تو کوئی بات نہیں بھائی! جس دن آپ کو فرصت ملے گی پھر چل پڑیں گے۔''

سدا کی صلح جو عفاف بغیر برا مانے بولی تھی اور اس کے جانے کے بعد عفان کو بہن سے اتنے سخت لہجے میں بولنے پر افسوس ہوا تھا۔ وہ ان دونوں کو شاپنگ پر جانے کے لیے تیار ہونے کا کہنے ان کے کمرے تک آیا تھا کہ وریشہ کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

''تمہارے بھائی نے آج اپنے دل کی بات کہہ دی۔ میں اتنے دنوں سے اس کی جھنجلاہٹ نوٹ کررہی تھی۔ ہم دونوں یہاں آ کر رہنے لگے ہیں، اس وجہ سے اس کی سرگرمیوں میں خلل پڑا ہے، بس اسی لیے اتنا کھڑوس ہوگیا ہے۔ ابھی تو دیکھنا، جب ہم اس کے ساتھ یونی ورسٹی جانے لگیں گے، تب اس کی جھنجلاہٹ کا کیا عالم ہوگا۔'' وریشہ پورے وثوق سے بولی تھی۔

''تم کیا چاہ رہی ہو۔'' عفاف اس کی بات سن کر ذرا سا خفا ہوئی۔

''مائنڈ مت کرنا عفاف! لیکن مجھے تمہارے بھائی پر ذرا سا بھی اعتماد نہیں اور سچ کہوں تو شہر آ کر پڑھنا میری خواہش تو تھی، لیکن یہاں آنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ میں تمہارے بھائی کا کریکٹر

جانچنا پرکھنا چاہتی تھی۔" وریشہ مزے سے بول رہی تھی اور باہر کھڑے عفان کا خون اس کے زریں ارشادات سن کر کھول رہا تھا۔

"اچھا ایسے گھورو تو مت۔ آخر تمہارے بھائی سے میری قسمت پھوٹنی ہے۔ جانچ پڑتال کا حق تو حاصل ہے نا مجھے۔" عفاف کے گھورنے پر وہ ہنس کر بولی تھی۔

"ایسا ہے تو ایسا ہی سہی، وریشہ صاحبہ! تم اپنا جانچ پڑتال کا حق استعمال کرو۔ میں تمہیں مایوس نہ ہونے دوں گا۔ تمہارے خدشات کو سچ ثابت کرنا اب میرا کام ہے۔"

"محبت ......" کی بے اعتباری دیکھ کر عفان شدید ہرٹ ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دینے کے بجائے وہ الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

کمرے میں اب عفاف سہیلی کو لعن طعن کرنے میں مصروف تھی۔

"اتنی محبت کرتے ہیں بھائی تم سے اگر تمہاری بکواس سن لیں تو انہیں کتنا دکھ پہنچے گا۔"

"تمہارا بھائی مجھ سے محبت کرتا ہے، یہ بات اس نے مجھے خواب تک میں تو آ کر بتائی نہیں۔ حقیقت میں اظہار اور اقرار تو بہت دور کی بات ہے اور میں نے جو کچھ کہا غصے میں ہی کہا ہے، ہم صبح سے شاپنگ کی لسٹ فائنل کر رہے تھے اور محترم نے عین وقت پر انکار کر دیا۔ ایسے میں اس پر غصہ بھی نہ آئے۔" وریشہ اس بار منہ بنا کر بولی تھی۔

"بھائی کا آج موڈ نہیں، وہ ہمیں کل لے جائیں گے۔ تم اتنا ڈیپریس نہ ہو۔"

عفاف نے اسے تسلی دی۔ وریشہ نے بھی بحث میں پڑے بغیر اثبات میں گردن ہلا کر گویا عفاف کی بات سے اتفاق کر لیا تھا۔

☆☆☆

عفاف اور وریشہ کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔

عفان نے فقط پہلے دن دونوں کی رہنمائی کی تھی۔

"تمہیں جتنی گائیڈنس فراہم کر سکتا تھا، کر دی، اب تم جانو اور تمہارا کام۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے لیے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں فارغ نہیں ہوتا، مجھے یہاں اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

وہ مروت سے عاری لہجے میں دونوں سے مخاطب تھا۔ عفاف نے اس کٹھور پن پر شاکی نگاہوں سے بھائی کو دیکھا۔ عفان نے نگاہ چرالی۔

(اکیلے میں عفاف کو سمجھا دوں گا کہ اس کی کم عقل سہیلی کو عقل سکھانے کے لیے یہ رویہ اختیار کیا ہے، لیکن اس عفاف کے پیٹ میں کوئی بات ٹکتی بھی تو نہیں۔ خیر ہے کبھی کبھی گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔) عفان نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے سوچا تھا۔

اتنی سی بہن سے بے مروتی اختیار کرنا آسان کام تھوڑی تھا اور دوسری کو تو اس کے کٹھور لہجے سے کوئی فرق ہی نہ پڑا تھا۔

"ہم خود نہیں چاہیں گے کہ آپ کو چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بلاوجہ زحمت دیں، ظاہر ہے اس طرح تو ہم کبھی بھی پُراعتماد طریقے سے تعلیم حاصل نہیں کر پائیں گے۔ اپنے مسئلے آپ سلجھانے سے ہی ہم میں اعتماد آئے گا اور یہ ہی ہمارے آگے بڑھنے کا مقصد بھی ہے۔"

وہ لاپروا سے انداز میں مخاطب ہوئی تھی، گویا کہنا چاہ رہی ہو عفان صاحب آپ کو بھی ہر وقت ہمارے سر پر سوار رہنے کی ضرورت نہیں، اس انداز پر عفان کا خون کھول اٹھا تھا، لیکن اس نے کچھ مزید کہنے سے گریز کیا اور بے نیاز سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر وہاں سے چلا گیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے وریشہ! یہ تم بھائی سے کس لہجے میں بات کرنے لگی ہو۔" عفاف نے خفگی سے سہیلی سے دریافت کیا۔

"جس لہجے میں تمہارا بھائی ہم سے بات کرنے لگا ہے۔ لگتا ہی نہیں عفاف یہ پرانے والا عفان ہے۔ یہ ہم سے اتنی بے زاری کا اظہار کیوں کر رہا ہے۔" وریشہ بھی اس بار روہانسی ہو کر بولی تھی۔

''بھائی! ہم سے بے زاری کا اظہار کیوں کرے گا۔ وہم ہے تمہارا۔'' عفاف نے اسے سمجھانا چاہا۔

''ظاہر ہے۔ تم بہن ہو اس کی۔ اسی کی سائڈ لینی ہے تمہیں۔'' وریشہ خفگی بھرے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

''وہ بھائی ہے تو تم ہونے والی بھابھی۔ تم بھی کم پیاری نہیں ہو مجھے۔''

عفاف نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ وریشہ نے اسے گھورنا چاہا، مگر پھر ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

''تمہیں پتا ہے عفاف، میں نے آج تیمور خان کو دیکھ لیا۔'' عفاف کتاب میں سر دیے بیٹھی تھی۔ جب وریشہ نے اسے مخاطب کیا۔ اس انکشاف پر عفاف نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''کہاں دیکھ لیا تم نے تیمور خان کو؟'' اس نے وریشہ کو گھور کر دیکھا۔

''ظاہر ہے یونی ورسٹی میں، جب تم لائبریری گئی تھیں نا بس اسی وقت میں نے تیمور بھائی کو دیکھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ تھے۔ ناجیہ نے مجھے بتایا کہ یہ تیمور خان ہیں، یونی ورسٹی کی پاپولر ترین شخصیت۔'' وہ بولے جارہی تھی۔

''تو تم نے تیمور خان کو بھائی بھی بنا ڈالا۔'' عفاف نے خفگی سے اسے ٹوکا۔

''بنانے کی کیا بات ہے۔ وہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں۔ اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے۔'' وریشہ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''ظاہر ہے جھٹلا تو کوئی نہیں سکتا، لیکن اگر تمہارے بابا یعنی میرے چاچا جان کو علم ہو گیا کہ ان کی صاحب زادی اپنے خالہ زاد بھائی کو دیکھنے کی اتنی مشتاق ہے تو وہ تمہیں یونی ورسٹی سے اٹھالیں گے۔''

عفاف نے طنزیہ انداز میں باور کروایا تھا۔ وریشہ کے لبوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کتنی زیادتی کی بات ہے نا عفاف! صرف بابا کی نام نہاد انا کی وجہ سے امو جان اپنی اکلوتی سگی بہن سے بھی نہیں مل سکتیں۔ کوئی مرجائے تو صبر آجاتا ہے، لیکن زندہ رہتے ہوئے بھی اپنے پیاروں سے اتنی لمبی جدائی، دل کو قرار آئے تو کیسے آئے عفاف۔''

وہ پوچھ رہی تھی، لیکن اس سوال کا جواب عفاف کے پاس بھی نہ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی مغموم مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

آج وریشہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے یونی ورسٹی نہیں آئی تھی۔ عفاف خود اس کے بغیر آنا نہیں چاہ رہی تھی، لیکن سر باقر کا بہت اہم لیکچر مس ہو جاتا، وریشہ نے ہی اسے زبردستی بھیجا تھا۔ لیکن آج ناجیہ محترمہ نے بھی چھٹی کر لی۔ ناجیہ کو اب تک ان دونوں کی اکلوتی یونی ورسٹی فرینڈ ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ پرخلوص اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔

وریشہ اور ناجیہ کے بغیر عفاف عجیب گھبراہٹ میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ وریشہ اس کی نسبت کہیں زیادہ پراعتماد تھی۔ اب بھی وہ سر باقر کی کلاس لے کر نکل رہی تھی کہ اسٹوڈنٹس کے ایک گروہ نے اسے گھیر لیا۔ یونی ورسٹی میں اسٹوڈنٹس کے انتظامی عہدوں کے لیے الیکشن ہو رہے تھے۔ ساتھی طلبا اپنے اپنے امیدواروں کے حق میں زبردست مہم چلا رہے تھے۔ ان کے اپنے ڈپارٹمنٹ میں بھی آج کل یہ ہی گہما گہمی عروج پر تھی۔

''آپ نے ڈیسائڈ کر لیا کہ آپ نے ووٹ کس کو دینا ہے؟'' ایک لڑکے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ عفاف نے گھبرا کر نفی میں گردن ہلا دی۔

''چلیں، فیصلہ نہیں کیا تو اب کر لیجیے۔ آپ کے ووٹ کا صحیح حق دار صرف تیمور خان ہے، آپ نے ووٹ صرف اسی کو دینا ہے۔'' لڑکے نے اسے قطعی انداز میں باور کروایا تھا اور اس حکمیہ لہجے کو سن کر وہ سٹپٹا ہی تو گئی تھی۔

''میں تیمور خان کو ووٹ کیسے دے سکتی ہوں۔''

اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر پھسلا تھا۔

"کیوں بھئی۔ کیوں نہیں دے سکتیں آپ تیمور خان کو ووٹ؟" اس بار ایک تیز طرار لڑکی نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا، اس کا لہجہ اور انداز عفاف سے برداشت نہ ہو پایا۔ یہ لوگ کس خوشی میں اس پر اتنا رعب جما رہے ہیں۔ خاندانی انا، فطری بزدلی پر غالب آئی اور اس نے سپاٹ سے انداز میں انہیں مخاطب کیا تھا۔

"وہ ہمارے دشمنوں میں سے ہیں۔ ہم ان کی حمایت نہیں کر سکتے۔"

"ہائیں! کیا کہہ رہی ہو۔ تیمور تمہارا دشمن؟" تیز طرار خرانٹ سی سینئر نے اس غیر متوقع جواب پر حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

باقی لوگوں کے تاثرات بھی اس سے مختلف نہ تھے اور بات کہنے کے بعد عفاف کو اس کی نامعقولیت کا بخوبی احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سینئرز کے تاثرات دیکھ کر پھر سے پزل ہو گئی۔

"ہاں بتائیں تو محترمہ! تیمور خان سے کس قسم کی دشمنی ہے آپ کی؟" ایک اور اسٹوڈنٹ اچنبھے کے عالم میں استفسار کر رہا تھا۔

عفاف بہت بری پھنسی تھی۔ کاش اس وقت وریشہ ہوتی، وریشہ نہ سہی کاش عفان ہی ادھر آ نکلتا۔ اس کی بہن کس مشکل میں گرفتار تھی اور وہ قطعاً لاعلم تھا۔ عفان تو نہ آیا، مگر سامنے سے اپنے دوستوں کے ہمراہ تیمور خان ضرور چلتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ بھی یقیناً اپنی انتخابی مہم میں ہی مصروف تھا۔

"یار تیمور! ذرا ادھر آؤ، بتاؤ تو سہی یہ محترمہ تم سے کس قسم کی دشمنی کا ذکر کر رہی ہیں۔" اس کے گروپ نے اسے پکارا تھا۔

وہ حیران ہوتا ہوا قریب آیا۔ عفاف کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ دو دن پہلے وہ وریشہ کو ڈرا رہی تھی کہ تیمور کو دیکھنے کی پاداش میں اسے یونی ورسٹی سے اٹھوایا جا سکتا ہے اور اب وہ خود اس کے روبرو تھی۔

"ہم نے ان سے کہا کہ تمہیں ووٹ دیں، لیکن یہ محترمہ کہہ رہی ہیں کہ تم ان کے دشمن ہو، یہ تمہیں ہرگز ووٹ نہ دیں گی۔" چہکتی ہوئی باریک آواز والی اس تیز طرار لڑکی نے تیمور کو آگاہ کیا۔

تیمور نے استعجابیہ نگاہ عفاف پر ڈالی۔ عفاف نے بھی اسی پل اس کی حیران ڈارک براؤن آنکھوں کو دیکھا۔ پھر مزید گڑبڑا گئی۔

"دراصل یہ ہمارے مخالف قبیلے کے ہیں، اس لیے۔" اس نے اٹکتے ہوئے اپنی دشمنی کی ادھوری سی وضاحت کی۔

تیمور کو سمجھنے میں فقط چند پل لگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ عفان کی ایک بہن اور کزن نے بھی یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے اور یہ لڑکی یقیناً ان دو میں سے کوئی ایک تھی۔

"آئی ایم ساری۔ میرے دوستوں نے آپ کو تنگ کیا۔ بہت معذرت خواہ ہوں۔" اس نے فوراً سے پیشتر معذرت کا اظہار کیا تھا۔

اس کے دوست حیران رہ گئے تھے، وہ تیمور سے اس بارے میں استفسار کرنے لگے، تیمور نے ان کی بات کا جواب نہ دیا، بلکہ انہیں درشتی سے ٹوکتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہا۔ وہ واقعی پل بھر میں تیمور سمیت وہاں سے رخصت ہوئے۔ عفاف عجیب سے احساسات میں گھری وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

تیمور ویک اینڈ پر گھر گیا تو ماں کی حالت پہلے سے زیادہ ناساز تھی۔ "میں اب آپ کی ایک نہ سنوں گا، آپ کو میرے ساتھ شہر چلنا ہوگا۔" اس نے دوٹوک انداز میں انہیں باور کروایا۔

"بہت ضدی ہے تمہاری ماں۔ مانتی ہی نہیں۔ میں تو خود کب سے اس کے پیچھے پڑی ہوں کہ اپنا تفصیلی چیک اپ کروائے۔" خانم بی بی نے خفگی سے بھاوج کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے، کروالو میرا چیک اپ، لیکن سچ کہوں بی بی! مجھے تو یوں لگنے لگا ہے جیسے اب آپ

کے بھائی کے پاس پہنچنے کا وقت بس آن پہنچا ہے۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں مسکرائیں۔

"اللہ کا نام لو زہرہ! کیوں بچے کو پریشان کررہی ہو۔ بھلی چنگی ہو، چیک اپ ہوجائے گا تو بس ہمارے دل کو تسلی ہوجائے گی۔" خانم بی بی نے انہیں رسانیت سے ٹوکا، لیکن انہوں نے جیسے نند کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"تیمور کی پڑھائی ختم ہوجائے تو آپ نے فوراً اس کے لیے لڑکی ڈھونڈنی ہے۔ اللہ سے بس یہ دعا ہے کہ مجھے اتنی مہلت دے دے کہ میں اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ لوں اور مرنے سے پہلے اپنی ماں جائی سے مل لوں۔"

"شہر جاکر سب سے پہلے آپ کے ڈپریشن کا علاج کروانا پڑے گا۔ بلاوجہ اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کررہی ہیں آپ؟" تیموران پر بگڑا۔ خانم بی بی نے گہری سانس اندر کھینچی تھی۔

"تمہاری بہن سے ملنے پر ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے زہرہ، لیکن پھر بھی تمہارا تڑپنا دیکھ کر میں احساس جرم میں مبتلا ہوجاتی ہوں۔ دو قبیلوں کی دشمنی نے تم دونوں بہنوں کے مقدّر میں ہمیشہ کی جدائی لکھ دی۔" خانم رنجیدہ تھیں۔

"افوہ بی بی جان! آپ نے بھی ماں کی دوسری بات پکڑلی۔ ذرا پہلے والی بات پر دھیان دیں نا۔ میرے لیے لڑکی ڈھونڈنے والی بات۔" تیمور نے دونوں کا دھیان بٹانا چاہا، اس کے شرارتی انداز پر دونوں خواتین ہی مسکرادی تھیں۔

"اپنے شہزادے کے لیے تو میں کوئی شہزادی ہی ڈھونڈوں گی۔" انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے بھتیجے کو دیکھا۔

☆☆☆

چیف سیکریٹری کے بیٹے کا دعوت ولیمہ تھا۔ نامی گرامی مہمان مدعو تھے۔ چیدہ چیدہ صحافیوں کو بھی تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ واصف اور امبر ایک ہی چینل سے منسلک تھے اور ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بھی۔ دونوں ہی آج کی تقریب کی کوریج کے لیے موجود تھے۔ جب قاسم علی خان کی آمد ہوئی تو امبر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اس عمر میں بھی یہ شخص کتنا ڈیشنگ ہے ناواصف! جوانی میں تو کیا قیامت ڈھاتا ہوگا۔"

"دولت کی فراوانی ہو تو وجاہت کو زوال بھی دیر سے آتا ہے۔" واصف نے عجیب انداز سے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ امبر نے اسے پل بھر کے لیے گھورا تھا، پھر دوبارہ قاسم علی خان کی طرف متوجہ ہوئی، جو اپنی نشست سے اٹھ کر اپنے ہی علاقے کی ایک معزز خاتون سے سلام دعا کررہے تھے۔

"کتنے کلچرڈ اور ویل مینرڈ بھی ہیں۔ دیکھو تو سہی زرمینے خان کی آمد پر انہیں کیسے تعظیم دی ہے اور کتنی متانت اور شائستگی سے ان سے مخاطب ہیں، حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے روایتی حریف ہیں۔" امبر نے مزید تبصرہ کیا تھا۔

"ہاں، یہ تو سچ ہے کہ دونوں کے قبائل ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں، اب تو خیر عرصہ دراز سے دونوں قبیلوں میں خونریزی نہیں ہوئی ہے۔ زرمینے خان اپنے علاقے میں خانم بی بی کہلاتی ہیں اور اپنے علاقے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کام کررہی ہیں۔ تمہارے قاسم علی خان کو بھی اپنے ووٹ بینک کو قائم رکھنے کے لیے مجبوراً ان ہی کے نقش قدم پر چلنا پڑ رہا ہے۔ ورنہ یہ لوگ بہت ظالم، جابر اور تندخو ہوتے ہیں۔"

واصف نے مسکرا کر امبر کی معلومات میں اضافہ کیا تھا اور وہ "تمہارے" قاسم علی خان کہنے پر بس اسے گھور کر ہی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ناجیہ کی والدہ اسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔ عفان کی اجازت سے عفاف اور وریشہ ان کی مزاج پرسی کرنے اسپتال گئے تھے۔ اسپتال میں ہی وریشہ کو چند یونی ورسٹی فیلوز نظر آئی تھیں۔

"یہ نک چڑھی سینئرز بھی کیا آنٹی کی عیادت

کرنے آئی تھیں؟'' وریشہ نے حیرانی سے ناجیہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ارے نہیں۔ یہ لوگ تیمور خان کی والدہ کا حال پوچھنے آئے تھے۔ وہ بھی اسی وارڈ میں ایڈمٹ ہیں، ان کا بھی ہارٹ کا کوئی پرابلم ہے۔'' ناجیہ نے سادگی سے بتایا۔

''وہ خیریت سے تو ہیں نا؟'' وریشہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں، اب تو بہتر ہیں، صبح میں بھی مہرین کے ساتھ ان کا حال پوچھ کر آئی ہوں۔'' ناجیہ نے اپنی کزن کا نام لیا، جو تیمور کی کورس میٹ تھی۔

''عفاف! ہم بھی انہیں ایک نظر دیکھ لیں۔'' وریشہ نے لجاجت سے عفاف کو مخاطب کیا۔

''ہرگز نہیں، دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟'' عفاف نے اسے ڈپٹا تھا۔

''پلیز عفاف! صرف ایک نظر......'' وریشہ کا لہجہ مزید ملتجیانہ ہوا تو عفاف کا سر بھی مزید قطعیت کے ساتھ نفی میں ہلا تھا۔ ناجیہ کے لیے اگر وریشہ کا اصرار نا قابل فہم تھا تو عفاف کا رویہ بھی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''اچھا! تم نہ چلو میرے ساتھ۔ میں خود جا رہی ہوں، بس ایک نظر ہی تو دیکھنا ہے۔ ناجیہ! تم پلیز، مجھے ان کا روم نمبر بتاؤ۔''

وریشہ نے ناجیہ کو مخاطب کیا اور کمرہ نمبر جان کر فوراً باہر نکلی تھی۔ دانت پیستے ہوئے عفاف بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔ مطلوبہ کمرے میں دستک دے کر دونوں اندر داخل ہوئیں تو سامنے ہی بیڈ پر تیمور کی والدہ نیم دراز تھیں۔ عفاف نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس وقت ایک ملازمہ کے سوا ان کے پاس کوئی موجود نہ تھا۔

وریشہ نے اپنا تعارف تیمور کی کلاس فیلو کی حیثیت سے کروایا تھا۔ انہوں نے بہت پرشفقت انداز میں مسکرا کر دونوں کے سلام کا جواب دیا تھا۔ وریشہ اب بے تابی سے ان کی طبیعت کے بارے میں دریافت کر رہی تھی۔

عفاف اس کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھی، لیکن یہ جذباتیت ہرگز بھی سودمند نہ تھی۔ تیمور کی والدہ بھی قدرے چونکی تھیں۔ صبح سے تیمور کے کلاس فیلوز ان سے ملنے آرہے تھے، لیکن وہ سب رسمی عیادت کرنے آئے تھے، لیکن یہ بچی ان کی صحت کے بارے میں کتنی فکرمندی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس تشویش کا اظہار اس کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔

''بس بیٹا! تیمور تو روٹین چیک اپ کے لیے شہر لایا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد انجائنا کا اٹیک ہوگیا۔ اب تو خدا کا شکر ہے طبیعت خاصی بہتر ہے، اب دیکھو، ڈاکٹرز کب ڈسچارج کرتے ہیں۔'' وہ مسکرا کر مخاطب ہوئی تھیں۔

''اپنی صحت کا خیال رکھا کریں آپ۔ مجھے پتا ہے میری اموجان کی طرح آپ بھی اپنی صحت کے بارے میں لاپروائی برتتی ہوں گی۔'' وریشہ اپنائیت بھرے انداز میں ان سے مخاطب تھی۔

''بیٹا! اپنا نام تو بتاؤ۔ تیمور آئے گا تو میں اسے بتا تو سکوں کہ دو پیاری سی بیٹیاں مجھ سے ملنے آئی تھیں اور ان کا نام یہ تھا۔''

ان کے کہنے پر وریشہ نے تھوک نگلا۔ عفاف نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے گھورا۔ اب بتائے اپنا نام۔ اسے جی ہی جی میں وریشہ پر خوب تاؤ چڑھ رہا تھا۔ وریشہ کچھ پل سوچ کر کوئی فرضی نام بتانے والی تھی، مگر اس کی نوبت نہ آئی، اسی وقت دستک دے کر کوئی اندر آیا تھا اور آنے والی دونوں شخصیات کو دیکھ کر عفاف اور وریشہ کے ہاتھوں کے طوطا، مینا، چڑیا سب اڑ گئے۔ وہ تیمور تھا اور اس کے ساتھ عفان جو ایسی قہربار نگاہوں سے دونوں کو گھور رہا تھا کہ اس کی نگاہوں کی تاب لانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

''آؤ عفان بیٹا! کیسے ہو؟'' زہرہ بیگم نے مسکرا کر عفان کو مخاطب کیا۔ عفان نے بھی اپنے تیکھے تیوروں پر قابو پا کر ادب سے انہیں سلام کیا۔

''بیٹا! یہ تمہاری کلاس فیلوز میری عیادت کرنے

آ ئی تھیں۔'' اس بار تیمور کو مخاطب کیا۔ انہیں حیرت بھی ہوئی تھی کہ یہ کیسے کلاس فیلوز تھے جو ایک دوسرے کو سلام تک کرنے کے روادار نہ تھے۔

''ہم چلتے ہیں آنٹی، اپنا خیال رکھیے گا۔'' وریشہ جلدی سے اٹھی تھی۔

تیمور نے ایک سرسری نگاہ وریشہ پر ڈال کر اس کے ساتھ کھڑی اس کامنی سی لڑکی کو دیکھا، وہ وہی تھی جو اس روز تیمور کے دوستوں کے سامنے اپنی دشمنی کا تذکرہ کرکے پھنس گئی تھی اور اب بھی اس کے چہرے کے تاثرات اس روز سے مختلف نہ تھے۔

بے تحاشا گھبرائی ہوئی پریشان شکل والی لڑکی کے صبیح چہرے سے نگاہیں ہٹانے میں تیمور کو خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ پل بھر میں وہ دونوں رخصت ہوئی تھیں۔ عفان گہری سانس اندر کھینچتا زہرہ بیگم کے قریب آیا تھا۔

''آپ کی بھانجی بہت جی دار ہے۔ آپ سے ملاقات کر ہی لی۔'' عفان کے کہنے پر ان کی آنکھوں میں بے یقینی تیرنے لگی تھی

''یہ وریشہ تھی۔ میری عائشہ کی بیٹی۔'' زہرہ بیگم کی آواز سرسرائی تھی۔ عفان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے بتا تو دیتی۔ میں اسے ایک بار سینے سے تو لگا لیتی۔'' وہ تڑپی تھیں۔

''آپ صحت یاب ہوکر گھر چلی جائیں۔ میں کسی بہانے سے اسے آپ سے دوبارہ ملوانے لے آؤں گا۔'' عفان نے انہیں تسلی دی۔

''نہیں بیٹا، اگر اس کے باپ کو پتا چل گیا تو بہت برا ہوگا۔'' انہوں نے فوراً ہی منع کر دیا۔ چہرے پر آزردگی چھا گئی تھی۔ تیمور اور عفان بھی خاموشی اور بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

''بھائی بہت خفا ہوں گے وریشہ۔'' عفاف، عفان کی متوقع ناراضی سے سہم رہی تھی۔

''کیوں ہوگا تمہارا بھائی خفا، وہ بھی تو وہاں زہرہ خالہ کی عیادت کو ہی گیا تھا نا، حالانکہ اس کا تو ان سے کوئی قریبی رشتہ بھی نہیں اور میری تو وہ سگی خالہ ہیں۔'' وریشہ کو عفان کی خفگی کی مطلق پروا نہ تھی۔

''ویسے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہارا بھائی وہاں گیا کیوں اور وہ بھی تیمور بھائی کے ہمراہ۔ خالہ نے عفان کو نام لے کر پکارا، یعنی وہ پہلے سے اسے جانتی ہیں۔'' اب وہ قیاس کے گھوڑے دوڑا رہی تھی۔

''اپنی ناقص عقل پر اتنا زور مت دو اور آئندہ بہادری کا کوئی کارنامہ سرانجام دینے سے پہلے مجھ سے اجازت نہ سہی، مشورہ ضرور مانگ لینا۔'' عفان جانے کب وہاں آ نکلا تھا۔ ایک پل کو تو وریشہ بھی خفیف سی ہوکر چپ ہوگئی تھی۔

''تمہاری خالہ سے ملنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تیمور میرا بہت اچھا دوست ہے اور ہم دونوں ہی نسلوں پرانی دشمنی سے نجات چاہتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں عائشہ چچی اور زہرہ آنٹی کے درمیان برسوں کی پھیلی ہوئی جدائی کی خلیج پاٹنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ میں دونوں کی اذیت سے واقف ہوں، لیکن تمہارے ظالم، جابر بابا جان کے ہوتے ہوئے دونوں کی ملاقات کی ہمت ابھی تک نہ کر پایا ہوں، ہاں میرے ذریعے دونوں فون پر ایک دوسرے کی آواز سن لیتی ہیں اور میں توقع کرتا ہوں کہ تم دونوں اس راز سے آگاہ ہونے کے بعد کہیں آگے نشر نہیں کرو گی۔''

وہ سیدھے سپاٹ انداز میں دونوں سے مخاطب تھا۔ وریشہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اگر عفان ان کے بہادری کے کارنامے سے آگاہ ہوگیا تھا تو وہ بھی تو تیمور خان اور اس کی دوستی سے واقف ہوگئے تھیں۔ اسی لیے تو موصوف نے ''گوشمالی'' کرتے ہوئے ہاتھ اتنا ہولا رکھا تھا، لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اب دل میں محبت بھرے جذبات کے ساتھ اس کی قدر بھی بڑھ گئی تھی۔

''مجھے ہرگز اندازا نہ تھا عفاف کہ تمہارا بھائی

اتنا گریٹ ہوگا۔ اس نے امو جان کے لیے کتنی ہمت دکھائی نا اور امو جان نے آج تک میرے سامنے بھاپ تک نہ نکالی کہ وہ اور خالہ ایک دوسرے سے ٹیلی فونک رابطے میں ہیں۔" عفان کے جانے کے بعد وہ عفاف سے مخاطب ہوئی۔

"میں ایسے ہی تو نہیں کہتی کہ تم بہت خوش قسمت ہو جو تمہیں عفان بھائی جیسے بندے کا ساتھ ملا۔"

عفاف مسکرائی تھی، وریشہ بھی تردید کرنے کے بجائے مسکرادی تھی۔

☆☆☆

"تیمور بھائی میرے فرسٹ کزن ہیں۔ میری سگی خالہ کے بیٹے۔" وریشہ، ناجیہ سے مخاطب تھی۔ اس روز زہرہ خالہ سے ملنے کی اس کی تڑپ نے ناجیہ کو متجسس کر دیا تھا اور اب وریشہ اس کے اسی تجسس کی تشفی کر رہی تھی۔

"میری امو جان اور زہرہ خالہ دونوں بہنوں کی پرورش ان کے تایا نے کی تھی۔ میرے نانا، نانی کا انتقال تو ہماری ماؤں کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ بہنوں میں محبت تو ایک فطری امر ہے، لیکن امو جان اور زہرہ خالہ تو سمجھو یک جان دو قالب تھیں۔ پھر امو جان کی شادی میرے بابا جان سے ہوگئی۔ خالہ میری امو سے دو برس بڑی تھیں، لیکن ان کا رشتہ تایازاد بھائی سے طے تھا جو پڑھائی کی وجہ سے بیرون ملک تھے، سو ان کے تایا نے پہلے امو جان کی شادی کر دی۔ پھر کچھ عرصے بعد خالہ جان کے منگیتر نے اعلان کیا کہ وہ باہر شادی کر چکے ہیں اور ان کی طرف سے خالہ آزاد ہیں۔ وہ بچپن کی منگنی کو ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ خالہ کی شادی جہاں مرضی چاہے کر دی جائے۔

خالہ کے تایا، بیٹے کے اقدام پر سخت چراغ پا ہوئے، پھر ان ہی دنوں خالہ کے لیے جلال خان کا رشتہ آیا۔ وہ بابا جان کے انتہائی مخالف قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ بابا کو پتا چلا کہ سالی کا رشتہ کہاں سے آیا ہے، تو وہ سخت طیش میں آ گئے۔ حالانکہ امو جان کے تایا اس رشتے پر اتنے سنجیدہ نہ تھے، لیکن بابا جان نے تایا سسر کے سامنے انتہائی غصے کا مظاہرہ کیا اور انہیں دھمکی دی کہ اس رشتے کی صورت میں ان کی بیوی کا میکے سے تعلق ختم ہو جائے گا۔ داماد کی بدتہذیبی پر تایا بھی غصے میں آ گئے۔ انہوں نے فوری طور پر خالہ جان کا رشتہ جلال خان سے طے کر دیا۔

امو جان کا رشتہ میکے سے ٹوٹا سو ٹوٹا دونوں سگی بہنوں کے بیچ ہمیشہ کی جدائی در آئی۔ میں نے ہمیشہ ہی اپنی امو جان کو اپنی بہن کی یاد میں تڑپتے دیکھا۔ کوئی اپنا مر جائے تو دل کو قرار آ جاتا ہے، لیکن اس دنیا میں ہوتے ہوئے بہت پیارے کو مرا ہوا تصور کرنا کتنا اذیت ناک ہے، اس کا اندازہ کوئی میری امو جان کو دیکھ کر لگا سکتا ہے۔" وریشہ کی آواز رندھ گئی تھی۔

"اوہ تو یعنی اس طرح تیمور خان تمہارا اتنا قریبی رشتہ دار بھی ہوا اور تمہارے لیے یکسر اجنبی بھی۔" ناجیہ کو اب پورا قصہ سمجھ میں آیا تھا۔

"ویسے اگر تمہارے عفان صاحب درمیان میں نہ ہوتے تو خاصی فلمی سچویشن بن سکتی تھی۔ حریف قبیلے، فرسٹ کزن، غصیلے بابا جان اور......" ناجیہ کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

وریشہ نے اس کے کندھے پر فائل رسید کی تھی۔

"عفاف کے بھائی کے علاوہ دنیا کا ہر لڑکا میرا بھائی ہے۔ آئی سمجھ میں۔"

"زبان سے کہتیں، پھر بھی سمجھ جاتی۔ تشدّد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" ناجیہ کراہی۔ عفاف اور وریشہ ہنس پڑیں۔

☆☆☆

"عفان بہت پیارا بچہ ہے بی بی اور میری وریشہ تو شہزادی لگتی ہے۔ دونوں کی جوڑی بہت جچے گی۔" زہرہ، خانم بی بی سے مخاطب تھیں۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اب کوئی شہزادی اپنے شہزادے کے لیے بھی ڈھونڈو۔'' انہوں نے پاس بیٹھے تیمور کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھاوج کو مخاطب کیا۔

''پہلے اپنے شہزادے سے تو پوچھ لیں، اس کے ساتھ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور طرح دار لڑکی پڑھتی ہے۔ کہیں یہ ہمیں لڑکی ڈھونڈنے کی زحمت دیے بنا' بالا ہی بالا کوئی لڑکی خود ہی منتخب کرلے۔''

انہوں نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔ وہ محض مسکرا دیا۔ ماں اور پھوپھی کو کیسے بتاتا کہ دل ودماغ پر واقعی صرف ایک ہی چہرہ چھایا ہوا ہے۔ من موہنی صورت والی عفان کی بہن' یونی ورسٹی میں جب بھی اس سے سامنا ہوتا اس کی بوکھلاہٹ دیکھنے کے لائق ہوتی، شاید وہ بھی تیمور کی نگاہوں کی تپش سے آگاہ تھی۔ اس کا بے حد احترام کرنے کے باوجود تیمور اسے دیکھتے ہی بے خود سا ہوجاتا، مگر پھر جی ہی جی میں خود کو ڈپٹتا بھی۔ دل جس انوکھی لے پر دھڑکنے لگا تھا اس کی خواہش کو پورا کرنا ناممکنات میں سے تھا۔

''کیا ہوا تیمور، چپ کیوں ہوگئے بیٹا؟'' خانم بی بی اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ اکلوتے بھتیجے میں ان کی جان تھی۔ برسوں پہلے جلال خان کی حادثاتی موت کے بعد نہ صرف جاگیر کا انتظام ان کے کندھوں پر آگیا تھا، بیوہ بھاوج اور بھتیجے کو بھی انہوں نے ہی سنبھالا تھا۔ اب تیمور بھرپور جوان تھا۔ ماں اور پھوپھی کی آنکھوں کا تارا اور ان دونوں کے جینے کا سبب بھی۔ اگر دونوں میں سے کسی کو بھی اس کے دل میں ابھرنے والے جذبے کی خبر ہوجاتی تو وہ کتنا دکھی ہوجاتیں۔ شہباز خان کی بھتیجی سے رشتہ جڑنا مشکل ہی نہیں، ناممکن امر تھا۔

جب شہباز خان نے اپنی بیوی کو اس کی سگی بہن سے ملنے کی کبھی اجازت نہ دی تھی تو وہ تیمور کا رشتہ اپنی بھتیجی سے کیوں کر ہونے دیتے۔ عافیت اسی میں تھی کہ تیمور دل کی خواہش دل میں ہی دبی رہنے دیتا اور وہ یہی کررہا تھا۔

''آپ دونوں مجھے سکون سے پڑھائی کرنے دیں۔ آخر آپ کو میرے سہرے کے پھول کھلانے کی اتنی جلدی کیوں ہے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

ماں اور پھوپھی بنا جواب دیے مسکرادی تھیں اور کچھ مہینے بعد ہی پتا چل گیا کہ ماں اس کی شادی کے لیے اتنی اتاؤلی کیوں ہورہی تھی، اس کے وجدان نے اسے بتادیا تھا کہ زندگی کی مہلت بس ختم ہی ہوا چاہتی ہے۔

ایک دن زہرہ بیگم نے چپکے سے آنکھیں موندلیں۔ غم کی شدت سے تیمور کے حواس سلب ہوگئے تھے۔ خانم بی بی بھتیجے کو سنبھالتے سنبھالتے خود بھی غم سے دہری ہوئے جارہی تھیں۔ عائشہ بیگم کو مردہ بہن کا دیدار کرنے کے لیے بڑی حویلی آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ شہباز خان اب بھی بڑکھوں کی دشمنی نبھا رہے تھے۔ قاسم خان بھاوج کے ساتھ آئے تھے۔ عائشہ بیگم تو بہن کی موت پر اپنے حواسوں میں ہی نہ تھیں۔ قاسم خان نے خانم بی بی سے تعزیت کی تھی۔

''خان! میں نے تو باپ، دادا کے زمانوں کی دشمنی ختم کرنے کی اپنی سی بہت کوشش کرلی۔ آپ اتنے برسوں میں اپنے چھوٹے بھائی کو ہی نہ سمجھا پائے۔'' انہوں نے دھیرے سے شکوہ قاسم خان کی سماعتوں میں انڈیلا تھا۔

''میں ہمیشہ سے ہی ایک بزدل مرد ثابت ہوا ہوں زرمین، جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر خود کو مزید ملامت کرتا ہوں۔ ایک شکست خوردہ شخص کو مزید طعنے تو مت دو۔''

قاسم خان کی آواز خانم بی بی سے بھی دھیمی تھی۔ دو موتیوں جیسے آنسو خانم بی بی کے گالوں پر لڑھکے تھے۔

ایک مدت بعد اس شخص کے لبوں سے انہوں نے اپنا نام سنا تھا۔ دنیا سمجھ رہی تھی کہ قاسم خان ان کی بیوہ بھاوج کے انتقال پر تعزیت کی رسم نبھانے آئے ہیں، کس کو علم تھا کہ اس سمے وہ دونوں اپنے ذاتی نفع،

نقصان کی بات کررہے ہیں۔اس بیتے وقت کا تذکرہ جب وہ خانم بی بی نہیں بلکہ صرف زرمینے خان تھیں۔ ایک دوسرے کی جان کے پیاسے قبیلوں کی دو اولادیں، جب اتفاق سے ایک ہی درس گاہ میں پڑھنے پہنچیں تو اپنی روایتی دشمنی فراموش کرکے دونوں کے دل ایک ہی لے پر دھڑکنے لگے۔

زرمینے خان جو قاسم خان کے لیے صرف زرمین تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا اور چاہ کر ٹوٹ بھی گئے تھے۔ ایک دوسرے کا ساتھ پانا دونوں کے مقدر میں ہی نہ تھا اور وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔

''چاہت پر میرا، تمہارا اختیار نہ تھا زرمین، لیکن اس چاہت کو رشتے کی ڈور میں پرونا میرے بس کی بات نہیں۔ خون کی ندیاں بہہ جائیں، پھر بھی تمہارا، میرا ساتھ ممکن نہیں۔''

انہوں نے یونی ورسٹی کے آخری ایام میں شکستہ لہجے میں زرمین کو باور کروادیا تھا۔ وہ خود اس حقیقت سے باخبر تھیں، لیکن قاسم خان کے لبوں سے یہ اعتراف شکست ان کے کانوں کو بھلا نہ لگا تھا۔

''میں جانتی تھی قاسم کہ ہمارے ملاپ کے بیچ آگ اور خون کا سمندر حائل ہے، میں خود تمہیں یہ سمندر پار کرنے کی اجازت نہ دیتی، لیکن جدائی کا یہ فیصلہ مجھے تمہاری زبان سے سننا گوارا نہ تھا۔ اب میرے پاس بھی اجنبی بن کر جدا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

وہ کہہ کر پلٹ گئی تھیں۔

زندگی کا سفر جاری وساری رہا۔ قاسم خان نے ماں، باپ کے دباؤ میں آکر اپنے سے آٹھ برس بڑی کزن سے شادی کرلی۔ اللہ نے یکے بعد دیگرے دو اولادوں سے بھی نوازا۔ عفان اور پھر عفاف دونوں ان کے جگر کے ٹکڑے تھے۔ اہلیہ کبھی ان کے دل پر تو راج نہ کرپائیں لیکن انہوں نے زندگی میں بیوی کو اس کا جائز حق اور مقام ضرور دیا تھا، وہ تو بیوی کی زندگی ہی مختصر تھی۔

عفاف چار برس کی تھی جب فردوس زچگی کے دوران زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ماں، باپ پہلے ہی دُنیا سے سدھار گئے تھے۔ دوسری شادی کے لیے زور دینے والا کوئی نہ بچا تھا۔ بچوں کی پرورش نیک خصلت بھاوج کے حصے میں آئی۔

عائشہ بیگم جوان کے چھوٹے بھائی شہباز خان کی بیوی تھیں۔ تندخو شوہر کے ساتھ انہوں نے بہت صبر کے ساتھ گزارا کیا۔ وریشہ کے بعد کسی طبی پیچیدگی کی وجہ سے وہ دوبارہ ماں نہ بن سکیں۔ شہباز خان اولاد نرینہ کے لیے دوسری شادی کے خواہش مند تھے، یہاں اس بار قاسم خان نے بڑے بھائیوں والا رعب استعمال کیا۔

''عائشہ پر کوئی سوتن ہرگز نہیں آئے گی۔ بیٹے کی خواہش کو جواز مت بناؤ۔ میرا عفان آج سے تمہارا بیٹا ہے۔ داماد سمجھو، بھتیجا یا بیٹا۔ جو رشتہ مناسب لگے جوڑلو۔ اگر بیٹے پر ہی اصرار ہے تو میں اسٹامپ پیپر پر لکھ دیتا ہوں کہ عفان سے اب میرا کوئی تعلق، واسطہ نہ ہوگا، میں اسے بخوشی تمہیں سونپتا ہوں۔''

انہوں نے بھائی کے سامنے آپشن رکھ دیا تھا۔ شہباز خان شرمندہ ہوگئے۔

''دوسری شادی نہیں کروں گا بھائی! بس آج سے طے ہوا، وریشہ آپ کی بیٹی اور عفان میرا بیٹا۔''

وہ فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ہی صائب ترین فیصلہ تھا۔ یوں وریشہ اور عفان کا رشتہ بچپن میں ہی طے ہوگیا۔

قاسم علی خان کی زندگی اب بھی پچھتاووں کی زد میں تھی۔ محبت نہ ملنے کی کسک نے تو خیر ساری عمر ساتھ دینا تھا، لیکن زرمینے کی سونی زندگی کا مجرم بھی وہ خود کو ہی ٹھہراتے۔

زرمینے راہ وفا کی ثابت قدم مسافر ٹھہری تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی سے شادی نام کا ورق ہی پھاڑ ڈالا تھا۔ خاندان، برادری میں ان کے جوڑ کا کوئی تھا ہی نہیں۔ خاندان سے باہر شادی کی صورت میں ان کے حصے کی جائیداد غیروں کے پاس چلی جاتی۔

باپ نے بھی ان کے ساتھ یہ نیکی ضرور کی کہ خاندان میں ـــ بے جوڑ بندھن باندھنے پر مجبور نہ کیا۔ باپ کے مرنے کے بعد اکلوتے بھائی جلال خان نے اپنی بہن کو بہت سمجھایا کہ وہ شادی پر ہامی تو بھریں، وہ خاندان سے باہر بھی ان کی شادی پر تیار تھے، لیکن زرمینے کی نہ...... ہاں میں نہ بدلی۔ وہ اکلوتے بھتیجے کو ہی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

جلال خان کی ایکسیڈنٹ میں موت کے بعد جاگیر کی ذمہ داری بھی ان کے کندھوں پر آ گئی۔ وہ نازک اندام زرمینے خان اب خانم بی بی کہلائی جانے لگیں۔ اب ان کی شخصیت کے وقار اور تمکنت کے سامنے اچھے اچھوں کا ٹھہرنا مشکل تھا۔ اپنے علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے انہوں نے بہت کام کیا۔ وہ اپنے لوگوں کے دل پر راج کرتی تھیں۔ ان کے دل پر اب بھی کس کا راج تھا، اس کا علم راج کرنے والے کے سوا کسی کو نہ تھا۔

اب بھی کسی سرکاری تقریب میں اپنے اپنے قبیلوں کے نمائندوں کی حیثیت سے دونوں کا آمنا سامنا ہوتا۔ رسمی علیک سلیک بھی ہوتی، پھر دونوں ہی اپنی کسک دل میں دبائے ایک اچٹتی ہوئی الوداعی نگاہ ایک دوسرے پر ڈال کر اپنی اپنی راہ پر چل پڑتے۔ یہ نارسائی ساری عمر کا مقدر تھی۔

☆☆☆

زرمینے کو کب علم تھا کہ ان کا بھتیجا بھی اسی رہ گزر کو منتخب کر بیٹھا ہے۔ وہ قاسم علی خان کی بیٹی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا، حالانکہ وہ اس لڑکی سے بھی ہم کلام تک نہ ہوا تھا۔ اس کے صبیح چہرے پر نگاہ پڑتے ہی تیمور کا دل انوکھی لے پر دھڑکنے لگتا۔ یونی ورسٹی میں دونوں کا بہت بار آمنا سامنا ہوتا۔ تیمور کو دیکھ کر عفاف کے چہرے پر حیا کی لالی جھلکنے لگتی۔ وہ صاف بتا دیتی ہے کہ محبت کی رہ گزر پر وہ تنہا نہیں ہے۔ یہ اپنی طرز کی انوکھی محبت تھی، جس کے اظہار اور اقرار کے لیے زبان تک سہارا نہیں لیا گیا تھا۔

وریشہ سب سے پہلے اس محبت کا سراغ پا گئی تھی۔ وہ اور عفاف ویسے بھی یک جان دو قالب تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ چھپانا چاہتیں بھی تو اس پر قادر نہ تھیں۔ زہرہ بیگم کی وفات کے بعد وریشہ عفان کی موجودگی میں تیمور کا حال احوال دریافت کر لیتی تھی۔ تیمور کی طرح عفان بھی اس قبائلی دشمنی سے حد درجہ بے زار تھا۔ یونی ورسٹی کے ابتدائی دنوں میں ہی جب دونوں کو ایک دوسرے کے مزاج کا اندازہ ہو گیا تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔

دونوں ہی اپنے قبیلوں کے درمیان کھڑی نفرت کی دیوار گرانا چاہتے تھے، لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ ایسا ہونا فی الوقت ناممکن ہے۔ عفان تو اب تک اس دوستی کی بابت اپنے باپ اور چچا کو بھی نہ بتا پایا تھا، اگر چچا کو علم بھی ہو جاتا کہ وہ ان کی بیوی کا بچھڑی بہن سے ٹیلی فونک رابطہ بھی کروا چکا ہے، تو وہ اس گستاخی پر عفان کو کم از کم شوٹ اور زیادہ سے زیادہ جانے کیا کر ڈالتے۔ ہاں تیمور نے اپنی پھوپھی سے کچھ نہ چھپایا تھا، نہ ہی انہیں اس دوستی پر کوئی اعتراض تھا۔

عفان اور تیمور اس کوشش میں تھے کہ عائشہ اور زہرہ کی ملاقات کروا دی جائے، لیکن تقدیر کو یہ منظور نہ ہوا۔ زہرہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئی تھیں۔ تیمور ماں کے مرنے سے بکھر کر رہ گیا تھا۔ جب اس نے رفتہ رفتہ خود کو سنبھالا تو وریشہ کی زبانی یہ خبر اعصاب پر بم بن کر گری کہ عفاف کا عنقریب رشتہ طے ہونے والا ہے۔ قاسم علی خان کے چچازاد بھائی نے اپنے بیٹے کے لیے عفاف کا ہاتھ مانگا تھا اور قاسم علی خان سنجیدگی سے اس رشتے پر غور و غوض کر رہے ہیں۔ شہباز خان بھی اس رشتے کے پرزور حامی تھے۔

''اگر عفاف کی شادی ہو گئی تیمور بھائی! تو پھر میرا یونی ورسٹی آنا بھی مشکل ہی ہو گا، کیوں کہ عفان کا تو خود لاسٹ سمسٹر ہے اور بابا جان مجھ اکیلی کو کبھی یہاں آنے کی اجازت نہ دیں گے۔ پھر تو آپ سے ملاقات بھی قصہ پارینہ بن جائے گی۔''

وریشہ' تیمور سے مخاطب تھی۔ عفان ابھی کسی کام سے اٹھ کر گیا تھا۔ عفاف بھی یہاں موجود نہ تھی، تب موقع غنیمت جان کر اس نے تیمور کو یہ اطلاع پہنچائی تھی اور یہ خبر سن کر تیمور کے چہرے پر جو اضطراب چھایا تھا وہ وریشہ کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ پایا۔

''کیا ہوا تیمور بھائی آر یو او کے۔'' وریشہ نے تجاہل عارفانہ برتا۔ تیمور نے گہری سانس اندر کھینچی۔

''پتا نہیں یہ بات کرنی مناسب ہے بھی یا نہیں۔ کم از کم عفان کے سامنے میں یہ بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن تم بتاؤ وریشہ! اگر میری بی بی جان عفاف کے لیے میرا رشتہ لے کر تمہاری حویلی آئیں تو تمہارے والد اور چچا کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیا اس بارے میں سوچنا بھی گوارا نہ کریں گے۔'' وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔

''آ کا جان میرے بابا سے مختلف ہیں، میں ان کے بارے میں حتمی بات نہیں کر سکتی، لیکن میرے بابا، اوف، ان کا تو نہ پوچھیں تیمور بھائی۔'' وریشہ نے چشم تصور سے شہباز خان کو بندوق سیدھی کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا، اسے اس تصور سے ہی جھرجھری آ گئی۔ تیمور کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہی تو مسئلہ ہے وریشہ...... دو خاندانوں کی دشمنی تو پھر بھی ختم کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے، لیکن دو قبیلوں کی نسلوں پرانی دشمنی کیسے ختم ہو۔ کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔''

وہ بے بسی سے بولا تھا اور بے بسی کے اس اظہار پر وریشہ کا جی بھی کٹ کر رہ گیا۔

اس سے بے وقوفی یہ ہوئی کہ عفاف کو من وعن ساری باتیں بتا دیں۔ عفاف نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا عفاف، کچھ تو بولو۔'' وریشہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پریشان ہوئی۔

''بولنے کے لیے کیا بچا ہے وریشہ......'' وہ یاسیت سے مسکرائی۔

''تم ہمیشہ کہتی تھیں کہ مجھے لگتا ہے عفاف کہ تیمور بھائی تمہیں پسند کرتے ہیں، تمہیں دیکھ کر ان کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ میں نے تمہیں ہمیشہ جھٹلایا، لیکن میں بھی جانتی تھی کہ ایسا ہی ہے، لیکن کاش آج تم مجھے اس کی باتیں نہ بتاتیں۔ میں خود کو بھی یہ ہی کہہ کر جھٹلاتی رہتی کہ یہ سب میرے وہم کے سوا کچھ نہیں، لیکن اب میں کیا کروں گی وریشہ! اس کی چاہت کا پتا چلنے کے بعد میں کسی اور کی زندگی میں کیسے شامل ہو پاؤں گی۔ میں تو جذبوں میں بھی ایمان داری کی قائل ہوں۔''

عفاف بے بسی سے لب کاٹنے لگی تھی۔ جان سے پیاری سہیلی کے لیے وریشہ کا جی بری طرح بھر آیا۔ کس زمانے میں کس دور کی محبت کر بیٹھی تھی عفاف۔ ان کے بیچ قول واقرار، عہدوپیمان کچھ بھی تو نہ ہوا تھا، اس کے باوجود دونوں پر ہی چاہت کا رنگ کس قدر گہرا چڑھا۔ وہاں تیمور کا حال اس سے مختلف نہ تھا اور یہاں عفاف بھی لٹی پٹی سی بیٹھی تھی۔

''کیا کمی ہے تیمور بھائی میں۔ کاش ہمارے بڑے اپنی دشمنی اور عصبیت کی عینک اتار کر اس معاملے کو دیکھ پاتے۔'' وریشہ نے خواہش کا اظہار کیا۔

''ایسی انہونی خواہشیں کیوں کرتی ہو وریشہ!'' عفاف اداسی سے مسکرائی تھی۔ کمرے کے باہر کھڑے عفان نے گہری سانس اندر کھینچی۔ تیمور خان سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''شکل سے ہی کتنا اکھڑ اور کھڑوس لگتا ہے رستم خان۔ آ کا جان اور بابا جان کو عفاف کے لیے کوئی بہتر شخص نہیں مل سکتا۔'' عفاف، وریشہ اور عفان چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے اور اب وریشہ ماں کا سر کھا رہی تھی۔

''رستم پڑھا لکھا ہے، خوب صورت ہے اور پھر عفاف سے عمر میں دو، چار برس ہی بڑا ہے۔ یہ کوئی بے جوڑ بندھن تو نہیں، ورنہ اپنے قرب و جوار میں

دیکھو کتنی بچیاں یا تو ماں، باپ کی دہلیز پر بیٹھی زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں یا پھر اپنی عمر سے دگنی تگنی عمر کے مردوں کی بیویاں بن کر رخصت ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے تو رستم کے رشتے میں کوئی برائی نہیں۔ ہاں مزاج کا تیز ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ شادی کے بعد ہماری عفاف کے حق میں محبت کرنے والا شوہر ثابت ہو۔" عائشہ بیگم رسانیت بھرے لہجے میں بولی تھیں۔

"لیکن امو جان!" وریشہ نے کچھ کہنا چاہا۔

اس کے ذہن کے پردے پر محبت کرنے والے نرم خو سے شخص کی شبیہہ لہرائی تھی، لیکن وہ چاہنے کے باوجود ماں کو کچھ بتانے کی ہمت نہ کر پائی تھی۔

"اچھا، اب خاموش ہو جاؤ۔ رستم کے بارے میں تمہارے خیالات عفاف کے کانوں میں نہ پڑ جائیں۔ خواہ مخواہ اس کا جی برا ہوگا۔"

عائشہ نے بیٹی کو سمجھایا۔ اس نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

زرمینے ششدر سی بیٹھی تھیں۔ تیمور کی ڈائری ان کی گود میں تھی۔ کئی دنوں سے انہیں تیمور بہت الجھا، الجھا اور مضطرب لگ رہا تھا۔ انہوں نے بہت بار کریدا، مگر وہ ہر بار ٹال گیا۔ آج بادل نخواستہ انہیں اس کی ڈائری پڑھنے کی غیر اخلاقی حرکت کرنا پڑی تھی اور اس کا حال دل پڑھ کر حیرت اور صدمے سے ان کا برا حال ہو گیا۔

ان کے بھتیجے نے بھی ان جیسا ہی نصیب پایا تھا۔ وہ قاسم علی خان کی بیٹی پر دل ہار گیا تھا، لیکن اسے اپنے نصیب کا حصہ بنانے پر قادر نہ تھا۔ کاش وہ اپنے جان سے پیارے بھتیجے کے لیے کچھ کر پاتیں۔ بک ریک میں کتابوں کے نیچے ڈائری رکھتے ہوئے ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، لیکن ماضی کی طرح بے بسی اب بھی ان کے مقدر کا حصہ تھی۔

"بی بی جان! آپ یہاں...... میں نے آپ کو کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔" اسی پل تیمور اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ ان کی اس کی طرف پشت تھی۔ فوراً ہی اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے وہ پلٹی تھیں۔

"خیر تو ہے۔ کیوں ڈھونڈ رہے تھے مجھے۔" وہ بدقت مسکرائی تھیں۔

"ہاں...... دراصل یہ کہنا تھا کہ ملازماؤں سے کہہ کر مہمان خانے کی اچھی طرح صفائی کروالیں۔ شام تک میرے کچھ دوست پہنچ رہے ہیں۔ دو، تین روز ٹھہریں گے۔ کل شکار کا پروگرام ہے۔" تیمور نے انہیں آگاہ کیا تھا۔

"اچھی بات ہے، میں زینت سے کہہ دیتی ہوں۔ وہ سارا انتظام دیکھ لے گی۔" ان کے کہنے پر تیمور نے مطمئن ہو کر گردن ہلا دی۔

☆☆☆

قاسم علی خان کی حویلی میں سناٹے کا عالم تھا۔ واقعہ ہی ایسا رونما ہو گیا تھا۔ عفان کی بندوق سے نکلی گولی سے دشمنوں کا ایک بندہ مارا گیا تھا۔ عفان، باپ اور چچا کے سامنے قسمیں کھا رہا تھا کہ ایسا نادانستگی میں ہوا ہے۔ وہ بھی شکار پر نکلا تھا اور کسی پرندے کو نشانہ بنا رہا تھا کہ تیمور خان کا دوست اس کے نشانے پر آ گیا۔ وہ تو کسی کو قتل کرنے کے متعلق سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

"جانتے ہیں بابا! جانتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو وہ کیوں مانیں گے۔ پچھلے ہی ہفتے شیر خان والے واقعے کو لے کر کیسی گرما گرمی ہوئی تھی۔ ہمارے بندوں نے ان لوگوں کو جو دھمکیاں دی تھیں اس سے پورا علاقہ واقف ہے۔ پھر مہمان کا قتل۔ یہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں۔" شہباز خان پریشانی سے اپنی پیشانی مسل رہے تھے۔ قاسم علی خان بھی بیٹے کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"تیمور خان تو فوراً ہی اپنے دوست کی ڈیڈ باڈی لے کر شہر روانہ ہو گیا ہے۔ شکر ہے بات میڈیا میں ابھی نہیں آئی، لیکن وہ لوگ خاموش تو نہیں بیٹھیں گے۔ اپنے مہمان کے خون کا تاوان تو ضرور مانگیں گے۔"

شہباز خان کو طرح طرح کے خدشے ستا رہے

تھے اور ان کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ جرگہ بیٹھا تو تیمور خان نے دوست کے خون کے بدلے عفان کی بہن کا ہاتھ مانگا تھا۔

مطالبہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ عفاف قسمت کے اس ہیر پھیر پر بے یقین تھی۔ تیمور خان اس کی اولین چاہت تھا، لیکن اس انداز میں اس کی زندگی کا حصہ بننا اس کی انا کو گوارا نہ تھا، لیکن رخصتی کے وقت تیمور خان کے ساتھ آئی خانم بی بی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''میں اپنے علاقے سے ونی کی رسم کے خاتمے کا اعلان کرتی ہوں۔ میں عفاف کو پوری عزت و احترام سے رخصت کروا کر لے کر جا رہی ہوں اور دونوں خاندانوں کے بیچ جڑنے والے اس رشتے کے بعد ہماری طرف سے ہر طرح کی دشمنی کا سلسلہ ختم ہے۔ ہم نے اپنی نئی نسل کو ان دشمنیوں کی بھینٹ نہیں چڑھانا۔'' خانم بی بی کے واشگاف اعلان کے بعد علاقے کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

حجلہ عروسی میں عفاف کی کلائیوں میں طلائی کنگن پہناتے ہوئے تیمور نے محبت کے اظہار سے پہلے معذرت کرنا ضروری خیال کیا تھا۔

''تمہیں اس انداز سے اپنی زندگی کا حصہ بنانا مجھے گوارا نہ تھا، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آئیڈیا شہریار کا تھا۔ تمہاری محبت میں عفان کو بھی آئیڈیا تسلیم کرنا پڑا۔''

تیمور نے اپنے جگری دوست کا نام لیا تھا۔ حیرت کے مارے عفاف کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شہریار ہی تو تیمور کا ''مقتول'' دوست تھا۔ یونی ورسٹی کی ڈرامیٹک سوسائٹی کا سب سے سرگرم رکن۔

''شہریار تو نقلی داڑھی مونچھیں لگا کر میرا ولیمہ اٹینڈ کرنے بھی آنا چاہ رہا تھا۔ بہت مشکل سے اس کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑ کر اسے روکا ہے۔'' تیمور نے شگفتگی سے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

''بہت خراب ہیں ''آپ۔'' کئی لمحوں تک اسے گھورنے کے بعد عفاف یہ ہی کہہ پائی تھی۔

''اب تو جیسے بھی ہیں آپ کے ہیں۔''

وہ مسکرایا اور اس بار عفاف اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ پائی تھی۔ وہ بے ساختہ نگاہیں جھکا گئی۔ تیمور ہنس پڑا تھا۔

☆☆☆

خانم بی بی نے بہت دھوم دھام سے بھتیجے کا ولیمہ منعقد کیا تھا۔ دلہن کے گھر والے آئے تو انہیں بھی بھرپور عزت و احترام سے نوازا گیا۔ دوران تقریب قاسم خان کو الگ گوشے میں بیٹھا دیکھ کر وہ ان کے قریب آئی تھیں۔

''یہ اداسی آپ کے چہرے پر جچ نہیں رہی خان! آپ کی بیٹی کو آپ سے بڑھ کر چاہوں گی۔ یہ یقین رکھیے گا۔'' انہوں نے مسکرا کر قاسم خان کو مخاطب کیا۔ قاسم خان بس انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

''ویسے بات ماننے کی ہے۔ ہم سے جی دار ہمارے بچے نکلے۔ کس خوبی سے انہوں نے یہ ڈراما اسٹیج کیا ہے، کاش اپنے وقتوں میں ایسی عقل آپ بھی لڑا لیتے۔''

برسوں پرانی بے تکلفی اور اپنائیت سے یہ شکوہ ان کے لبوں سے پھسلا تھا۔ زرمینے کے انداز پر قاسم خان کے لبوں پر تبسم بکھر گیا۔

''ڈرامے میں بہت جھول تھے زرمین! وہ تو تم اور میں بخوشی بچوں کے ہاتھوں بے وقوف بن گئے تو ان کا پلان پایہ تکمیل کو پہنچا۔ مجھے شہباز کی طرف سے خدشہ تھا، اگر اسے شک بھی ہو جاتا تو بہت برا ہوتا۔''

''اب تو ڈر، ڈر کر جینا چھوڑ دیں قاسم! اور رہی بات آپ کے بھائی کی تو جو لوگ ہر وقت طیش کو سر پر سوار رکھتے ہیں، وہ عقل کا استعمال کم ہی کرتے ہیں۔ کم از کم میں کسی خدشے میں گرفتار نہ تھی۔'' وہ طمانیت سے مسکرائی تھیں۔ ''تم واقعی بہت جرات مند ہو زرمین۔'' وہ اعتراف کیے بنا نہ رہ پائے۔ تھکی ہوئی مسکراہٹ زرمینے کے لبوں پر بکھر گئی۔

''میں اب خانم بی بی کے نام سے پکاری جاتی

ہوں قاسم خان۔ امید ہے آئندہ آپ بھی مجھے اسی نام سے پکاریں گے۔" یک لخت ہی اپنائیت کا لبادہ سمیٹ کر انہوں نے اجنبیت کی چادر اوڑھ لی تھی۔ قاسم خان بدقت مسکرائے۔ خانم بی بی آگے بڑھ گئی تھیں۔

☆☆☆

وریشہ کی توقع کے عین مطابق شہباز خان نے اسے یونی ورسٹی جانے سے منع کر دیا تھا۔ عفاف کی رخصتی اور عفان کے یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ وریشہ کو اکیلے یونی ورسٹی بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔

"یہ سخت ناانصافی ہے امو جان! میری اتنے عرصے کی محنت اکارت جائے گی، اب تو اتنا تھوڑا سا عرصہ باقی رہ گیا ہے، پلیز مجھے بابا جان سے اجازت دلوا دیں۔"

وہ ماں کے سر ہو رہی تھی۔ قاسم علی خان بھی کسی کام کے سلسلے میں بیرون ملک تھے، ورنہ وہ ان ہی کی حمایت حاصل کرتی۔

"تمہارے بابا کہتے ہیں، جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب سکون سے گھر بیٹھو۔" عائشہ نے شوہر کا پیغام پہنچا دیا۔

"کیا مطلب، جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا، کم از کم ڈگری تو ہاتھ میں آنے دیتے۔ سخت ڈکٹیٹر ہیں بابا جان۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"چچی جان کے سر کیوں ہو رہی ہو۔ جانتی بھی ہو یہ چچا جان کے سامنے کچھ نہیں بول سکتیں۔" عفان بھی ادھر آ نکلا تھا۔

"یہ ہی بات تو اس کی عقل میں سماتی نہیں، تم ہی سمجھاؤ عفان اسے۔" وہ وریشہ کی تکرار سے زچ ہو کر آخر اٹھ کر ہی چلی گئیں۔

"آپ کیا سمجھائیں گے مجھے۔ اپنی بہن کا معاملہ تھا تو ہمیں یونی ورسٹی جانے کی اجازت دلوانے کے لیے آغا جان اور بابا جان کے سامنے بول بھی پڑے۔ میرے لیے آپ کیوں اسٹینڈ لینے لگے۔" شکوہ اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔

"بالکل صحیح کہہ رہی ہو، کیوں کہ میری بہن صرف پڑھنے کی خاطر یونی ورسٹی جوائن کرنا چاہتی تھی اور تم تو شاید میری سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی خاطر وہاں گئی تھیں۔ میں نے بہت چاہا کہ وہاں کسی بھی لڑکی سے افیئر چلا کر تمہارے شک کو یقین میں بدل دوں، لیکن میری فطری شرافت آڑے آئی اور اب جب کہ میں بھی یونی ورسٹی چھوڑ چکا ہوں تو میرا نہیں خیال کہ تمہارا وہاں جانے کا کوئی مقصد بچا ہے۔"

وہ بھرپور سنجیدگی سے مخاطب تھا۔ وریشہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ کتنی پرانی بات کا حوالہ دے رہا تھا۔ مذاق میں کی گئی بات کو نہ صرف وہ سن لے گا بلکہ اتنے عرصے تک یاد بھی رکھے گا، یہ وریشہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، تو اس وجہ سے موصوف اتنے عرصے سے اینٹھے اینٹھے سے تھے اور وریشہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جاتی تھی کہ آخر وہ اتنا سنجیدہ اور ریزرو کیوں ہو گیا ہے۔

"میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا اور ویسے بھی میں اور عفاف آپس میں ایسی ہی بے سروپا باتیں کرتے رہتے تھے۔ آپ میری بات سے ہرٹ ہوئے تو سوری، لیکن چھپ کر کسی کی باتیں سننا غیر اخلاقی حرکت ہے۔"

معذرت کے ساتھ ہی وہ جتائے بنا بھی نہ رہ پائی۔

"بہت لاجواب انداز ہے معذرت کا۔ اپنا سوری اپنے پاس ہی رکھو۔" عفان بھنا کر وہاں سے پلٹ کر گیا تھا۔ وریشہ اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

"میرے بھائی کی ناراضی بالکل بجا ہے۔ تمہیں تو ڈھنگ سے انہیں منانا بھی نہ آیا۔" عفاف نے تاسف سے وریشہ کو دیکھا۔

آج تیمور اسے میکے والوں سے ملوانے لایا تھا۔ امو جان، تیمور کی خاطر مدارت میں لگی تھیں۔ جب وریشہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی اور

اپ روہانسے انداز میں عفان کی خفگی سے آگاہ کر رہی تھی۔

"پھر کیسے مناؤں تمہارے بھائی کو۔ وہ تو اس دن کے بعد سے مجھے نظر۔ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا۔ اتنی سی بات پر اتنی ناراضی' کیا اسے میرے دل کی خبر نہیں، وہ تو ہمیشہ سے ہی میرے دل کی ہر دھڑکن میں بستا ہے۔" وریشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"بس ایسا ہی اظہار میرے بھائی کے سامنے کرلو۔ فوراً مان جائیں گے۔" عفاف نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔

"تم شادی کے بعد بے شرم ہوگئی ہو، میں نہیں، کوئی باعزّت طریقہ بتاؤ۔" وریشہ کے کہنے پر عفاف کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"مذاق اڑانے کے لیے نہیں بلایا تھا تمہیں۔"

اسے سخت تاؤ چڑھا۔

"او کے، او کے ناراض مت ہو۔" عفاف نے ہنسی پر قابو پایا۔

"ویسے سنا ہے شوہر کے دل کا راستہ تو معدے سے ہو کر گزرتا ہے، یہ منگیتر پلس محبوب کے دل کا راستہ کہاں سے گزرتا ہے اور اسے کیسے منایا جا سکتا ہے، اس کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ تجربہ تو مجھے شوہر کو منانے کا بھی نہیں۔ تیمور تو مجھ سے خفا ہونے کا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔" عفاف اترائی تھی۔

"زیادہ شیخیاں مارنے کی ضرورت نہیں اور اللہ کرے تیمور بھائی آج شام تک ہی تم سے کسی بات پر خفا ہو جائیں، پھر پوچھوں گی تم سے۔"

وریشہ نے کلس کر بددعا ہی دے ڈالی اور اس کے انداز پر عفاف کی پھر ہنسی چھوٹ گئی تھی، لیکن جاتے سمے اس نے چپکے سے بھائی سے سہیلی کی سفارش ضرور کی تھی۔

"اب میری سہیلی کو مزید مت ستائیں، بھائی! بلاوجہ کی ناراضی چھوڑیں۔ آپ اس بے چاری کی پریشانی کا تصوّر تک نہیں کر سکتے۔"

"زندگی میں پہلی بار تو اس "بے چاری" کو پریشان کر پایا ہوں۔ تھوڑا سا تو مزا لینے دو۔"

عفان مسکرایا تھا۔ عفاف بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

"چچی جان! یہ آپ نے کون سا کک رکھ لیا۔ کھانے میں بالکل مزا نہیں آ رہا۔" عفان نے چند نوالوں کے بعد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"رحمت آج کل چھٹی پر ہے بیٹا! اپنی جگہ اپنے بھتیجے کو بھیجا ہے، لیکن واقعی بالکل ڈھنگ کا نہیں پکا رہا۔ آج رحمت سے ہی رابطہ کرکے پوچھوں گی کہ واپس آ رہا ہے یا ہم کوئی اور انتظام کریں۔"

عائشہ نے جواب دیا۔ وریشہ اس وقت تو خاموشی سے چاولوں کی پلیٹ میں چمچہ گھماتی رہی، لیکن عفان کے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھنے کے بعد اس نے ماں کو مخاطب کیا تھا۔

"آج رات کا کھانا میں خود بناؤں گی۔ مینیو بھی خود ہی ڈیسائڈ کروں گی۔"

"اچھی بات ہے، تمہیں خود بھی یہ خیال آیا۔ گھر میں جتنے مرضی ملازم ہوں، کچن کا کام عورت کو ہی سجتا ہے۔ مجھے گھٹنوں کے درد نے عاجز نہ کیا ہوتا تو ان باورچیوں کے ہاتھ کے رنگ برنگے کھانے کیوں کھانے پڑتے، آج سے کچن کا چارج تم ہی سنبھالو۔"

عائشہ خوش ہوگئی تھیں، اس نے فی الوقت ماں کی خوشی کو غارت کرنا، مناسب نہ سمجھا۔ وہ صرف آج ہی کچن کو رونق بخشنا چاہتی تھی، کل تو ویسے بھی عفان نے شہر چلے جانا تھا۔ آج وہ اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے پُرتکلف کھانا تیار کرنا چاہتی تھی۔ عفاف کے برعکس وہ کوکنگ میں بالکل اناڑی تھی اور آج بھی اسے عفاف کی ہی مدد درکار تھی۔ اس نے فوراً عفاف کو میسج کیا تھا۔

"آج کوشش کر رہی ہوں کہ معدے کے راستے ہی تمہارے۔ کھڑوس بھائی کے دل میں جگہ بنا لوں۔ فوراً مجھے چکن جنجر کی ریسپی سینڈ کرو۔

تمہارے ہاتھ کی بنی یہ ڈش تمہارا بھائی بہت شوق سے کھاتا تھا۔ ساتھ مشورہ دو کہ میٹھے میں کیا بناؤں؟''

عفاف کو میسج بھیجنے کے چند لمحے بعد ہی موبائل پر بپ ہوئی تھی۔ وریشہ نے موبائل اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ یہ میسج عفان کی طرف سے تھا۔

''تم چکن کے بجائے مٹن یا بیف میں کچھ کیوں ٹرائی نہیں کرتیں۔ چکن کھا کھا کر ویسے بھی میرا جی اوب ہوگیا ہے۔ سوئٹ ڈش میں گاجر کا حلوہ بنالینا۔''

''او مائی گاڈ!'' وریشہ نے بوکھلا کر کچھ لمحوں پہلے کیا جانے والا میسج چیک کیا تھا۔ وہ کس فاش غلطی کی مرتکب ہوگئی تھی۔ جلدی میں عفاف کے بجائے میسج عفان کو کردیا تھا۔

''بیڑا غرق ہو تم دونوں بہن، بھائیوں کا۔ آخر کس نے تمہارے اتنے ملتے جلتے نام رکھے تھے۔''

خفت سے اس کا برُا حال تھا۔ اب کچن میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ تو رات کے کھانے پر بھی غیر حاضر رہنا چاہتی تھی، لیکن امو جان نے ملازمہ بھیج کر اسے بلوالیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ عفان بہت سنجیدگی سے ڈونگوں کے ڈھکن اٹھا کر چیک کررہا تھا۔

''مجھے لگا آج ڈنر میں چکن جنجر ملے گا۔'' اس نے خود کلامی سی کی۔

''بیٹا! تم کہہ دیتے، میں وہ ہی بنوالیتی۔'' عائشہ کو اس کی من پسند ڈش نہ بنوانے پر افسوس سا ہوا۔

''ویسے تو صاحب زادی نے اعلان کیا تھا کہ آج رات کا کھانا وہ بنائیں گی، لیکن شام سے کمرے میں بند تھیں، اب نکلی ہیں باہر۔''

وریشہ پر خفگی بھری نگاہ ڈال کر انہوں نے کہا تھا۔ وریشہ سر جھکائے کھانا کھانے لگی۔ ماں کی بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ عفان نے بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

''چاچا جان کب تک آئیں گے۔ مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے عائشہ کو مخاطب کیا۔

''پتا نہیں بیٹا۔ صبح سے ڈیرے پر ہی ہیں۔ کوئی مسئلہ نمٹانا تھا۔ ہوسکتا ہے، رات بھی وہیں قیام کریں۔'' عائشہ بیگم نے جواب دیا۔ عفان نے ہنکارا بھرا تھا۔

''وریشہ! تمہیں زحمت نہ ہو تو کافی بنا کر اسٹڈی میں دے جاؤ۔'' وہ کرسی گھسیٹتے ہوئے اٹھ کھڑا تھا۔

''کافی تو وریشہ ضرور بنا دے گی، لیکن بیٹا! تم نے ٹھیک سے کھایا ہی نہیں، دو چار نوالے کھا کر ہی اٹھ گئے۔''

''کل اگر وریشہ چکن جنجر بنائے گی تو میں ڈٹ کر کھاؤں گا۔ وعدہ رہا۔''

وہ وریشہ پر متبسم نگاہیں ڈال کر بولا۔ ماں کی موجودگی میں وہ عفان پر تیکھی نگاہ ہی ڈال سکی تھی۔

اپنی طرف سے نہایت بدمزا کافی بنا کر وہ اسٹڈی میں آئی تھی۔ وہ راکنگ چیئر پر نہایت فرصت سے جھولتا ہوا، اسی کا منتظر تھا۔

''صرف ایک مگ کافی۔ اپنے لیے بھی لے آتیں۔'' اس نے نہایت دوستانہ لہجے میں مخاطب کیا۔

''مجھے طلب نہیں ہے۔'' اس نے سپاٹ سے انداز میں جواب دیا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ دونوں شیئر کرلیں گے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ پھر مگ ہونٹوں سے لگا کر گھونٹ بھرا تھا۔

''اگر دل کا راستہ معدے سے ہوکر گزرتا ہے تو یقین کرو، کافی کا ایک گھونٹ پی کر ہی یہ راستہ بلاک ہوگیا ہے۔'' اس نے مگ ایک طرف رکھ دیا۔ وریشہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''اگر غلطی سے ایک میسج آپ کو چلا ہی گیا تو آخر آپ مجھے کب تک اور کتنا ذلیل کریں گے۔''

اس کی برداشت جواب دے گئی تھی اور ان نین

کٹوروں کو بھرتا دیکھ کر عفان کو بھی اپنی زیادتی کا احساس ہوگیا تھا۔

"میرے دل تک پہنچنے کے لیے تمہیں آخر ان ٹیڑھے میڑھے راستوں کا انتخاب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا تم جانتی نہیں کہ تم میرے دل کی ہر دھڑکن میں بستی ہو۔"

وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔ وریشہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ڈائیلاگ کچھ سنا سنا سا لگا، پھر کچھ یاد آیا۔ اف یہ عفاف کی بچی۔ کوئی بات پیٹ میں ٹکتی ہی نہیں۔ اسے عفاف پر شدید ترین تاؤ آیا۔ نگاہیں اٹھا کر عفان کو دیکھا۔ وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے محبت پاش نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

وریشہ نے ٹپٹا کر نگاہیں جھکالیں۔ عفاف کے بھائی کا یہ روپ آج سے پہلے تو کبھی نہ دیکھا تھا اور وریشہ کی بوکھلاہٹ دیکھ کر بالکل یہ ہی بات عفاف کا بھائی بھی سوچ رہا تھا۔

"یوں شرمائی، لجائی گھبرائی، گھبرائی تم سیدھا دل میں اتر رہی ہو۔" وہ مزید رومانٹک ہوا۔

"میں جا رہی ہوں، مجھے امو جان کے پاؤں بھی دبانے ہیں۔" وریشہ نے کھسکنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

"بالکل جاؤ اور ہاں اپنی تیاری بھی مکمل رکھو۔ پچھلے سمسٹر میں تمہاری جی پی سے میں بالکل مطمئن نہ تھا۔ اس بار تم نے وہ کارکردگی نہیں دہرانی۔" عفان نے اس بار قدرے سنجیدگی سے مخاطب کیا، وریشہ نے بے یقینی سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تو میں پھر سے یونی ورسٹی جاؤں گی۔ آپ بابا جان کو منالیں گے۔"

"چچا جان کو اپنی بیٹی کے یونی ورسٹی جانے پر اعتراض ہے نا، میں یہ اعتراض ختم کرنے والا ہوں۔ تین دن بعد بابا جان وطن لوٹ رہے ہیں، وہ آتے کے ساتھ ہی چچا جان سے ہماری شادی کی بات کریں گے۔ فوری نکاح، فوری رخصتی اور پھر میرا اختیار ہوگا کہ میں تمہیں یہاں رکھوں یا اپنے ساتھ شہر لے جاؤں۔ شہر والی فیکٹریوں کے معاملات بھی آخر مجھے ہی دیکھنے ہیں اور میرے معاملات دیکھنے کے لیے وہاں میری بیوی کا ہونا ضروری ہے، میں آخر کب تک چھڑا چھانٹ زندگی گزاروں گا۔" وہ بے چارہ سا بن کر بولا تھا۔

"اتنی جلدی شادی، پھر تو ہوگئی مکمل میری پڑھائی۔" وریشہ تجویز سنتے ہی بوکھلا گئی تھی۔

"تمہاری پڑھائی مکمل ہونے تک تمہیں ہرگز نہ ستاؤں گا۔ یہ وعدہ رہا، ہاں بعد کی کوئی گارنٹی نہیں۔" وہ شرارتی انداز میں مخاطب ہوا تھا۔

وریشہ نے ہچکچا کر کچھ کہنا چاہا، پھر عفان کی سمت دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی محبت کی جوت دیکھ کر ہر اعتراض دم توڑ گیا۔

حیا کی لالی چہرے پر بکھری اور اقرار میں سر ہلاتے وہ واپس پلٹ گئی تھی۔

☆

سارہ عرفان

رہے نام اللہ کا

''رکھے کی مت ماری گئی ہے۔''
''پاگل ہوگیا ہے..... سٹھیا گیا ہے۔''
''کسی کی سننے کو تیار ہی نہیں۔''
''آخرت خراب کرنے پر تل گیا ہے۔''

بھانت بھانت کی بولیاں جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ چوپال، دھوتی صافہ باندھنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ سب غصے میں تھے۔ کچھ کم غصے میں اور کچھ بہت زیادہ غصے میں..... چودھری خداداد کی تو مونچھیں بھی غصے سے کانپ رہی تھی۔

''دیکھ بھائی اللہ رکھے..... دھیاں (بیٹیاں) سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ ان کا نام اس طرح پنچایتوں میں لیا جانا اچھا نہیں ہوتا..... پیار پیار سے تجھے سمجھایا تھا تو بات یہاں تک لے ہی آیا۔''

چودھری برکت نے رنگیلے حقے کی نال مٹھی میں دابے دابے تحمل سے کہا۔

اللہ رکھا جوں کا توں بیٹھا رہا..... اونچے پایوں والی چارپائی پر پاؤں لٹکائے..... اپنی کہنیوں کا سارا زور اپنے زانوں پہ ڈالے..... سرنیہوڑائے..... اور نظریں اپنے سرمئی کھسے پر کڑھے سنہری تلے پر ٹکائے..... اس کے وجود میں بس سانس رواں تھی جیسے باقی سب ساکن۔

''چل آخری بار سوچ لے..... اچھی طرح سوچ لے..... ورنہ ہم سخت فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔'' چودھری حق نواز دھمکی والے انداز میں بولے۔

اللہ رکھے نے گلا کھنکھارا۔ ''بات یہ ہے چودھری برکت .....!'' کھسے کے تلے سے نظریں اٹھائیں..... پلکوں پر بھی سفیدی اتری تھی..... شاید یہاں بیٹھا بیٹھا وہ تھوڑا اور بوڑھا ہوگیا تھا..... لیکن نظروں میں کچھ اور ہی تھا..... چونکانے والا ..... للکارنے والا..... دھمکیوں میں نہ آنے والا ......[illegible] اللہ رکھا۔

''ڈیڑھ مربع زمین ہے میری..... چوٹی کے ڈنگر (گائے، بھینس) میرے ڈیرے پر بندھے ہیں..... میری گھوڑیوں سے ستھری گھوڑیاں کسی ایک بھی جٹ کی نہیں ہیں..... کسی بھی طرح تم سب سے کم چودھراہٹ نہیں میری..... اس لیے کوئی مائی کا لال مجھے دھمکیاں نہ دے..... اور رہی بات میری دھی کی..... تو وہ کالج جائے گی..... روز شہر جائے گی اور آئے گی اور اگر کسی نے اسے روکنے کی یا اس کے راستے میں بھی آنے کی کوشش کی..... تو ڈکرے کر کے کتوں کو کھلا دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا نہیں..... شان سے اٹھا..... قدموں کی دھمک پیدا کرتا چوپال چھوڑ گیا..... بھنبھناہٹیں بڑھ گئیں۔ مکھیوں میں جیسے طوفان آیا ہو۔

اور پھر وہ طوفان بڑھتا بڑھتا پورے گاؤں میں پھیل گیا۔

''اللہ رکھے کا حقہ پانی بند ہے۔''
''سب گاؤں والے اللہ رکھے کا بائیکاٹ کریں گے۔''
''اسے شادی بیاہ میں نہیں بلایا جائے گا۔''
''زمین بیجنے (بوائی) میں اس کی کوئی مدد نہیں

کی جائے گی۔"

"کاشت کے موسم میں کوئی اس کا ہاتھ نہیں بٹائے گا۔"

"اس کے گھر میں کوئی موت ہو جائے تو کوئی جنازے میں شریک نہیں ہوگا۔"

"نائی کھانا نہیں پکائے گا، اس کا خط نہیں بنائے گا۔"

"موچی جوتی نہیں گانٹھے گا۔"

"درزی کپڑا نہیں سیے گا۔" سارے گاؤں نے حلف اٹھالیا۔

وہ سمجھتے تھے اللہ رکھا جلد ہی ٹوٹ جائے گا۔ تھک جائے گا۔ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا آئے گا۔ وہ نہیں جانتے تھے اللہ رکھا کبھی نہیں تھکا تھا۔

اپنی لاغر ماں کو کندھوں پر اٹھا کے کھیتوں کی سیر کراتے نہیں تھکتا تھا۔

اپنی پانچ بہنوں اور چھ بیٹیوں کو بیاہتے بیاہتے نہیں تھکا تھا...... وہ تھک ہی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی...... بولتی ہوئی دستک...... جیسے آنے والا دنیا سے چھپ کے آیا ہو...... ہمدردانہ دستک...... وہ تینوں ہی جاگ رہے تھے۔ حقہ پانی بند ہو جائے تو نیند بھی بائیکاٹ کر دیتی ہے...... رات کے اس پہر کون ہمدرد تھا۔

اللہ رکھے نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا دروازہ کھول دیا۔ چودھری برکت تھا۔ بچپن کی یاری نبھانے آیا تھا شاید۔

"دیکھ رکھے......! جو کبھی نہیں ہوا ہوتا، وہ ٹھیک بھی ہو تو ٹھیک نہیں لگتا۔ ہمارے ہاں عورتوں کو شہروں میں نہیں بھیجا جاتا...... چاہے وجہ تعلیم ہی کیوں نہ ہو...... غیرت بھی کوئی چیز ہے...... اور بیٹا تیرا کوئی ہے نہیں...... بیٹی کا ساتھ ہے۔ گاؤں والوں سے دشمنی کیسے نبھاؤ گے؟ بھائی سمجھ کے میری بات مان لو...... بھولو کو اپنی فرزندی میں لے لو...... اس کا کوئی گھر نہیں اور تمہارا گھر سنجا (خالی) ہے۔ تمہارا گھر آباد رہے گا...... کوئی تمہارا ابھی نام لینے والا ہوگا...... ورنہ تو لوگ گدھوں کی طرح تمہارے مال جائیداد پہ آنکھیں گاڑے بیٹھے ہیں...... بس تمہارے مرنے کی دیر ہے۔" چودھری برکت نے خوب یاری نبھائی۔

"تو سب سے چھپ کے یہاں آیا۔ تیرا شکریہ



چودھری برکت! اگر صرف میری بات ہوتی تو میں پیچھے ہٹ جاتا..... لیکن یہ میری بیٹی کی خواہش ہے۔ اور اولاد کے لیے تو جان بھی حاضر ہے ایسا ہی ہے نا؟" مسکراتے ہوئے برکت کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اور جہاں تک نام لینے والے کی بات کی ہے تم نے..... تو میرے یار! میرا تو ایک ہی عقیدہ ہے "رہے نام اللہ کا۔" اس نے شہادت کی انگلی آسمان کی سمت اٹھائی۔

"اور رہی بات غیرت کی..... تو چودھری صاحب! یہ غیرت تب کہاں ہوتی ہے جب گاؤں کی عورتیں گھٹنوں تک شلواریں اڑس کر لاب (دھان کی پنیری) لگاتی ہیں..... یا جب وہ اپنے پلو سروں پہ باندھ کر پودے پودے سے کپاس چنتی ہیں۔ کیا اتنا بے غیرت ہونا جائز ہے؟"

وہ نہیں ماننے والا تھا۔ وہ نہیں مانا..... لکڑی کے بھاری دروازے کی اوٹ میں ماں کے پہلو سے چپکی رقیہ بہت غمگین تھی..... اپنے باپ کو تنہا ہوتے دیکھنا، برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔

"ابا....." وہ دھیرے دھیرے چلتی اللہ رکھے کے پاس آن بیٹھی..... آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے..... اگلے ہی لمحے ہار ماننے والی تھی..... اپنی خواہش سے دست بردار ہو کے ابا کو اس قید سے آزاد کرنے والی تھی۔ باپ نے آنسوؤں میں چمکتی تحریر پڑھ لی۔

"تو میری کیڑی (چیونٹی) ہے نا.....؟" وہ اسے پیار سے کیڑی کہتا تھا..... سب سے آخری، لاڈلی بیٹی تھی۔ بنا بولے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ دیکھ۔" وہ زمین پر بیٹھ گیا..... کچی سطح پر چلتی چیونٹیاں چودھویں کے چاند کی روشنی میں بہ آسانی دیکھی جا سکتی تھیں..... اللہ رکھے نے ایک جاتی چیونٹی کے سامنے اپنی انگلی رکھی..... وہ انگلی سے ٹکرائی..... فوراً رستہ بدلا اور پھر منزل کی طرف چل دی۔

تھوڑی دیر بعد پھر انگلی رکھی....." انگلی مطلب..... مشکل، رکاوٹ حد..... چیونٹی نے پھر پرواہ نہیں کی۔" اس کی لگن کسی رکاوٹ کو نہیں مانتی..... کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتی..... اس کا ذہن صاف اور نظر منزل پر ہے۔ وہ بھٹکنے والی نہیں۔ تو بھی تو میری کیڑی ہے نا.....؟"

وہ اپنی ذہین بیٹی کو ایک بڑا سبق دے رہا تھا..... اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ہار مٹ گئی..... فنا ہو گئی..... وہ کیڑی تھی۔ کسی رکاوٹ کو نہیں مانے گی۔

☆☆☆

بائیکاٹ کا حلف صرف دھارو والی کے باسیوں نے اٹھایا تھا..... پڑوسی گاؤں کا خیر دین اس سے بری تھا..... رقیہ کے لیے اسی کا تانگا لگوایا تھا..... وہ تانگہ بڑی سڑک پر چھوڑتا، وہاں سے کالج کی بس لے جاتی..... اسی طرح واپسی پر تانگہ سڑک سے لے لیتا..... وہ ابھی رقیہ کو تانگے پر بٹھا کے آیا تھا..... اب رنگین پایوں والی چارپائی پہ بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا..... کھلے دروازے سے بھولو آیا۔

"روٹی ملے گی چاچی.....؟" ہمیشہ کی طرح مسکراتا ہوا چہرہ اور داغ دار کپڑے۔

"کدھر چلا آ رہا ہے؟ تیرا بائیکاٹ نہیں ہے؟" چاچی نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ کھسیا گیا، مسکراہٹ ہنوز باقی تھی۔

"او بھلیے لوکے..... اس غریب کو کیا کہتی ہے۔ آ جا پتر آ جا۔" اللہ رکھا پیار سے بولا۔

کھسیاہٹ، اپنائیت میں بدل گئی۔ روٹی کھاتے بھولو کو دیکھتے ہوئے اللہ رکھے کو برکت کی ہمدردی یاد آ گئی۔ چھوٹا سا تھا بھولو۔ جب رستہ بھولے کہیں سے آیا تھا۔ گاؤں والوں نے بہت اعلان کروائے۔ اردگرد کے تمام گاؤں میں..... شہر میں جا کے اخبار میں تصویر بھی چھپوائی..... مگر اس کا کوئی وارث نہ آیا۔ وہ لاوارث ہی پلنے لگا۔ کسی نے روٹی دے دی تو کسی نے پانی پوچھ لیا۔ یوں ہی بھولو جوان ہو گیا..... اس کا کوئی گھر نہیں تھا..... مگر سارے گھر اس کے تھے..... وہ کسی حلف کا حصہ نہیں تھا۔ وہ رقیہ کو باجی کہتا

تھا...... سمجھتا تھا۔

اللہ رکھے کو ایک بار پھر چودھری برکت یاد آیا...... بھولو کو مہرہ بنانے کا خیال یقیناً اسی کے دماغ میں آیا تھا...... اللہ رکھے نے سرد آہ بھری۔

☆☆☆

زمین کی بوائی کے دن سر پہ تھے۔ اتنی بڑی زمین کو تیار کرنا اللہ رکھے کو مشکل لگ رہا تھا...... یقیناً اس کے لیے اسے مدد درکار تھی...... جتنا ہو سکا وہ خود کرے گا...... بعد میں ساتھ والے گاؤں سے لڑکے بلوا لے گا...... یہ اس نے سوچ رکھا تھا...... بیلوں کی چار جوڑیاں تھیں اس کے پاس لیکن ہالی وہ بس خود تھا۔

پہلے دن بھولو ساتھ تھا...... لیکن شام تک اسے بخار نے آ لیا...... وہ لڑکیوں جیسا نازک تھا...... بھاری کام کبھی نہ کیا تھا...... اسے بس چند ہی کام آتے تھے...... کھانا، سوتے میں بڑے بڑے خراٹے لینا اور بابے گوگے کے مزار پر دھمال ڈالنا اور بس...... اللہ رکھے کی محبت میں آ گیا اور بیمار ہو گیا۔ جب اللہ رکھا گھر پہنچا تو تھکن سے چور تھا...... وہ ہمیشہ سے جسمانی مشقت کا عادی تھا...... ایسا نڈھال کبھی نہ ہوا تھا...... ماں بیٹی دل تھام کے رہ گئیں۔

''زندگی کے سفر میں خواب ہمالیہ جیسے ہوں تو نڈھال ہونا پڑتا ہے۔'' ایسے جملے کہنا بہت آسان ہیں۔ لیکن عمل پیرا ہونا بہت مشکل......

نیند کی نرم گود نے اس کی ساری تھکن سمیٹ لی...... اور صبح کے روشن نیلے آسمان نے اسے تازہ دم کر کے اس کے سینے میں نیا عزم بھر دیا۔ تگڑے بیلوں کی جوڑی میں ہل جوتا اور کھیت کی طرف بڑھا۔ چونک گیا...... دور ہی رک گیا...... بیل چلتے جا رہے تھے۔ وہ تذبذب میں تھا۔ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے دھیرے دھیرے چلنے لگا۔

اس کا شک درست تھا۔ اس کے بعد بھی کسی نے اس زمین پر ہل چلایا تھا۔ کسی نے اس کی خاموش مدد کرنا چاہی تھی...... اس نے وہیں سے ہل کو زمین میں اتارا جہاں سے اس خاموش مددگار نے چھوڑا تھا۔ کون تھا جو رات کو اس کے بعد وہاں آیا ہو گا......؟ وہ یقیناً اپنا ہل لایا ہو گا...... کیونکہ اللہ رکھا سارا سامان ڈیرے پر بنی کوٹھڑی میں رکھ کر جاتا تھا...... کوٹھڑی پر تالا ڈالنا بھی نہیں بھولتا تھا۔

''کون ہو سکتا ہے۔'' سوچتا رہا...... خوش بھی تھا کہ بائیکاٹ کے باوجود بھی کسی کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ تھا۔ دل ہی دل میں اس مہربان کا شکر گزار ہوتا، قیافے لگاتا رہا...... ایک دم سارا گاؤں ہی اچھا لگنے لگا...... یقیناً ان ہی میں سے کوئی تھا۔

☆☆☆

''جب اللہ اپنے بندوں کو پریشان دیکھتا ہے تو ایسے ہی مدد کر کے اپنے بندے کو حیران کرتا ہے۔ خوش کرتا ہے...... اب دیکھو ابا...... آپ کتنے خوش ہو......؟'' اس نے گھر آ کے بھی بتایا...... تو رقیہ محبت سے باپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی...... وہ واقعی خوش تھا۔

اگر کوئی تھوڑا بہت شک تھا بھی تو اگلی صبح باقی نہ رہا۔ کل جاتے وقت اللہ رکھا نشانی کے طور پر وہاں درانتی رکھ آیا تھا...... تاکہ یاد رہے کہ اس نے یہاں ہل بند کیا تھا۔ درانتی وہیں تھی...... لیکن زمین میں ہل آگے تک چلا ہوا تھا۔ زمین تقریباً نرم ہو جاتی آج کل...... سے اسے ہموار کرنے کا کام شروع ہو جاتا۔ اس نے ساتھ کے گاؤں سے دو لڑکے بلوا لیے تھے۔ لیکن وہ اس مددگار کو جاننے کے لیے بہت متجسس تھا۔

اس نے ٹھان لیا تھا کہ آج رات کو کھوج لگائے گا...... لیکن تھکاوٹ کا مارا چارپائی پہ لیٹتے ہی گہری نیند میں چلا گیا...... نجانے کس پہر آنکھ کھلی...... رفع حاجت کے لیے اٹھا تو یاد آیا کہ کیا ٹھانے ہوئے تھا...... دوسری چارپائیوں پر نظر دوڑائی تو دونوں ماں بیٹیاں سر تک چادر تانے گہری نیند سو رہی تھیں۔ دھیرے سے دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

حسب توقع ہل جوتا ہوا تھا...... اللہ رکھا درختوں کی اوٹ میں چھپتا چھپاتا، پگڈنڈیاں پار کرتا، قریب پہنچ گیا...... پگڈنڈی پر اگے درخت پر چڑھ کر اس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

طرح بیٹھ گیا کہ جیسے ہی ہالی چکر پورا کر کے واپس پلٹتا، اس کا چہرہ اللہ رکھے کے سامنے ہوتا...... صاف آسمان پر آدھی روٹی جیسا چاند اور روشن ستارے پہچاننے میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔ اللہ رکھے کا تجسس اپنی انتہا پر تھا...... اتنا ہمدرد، غمگسار بے لوث، آخر کون تھا؟ ہالی نے چکر پورا کیا...... پلٹا اور دھیرے دھیرے قریب آنے لگا۔ اتنا قریب کہ آدھی روٹی جیسا چاند اور روشن ستارے مدد کرنے کو تیار ہو گئے۔

شاخ سے چمٹے اللہ رکھے نے اپنی کھلی آنکھیں مزید کھول لیں...... ہالی نے صافہ ایسے باندھا تھا کہ سر پہ دو چکر دینے کے بعد دونوں پلے کمر پہ پھینکے ہوئے تھے...... بالکل ویسے جیسے اللہ رکھا پھینکتا تھا...... ہالی کا کرتا گہرے نیلے رنگ کا تھا...... جس کے بازو اس نے موڑ رکھے تھے۔ یہ تو ویسا ہی رنگ تھا جیسے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اللہ رکھا پہنتا تھا۔ تجسس کے ساتھ ساتھ حیرت نے بھی اللہ رکھے کو گھیر لیا...... کون تھا جو اس کا روپ دھارے اس کے کھیتوں میں اسی کے بیلوں سے ہل چلا رہا تھا؟ کون بہروپیا تھا؟

بہروپیا قریب آ گیا...... اتنا قریب کہ اس کے چہرے پر پڑنے والی چاند کی روشنی اللہ رکھے کی آنکھوں میں آن ٹھہری...... پہچان کے مرحلے طے ہو گئے۔ تجسس اپنی موت آپ مر گیا۔ حیرت کی جگہ دکھ نے لے لی...... ہالی درخت کے نیچے سے آگے گزر گیا...... اور اللہ رکھا درخت پہ کیسے بیٹھا رہ گیا، وہ خود نہیں جانتا تھا...... جس شاخ کو پکڑے بیٹھا تھا اسی شاخ سے لپٹ کے سسکنے لگا۔

''رقیہ! میری بچی۔'' وہ بچپن سے باپ کے ساتھ ڈیرے پہ آتی تھی...... چارہ کاٹ لینا...... بھینسوں کو پانی پلانا...... دودھ دوہ لینے جیسے کام کر لیتی تھی...... آج ہل چلا رہی تھی۔ یہ اس نے کب سیکھا اللہ رکھا حیران تھا۔

''اللہ مدد کر کے اپنے بندوں کو حیران کرتا ہے۔'' رقیہ کی آواز آئی۔ ''اب دیکھو ابا...... آپ کتنے خوش ہو؟'' وہ پھر بولی۔

''تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے اللہ رکھے...... بھولو کو فرزندی میں لے لو۔'' چودھری برکت کی آواز ابھری۔

''کاش چودھری برکت میں تمہیں اپنا بیٹا دکھا سکتا۔ ایسا کام تو تمہارے بیٹے بھی نہیں کرتے۔'' دل ہی دل میں برکت سے مخاطب ہوا۔

ہالی نے کام مکمل کیا...... کوٹھڑی میں ہل رکھا...... بیل باندھے اور کوٹھڑی میں کام والے کپڑے دوسرے کپڑوں سے بدل لیے۔ بدلے جانے والے کپڑے بھی اللہ رکھے کے تھے۔ اللہ رکھے ہی کی طرح ہاتھ میں گنڈاسہ پکڑا اور گھر کی طرف چل دی۔ اللہ رکھے کے آنسو ہی نہیں تھم رہے تھے۔ اس نے یہ بہروپ بھرا تھا...... تاکہ کوئی بھی دیکھنے والا اسے اللہ رکھا سمجھے۔ رات کے اندھیرے میں کس کو پڑی تھی کہ تصدیق کرتا پھرے...... ویسے بھی سب نے حلف اٹھا رکھے تھے۔

وہ دیوانوں کی طرح بے آواز روتا ایک فاصلے سے اس کے پیچھے آ رہا تھا...... وہ واقعی اپنے باپ کی کیڑی تھی۔ اس نے یہ دیکھے بنا کہ دروازے کی کنڈی باہر سے لگی ہے، معمول کی طرح دیوار پھلانگی اور صحن میں اتر گئی۔

اللہ رکھا باہر ہی تھڑے پر بیٹھ گیا...... مددگار وہی ہوتا ہے جو ہمدرد ہو...... بے لوث ہو غمگسار ہو اور رقیہ سے بڑھ کر کون اس کا ہمدرد ہو سکتا تھا۔ کون اس کا رفیق تھا...... کون اس کا اپنا تھا...... وہ اس کو کبھی نہیں بتائے گا کہ اس نے اسے دیکھ لیا تھا...... وہ اس کی خوش گمانی قائم رکھنا چاہتی تھی...... وہ خوش گمان ہی رہے گا...... اسے حیران اور خوش دیکھ کر اسے اچھا لگا تھا...... وہ حیران اور خوش ہی رہے گا۔ وہ اس کے سامنے اس خاموش مددگار کو بہت دعائیں دے گا۔ وہ تھڑے پر بیٹھا اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ عجیب باپ بیٹی تھے۔

وہ ایک دوسرے کا حصار تھے...... جیسے کوئی حاسد نہ توڑ سکے۔ ایک دوسرے کی فصیل تھے...... جسے کوئی دشمن نہ پھلانگ سکے۔ اور ایک

دوسرے کا بند تھے...... جسے کوئی کانگ (سیلاب) نہ روند سکے۔ وہ کسی رکاوٹ کو نہیں مانیں گے۔ یہ طے تھا۔

☆☆☆

چودھری برکت چھڑی کے سہارے چلتے چلتے بمشکل وہاں تک پہنچا۔ سر، گردن کے اوپر ایسے کانپ رہا تھا گویا گردن اس کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہو اور سر وہیں رہنے پہ بضد۔

''او چاچا جی آئے ہیں ......آؤ چاچا جی آؤ......بسم اللہ۔'' رقیہ نے انہیں بمشکل چلتے دیکھا تو اٹھ کر دو قدم آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ کے لے گئی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی وہ سانس بحال کرنے لگے۔ پانی پیا تو حواسوں میں آئے۔

''میں نے سنا تم آئی ہو تو سوچا مل آؤں......موت کا کیا بھروسا، ابھی آئی کہ آئی ......اللہ رکھا کیسا ہے؟ اس کا دل نہیں کرتا آنے کو؟'' مغموم دل سے پوچھا۔

''اللہ پاک آپ کو لمبی عمر دے چاچا جی......مرنے کی باتیں آپ کو بجتی نہیں ہیں۔'' وہ حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ابا کا بھی آپ والا ہی حال ہے......مجال ہے میٹھا کھانا چھوڑ دیں......گڑ کی ڈلی تو ہر وقت جیب میں لیے پھرتے ہیں۔'' ہلکے پھلکے انداز میں بتانے لگی۔

''وہ کیوں آئے گا یہاں؟ اس گاؤں نے اسے ستایا بھی تو بہت ہے۔'' ٹوٹے لہجے میں بولے۔

''ہاں بہت ستایا ہے۔ پر اب دیکھیں، پلکوں پر بھی تو اسی گاؤں نے بٹھایا ہے۔'' اس سے ملنے کے لیے آنے والے لوگوں کو دیکھ کر بولی۔

وقت گزرنے کے ساتھ بائیکاٹ اپنی موت آپ مر گیا۔ سب جان گئے کہ یہ باپ بیٹی کسی دھونس میں نہیں آنے والے۔ پہلے پہل لوگ چوری چھپے ملنے لگے۔ پھر کھلم کھلا......اور پھر دیکھا دیکھی اور لوگ بھی لڑکیوں کو تعلیم کے لیے شہر بھیجنے لگے۔ رقیہ کے اعلا کردار نے ان کے تمام خدشے مٹا دیے۔ پھر رقیہ کی ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدے پر تقرری ہوئی تو اماں ابا کو بھی شہر لے گئی۔ لیکن وہ تو ابا کی کیڑی تھی، گاؤں کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔

ابا کی زمین بیچ کر گاؤں میں ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کروائی۔ کچھ گاؤں والوں نے تڑی لگائی بھی تو چودھری برکت ڈھال بن کے کھڑا ہو گیا......اس عمارت کو زنانہ اور مردانہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا......زنانہ حصے میں تعلیم بالغاں، سلائی کڑھائی سکھانے اور کھانا بنانا سکھانے کے سینٹرز تھے......جبکہ مردانہ حصے میں مردوں کی تعلیم، سلائی اور ویلڈنگ وغیرہ سکھانے کے سینٹرز تھے۔ چودھری کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار رہنے والے کمیوں کے نوجوان لڑکے اب ہنر سیکھ رہے تھے۔ دونوں طرف ڈسپنسریاں بھی تھیں۔

شروع شروع میں مشکل ہوئی تھی لیکن اب گاؤں کے ہی سکھانے والے تھے اور گاؤں کے ہی سیکھنے والے تھے۔ بلکہ کچھ لڑکے لڑکیاں تو ساتھ والے گاؤں سے بھی آ رہے تھے۔ رقیہ کبھی کبھار خود آتی تھی۔ سب سے ملتی، حوصلہ افزائی کرتی اور چلی جاتی۔ مخیر حضرات کا اعتماد اور دلچسپی بھی بڑھتی جاتی۔ ہر رات کے بعد سویرا ہے، ہر مشکل کے بعد آسانی ہے، ہر دکھ کے بعد خوشی ہے۔ بشرطیکہ ہار نہ مانو...... مایوس نہ ہو اور اپنی سی کوشش کرتے رہو۔

چودھری برکت رقیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس عمارت سے باہر نکل آیا۔ جاتے جاتے یوں ہی مڑ کر دیکھا۔

''اللہ رکھا فلاحی سینٹر۔'' پُرشکوہ عمارت کے ماتھے پر سنہری حروف میں لکھا تھا۔

''وہ مالک ہے......جسے چاہے عزت دے۔''

چودھری برکت بڑبڑایا......

''اور رہی بات نام کی......تو رہے نام اللہ کا۔''

اللہ رکھا کی کبھی کی کہی بات یوں ہی یاد آ گئی۔

☆

کب ٹھہرے گا دردِ دل

فاخرہ جبیں

زلیخا خاتون نے اس سے پہلے تین بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ اوپر تلے کی پیدائش تھی، آگے پیچھے تینوں نے جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ دیا تھا۔

جیسے رات کے کسی پہر منڈیر پہ کوئی بلی اُترتی ہے 'بغیر آواز کے...... اور آنگن میں گھوم پھر کر واپس بھی لوٹ جاتی ہے۔ سونے والے بے خبر سوئے رہتے ہیں۔

یوں ہی زلیخا خاتون بھی سوئی رہتی تھیں۔ بنا کسی ڈر، خوف، خدشے کے...... ان کی نیندوں پر آرام اور سکون کا پہرہ تھا۔ دل میں اطمینان کے ڈیرے تھے کہ ان تینوں پر جو جوانی آئی تھی، بڑے مدھم سروں کی تھی اور ہلکے رنگوں کی۔

بنا آہٹ کی جوانی۔

☆☆☆

وہ زرناب تھی۔ جسے سولہ کا سن لگا تو زلیخا خاتون کو لگا کہ سورج پوری آب و تاب سے ان کے آنگن میں اُتر آیا ہے۔ ایسی غضب کی اٹھان تھی کہ زلیخا خاتون اسے دیکھ کر دل تھام لیتی تھیں۔ سنہری رنگت...... شہد رنگ آنکھیں...... چہرے کا ایک ایک نقش اس قدر خوب صورت، جاذب نظر کہ گھنٹوں بیٹھ کر تکتے رہنے کو دل چاہتا تھا۔ لمبے بال پشت پہ یوں لہراتے تھے، گویا پگھلا ہوا سونا۔

"یا اللہ! ایسا خزانہ...... ہم غریبوں کے گھر میں، جسے چھپانے کی طاقت ہے ہم میں، نہ حفاظت کی سکت، کوئی بیٹا ہی دیا ہوتا تو اس دولت سے، میں کیوں خوف کھاتی؟"

زلیخا خاتون کو گھر کی دیواریں چھوٹی لگنے لگی تھیں۔

☆☆☆

زرناب اپنی عادات و اطوار میں بڑی تینوں



ناولٹ



بہنوں سے مختلف تھی...... بے حد مختلف...... سارا دن بس کھاتی...... اور باتیں کرتی تھی۔ زبان ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ کبھی اس بہن کے ساتھ، تو کبھی اس بہن کے ساتھ...... سب سے چھوٹی تھی تو سب سے لاڈلی بھی تھی...... من چاہا کھاتی تھی، من چاہا پہنتی تھی۔

باپ گھر میں آتا تو بڑی تینوں شرماتی، لجاتی، کھانا، پانی باپ کے سامنے رکھتیں اور گھر کے کسی کونے میں دبک جاتیں...... اور زرناب...... وہ آلتی پالتی مارے باپ کے برابر بیٹھتی اور ان ہی کی پلیٹ میں کھاتی...... کھاتی تو شروع دن سے تھی...... مگر اب...... ان کی نگاہ اٹھی...... تو پھر سر تھام کر رہ گئیں۔

"اس لڑکی کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔"

لمبے بالوں کی چوٹی سینے پہ جھول رہی تھی...... دوپٹا ندارد...... زلیخا خاتون نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہا، پر زرناب کو کہاں آتی تھی ایسے اشارے کنائیوں کی سمجھ، سو وہ اٹھیں اور ستارہ کو جا لیا۔

"گھر میں بڑی ہو سب سے...... کچھ طور طریقہ اسے بھی سمجھا دو...... ڈٹ کر باپ کے برابر جا بیٹھتی ہے۔ باپ کا کوئی لحاظ ہونا چاہیے، مگر اس لڑکی میں تو حیا، لاج نام کی کوئی چیز ہی نہیں...... آئندہ سے کھانا کھاؤ...... تو اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا کرو...... اور ہاں......" وہ جاتے جاتے مڑیں۔ "دوپٹا اوڑھنے کا ڈھنگ بھی سکھا دو اسے۔" وہ پلٹ کر آنگن میں آ گئیں۔

زرناب، باپ کے ہاتھ دھلوا رہی تھی، کوئی بات کہہ کر ہنستی جا رہی تھی۔ قندھاری انار سے سرخ ہونٹ تھے، چمکیلے ہموار دانت...... گالوں میں گڑھے سے بن گئے تھے، ہنستے ہوئے۔ انہوں نے ڈر کے نظریں ہٹا لیں۔

"کم بخت کو میری نظر ہی نہ لگ جائے۔"

☆☆☆

"یہ والا میں لوں گی۔" ابھی چاروں سوٹ کھلے ہی تھے کہ گہرے گلابی رنگ کا سوٹ زرناب نے جھپٹ لیا۔ تینوں بہنوں نے بس ایک نظر اس سوٹ کو دیکھا...... پھر باقی ماندہ جوڑوں کے متعلق باہمی مشاورت کرنے لگیں...... یوں جیسے وہ سوٹ تھا ہی زرناب کے لیے...... زلیخا خاتون دیکھ رہی تھیں، لیکن بولنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ شوخ رنگوں کا سوٹ پڑا بھی رہتا تو بڑی تینوں اتنے تیز رنگ پہننے کی عادی نہ تھیں۔

☆☆☆

"تم یہ سوٹ پہن کر ٹیوشن جا رہی ہو؟" ستارہ کی آواز پر سلائی مشین پہ جھکی زلیخا خاتون نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس دن والا سوٹ پہنے 'ٹیوشن جانے کو تیار ہو رہی تھی۔ لمبے بالوں کو بل دے کر چوٹی بناتے ہوئے اس نے ستارہ کو دیکھا۔

"ہاں...... کیوں......؟"

"بہت گہرا رنگ ہے اس کا اور تم تو جاتی بھی پیدل ہو۔"

"آپ ڈرائیور سے کہیں، گاڑی نکالے ـــ میں گاڑی میں چلی جاتی ہوں۔" کنگھے میں الجھے دو چار بال نکال کر اپنی انگلی پہ لپیٹتے ہوئے اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ ستارہ اپنا سا منہ لے کر پلٹ گئی اور وہ حسب عادت کھلکھلا کر ہنس دی۔

"راستے میں سو لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے، برے، ہر طرح کے...... ہر ایک کی نظریں اٹھیں گی۔" زلیخا خاتون نے مشین میں دھاگا ڈالتے ہوئے نپے تلے لہجے میں کہا تھا۔

زرناب نے قدرے اکتائی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا اور پھر لبوں کو بے آواز جنبش دے کر سر جھٹکتی ہوئی کمرے میں چلی گئی کہ ماں کو جواب دینے کی جرات تھی، نہ ہمت۔

"اب جاؤں......" ذرا دیر بعد وہ ان کے سامنے تھی۔ منجھلی کا سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا اور چہرا

جیسے رات کی تاریکی میں سورج بن کر دمک رہا تھا۔ آنکھوں، میں ہلکی سی خفگی تھی۔ سرخ ہونٹوں کو کاٹ کاٹ کر مزید سرخ کر رہی تھی۔

زلیخا خاتون جیسے ہار سی گئیں۔ کتنے پہناوے بدلتی وہ...... جو بن رنگوں کا نہیں...... اس کی اٹھان کا تھا...... اور رنگ تو جیسے بنے ہی زرناب کے لیے تھے۔ جو رنگ بھی اس کے بدن پہ آتا، دہک سا جاتا تھا۔

☆☆☆

دھوپ دیوار پہ چڑھی اور پھر آنگن میں اتر آئی۔ آنگن کے ایک کونے میں تخت پہ سلائی مشین ڈالے زلیخا خاتون نے دھوپ کی تپش کے ساتھ ساتھ تھکاوٹ کو بڑھتا محسوس کیا تو مشین ایک طرف دھکیل کر وہیں نیم دراز ہو گئیں۔ دوپہر کے کھانے کے لیے مسالا بھونتی ستارہ نے باورچی خانے کی کھڑکی سے ماں کو لیٹے دیکھا تو دم پہ رکھی چائے مگ میں انڈیل کر لے آئی۔

''اماں چائے پییں گی؟''

ململ کے دوپٹے کا پلو چہرے سے ہٹا کر انہوں نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔ بھاپ اڑاتا چائے کا مگ سامنے تھا۔ وہ شفقت سے مسکرا دیں۔ ستارہ جیسی بیٹیاں دعا کی صورت ہوتی ہیں جنہیں رب قبولیت کے بعد دوبارہ اپنے بندے کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

''جیتی رہو میری بچی! ہزاروں خوشیاں پاؤ۔''

انہوں نے بڑے دل سے دعا دی تھی۔

تب ہی دروازہ دھڑ دھڑایا تھا۔

''زرناب آ گئی۔'' ستارہ نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

اس نے حال ہی میں کالج میں داخلہ لیا تھا۔ سفید یونیفارم میں وہ تپے تپے سے چہرے کے ساتھ اندر آئی تھی۔

''اف ماں...... بہت گرمی ہے...... توبہ...... سر جل رہا ہے میرا...... ستارہ آپی! جلدی سے کوئی شربت پلا دیں...... ورنہ میری جان نکل جائے گی۔''

بڑا سا دوپٹا اتار کر ایک طرف پٹختے ہوئے اس نے پیڈسٹل فین کا رخ سیدھا اپنی طرف کیا اور چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

پسینے کے قطرے اس کی کنپٹیوں سے بہہ کر گردن تک آ رہے تھے۔ گال سرخ...... آنکھیں تھک کر مزید خواب ناک ہو گئی تھیں۔

''ہم تو پسینہ آنے سے میلے کچیلے لگنے لگتے ہیں اور زرناب پہلے سے بھی زیادہ نکھر جاتی ہے۔'' منجھلی کی کہی گئی بات اچانک ہی ان کے ذہن میں آئی تھی۔

''اچھا اللہ پاک! جیسی صورت اچھی بنائی ہے۔ ویسا ہی نصیب بھی اچھا ہی لکھنا۔''

جانے کن اندیشوں کا شکار رہتا تھا ان کا دل، جس نے بڑی شدت سے زرناب کو دیکھ کر بس یہ ہی چاہا تھا...... لیکن ہر چاہ کے نصیب میں وصال نہیں ہوتا، اس بات کا علم تب انہیں نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ بوتیک میں آرڈر کے سلائی کیے ہوئے کپڑے دے کر آ رہی تھیں جب زرناب کی دوست مریم کو اکیڈمی سے تنہا واپس آتے دیکھا۔

''مریم، زرناب نہیں آئی تمہارے ساتھ؟''

انہوں نے بے ساختہ ہی اسے روک لیا تھا۔

''اس کے کچھ پریکٹیکل رہتے تھے، اس لیے رک گئی۔''

اکیڈمی زیادہ دور نہیں تھی، وہ زرناب کو لینے کے ارادے سے اپنا راستہ بدل گئیں۔

کمپیوٹر لیب کے گلاس ڈور کے ہینڈل کو تھامتے ہوئے وہ ایک پل کو ٹھٹک سی گئی تھیں۔ اندر کا منظر بہت صاف اور واضح تھا۔ وہ لمبے، چوڑے ڈیل ڈول کا لڑکا تھا۔ گریبان کے چند بٹن کھلے تھے۔ وہ زرناب کے برابر کھڑا اس کے کی بورڈ پر اس حد تک

جھکا ہوا تھا کہ زرناب کا شانہ اس کے سینے کو چھو رہا تھا۔ دونوں کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پہ ٹکی تھیں۔

وہ کچھ بول رہا تھا، سمجھا رہا تھا...... اور زرناب مسلسل سر ہلا کر اس کے ایک ایک لفظ کو گویا ازبر کر رہی تھی۔ لیکن اس کا چہرا...... اے سی کی ٹھنڈک میں بھی اس کا چہرا اس روز سے زیادہ تپا ہوا تھا جس روز وہ گرم، چلچلاتی دھوپ میں کالج سے گھر واپس آئی تھی۔

زلیخا خاتون کا بدن جاڑے کے بخار کی طرح لرز رہا تھا۔

ان کی بیٹی انجان تھی یا بے حجاب...... یہ فیصلہ کرنے کا ابھی وقت نہیں تھا۔ شیشے کا وہ دروازہ کھولنے کے لیے انہیں پوری قوت صرف کرنا پڑی تھی۔ جتنی دیر میں وہ اندر داخل ہوئیں' منظر بدل چکا تھا۔ وہ لڑکا اب دونوں ہاتھ اٹھائے لیب میں موجود چند لڑکیوں کو اپنی زبان میں لیکچر دینے لگا تھا۔

''اماں...... آپ یہاں؟'' زرناب نے انہیں دیکھا اور پھر اگلے ہی پل اپنا بیگ اٹھائے' انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی باہر کھینچ لائی تاکہ لیکچر میں خلل نہ آئے۔

''یہ کیا ہو رہا تھا؟''

''پریکٹیکل کر رہی تھی۔ کمپیوٹر کی شکل تک تو کبھی دیکھی نہیں۔ آپریٹ کرنا کیسے آئے۔ ہاں اماں...... ایک کمپیوٹر ہی لے دیں...... کس صدی میں رہ رہے ہیں ہم لوگ...... بچہ بچہ...... لیپ ٹاپ، ٹیب پہ گیمز کھیل رہا ہے اور ہم ہیں کہ......'' وہ اپنی ہی داستان سناتی کھٹ کھٹ اکیڈمی کی سیڑھیاں اترتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

رات ہولے ہولے بیت رہی تھی۔ زلیخا خاتون کی آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے نیند ان میں کبھی اتری تھی نہ اترے گی۔ وہ ایک ہی منظر تھا جو آنکھوں میں گھات لگائے بیٹھا تھا اور ان کی نیند پہ بار بار غراتا تھا۔

''زری...... اکیڈمی جانا لازمی ہے کیا؟''

لڑکیاں کمرے میں کھٹر پٹر بند کر کے اپنے اپنے بستروں پہ آ گئیں۔ زرناب سب سے بعد میں آئی۔ ان کے برابر چارپائی پہ آ کر لیٹی تو وہ بے اختیار ہی بول اٹھیں۔

''آپ سوئی نہیں ابھی تک۔''

''ہاں...... اتنا تھک جانے کے بعد اب تک سو جانا چاہیے تھا...... مگر پتا نہیں، آج نیند کیوں نہیں آ رہی؟'' وہ بڑبڑائیں۔ ''میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ اکیڈمی......''

''کمپیوٹر نہیں ہے گھر میں...... آئی سی ایس کر رہی ہوں تو کمپیوٹر کے بغیر ساری تیاری کیسے ہو گی؟''

زرناب کا لہجہ کچھ سخت سا لگا۔ اپنے وقتوں کی مڈل پاس زلیخا خاتون کے لیے آئی سی ایس کا نام ہی بڑا بارعب تھا۔

''پتا نہیں کیسی مشکل پڑھائی ہے۔'' انہوں نے سوچا۔

''کمپیوٹر نہیں تو اکیڈمی جانا ہو گا...... اور اکیڈمی جائے گی تو......'' بستر پہ کانٹے اگ آئے تھے۔

''اور یہ دنیا داری کو پڑھانا بھی کتنا مشکل ہے۔ معصوم سی بچی...... کیسے سمجھاؤں...... کیا کہوں......؟ مرد بھی اپنے نفس کی تسکین کے لیے کیسے کیسے طریقے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وقت سے پہلے آگاہی دے دوں۔ کیا کہوں اس سے......؟''

رات بھر سوچتی ہی رہیں۔

آخری پہر میں آنکھ لگی۔ صبح آنکھ کھلی تو وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

''سنو زرناب! آج تم اکیڈمی مت جانا۔''

رات کی تاریکی میں جمع شدہ سارے لفظ دن کے اجالے میں کہیں کھو گئے تو انہیں یہ کہنا بہت آسان لگا تھا۔

''کیوں......؟''

''حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ زمانہ بہت خراب

ہے بیٹا۔ میرا دل نہیں مانتا تجھے اکیلے کہیں بھیجوں۔"

"اکیلے کیوں؟ مریم میرے ساتھ ہوتی ہے۔ نادیہ اور فریحہ بھی ہوتی ہیں اکیڈمی میں۔"

"ہوتی ہوں گی، لیکن تمہاری طرح بے وقوف کوئی بھی نہیں ہے۔" وہ تپ کر کہہ گئیں۔

"میں نے کیا بے وقوفی کی ہے؟"

باقی تینوں حیرت سے زرناب اور ماں کو دیکھ رہی تھیں...... یہ کیسی بحث تھی۔

"تمہارے لیے کمپیوٹر آجائے گا گھر میں۔"

"جب آجائے گا تو میں اکیڈمی جانا چھوڑ دوں گی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

زلیخا خاتون بوتیک سے آرڈر لینے گئیں تو پہلے سے دگنے کپڑے اٹھا لائیں۔

ستارہ اور منجھلی باقاعدہ خفا ہوئیں۔ "کمر میں مستقل درد رہنے لگا ہے۔ عینک کا نمبر بڑھ گیا۔ کیوں خود کو اتنا ہلکان کر رہی ہیں۔"

"دو ہزار ہر ماہ اکیڈمی جاتے ہیں۔ کمپیوٹر ہو گا تو ان ہی پیسوں کی بچت بھی ہو جائے گی۔ (سب سے بڑھ کر تو عزت بچانی ہے مجھے۔)" انہوں نے بات بنائی اور جُت گئیں۔

تینوں بیٹیاں ساتھ نبھانے لگیں۔ کسی نے بٹن لگانے، ترپائی کرنے کا کام سنبھال لیا، کوئی پائنچے بنانے لگی۔

زرناب البتہ اسی معمول کے مطابق کالج اور اکیڈمی جاتی رہی۔

☆☆☆

زرناب کے کالج سے فون آیا تھا۔ زلیخا خاتون نے ہی سنا۔

"آپ زرناب کی والدہ بات کر رہی ہیں؟"

"جی...... جی...... بول رہی ہوں...... خیریت؟" وہ گھبرا سی گئیں۔ انہیں آج تک کبھی کسی اسکول، کالج سے فون نہ آیا تھا۔ "یا اللہ! خیر......"

انہوں نے خاموش لبوں سے دعا کی۔ دل الگ سے دھڑ دھڑ کرنے لگا تھا۔

"آپ ابھی اور اسی وقت کالج تشریف لے آئیں۔ بے حد ضروری ہے آپ کا آنا۔ کوئی معمولی بات مت سمجھیے گا۔" اور ٹھک کی آواز سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

زلیخا خاتون چادر اوڑھے' ہانپتی کانپتی رکشے میں جا بیٹھیں۔ ہر موڑ پہ وہم کا ایک نیا اژدھا پھنکارتا اور ان کے دل میں کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا۔ کالج کا راستہ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا...... اور جب ختم ہوا تو وہ اپنی آدھی سے زیادہ توانائی کھو چکی تھیں۔ رکشے والے کو کرایہ دیا تو بقایا لینا بھی یاد نہ رہا۔

"کیوں بلایا ہے مجھے؟ کیا کہیں گے؟ کیا دیکھنے کو ملے گا آج؟" لمبی روش تھی۔ پھر سیڑھیاں...... پھر پختہ برآمدہ...... اور کوریڈور......

"آپ؟" چوکیدار مستعدی سے اٹھا تھا۔

"میں زرناب کی والدہ ہوں۔ ابھی ابھی

یہاں سے فون......"

"آپ اندر چلی جایئے۔" پرنسپل کے آفس کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔

☆☆☆

ان کی نظروں کے عین سامنے میز کی چکنی سطح پر ایک موبائل پڑا تھا۔

"یہ موبائل زرناب کے بیگ سے نکلا ہے۔ وہ تسلیم کرچکی ہے...... کہ یہ موبائل اسی کا ہے اور وہ اس کے ذریعے اپنے کسی بوائے فرینڈ سے باتیں کرتی ہے...... یہ کوئی پرائیویٹ کالج نہیں ہے، جہاں طلبا و طالبات کو ہر اچھا، برا کام کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ گورنمنٹ کا ادارہ ہے، جہاں غریب اور متوسط گھرانے کی بچیاں اپنا مستقبل سنوارنے آتی ہیں......

ہم دو دفعہ زرناب کو وارن کرچکے ہیں کہ ہمارے کالج میں بچیوں کو موبائل لانے اور اس پر بات چیت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اس نے ہماری وارننگ کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اب ہم آپ کی بچی کو مزید موقع نہیں دے سکتے۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ زرناب ہمارے کالج میں اپنی تعلیم مزید جاری نہیں رکھ سکتی۔

ہمارے چوکیدار نے یہ بھی بتایا ہے کہ زرناب صبح کے وقت کالج آنے کے بجائے باہر سے ہی کسی لڑکے کے ساتھ چلی گئی تھی اور پھر چھٹی سے ایک گھنٹہ قبل آئی ہے، اس کے بازپرس کرنے پر زرناب نے اس سے جھگڑا کیا۔ نتیجتاً یہ ساری بات ہمارے سامنے آگئی۔"

اسی پہ موقوف نہیں تھا، پرنسپل نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ عزت، نیک نامی، بدنامی، بیٹیوں کی تربیت، ماں کے فرائض، کیا کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ مگر زلیخا خاتون کو سنائی دینا بند ہوگیا تھا۔ ہاں سمجھ میں آرہا تھا کہ کیا کہہ رہی ہوں گی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ان کے بائیں جانب تین لڑکیوں کے ساتھ قطار بنائے کھڑی تھی۔ یہ تینوں لڑکیاں اس کی ہم راز ہوں گی یا مخبر ہوں گی۔ زلیخا خاتون بدقت تمام کھڑی ہوئیں۔ زرناب نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر ماں کا چہرا دیکھا۔ جہاں رتی بھر خون کی رمق نہ تھی۔

"یہ اعزاز...... یہ رتبہ دینے کے لیے تو نے ماں کو یہاں بلایا تھا؟" پتا نہیں زلیخا خاتون میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ ان کا ہاتھ اٹھا تو زرناب کے چہرے پہ پانچوں انگلیوں کے نشان چھوڑتا چلا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرائی، پھر گھٹنوں کے بل زمین پہ جا گری۔

"ذرا سی بھی شرم ہوئی تو آج گھر مت آنا۔ ڈوب مرنا راستے میں ہی کہیں۔" وہ پرنسپل کے دفتر سے نکلیں تو پھر رکی نہیں۔ کالج کا گیٹ بھی پار کرگئیں۔

☆☆☆

گھر کے مستطیل نما کمرے میں ان کا کوئی ہزارواں چکر تھا۔ اس کے بعد قدم لڑکھڑا سے گئے تو قریب رکھی کرسی پہ ڈھے گئیں۔ بڑی عجیب کیفیت تھی...... نہ رونا آرہا تھا...... نہ غصہ تھا۔ بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

"کیا ہوگیا تھا مجھے۔ میں اندھی تھی، بہری تھی...... مجھے کچھ دکھائی، کچھ سنائی کیوں نہ دیا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھیں۔ "دل میں خدشے پالتی رہی اور آنکھوں پہ یقین کی پٹی باندھے رکھی۔ کیا مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جس لڑکی کو میں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے' وہ بدکردار بھی ہوسکتی ہے۔" وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح جھول رہی تھیں۔ "کیا کوئی بھی ماں یہ سوچ سکتی ہے کہ اس کی بیٹی......" وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"وہ موٹر سائیکل پہ کس کے ساتھ گئی تھی؟ کیا کرنے گئی تھی؟ کیا کرکے آئی تھی؟ احمد کرم کو دکان سے بلواؤں...... انہیں بتاؤں؟ ان کی لاڈلی کے کرتوت...... موبائل کہاں سے آیا اس کے

پاس......" یہ سارے جواب جس سے مل سکتے تھے۔
وہ اگلے دس منٹ میں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

☆☆☆

"آنٹی......!!" مریم آج چھٹی پہ تھی، سو گھر میں مل گئی تھی۔

"صرف میرے سوال کا جواب دو مریم؟ اس نے موبائل کہاں سے لیا؟"

"محلے کی دکان سے ہی لیا تھا آنٹی۔" مریم کو سچ بتانے میں ہی عافیت نظر آئی تھی۔

"پیسے کہاں سے لیے اس نے؟"

"اکیڈمی میں فیس جمع نہیں کرائی تھی اس نے...... سر نے اسے یوں ہی فری میں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔"

"سر......؟"

"سر سلطان۔" زلیخا خاتون کی نظروں میں بے اختیار ہی اس لڑکے کا سراپا گھوم گیا۔

اسے فیس کی کیا ضرورت تھی؟ فیس کے بدلے میں اور بہت کچھ وصول کر رہا تھا وہ۔ وہ الٹے قدموں گھر لوٹ آئیں۔

دروازہ بھیڑ کر سیدھی ہوئی ہی تھیں...... کہ رکشہ رکنے کی آواز آئی۔ "آ گئی کلموہی......" انہوں نے پلٹ کر دروازہ کھولا۔

"بی بی...... بی بی جی!" رکشہ ڈرائیور کا ہونق پن...... بوکھلایا ہوا انداز......

انہیں کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"آپ کی بیٹی نے خودکشی کر لی...... نہر میں کود گئی جی۔"

وہ بولا نہیں تھا۔ صور پھونکا تھا اس نے...... گھر کے بام و در...... چھتیں...... دیواریں کچھ بھی تو اپنی جگہ پہ نہیں رہا تھا اور قیامت کیسے آئے گی...... آ ہی تو گئی تھی۔

"نہر کے پل پہ پہنچے تو کہنے گی۔ بھیا میری کتاب گر گئی۔ میں نے رکشہ روک دیا۔ وہ اتری، پل کی دیوار پر پاؤں رکھا اور پلک جھپکتے میں نہر کے اندر۔" وہ زلیخا خاتون کو نہیں...... محلے کے جمع ہوتے لوگوں کو بتا رہا تھا۔ زلیخا خاتون نے کھوئی کھوئی نظروں سے سب کو دیکھا اور پھر کھڑے قد سے زمین پہ آ رہیں۔

☆☆☆

رات ہو گئی تھی۔

نیزے کی انی جیسی دوپہر بیت گئی تھی پر کہیں گئی نہیں تھی، دلوں میں گڑ کے رہ گئی تھی۔ نہ جانے کتنے پل، کتنی صدیاں بیت گئیں۔ تب زلیخا خاتون نے آنکھیں کھولیں۔ برابر کی چارپائی پہ احمد کرم بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھوں پہ سر گرائے وہ رو رہے تھے۔

آنسوؤں کا نمکین پانی ان کی آنکھوں سے نکل کر جھرّیوں زدہ چہرے پہ لکیریں ڈالتا ان کے پیروں پہ گر رہا تھا۔ زلیخا خاتون نے بمشکل خود کو سنبھالا دے کر اٹھایا۔ چہار اطراف میں دیکھا۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ ان کے کسی اندازے کی تصدیق یا تردید نہیں کر پایا تھا۔

"وہ مر گئی۔" پتا نہیں کیسے ان کے منہ سے نکلا۔

احمد کرم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ "وہ نہیں مری زلیخا خاتون! میں مر گیا...... احمد کرم مر گیا۔" وہ پھر سے سسک اٹھے تھے۔

نہر میں کئی لوگ نہا رہے تھے۔ زرناب کو گرتے دیکھا تو کتنوں نے غوطہ لگا دیا۔ نہر لوئر باری دوآب اپنی آغوش میں آنے والے کسی بھی فرد کو اتنی آسانی سے نہیں لوٹاتی، تاریخ گواہ تھی۔ پتا نہیں خوش نصیبی تھی یا بدنصیبی کہ اسے بچا لیا گیا۔ لیکن احمد کرم نے جن حالات، جن سوالات کا سامنا کیا۔ اس سے انہیں کوئی نہیں بچا سکا۔ پچھلے سات گھنٹوں میں انہوں نے جو کچھ سنا اور سہا...... اپنی ساری زندگی میں شاید کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

ڈاکٹر کی ایک ہی ضد تھی۔ "یہ پولیس کیس

ہے...... پولیس کے آنے تک میں پیشنٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

جانے، انجانے چہرے...... ہمدرد...... مضحکہ اُڑاتے...... تجسس سے بھرپور...... ان کے اردگرد ایک مجمع تھا......اور وہ ایک بونے تھے۔ آج ہر انسان کا قد ان سے بڑا تھا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے...... پیشانی ٹیک دی۔

"میں نہیں سہہ پاؤں گا۔ اس سے پہلے میں مر جاؤں گا۔" وہ ایسی لاچاری سے کرلائے کہ ڈاکٹر کے دل میں رحم آ گیا۔

زرناب کی زندگی باقی تھی...... سو اسے بچالیا گیا۔

☆☆☆

"وہ تو غلطی کر ہی چکی تھی۔ تم کیوں آپے سے باہر ہوگئیں۔ اس کی کلاس فیلوز، اس کے اساتذہ، اس کی پرنسپل کے سامنے تم اس کے منہ پر تھوک کر چلی آئیں۔ اس کی انا، خودداری، عزت نفس یہ برداشت نہیں کرپائی۔ اسی لیے اس نے یہ انتہائی قدم اٹھالیا۔"

یہ اس سے اگلی صبح تھی۔ جب احمد کرم کو الزام دیتے دیکھ کر وہ صدمے سے اٹھ کر ان کے سامنے چلی آئی تھیں۔

"وہ ہماری نیک نامی، ہماری عزت کو کچل کر، ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر کالج سے کسی لڑکے کے ساتھ گئی۔ کون تھا وہ؟ کیا لگتا تھا اس کا؟ پوچھا ہے آپ نے اس سے......کون سی انا، کون سی خودداری......کیسی عزت نفس...... جو لوگ یہ خوبیاں رکھتے ہیں وہ ایسی حرکتیں نہیں کرتے احمد کرم...... ہاں میں نے اس کے منہ پہ طمانچہ مارا...... ماں ہوں اس کی......حق رکھتی ہوں اس پر۔"

"یہ حق گھر کی چار دیواری میں استعمال کرنا چاہیے تھا زلیخا خاتون......اور حق تو میں بھی رکھتا ہوں تم سے پوچھنے کا...... چار جوان بیٹیاں ہیں تمہاری......کیسی مدہوش رہتی تھیں کہ بیٹی اس مقام تک آن پہنچی اور تمہیں خبر تک نہ ہوئی۔"

بس ایک یہ ہی سننا باقی رہ گیا تھا۔ ان کے منہ پہ قفل لگ گیا۔ جو طمانچہ انہوں نے زرناب کے منہ پہ مارا تھا۔ وہ پلٹ کر ان کے منہ پہ آ لگا تھا......کم از کم زلیخا خاتون کو تو یہ ہی لگا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں خزاں سے بڑھ کر ویرانی تھی۔

سلائی مشین کے پاس کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور زلیخا خاتون جیسے سارے زمانے سے خفا ململ کا دوپٹا منہ پہ ڈالے پڑی تھیں۔ دماغ کی رگیں بہت کچھ سوچ سوچ کر تھک گئی تھیں۔ پھر جانے دل میں کیا آئی کہ جھٹکے سے اٹھیں اور سیدھا لڑکیوں کے کمرے میں جا کھڑی ہوئیں۔

منجھلی سو رہی تھی۔ چھوٹی کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ ستارہ نیم تاریک کمرے میں کسی قمیص پہ کڑھائی کرتے ہوئے اپنی آنکھیں پھوڑ رہی تھی۔ ماں کو اچانک سامنے دیکھ کر وہ بری طرح چونکیں۔

تین دن ہوگئے تھے۔ دعا، کلام، سلام سب چھوڑے بیٹھی تھیں۔ زلیخا خاتون کی توجہ صرف زرناب پہ مرکوز تھی۔ وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے مایوں کی دلہن کی طرح جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"زرناب!" ان کے پکارنے پر وہ چونکی۔ انہیں دیکھا اور پھر فوراً نظریں چرا گئی۔

"وہ کون تھا زرناب؟" زرناب نے اپنے ہونٹ بری طرح کچلے تھے۔

"بتاؤ......تم کس کے ساتھ گئی تھیں؟ کیا کہا اس نے تم سے؟ کہاں لے کر گیا تھا وہ...... بتاؤ زرناب۔" انہوں نے اس کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا تھا۔

"اس نے تمہاری کوئی تصویر تو نہیں لی۔ کوئی ویڈیو تو نہیں بنائی نا تمہارے ساتھ...... زمانہ بہت خراب ہے میری بچی......وہ کچھ ہو جاتا ہے، جس کا

ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا...... کچھ تو بولو زرناب۔"

"اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے...... کہتا تھا اپنے والدین کو بھیجے گا۔"

"شادی؟" وہ بولی تو زلیخا خاتون کو چپ لگ گئی۔

انہوں نے ستارہ کو دیکھا جو ٹانکا بھرنا بھول گئی...... پھر منجھلی کو...... جس کا قد چارپائی کے برابر تھا...... اور چھوٹی...... جس نے زرناب کی بات سن کر کتاب میں سر گھسا دیا۔ انہوں نے حیرانی سے زرناب کو دیکھا۔

وہ سترہ سالہ لڑکی...... کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ اپنی شادی کو پلان کر رہی تھی۔

"کیوں زرناب؟ ایسا کیوں؟ تم سے بڑی عمر کی تین بیٹیاں ابھی کنواری بیٹھی ہیں۔ تمہیں اتنی جلدی کیوں؟"

"مجھے نہیں...... اسے جلدی ہے...... وہ گھر میں سب سے بڑا ہے۔"

"یہ فیصلے تمہارے کرنے کے نہیں ہیں...... ہم زندہ ہیں ابھی......"

"خوش قسمتی بار بار دروازے پہ دستک نہیں دیتی ماں...... وہ اتنا اچھا، اتنی محبت کرنے والا ہے کہ لڑکیاں ایسے مرد کا صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہیں۔"

"بکواس بند کرو...... غیر مردوں کے خواب تم جیسی بے حیا آنکھوں میں ہی اترتے ہوں گے زرناب...... جسے یہ بھی شرم نہیں کہ وہ کس کے سامنے بیٹھ کر کیا باتیں کر رہی ہے۔" یہ زلیخا خاتون نہیں، یہ ستارہ تھی جو بھڑک اٹھی تھی۔

پچھلے تین دن سے اس کی ناز برداریوں میں لگی ستارہ گزشتہ سارے معاملے کو کسی غلط فہمی کا نتیجہ سمجھ رہی تھی۔ آج زرناب کو اپنے منہ سے یہ کچھ کہتے سنا تو مارے شرم کے برداشت نہ کر پائی تھی۔ روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

زلیخا خاتون نے زرناب کو یوں دیکھا جیسے کوئی بچہ ڈور سے کٹ جانے والی پتنگ کو آسمان میں ڈولتے ہوئے نیچے گرتے دیکھتا ہے یا پھر اپنے ہاتھ میں رہ جانے والی ڈور کو...... اس نظر میں غم ہوتا ہے، اور دل میں کہیں پچھتاوے کا احساس بھی...... کاش پتنگ ڈور سے نہ کٹی ہوتی۔

لمبی سی گاڑی تھی جس میں سے ایک اجنبی خاتون کروفر کے ساتھ اتریں اور گھر کے کھلے دروازے سے اندر ہی اندر گھستی چلی آئیں۔

"زرناب کون ہے تم میں سے......"

زلیخا خاتون کے بخار زدہ بدن پہ تینوں بیٹیوں کا پہرہ تھا۔ کوئی ٹانگیں دبا رہی تھی...... کوئی دوا لیے کھڑی تھی، کوئی کھچڑی کے ایک نوالے کے لیے منت کر رہی تھی اور جو باعث مرض تھی، وہ سامنے ہی نہ آتی تھی۔

خاتون منتظر نگاہوں سے ایک ایک چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ تب ہی ہوا کے جھونکے کی طرح زرناب کمرے میں داخل ہوئی۔

"میں...... میں ہوں زرناب۔" آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی تھی...... کسی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔

خاتون نے نگاہ اٹھا کر سبز رنگ کے لباس میں کھڑی زرناب کو دیکھا...... تو پھر کئی لمحے دیکھتی ہی رہیں۔

"میں سلطان کی ماں ہوں۔" انہوں نے طویل سانس لے کر کہا۔ زلیخا خاتون کے ایک اشارے پر تینوں لڑکیاں ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"میں چائے لے کر آتی ہوں۔" زرناب کے وجود میں بجلی سی بھری تھی۔

محبت فاتح عالم بننے جا رہی تھی۔

"یہ باہر گاڑی کس کی......؟" احمد کرم پوچھتے ہوئے آ رہے تھے۔

جواب مجسم سامنے تھا۔

زلیخا خاتون نے پچھلے دس دنوں میں شاید پہلی سانس احمد کرم کو دیکھ کر لی تھی۔

"بہت قیمتی خزانہ ہے آپ لوگوں کے پاس......لیکن حیرت ہے کہ کھلے عام رکھ چھوڑا ہے۔" چبھتا ہوا لہجہ تھا۔

"اپنے آنے کا مقصد بیان کریں خاتون۔" احمد کرم کے لہجے میں تپش تھی۔

"ہم کھاتے پیتے لوگ ہیں جناب! سلطان کی منگنی دو سال قبل میری بھانجی کے ساتھ ہو چکی ہے۔ یہ منگنی اتنی دھوم دھام سے ہوئی تھی کہ رشتے داروں میں دو سال کے بعد بھی اس منگنی کا تذکرہ زور و شور سے ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا اپنا ایک اسٹینڈرڈ ہے۔ اپنی ویلیوز ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی کہ وہ تفریحاً اپنے دوست کی اکیڈمی کو جوائن کر بیٹھا......اور یہیں آپ کی بیٹی کو موقع مل گیا، اپنے لیے ایک تگڑا مرغا پھانسنے کا۔"

احمد کرم نے کچھ کہنا چاہا، لیکن خاتون سننے کے موڈ میں نہ تھیں۔

"وہ زرناب کے لیے اپنی جان دینے پر تلا ہوا ہے۔ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ سچی اور صاف بات کہوں گی۔ اس کے مجبور کرنے پر میں یہاں آتو گئی ہوں، لیکن اس کی کوئی گارنٹی نہیں دوں گی۔ یہ شادی خفیہ رہے گی۔ وہ اسے کہاں رکھتا ہے، کیسے رکھتا ہے؟ ہم اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ کیوں کہ ہماری خاندانی بہو وہی ہوگی جہاں ہم نے اس کی بات طے کی ہے۔"

احمد کرم نے بہت صبر اور برداشت سے ان کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیا۔

"بات یہ ہے خاتون! آپ میرے گھر میں آئی ہیں۔ میں کسی بھی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ ضرور بتادوں کہ آپ کسی غلط فہمی میں تشریف لے آئی ہیں یہاں۔ ہمارے ہاں خاندان سے باہر رشتے نہیں کیے جاتے......زرناب کی بات بچپن سے ہی اس کے پھپھی زاد فواد حسن سے طے ہے۔ اور اسی جمعے ان دونوں کا نکاح بھی ہے۔ ضروری سمجھا تو شاید رخصتی بھی ساتھ ہی کردوں۔

آپ مطمئن ہوکر جایے اور بیٹے کو سمجھایے......بلکہ ہوسکے تو فوری طور پر اس کی شادی بھی ارینج کردیں تاکہ دوسروں کی بہو، بیٹیوں پہ تفریحاً نظر نہ ڈالے۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔"

احمد کرم کا نپا تلا لہجہ اور ان کا ایک ایک لفظ کمرے میں ہی نہیں، کمرے سے باہر بھی سنا گیا تھا۔

سلطان کی ماں شاداں و فرحاں جانے کے لیے اٹھیں۔ "آپ تو خاصے سمجھ دار انسان ہیں، خوشی ہوئی آپ سے مل کر......چلتی ہوں......اور ہاں......یہ نکاح رازداری سے ہی کردیجیے گا۔ میں بھی سلطان کو خبر نہیں ہونے دوں گی۔ فی الحال یہ ہی کہوں گی کہ آپ لوگوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔" ان کی تو جیسے دلی مراد برآئی تھی۔ کھلتی ہوئی آئی تھیں، اڑتی ہوئی لوٹ گئیں۔

چولہے کے پاس بیٹھی زرناب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ چولہے پر چائے کا پانی کھولتا رہا، یہاں تک کہ ستارہ نے آکر چولہا بند کردیا۔

☆☆☆

کمرے میں سنسناتی ہوئی خاموشی تھی۔ زلیخا خاتون کی سوال کرتی نگاہیں تھیں اور احمد کرم کا جھکا ہوا سر تھا۔

"کیا واقعی آپ نے فیصلہ کرلیا ہے؟"

"ہوں......"

"نصرت مان جائے گی؟"

"بہن ہے میری......پگڑی پیروں میں رکھ دوں گا، تب بھی نہ مانے گی؟"

زلیخا خاتون نے دوبارہ منہ کھولا۔ پوچھنا چاہتی تھیں۔ "زرناب مان جائے گی؟" لیکن چپ ہورہیں۔

اگر احمد کرم پھر وہی جواب دے دیتے کہ پگڑی پیروں میں رکھ دوں گا، تب بھی نہ مانے گی؟

"تو؟" وہ سہم کر اپنے کپکپاتے بدن کو چادر

میں چھپانے لگیں۔

☆☆☆

احمد کرم نے بہن کو نہیں بلایا تھا۔ خود اس کے گھر گئے تھے۔ زلیخا خاتون کو بھی ساتھ لے کر نہ گئے۔ وہ انتظار کی سولی پہ لٹکی رہیں...... ساری شام...... پھر رات کا اولین پہر...... جب دروازے کی کنڈی بجی اور ستارہ کسی سائے کی طرح کنڈی کھول کر پھر سے کمرے کی تاریکی کا حصہ بن گئی۔

زلیخا خاتون نے بڑے صبر سے شوہر کے بیٹھنے اور پھر تکیے پہ سر رکھ دینے کا انتظار کیا۔

"مان گئی نصرت؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہوں......"

"اچھا، پھر کب؟"

"اسی جمعے......"

"اسی جمعے؟" زلیخا نے جھٹ اپنی انگلیوں پہ گنتی گنی۔ آج منگل ہے، بدھ، جمعرات، بس دو دن ہیں بیچ میں۔ "یہ دو دن گزر جائیں گے؟"

"کیسا عجیب سا سوال کر رہی تھی زلیخا۔ بیٹی نے جھلی کر دیا ہے اسے۔" انہوں نے دل میں سوچا۔

"تم زرناب سے کچھ مت کہنا۔ اس سے بات میں خود کروں گا۔ ویسے تو امید ہے کہ سلطان کی ماں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا دماغ کسی حد تک ٹھکانے پر آ گیا ہوگا۔" احمد کرم نے کروٹ بدل لی۔

زلیخا خاتون اپنے بستر پہ جا لیٹیں۔ دوا کھالی تھی۔ پھر بھی نیند بڑی دیر سے آئی۔

"میں کمرے میں ہی سوؤں گی۔" انہوں نے غنودگی کے عالم میں سنا۔

زرناب تکیہ اٹھا کر کمرے میں جا رہی تھی۔ انہوں نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ستارہ بھی اپنا تکیہ اٹھائے اس کے پیچھے کمرے میں جا رہی تھی۔

"میری سیانی دھی......" سونے سے ایک لمحہ قبل انہیں اطمینان دلانے والی ستارہ ہی تھی۔ بس دو ڈھائی گھنٹے کی نیند لی تھی انہوں نے...... پھر اچانک ہی آنکھ کھل گئی۔ نفل پڑھنے کی نیت سے وضو کرنے اٹھیں۔ صحن کی بتی جلائی...... صحن کے آخری کونے میں باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے ان کی نگاہ بیرونی دروازے پر پڑی۔ جس کی کنڈی لٹک رہی تھی۔

"ہائیں' دروازہ کس نے کھولا؟" ایک پل کی حیرت تھی۔ دوسرے پل میں کسی وہم کا اژدھا پھنکارا اور وہ الٹے پاؤں بھاگیں۔

زرناب کا بستر خالی تھا...... بے شکن......

وہ کمرے کی جانب لپکیں...... اس مختصر مسافت میں ان کے بدن کے روئیں روئیں نے دعا کی تھی کہ زرناب کمرے میں ہو...... گہری نیند میں...... مگر ہر لمحہ دعا کی قبولیت کا نہیں ہوتا۔ کمرے میں صرف ستارہ تھی۔

☆☆☆

زرناب کے جانے کا کسی کو علم نہ ہوتا اگر احمد کرم نہ چلا جاتا۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو کسی صدمے، سانحے کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہ رکھنے پر خواہش کرتے ہیں کہ کاش انہیں دوسرا سانس نہ آئے اور انہیں دوسرا سانس نہیں آتا۔ احمد کرم ایسے ہی خوش نصیب تھے۔ انہوں نے شدت سے خواہش کی اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گئے۔ پھر کسی کے اٹھانے سے نہ اٹھے۔

زلیخا خاتون نے بھی شدت سے چاہا' وہ مر جائیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں' ان دنوں ان کی کوئی دعا قبول ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ صدمے سے گنگ بیٹھی' روتی، کرلاتی بیٹیوں کو دیکھتی رہیں۔

"کوئی جائے...... جا کر اسے بھی بتائے۔ وہ باپ کی موت پر اپنی خوشیوں کی سیج سجانے گئی ہے۔ اسے یہ بھی بتاؤ کہ جو خاک وہ اپنے باپ کے سر میں ڈال گئی ہے' اس کا بوجھ اسے منوں مٹی تلے لے گیا۔ کوئی جائے...... اسے بتائے کہ دلوں کو روند کر خوشیاں نہیں ملتیں۔ وہ بے سکون رہے گی۔ تڑپے گی۔ خوشیاں راس نہیں آئیں گی اسے...... جاؤ بتا دو۔" انہوں نے دل ہی دل میں بین ڈالے تھے۔

آنکھیں پتھر ہوگئی تھیں...... لب منجمد...... نہ آنسو گرے...... نہ آہ نکلی۔ بس سراپا الم بن کر بیٹھ رہیں۔

☆☆☆

بس اتنی سی بات تھی۔ اس نے حیرت سے اپنے سجے سنورے روپ کو دیکھا۔ وہ سلطان کے فلیٹ میں تھی۔ اور اس کے نکاح میں تھی۔ بس...... صرف اتنی سی جرأت چاہیے تھی من پسند ساتھی کو پانے کے لیے...... بس ایک چھلانگ...... اور وہ سماج کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر محبت کی پرجوش پناہوں میں تھی۔

''کتنے بے وقوف ہوتے ہیں محبت میں جان دینے والے...... محبوب کو پالینا کوئی مشکل ہے کیا؟'' اس نے تفاخر سے سوچا۔

سلطان کچھ شاپنگ کے بعد اسے فلیٹ میں چھوڑ گیا تھا۔ ''میں کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں...... جب تک تم تیار ہو جاؤ...... جانتی ہو نا؟'' وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ''دلہن سہاگ رات کے لیے کس طرح تیار ہوتی ہے۔''

اس کے لہجہ و انداز پر وہ بری طرح شرما گئی تھی۔

سرخ و سبز رنگ کے امتزاج کا لباس، میک اپ اور کچھ زیورات پہن کر اس پر دلہناپے کا وہ روپ آیا تھا، جسے دیکھ کر سلطان ششدر رہ گیا تھا۔

''یہ تم ہو زرناب؟'' وہ اسے دونوں کندھوں سے تھامے حیرت زدہ تھا اور زرناب گویا اس کے لمس سے پگھلی جا رہی تھی۔

وہ اسے لے کر فلیٹ کے اس کمرے میں آ گیا جو اب تک بند تھا۔ سرخ گلابوں سے سجا، مہکا ہوا، ویسا ہی جیسا سہاگ رات کے لیے سجائے جانے والا کمرہ ہوتا ہے...... وہ رات زرناب نے پھولوں پہ بسر کی تھی۔ وہ آج رات زمین پر نہیں تھی، آسمان پر تھی۔

☆☆☆

ہنسی تھی یا قلقل کرتا کوئی پہاڑی جھرنا۔

مائی خیراں نے سر اٹھا کر کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے دوبارہ سے اپنے کام میں جت گئی۔ یہ فلیٹ اسے حال ہی میں کام کے لیے ملا تھا۔ نیا شادی شدہ جوڑا تھا۔ لڑکا فلیٹ کا دروازہ کھولتا اور پھر سے کمرے میں غائب ہو جاتا۔ لڑکی بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ کبھی سامنا ہوتا بھی، تو وہ ہولے سے مسکرا کر مائی خیراں کو سلام کرتی اور مائی خیراں تادیر اس مسکراہٹ میں کھوئی رہتی۔

''کسی بہت ہی اچھے گھرانے کی لگتی ہے۔ خوب صورت تو خیر ہے ہی...... ادب تمیز میں بھی اچھی ہے۔'' وہ اکثر اس کے بارے میں یہ ہی سوچتی۔

☆☆☆

مائی خیراں کمرے میں آئی تو وہ ابھی بستر میں ہی تھی۔ سرخ جالی دار لباس میں اس کا دودھیا بدن چاندنی کی طرح بکھرا جا رہا تھا۔ وہ بہت کم عمر تھی۔ خوابیدہ آنکھوں میں رت جگے کے سرخ ڈورے تھے۔ وہ بستر سے اتر کر ایزی چیئر پہ جا بیٹھی تھی۔

کانچ کی ٹوٹی چوڑیوں کے ٹکڑے بستر سے جمع کرتے ہوئے مائی خیراں نے زیر لب مسکرا کر اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے دھیے؟ آج کچھ چپ چپ سی ہو؟''

''ہوں...... کچھ نہیں اماں! بس تھکاوٹ سی ہے۔'' وہ اپنی گردن کو دبا رہی تھی۔

''اچھا، اچھا...... میں بھی گھر والے یاد آ رہے ہیں۔''

مائی خیراں نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔ پر وہ قدرے چونک سی گئی تھی۔ یوں جیسے کوئی بھولی بسری چیز اچانک دھیان میں آ جائے۔

''کہو تو تیل لگا دوں...... مالش کروں گی تو ساری تھکاوٹ اتر جائے گی۔''

''ہوں...... کام ختم کر لو پھر......''

مائی خیراں نے کام ختم کر کے دلجمعی سے تیل کی مالش کی تھی، بالوں میں...... کندھوں میں اور یہیں سے ان دونوں کے بہت اچھے تعلقات کا آغاز ہوا تھا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ کھڑکی سے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتی رہی اور پھر کھڑکی بند کر کے بنا آہٹ کیے اپنے بیڈ پہ آ ٹکی۔ سلطان نے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پیار سے پوچھا۔

"نیند نہیں آ رہی؟"

"اب آ رہی ہے۔" اس نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔

یہ پہلی رات تھی جب اس نے اپنے گھر والوں کو یاد کیا تھا۔ شاید اب بھی نہ کرتی اگر مائی خیراں ذکر نہ چھیڑتی تو۔

"پتا نہیں کیا کر رہے ہوں گے۔ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے یا دو حرف بھیج کر چپ سادھ لی ہو گی۔"

اس نے ایک ایک چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن سب خدوخال خلط ملط ہو گئے تھے۔ اس نے شاید کبھی ان چہروں کو اتنی توجہ، اتنے دھیان، اتنی محبت سے دیکھا ہی نہ تھا کہ وہ ازبر ہوتے۔ وہ خود پرستی کی انتہاؤں کو چھوتی ہوئی لڑکی تھی۔ جو خود سے محبت کرتی تھی...... اور خود سے محبت کرنے والے کو اپنے لیے چن لیا تھا۔

وہ سلطان تھا...... اس کے دل کا سلطان۔ جو بارش بن کر اس کے تن من کو سیراب کرتا تھا۔ جو دن رات اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا۔ گھنٹوں اسے تکتا رہتا۔ وہ حسن کی دیوی تھی، سلطان اس کا پجاری تھا۔ اور پجاری کا کام ہے پوجا کرنا...... دیوی خواہ کوئی بھی ہو۔

☆☆☆

چائے دم پہ رکھی تھی...... وہ مگ نکال رہی تھی...... جب ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا، مگر اس سے پہلے ہی سلطان اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اپنی طرف گھما چکا تھا۔

"ارے رے رے......" اس نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا تھا۔

"کتنی ظالم ہو تم؟ اتنے اچھے موسم میں شوہر کے بجائے چولہا سنبھال لیا ہے۔"

"چائے ہی تو بنا رہی ہوں...... اور چھوڑیں مجھے...... مائی خیراں آ چکی ہے۔ دیکھ لے گی۔"

"تو دیکھ لے...... وہ کیا اپنے شوہر سے رومانس نہیں کرتی ہو گی۔" وہ مزید اس کی طرف جھکا۔

"اللہ! سلطان چھوڑیں نا...... باورچی خانے میں کون رومانس کرتا ہے؟" وہ ایک بار پھر مچلی۔

"ہر نیا شادی شدہ جوڑا۔" وہ ڈھیٹ ابن ڈھیٹ تھا۔ اس کی بے بسی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا، دائیں آنکھ دباتا باہر نکل گیا تھا۔ جب کہ زرناب کو کئی پل لگے تھے خود کو سنبھالنے میں۔

"ہی...... ہی...... ہی...... بڑی محبت کرتا ہے صاب آپ سے......" مائی خیراں کی بوڑھی ہنسی پر وہ چونکی پھر مسکرا دی۔

"ہاں...... یہ تو ہے۔"

"بڑا خوش قسمت ہے جی...... بیوی بھی رج کے سوہنی ملی ہے اسے۔"

"اچھا! وہ خوش قسمت ہے، میں نہیں ہوں؟" زرناب نے یوں ہی چھیڑا۔

"عورت کی قسمت تو مرد سے جڑی ہے۔ مرد ہنس کر دیکھ لے تو عورت سمجھتی ہے، وہ خوش نصیب ہے۔ وہی مرد نگاہ پھیر لے تو قسمت بدلنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔"

"کسی ایک کی قسمت، دوسرے انسان سے وابستہ نہیں ہوتی اماں! یہ غلط فہمی ہے تمہاری...... چائے بن گئی ہے۔ دو کپوں میں ڈال کر بیڈ روم میں لے آؤ۔" زرناب کہہ کر چلی گئی تھی۔

"بڑی اکڑ ہے۔" مائی خیراں نے قدرے ناگواری سے دیکھا۔ ان کے عمر بھر کے تجربے کو غلط فہمی

کا نام دینے میں اس نے پل نہیں لگایا تھا۔ ماں خیراں کو یہ بات سخت ناگوار گزری تھی۔

''ہونہہ...... ابھی شروع شروع کے دن ہیں بی بی...... اڑو ہوا میں...... جھولو' جتنے جھولے جھولنے ہیں...... آخر کو تو زمین پہ آنا ہی ہے نا۔'' انہیں اپنے تجربات پر پکا یقین تھا۔

☆☆☆

پھوپھی نصرت، زلیخا خاتون کے سامنے سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ نویں کا ختم ہو گیا۔ لڑکیاں اتنی دنوں میں رو، رو کر آدھی رہ گئی تھیں۔ زلیخا خاتون صدمے سے گنگ تھیں۔

''ارے بی بی! دل کو سنبھالو ذرا...... اٹھو، اپنا گھر بار دیکھو۔ مجھے بھی چھٹی ملے۔ آخر اور کتنے دن یہاں بیٹھی رہوں گی میں...... تمہیں تو حالات کی سب خبر ہے، تین لونڈے وہاں میرے انتظار میں بیٹھے ہیں، کہاں سے کھاتے ہوں گے؟ کیا پہنتے ہوں گے...... ماں کے بغیر تو کبھی پانی کا گلاس تک نہیں پیا انہوں۔'' وہ نیر بہاتی اپنے دکھڑے روتی جا رہی تھیں۔

''اللہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ہنستا بستا گھر اُجڑ کر رہ گیا۔ اچھا، وہ ایک کم بخت چلی گئی۔ باقی تینوں کو تو اپنے آنچل میں چھپاؤ...... ان کا غم بانٹو زلیخا خاتون۔''

زلیخا خاتون ٹکر ٹکر دیکھے جاتی تھیں۔'' جو چلی گئی ہے وہ رسوائی کی ایسی خاک سر پہ ڈال کے گئی ہے جو ہمیں صدیوں پاک و مصفانہ ہونے دے گی۔''

وہ اپنے بال جھاڑ رہی تھیں، پھر اپنا دوپٹا اتار کر زور، زور سے جھاڑنے لگیں۔ پھر بستر...... اور پچھلے کئی دنوں سے وہ یہ ہی تو کر رہی تھیں۔ پھپھی نصرت نے دیکھا اور اپنا کہا، بولا اکارت جانے پر سر تھام لیا۔

''پھپھی اماں...... اگر تنگی ہے تو آپ چلی جائیں...... ہم سنبھال لیں گی اماں کو...... آپ سے فون پہ رابطہ رکھیں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو پھر آ جایئے گا۔'' ستارہ بڑی ہونے کا حق ادا کر رہی تھی۔

آنکھیں نم...... چہرہ نم...... لہجہ بھیگا ہوا۔ باقی تینوں کو صبر آ گیا تھا۔ مگر ستارہ کی آنکھیں جھلملاتی ہی رہیں۔ وہ پچھتاتی تھی اور روتی تھی۔

''میں کیوں اس رات سوتی رہ گئی؟ نہ میں سوتی، نہ یہ سب ہوا ہوتا۔''

اب اسے کون سمجھاتا کہ سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا، جیسے ہونا تھا...... اس میں اس بے چاری کا کیا دوش؟

''میرا دل نہیں مانتا۔ یوں تم لوگوں کو بے سہارا چھوڑ جاؤں...... تمہاری ماں کو تو اپنی خبر نہیں...... خیر کرتی ہوں کچھ......''

اگلے روز انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں سعود حسن اور داؤد حسن کو بلا بھیجا، وہ آئے تو انہیں لے کر کمرے میں جا گھسیں۔ دروازے کی کنڈی چڑھائی اور دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

''یہ کیا ہے اماں؟''

''میرا ماں جایا قبر میں پڑا کُرلاتا ہوگا۔ زندگی اور موت کے بیچ میں مہلت ہوتی تو انسان اپنے سارے فرض نبھا کے دنیا سے رخصت ہوتا۔ اب بتاؤ کیا کروں؟ جوان جہان لڑکیاں ہیں۔ صوم صلوٰۃ کی پابند...... مجھے ان کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں، لیکن دنیا سے ڈرتی ہوں۔''

''وہ بھی تو صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔'' بڑے والے نے زرتاب کا حوالہ دے کر چھیڑا۔

''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اور یہاں معاملہ میرے خاندان کی عزت بچانے کا ہے۔ بتاؤ، کیا کہتے ہو؟''

''میں تابعدار ہوں۔ جو آپ کا حکم ہو اماں!''

سعود نے ماں کا عندیہ جان کر فرماں برداری دکھائی۔ دیکھا دیکھی داؤد حسن نے بھی سر جھکا دیا۔

پھپھی نصرت نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ''ایسی سعادت مند اولاد۔''

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو ستارہ، داؤد اور عمارہ، سعود کے ساتھ نکاح کے بندھن میں باندھ دی

گئیں۔ کوری ہتھیلیاں؟ مسلے کپڑے...... کندھوں پر غم کا بوجھ...... وہ ایک قدم آگے بڑھاتیں تو سات قدم پیچھے کو پلٹتی تھیں۔

''بابل کے انگنا سے یوں رخصت ہونا تھا کہ پہلے بابل گیا اور پھر وہ۔'' ایک زمانہ ان کے دکھ پہ رویا...... اور ایک زمانے نے پھپھی نصرت کی پیٹھ تھپکی...... جس نے پھپھی ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔

''فواد حسن دبئی میں ہے۔ وہ یہاں ہوتا تو روادبہ کو بھی لے جاتا۔'' انہوں نے روادبہ کے بارے میں اپنی مجبوری ظاہر کی۔

دوپہر تک یہ سارا قافلہ رخصت ہو گیا۔

ستارہ اور عمارہ کی گردنوں پر احسان کا بوجھ تو لد ہی گیا تھا۔ اب شوہر نامدار اس بوجھ کو ہلکا کرتے ہیں یا ان کی گردنوں پہ پاؤں دھرتے ہیں۔ یہ ان کی قسمت۔

☆☆☆

وہ دونوں ہوٹل کے نسبتاً سنسان گوشے میں بیٹھے تھے۔ زرناب زرد رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی اور سلطان کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی۔ رات اپنے بھرپور طلسم کے ساتھ ان دونوں پہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ سلطان جھک کر اس کے کان میں کوئی سرگوشی کرتا تو ساتھ ہی اپنے بازو کا گھیرا اس کے نرم، خوشبودار وجود کے گرد تنگ کر دیتا۔ کھانا آنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ وہ دونوں بانسری کی لے پہ بجنے والے گیتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

تب ہی سلطان کا موبائل بجنے لگا تھا۔ قدرے ناگواری سے سلطان نے اپنے موبائل کو دیکھا اور پھر اسکرین پہ روشن نمبر دیکھ کر قدرے چونک سا گیا۔ یہ اس کے دوست کا نمبر تھا، وہ دوست جو ہم راز بھی تھا۔

''ایک منٹ۔'' وہ مسکرا کر کہتا، زرناب سے قدرے دور جا کر بات سننے لگا تھا۔ دوسری جانب سے جانے کیا کہا گیا تھا۔ زرناب نے سلطان کو ایک لمحے میں پریشان اور متغیر ہوتے دیکھا تھا۔ مختصر گفتگو کے بعد سلطان واپس آ گیا۔

''خیریت؟ کس کا فون تھا۔''

''ایک دوست کا تھا؟''

کھانا سرو کر دیا گیا تھا۔ سلطان نے مزید بات کرنے کا موقع دیے بغیر کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔ تاہم زرناب نے محسوس کیا کہ سلطان کے انداز میں وہ پہلی سی بے فکری، لاپروائی اور گرم جوشی کا فقدان تھا۔ وہ جیسے یہاں صرف کھانا کھانے ہی آیا تھا۔

☆☆☆

زرناب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بری طرح چونک گئی تھی...... یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان کو سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''آپ سگریٹ پیتے ہیں......؟''

''ہاں...... نہیں...... یوں ہی بس...... کبھی کبھار......'' وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کھول کر سگریٹ باہر اچھالی اور ایزی چیئر پہ آ گرا...... اس کی آنکھیں بند تھیں۔ زرناب کو فوراً ہی فکر لاحق ہو گئی۔

رات کے ان لمحات میں زرناب کو قریب پا کر اس کا جنون، اس کی وارفتگی اسے بے خود کر دیا کرتی تھی تو پھر آج...... وہ مضمحل سا آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی دوزانو اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا ہے سلطان؟''

''مام بہت بیمار ہیں زرناب! ہاسپٹلائزڈ ہیں۔''

''اوہ......'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس موقع پر وہ کیا کہے۔

''مزمل بتا رہا تھا، ان کی طبیعت مزید بگڑتی جا رہی ہے، نہ وہ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ بس ایک ہی ضد ہے کہ کہیں سے سلطان سامنے آ جائے۔''

زرناب کا دل دھڑکنے لگا...... سلطان خاموش ہو گیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ جا کر انہیں...... دیکھ آؤں......'' وہ جیسے اس سے اجازت چاہ رہا تھا۔

''میں بھی ساتھ چلوں......''

''نہیں ...... تمہارے جانے سے مسئلہ بڑھ سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں' اس وقت پورا خاندان ان کے گرد جمع ہوگا۔ کوئی بھی تمہیں اچھے طریقے سے ویلکم نہیں کرے گا اور میں یہ بات برداشت نہیں کرسکوں گا۔''

زرناب نے اپنا سر اس کے گھٹنوں پہ ٹکا دیا۔ سلطان کی انگلیاں ہولے ہولے اس کے بال سہلا رہی تھیں۔

''تم یہاں رہ کر میرا انتظار کرنا ...... مائی خیراں سے کہہ دوں گا' وہ دن رات تمہارے پاس رکے گی اور اس سے اگلی رات ان شاء اللہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔''

سلطان کی انگلیاں اس کے گالوں کو گردن کو سہلا رہی تھیں۔

''گویا جانا طے ہے ......'' وہ اندر سے بجھ سی گئی ...... وہ طے نہیں کرپائی تھی کہ سلطان کو واپس چلے جانا چاہیے یا نہیں ...... اب تک وہ دونوں اپنے اپنے گھر والوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔

''سلطان ......! وہ تمہیں واپس آنے دیں گے ناں ......؟''

''سلطان ان کے اشاروں پہ نہیں چلتا ...... سلطان کا دل، جان، روح، چین، سکون، قرار سب کچھ یہاں ہے ...... سلطان کو واپس آنا ہی پڑے گا۔''

وہ اس پہ جھک گیا ...... زرناب کو محبت کی اس شدت نے احسان مند سا کردیا تھا۔

''سلطان ......! تم بہت اچھے ......'' وہ کہنا چاہتی تھی، لیکن سلطان کی بے قراری نے موقع ہی نہیں دیا ...... وہ جانتی ہی نہ تھی' چراغ کی لو بجھنے سے پہلے بھڑکتی ضرور ہے ...... اس کی محبت کا چراغ بھی بھڑک رہا تھا، بجھنے کے لیے ......

☆☆☆

سلطان چلا گیا اور زرناب کے دل کو جیسے پنکھے لگ گئے ...... مائی خیراں اس کے پاس تھی ...... اپنی باتوں سے اس کا دل بہلانے کی پوری کوشش کرتی ہوئی، لیکن زرناب کے دل کو چین وقرار کہاں' دسیوں میسجز کردیے ...... ہر دو گھڑی بعد فون کال ...... آخر فون شام چار بجے اٹینڈ کیا تھا اس نے۔

''مام کے پاس اسپتال میں ہوں ...... اب فون مت کرنا ...... میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔'' وہ نرمی سے، لیکن نہایت مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

زرناب نے نہایت سعادت مندی سے اس کی بات پر عمل کیا تھا، لیکن آنکھیں، کان اور دل موبائل سے چپکے رہے ...... اب بجا کہ تب ...... کال آئی یا میسج ...... لیکن فون کو نہ بجنا تھا، نہ بجا ...... اور ...... سلطان کو نہ آنا تھا ...... نہ آیا۔

☆☆☆

چار دن ہوگئے تھے سلطان کو ...... اور ان چار دنوں میں وہ یوں تڑپی تھی جیسے بن پانی کے مچھلی ...... سلطان کے سارے نمبر بند تھے۔

''کیوں ......؟'' اس کیوں کے بعد جتنے جواب آتے تھے۔ وہ جواب نہیں سنپولیے تھے' اسے ڈستے تھے اور اس کی رگوں میں اندیشوں کا زہر بھرتے تھے۔

''یا اللہ ......! مجھے موت آجائے ...... لیکن میرے ساتھ ایسا نہ ہو ......'' وہ تین ماہ میں پہلی مرتبہ جائے نماز پہ بیٹھی رو، رو کر ہلکان ہورہی تھی ...... وہ پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑی تھی ...... قدم رکھنے کو جگہ آگے تھی نہ پیچھے۔

مائی خیراں گھر کی خیر، خبر لینے گئی تو رات وہیں ٹھہر گئی ...... موسم خراب تھا ...... وہ فلیٹ تک آنے کا رسک نہ لے سکتی تھی ...... زرناب کی جان پہ بن آئی ...... اس رات دروازے، کھڑکیوں پر آنکھیں اگ آئی تھیں ...... کمروں، راہداریوں میں اجنبی قدموں کی چاپ گونجتی تھی۔ زرناب کی انگلیاں کوئی ہزارویں مرتبہ سلطان کا نمبر ملا چکیں تب کہیں جاکر پہلی مرتبہ دوسری طرف بیل جانے کی آواز سنائی دی تھی ...... زرناب تڑپ کر اٹھ بیٹھی ...... جیسے گھپ

اندھیرے میں کوئی جگنو چمکتا ہے...... تو روشنی کی آس، امید بندھ جاتی ہے' اسی طرح اس کا دل بھی اس کے کانوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

''ابھی سلطان بولے گا...... ابھی وہ سلطان کو سنے گی......'' لیکن سلطان نہیں بولا...... فون اس کی ماں نے ریسیو کیا تھا اور پھر جو کچھ انہوں نے کہا...... اسے سننے کی تاب زرناب میں نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے سنا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی واسطہ، کوئی ترلا، کوئی منت کرتی...... فون بند کردیا گیا تھا...... وہ بھربھری مٹی کی طرح زمین پہ ڈھے گئی۔

موسم خراب تھا...... بلکہ خراب تر...... بادل گرج رہے تھے...... بجلی کی کڑک زوردار تھی۔ بارش تھی یا کوئی طوفان تھا...... جو اس کی ساری ہستی کو لکھ سے ککھ بنا کے اڑا لے گیا تھا۔

''محبت میں یہ مقام بھی آتا ہے......؟''

زرناب کو اندازہ ہوتا، تو محبت کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتی۔

☆☆☆

مائی خیراں کو اس کی حالت سے خوف آنے لگا تھا۔

''کہیں مر مرا گئی تو میرے سر ہی نہ پڑ جائے۔''

وہ کسی زمانے میں بڑی منجھی ہوئی دائی تھی...... پھر حاملہ عورتوں نے اسپتالوں کا رخ کیا تو اس نے بھی اپنے کام سے ہاتھ ہٹالیا، مگر غریب غربا کی بہو بیٹیاں ابھی بھی اس پر اعتماد کرتی تھیں اور مائی خیراں کو ایک سو ایک فیصد امید تھی کہ زرناب ماں بننے والی ہے۔

''ارے وہ نہیں آتا تو اپنے میکے سے ہی کسی کو بلالو...... یوں بغیر کھائے پیے، روتے دھوتے تو اپنی جان سے جاؤ گی تم......'' وہ اس کی حالت دیکھ کر دہائی دے رہی تھی۔

لیکن زرناب تو شاید اسی ایک لمحے کے انتظار میں تھی کہ جان کب جاتی ہے۔

''مہینہ ختم ہونے کو ہے...... صاحب واپس نہیں آئے تو میری تنخواہ کون دے گا...... اور اگر تنخواہ نہ ملی تو بتاؤ بھلا اور کتنے دن تمہاری مزاج پرسی کو آؤں گی...... میرے کون سے دھگیں پتر ہیں جو کما کما کر کھلائیں گے...... میری تو یہ ہی کمائی ہے' اسی سے پیٹ پوجا کرتی ہوں' اسی سے تن ڈھانپتی ہوں...... جوان جہان اکیلی عورت...... فلیٹ بھی کرائے کا...... میری مانو تو صاحب کے گھر چلی جاؤ۔''

زرناب کی حالت چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ داستان کیا ہے......؟

''اگر کہو تو میں ہو آؤں تمہارے سسرال یا میکے...... ماں باپ اخیر گلے لگا ہی لیتے ہیں اولاد جیسی بھی ہو......'' مائی خیراں کا آخری حربہ......

''ان کے لیے تو مرگئی ہوں گی اماں......! یا شاید ان سب کو مار دیا میں نے......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆☆☆

سلطان اپنے گھر پہنچا تو اسے لعنت ملامت کرنے کے بجائے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا...... ایسی آؤ بھگت ہوئی کہ سلطان احسان مند ہونے لگا اور اسی احسان مندی کو اس کے گھرانے نے پوری طرح استعمال کیا تھا۔ ماں بیمار تھی مگر اتنی نہیں جتنی سلطان کو دکھائی جارہی تھی اور بیمار ماں کے پاس بہت سے حربے ہوتے ہیں اپنی بات منوانے کے...... بہت سے تیروں میں سے کوئی نہ کوئی تو نشانے پہ جا ہی لگا تھا...... اس کی منگیتر اپنے نمکین حسن کو اس پہ نچھاور کرنے کو تیار بیٹھی تھی...... ساس سسر ورلڈ ٹور کے ٹکٹ ہاتھ میں لیے پھر رہے تھے۔

''اگر یہ نہیں کرو گے تو میں تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا......'' باپ کے غصے کا ایک عالم گواہ تھا اور پھر یہ گھاٹے کا سودا تو نہ تھا۔

اس کا اپنا بینک بیلنس ختم ہونے کے قریب تھا، ساری عمر کمایا تو نہ تھا، ہاں کھایا اور اڑایا ضرور تھا۔

''اگر عاق کردیا گیا...... خرچا، پانی رک گیا تو کیا کرے گا......؟'' رشتے داروں کے سوال۔

''اور پھر...... تین ماہ کافی ہوتے ہیں...... کسی

بھی حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے......" جو ان دیکھی وادیاں اسے اپنی جانب کھینچتی تھیں......ان سے وہ جی بھر کے سیراب ہو چکا تھا۔

"زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور اسے ایک ہی عورت کے ساتھ گزار دینا بے وقوفی ہے......" اپنے نکاح نامے اور زرناب کے طلاق نامے پر دستخط کرنے سے قبل اس نے ایک پل کے لیے یہ ہی سوچا تھا۔

☆☆☆

تنگ سی گلی تھی...... انتہائی غلیظ، بدبودار...... جس کے دونوں اطراف میں ماچس کی ڈبیوں جتنے گھر بستے تھے۔ یہ بند گلی نہیں تھی، لیکن یہاں سے کوئی گزرتا بھی نہیں تھا کیونکہ یہ گلی آدھا گھر تھی۔ یہاں ان ہی گھروں کے ننھے منے، بدوضع بچے دن چڑھے سے شام ڈھلے تک کچے کھیلتے، مٹی چوستے اور غلیظ گالیاں بکتے، لڑتے جھگڑتے تھے۔

بان کی دو چار پائیاں ہمہ وقت بچھی رہتیں جہاں عورتیں بیٹھ کر زمانے بھر کی باتیں کرتیں۔ بچوں کو کوستیں، سبزی بناتیں، گیلے بال سکھاتیں، سوئی دھاگے سے کرنے والے سارے کام نمٹاتیں اور بڑی بوڑھیاں حقہ گڑگڑاتے ہوئے اپنے وقتوں کی باتیں بتاتیں۔

شام ہوتے ہی یہ چار پائیاں اور گلی ویران ہو جاتی...... باہر کا سارا شور گھروں میں منتقل ہو جاتا اور رات کا اندھیرا چھاتے ہی دو، چار مرد ان چار پائیوں پر خراٹے لینے لگتے۔

گلی میں سایہ کرنے کے لیے گلی کے اوپر چھت ڈالی گئی تھی۔ برابر اور ہموار چھت نہ تھی، بساط بھر چھت، ہر گھر کے سامنے، کہیں ٹین کی چھت، کہیں پرالی اور کہیں صرف پرانے ٹینٹ کے چیتھڑے......گرمیوں کی بھری دوپہروں میں ننھی چڑیاں پرالی میں سے اپنے من پسند تنکے چراتیں اور گھروں کی چھتوں کی کڑیوں میں ایک نئے گھر کی بنیاد رکھتیں۔

ان ہی گھروں میں سے ایک گھر مائی خیراں کا تھا، جو دن بھر خالی رہنے کے سبب چڑیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا...... وہ ایک تنکا گھونسلے میں لگاتیں تو دسیوں نیچے گرا دیتیں...... مائی خیراں واپس آتی تو جی بھر کے ان چڑیوں کو کوستی جو وقت بے وقت گھر میں گند اور شور پھیلائے رکھتی تھیں۔

☆☆☆

پانی سے بھرے مٹی کے کٹورے میں زرناب کو اپنی شکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چند گھونٹ پانی پی کر کٹورا مائی خیراں کو واپس کیا اور پھر وہیں بان کی کھردری چار پائی پہ ڈھے گئی...... مائی خیراں نے کمرے سے ایک تکیہ لا کر اس کے سر کے نیچے رکھا اور خود صحن میں پانی بہانے لگی۔

"سارا دن لوگوں کے گھروں کو چمکاتی ہوں اور میرے اپنے گھر کی حالت دیکھو......" مائی خیراں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا...... شاید دھیان بٹانے کو......لیکن اس کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس کے گھر میں آ کر بھی نہیں آئی۔

فلیٹ کا کرایہ پورا ہو گیا تھا...... اب دو ہی صورتیں تھیں۔ مزید کرایہ جمع کراؤ یا رخصت ہو جاؤ...... زرناب پہ ایک نئی افتاد تھی...... اس نے مائی خیراں کا پلو یوں دبوچا تھا جیسے میلے میں کسی بچے کی ماں گم ہو جائے تو وہ کسی بھی رحم دل، نرم دل عورت کا پلو تھام لیتا ہے' ممتا کی تلاش میں......

مائی خیراں اور کیا کر سکتی تھی...... اسے لے کر اپنے دو مرلے کے گھر میں چلی آئی۔ جس طرح سونے کا نیا نکور چمکدار بندا کیچڑ میں گر جائے تو جھٹ سے نظر میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح زرناب کی اس گلی میں آمد ہوئی تھی۔

دودھیا رنگت...... جسے چھونے سے ڈر لگتا ہو کہ میلی ہو جائے گی...... چوٹی کی شکل میں بل کھائے سنہرے بال......شہد رنگ کھوئی کھوئی سی آنکھیں اور پھر قیمتی لباس......عورتیں چار پائیوں سے اٹھ کر مائی خیراں کے آنگن میں جمع ہو گئیں اور مائی خیراں کو کیا

پڑی تھی کہ کچھ غلط سلط کہہ کر لوگوں کو مشکوک کرتیں۔
صاف اور کھری بات کہہ ڈالی...... عورتوں نے جھٹ سے انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔
''گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی......؟'' اگلے کئی دنوں تک کے لیے ایک نیا عنوان...... ایک نیا موضوع......
شروع شروع میں ان عورتوں کی باتوں میں، رویوں میں، دلوں میں زرناب کے لیے تضحیک تھی...... غصہ تھا، استہزا تھا۔
''لو...... آ گیا مزا پھر گھر سے بھاگنے کا......''
''ایسی اتھری جوانی تھی...... چار دن صبر نہ ہوسکا...... آخر ماں باپ کسی کھونٹے سے باندھ ہی دیتے......''
''ماں باپ کو دغا دے کر نکلی تھی پھر یہ تو ہونا ہی تھا...... پڑی روتی رہے اپنے نصیبوں کو......'' اور وہ سچ مچ روتی تھی اپنے نصیبوں کو۔
''میں سلطان کے شہر جاؤں اسے ڈھونڈنے......؟''
''حالت دیکھو اپنی...... دوسرے جی سے ہو...... دو قدم تو تم سے چلا نہیں جاتا...... خیر خیریت سے فارغ ہو لو...... پھر میں چلوں گی تمہارے ساتھ......''
''فارغ ہونے میں تو کئی مہینے لگیں گے اماں......!'' وہ بے طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔
''تو کیا ہوا......؟ بچہ گود میں لے کر جاؤ گی تو اچھے اچھوں کو دل نرم پڑ جائے گا...... ہوسکتا ہے، اپنے خون کو دیکھ کر ساس سسر ہی گلے سے لگالیں......'' مائی خیراں ہر روز کوئی نہ کوئی میٹھی گولی اسے چوسنے کو تھمادیتی۔

☆☆☆

''اے مائی! یہ تو روز بروز کملاتی جارہی ہے...... میں تو کہتی ہوں، اس کے پچھلوں کا اتا پتا معلوم کرکے وہیں چھوڑ آؤ...... آخر کو ماں باپ ہیں...... گالیاں، کوسنے دیں گے...... مار پیٹ بھی لیں گے پر آخیر بکل میں لے ہی لیں گے......''
''پوچھ لو اس سے...... کہے تو میں آج ہی چھوڑ آؤں......'' مائی خیراں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی اور وہ نظریں چُرا جاتی......
''رات کی تاریکی میں جس در کو ٹھوکر مار آئی تھی وہاں کس منہ سے جاتی...... اسے سلطان کو ڈھونڈنا تھا، واپس لانا تھا اسے...... اس کے کندھے پہ سر رکھ کر رونا تھا...... اس کے سینے میں منہ دے کر دنیا والوں سے چھپ جانا تھا، اس کی مضبوط پناہ میں رات بھر سکون کی نیند سونا تھا......
بس ایک بار اس بچے سے فراغت پالوں......
سلطان اگر اس روئے زمین پر ہے تو اسے ڈھونڈ نکالوں گی......'' وہ رات رات بھر آسمان کو تکتی' نت نئے منصوبے بناتی تھی۔ سونا تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا۔

☆☆☆

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ عورتوں کی نفرت اور غصہ' ہمدردی و رحم دلی میں بدلتا چلا گیا...... ''کیسی معصوم صورت ہے...... باتوں میں چالاکی نہ ہوشیاری...... بس ٹکر ٹکر سب کی شکل دیکھا کرتی ہے...... میں تو کہتی ہوں...... اسی بھولپن میں ماری گئی...... باتوں میں پھنسالیا بے چاری کو......''
وہ آتیں، اسے خوش رہنے، مگن رہنے کے کئی طریقے بتاتیں...... وہ ان کے کہے پر اٹھتی اور پھر تیورا کر گر جاتی۔
چہرے کی رنگت سپیدی سے زردی میں بدل رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے بننے لگے تھے۔ جی متلانے اور سر چکرانے کا سلسلہ تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا...... جسم بخار کی طرح ٹوٹتا۔
''نئی روح پرورش پارہی ہے بدن میں...... ایسا تو ہوتا ہی ہے......'' مائی خیراں اسے تسلی دیتی......
پھر اس کی ایک انگوٹھی بیچ کر دوا، دارو...... پھل فروٹ بھی لے آئی...... لیکن کھاتا کون......؟

ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے نہ اترتا تھا......
دوائیوں کی بو سے جان جاتی تھی......

"خدا کا واسطہ ہے اماں! مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو...... مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں......" ایک روز تنگ آ کر اس نے مائی خیراں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

مائی خیراں نے تنگ آ کر دوائیاں میز پہ پٹخیں اور پھر پلٹ کر دوبارہ پوچھا بھی نہیں......

"نہیں تو نہ سہی میری بلا سے......"

☆☆☆

پچھلے کئی دنوں سے مائی خیراں سوئی دھاگا لے کر بیٹھ جاتی اور رنگ برنگی کترنوں کو جوڑ کر اس کے آنے والے بچے کے لیے لباس تیار کرتی رہتی...... رات ہوتی تو سب سامان لپیٹ کر اپنے صندوق میں رکھ چھوڑ دیتی۔

اور اس روز جانے دل میں کیا آئی کہ ان کپڑوں کو دیکھنے کے بہانے وہ صندوق کھول بیٹھی۔

"سلطان......! تمہارا بچہ لوگوں کی بچی ہوئی کترنوں کا سوٹ پہنے گا...... تم ایک بار پلٹ کر آؤ تو سہی...... دیکھو تو سہی میں کس حال میں ہوں......"

اس نے بددلی سے وہ کپڑے لپیٹ کر رکھے تب ہی صندوق کے ایک کونے میں شاپر میں لپٹے رجسٹرڈ ڈاک کے لفافے پہ اس کی نظر پڑی۔

"یہ کیا ہے......؟" اس نے وہ لفافہ باہر نکالا۔

"بنام زرناب احمد......!"

اس کے پورے جسم کو جیسے کرنٹ لگا تھا......

لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولنے اور پڑھنے میں اسے چند سیکنڈز لگے تھے۔ یہ طلاق نامہ نہیں تھا' اس کے تابوت کی آخری کیل تھا۔

یہ لفافہ کہاں سے آیا......؟ فلیٹ سے کون دے کر گیا......؟ مائی خیراں نے اس سے چھپا کر کیوں رکھا......؟ یہ سب ضمنی باتیں تھیں...... اہم تھا تو صرف یہ کہ زرناب کی کتاب زندگی میں "سلطان" نام کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔

وہ زرناب کی زندگی کا آخری سورج تھا جو اس شام غروب ہوا تھا دوبارہ کبھی طلوع نہ ہونے کے لیے۔

☆☆☆

وہ رات درد سے بھری رات تھی اور اس کا کوئی انت نہ تھا...... زرناب کی زندگی میں اتنی طویل رات اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ کم عمر تھی...... کمزور اور نقاہت زدہ تھی...... سب سے بڑھ کر ہمت اور حوصلہ ہار چکی تھی۔

"ہائے ماں......" وہ بدن کو چیرتے ہوئے درد سے کراہی تھی۔

مائی خیراں نے اس سارے عرصے میں پہلی بار اسے ماں کو پکارتے ہوئے سنا تھا۔ وہ رو رہی تھی...... بے خودی میں، مدہوشی میں......

"کاش ماں! تو میرے پاس ہوتی...... میرے ماتھے پہ اپنا ہاتھ رکھتی...... مجھ پہ آیتیں پڑھ کر پھونکتی۔ میری اس اذیت کو بانٹ لیتی...... مجھے سینے سے لگاتی...... میری پیٹھ کو سہلاتی...... دودھ، گھی پلاتی...... میرے لیے دعا کرتی......

میں نے کیا کر دیا ماں......؟ کیسے کر دیا......؟ میں نے تجھے ہی کھو دیا......" وہ سر پٹختی تھی اور بڑبڑاتی جاتی تھی۔ اس کی غیر حالت پہ محلے کی نرس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

"تم نے غلطی کی مائی جو اس کیس میں خود ہاتھ ڈال لیا...... یہ تو سیدھا سیدھا اسپتال کا کیس تھا۔"

"اچھا اب کیا ہو سکتا ہے...... تو چل اندر کوشش تو کر......" مائی نے نرس کو تقریباً دھکیلا۔

"میری کوشش سے کیا ہوگا...... اس نواب زادی سے کہہ خود کوشش کرے تاکہ اس کی جان بھی چھوٹے اور ہماری بھی......"

"یا اللہ! تو ہی رحم کر......" مائی خیراں نے دعا کی تھی اور اللہ کو رحم آ ہی گیا تھا۔ درد کی تیز لہر پہ اس کے بوٹی بوٹی وجود نے ایک طویل انگڑائی لی اور پھر بے سدھ ہو گیا۔

اسی لمحے مائی خیراں ایک کمزور، اور لوتھڑا سی بچی

کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے باہر نکل آئی جس کا پورا بدن نیلوں نیل تھا اور وہ ننھے سے حلق کو پھاڑ پھاڑ کر گھر میں شور کیے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ستارہ کے ہاں دو جڑواں بیٹوں نے جنم لیا تھا۔ داؤد فخر سے سینہ پھلائے پھرتا تھا۔ دو بیٹے۔ باپ کے دونوں بازو...... پھوپھی نصرت کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

کبھی ستارہ کے لیے اجوائن کا پانی بناتیں تو کبھی پوتوں کے لیے سونف ملا دودھ...... بھائی کی یاد میں دل بھر آیا تو ایک پوتے کا نام احمد اور دوسرے کا نام کرم رکھ چھوڑا۔

''خدمت حکومت کراتی ہے۔'' ستارہ جانتی تھی...... سو چپ چاپ خدمت کیے جاتی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ آج گھر کے ہر فرد کے دل پہ اس کی حکمرانی تھی۔ شوہر اکھڑ مزاج تھا، مگر آج گھڑی گھڑی اس پہ جھکا جاتا تھا...... کبھی پیشانی پہ ہاتھ دھرتا...... کبھی گالوں پہ...... بھوک، پیاس، درد...... اس کے پاس ستارہ کے پل پل کا حساب تھا...... دوا اپنے ہاتھوں سے کھلا رہا تھا۔

اس کے عین ایک ہفتے بعد عمارہ نے گل گوتھنی سی بیٹی کو جنم دیا تھا۔ سعود نے بچی کو بازوؤں میں لے کر سینے سے لگایا تو آنکھوں میں جگنو سے بھر گئے۔

''بیٹی کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے...... اس کی تربیت میں کوئی کمی مت چھوڑنا......'' عمارہ جانتی تھی۔ اس بات کا پس منظر کیا تھا......؟

''ماں باپ تو کبھی بھی نہیں چوکتے...... بس اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے لیے بخوشی جہنم کا سودا کر لیتے ہیں۔'' اس نے دل میں سوچا تھا، کہا کچھ نہیں۔

زلیخا خاتون کے گھر مٹھائی کا ڈبہ گیا تو رودابہ مٹھائی کھاتے ہوئے ہنستی چلی گئی۔

''لو بھئی اماں......! آپ کی دونوں بیٹیاں امیاں بن گئیں۔'' اس نے زبردستی ماں کو مٹھائی چکھائی۔ پھر چپکے سے دل میں سوچا۔

''ہو سکتا ہے...... تیسری بھی بن گئی ہو۔'' ایک ذرا سی سوچ ہی آئی تھی اور اسے بری طرح اداس کر گئی...... مٹھائی کا ڈبہ ایک طرف رکھا اور چپ ہو کر بیٹھ رہی۔

ستارہ اور عمارہ کی شادی کے بعد رودابہ نے بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ ماں کی جگہ سلائی مشین سنبھال لی تھی۔ صبح شام مگن رہتی۔ صفائی، ستھرائی، گھر کے سارے کام، دھلائی اور پھر ماں کی ذمہ داری...... جیسے جی جان سے نبھاتی تھی...... ماں کو نہلاتی، دھلاتی، صاف کپڑے پہناتی...... ناخن کاٹتی، بال بناتی...... ایک روز تھک کر ماں کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''کتنی ویرانی ہے اماں! گھر کی تنہائی سے وحشت ہو رہی ہے، ہم کب تک یوں ہی رہیں گے۔ اکیلے رہتے، خود سے باتیں کرتے میں تو تھک گئی اماں! تم ہی کچھ بول دیا کرو۔'' ماں ساکت نظروں سے دیکھتی رہی...... رودابہ کو غصہ آ گیا۔

''میں تو تمہیں پہلے بھی کبھی نظر نہیں آتی تھی اماں......! ایک زرناب کیا چلی گئی۔ تم نے تو ہم تینوں سے نظریں چرا لیں...... وہ خدا جانے کہاں گل چھرے اڑا رہی ہو گی اور تم ہو کہ......''

''چٹاخ......'' ایسا زور کا تھپڑ منہ پہ پڑا تھا کہ رودابہ کا گال سنسنا اٹھا تھا۔ کتنے ہی پل یوں ہی گزر گئے۔ تب رودابہ کو ہوش آیا۔ زلیخا خاتون نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ وہ زرناب کے لیے کچھ بھی غلط نہیں سننا چاہتی تھیں۔ رودابہ کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ نکلے۔ اٹھ کر وہاں سے بھاگنا چاہا، مگر زلیخا خاتون نے کلائی تھام لی...... رودابہ نے پلٹ کر دیکھا۔ زلیخا خاتون کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''آنسو......؟'' رودابہ نے پلکیں جھپکیں۔

آنسو تو تب بھی ان آنکھوں میں نہ آئے تھے جب احمد کرم رخصت ہوا...... جب زرناب نے دھوکا دیا۔ جب دونوں بیٹیاں روتی، کرلاتی پیا دیس

سدھاریں اور آج آنسو......

دفعتاً زلیخا خاتون نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگایا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رو دیں۔

☆☆☆

وہ تکیے کے سہارے بمشکل بیٹھی تھی اور مائی خیراں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتی۔ منی کی خوب ہی سیوا کرتی تھی۔ بالشت بھر کی کمزور سی بچی کو وہ نہلاتی، دھلاتی، پاؤڈر چھڑکتی اور پھر رنگ برنگی کترنوں سے سیے کپڑے پہنا کر اس کی گود میں ڈال دیتی تھی۔

''واہ...... مائی کی قسمت...... اپنی کوکھ سے اولاد کو جنم نہ دے سکی اور دوسروں کی بیٹیوں کے لیے چھپر چھایا بن گئی۔''

''میں تو کہتی ہوں اب اس کا کوئی نام رکھ ہی لو......ورنہ منی ہی کہلائی جائے گی۔''

''بختاور کیسا نام ہے؟'' مائی خیراں منی کو بنا سنوار کر لے آئی تھی۔

''بختاور......؟ جچتا ہے یہ نام اس پر......؟'' اس کے لہجے میں خوامخواہ ہی تلخی در آئی تھی۔ سانولی رنگت کی، کمزور سی منی......ٹکر ٹکر ماں کو تک رہی تھی۔

''تو وہ رکھ لے، جو جچتا ہے......'' مائی خیراں برا مان گئی۔

زرناب چپ چاپ منی کو دودھ پلانے لگی تھی۔ بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ منی سے محبت نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اسے اپنی محبت کی سزا لگتی تھی۔ کبھی دل چاہتا جائے اور اسے سلطان کے دروازے پر ڈال آئے......جس کا خون ہے وہی پالے......

پھر دل پہ ہاتھ پڑ جاتا......جو مجھے چھوڑ گیا...... وہ اسے کیوں قبولے گا...... ایسا نہ ہو...... کسی دارالامان...... کسی یتیم خانے میں ڈال دے......''

اسے منی پر پیار نہیں، ترس آنے لگتا تھا۔

☆☆☆

ہانڈی چڑھا کر وہ صفائی ستھرائی میں لگ گئی۔ مائی خیراں کا گھر بھی بڑا عجیب تھا۔ مائی خیراں کی طرح......اس گھر میں سبزہ بہت اگتا تھا......خود بخود، بنا کسی کوشش کے...... چند شاخیں منڈیر پہ نکل آئی تھیں تو کچھ پتے دیوار سے سر اٹھا رہے تھے۔ صحن کی گھسی ہوئی سرخ اینٹوں کے بیچوں بیچ بھی سبزہ سر اٹھاتا تھا...... جو قدموں تلے مسلا جاتا اور پھر سر اٹھانے لگتا۔ بالکل اسی کی طرح......جس طرح وہ مسلی گئی تھی اور اب سر اٹھانے کی کوشش میں تھی......

اسے یہاں ہمیشہ نہیں رہنا تھا اور کہاں رہنا تھا......؟ وہ ابھی نہیں جانتی تھی۔

منی کے رونے کی مہین سی آواز آئی تو وہ اٹھ کر چارپائی کے ساتھ باندھی گئی کپڑے کی جھولی تک چلی آئی۔ منی لاغر تھی اور اسی لحاظ سے چڑچڑی بھی...... اس کی بھوک ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی...... ہر وقت کا رونا...... ہر وقت کا چلانا......نہ وہ خود ڈھنگ سے سوتی......نہ زرناب کو آنکھ میچنے دیتی تھی۔

زرناب کتنی دیر اسے ہاتھوں میں لیے دیکھتی رہتی...... اس کے ایک ایک نقش میں سلطان کی مماثلت کھوجتی......لیکن مائی خیراں کہتی تھی......رنگ کے فرق سے وہ بنی بنائی زرناب تھی۔

☆☆☆

موسم بدلا...... بارشوں نے ڈیرے ڈال لیے...... آئے دن بارش......باہر گلی میں کھڑا پانی......جھینگروں اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں اسی غلاظت اور گندگی سے منی بیمار پڑ گئی۔

ہیضے کی وبا نے سارے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ منی رات سے الٹیاں اور دست کر رہی تھی۔ ننھی سی جان......دو چار الٹیوں کے بعد نقاہت سے ماں کے چہرے پہ نگاہیں جمانے کی کوشش کرتی تو زرناب کے کلیجے پہ ہاتھ پڑتا۔

''یااللہ! میری منی کو ٹھیک کر دے...... بالکل ٹھیک۔'' وہ اس کی دبلی کلائیوں کو اپنی ہتھیلی میں بھینچتی، سینے سے لگاتی اور اس کے گالوں کو ہزار بار چومتی، روتی رہی۔

''ارے کاہے کو ہلکان کرتی ہو خود کو...... بچے

یوں ہی پلتے ہیں۔ کون سی بیماری ہے جو نہیں دیکھتے اور پھر ساری گلی میں ہر بچے کا یہ ہی حال ہے۔" وہ سلگتی لکڑیوں کے دھوئیں میں پودینے کا پانی بناتی بولتی جا رہی تھی۔

"میرے پاس اس کے علاوہ ہے ہی کیا اماں......! اسی سے جینے کی آس بندھی ہے، یہ نہ ہوتی تو شاید اب تک ہزار بار جان دے دیتی۔" وہ منی جس سے وہ محبت نہیں کر پا رہی تھی۔ ان نو مہینوں میں اس کے روم روم میں بسنے لگی تھی۔

مائی خیراں اسے پودینے کا پانی پلا کر فلیٹ پہ کام کے لیے روانہ ہوگئی...... منی کو قدرے سکون سے سوتا دیکھ کر وہ بھی اپنے کاموں میں جُت گئی۔ ذرا سورج چڑھا تو منی کی حالت پھر بگڑ گئی۔ وہ ننگے پاؤں باہر کو لپکی۔ بان کی چارپائیوں پہ باتوں میں مگن عورتوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپا زرینہ...... منی کو دیکھنا ذرا۔" آپا زرینہ پڑوس میں رہتی تھی۔ اس کی ایک آواز پر بھاگی چلی آئی۔ اس نے منی کو ہلا جلا کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"ارے بے وقوف لڑکی! بچی تو نڈھال پڑی ہے۔ مجھے لگتا ہے، جسم میں پانی کی کمی ہوگئی ہے۔"

"اب کیا کروں آپا......؟"

"ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

"ڈاکٹر کے پاس؟ کیسے جاؤں...... اماں تو شام کو آئے گی۔"

"محلے کے پاس فری کیمپ لگا ہے، ڈاکٹر آیا بیٹھا ہے، حمیدہ ابھی اپنے بچوں کو چیک کروا کے آئی ہے، وہیں لے جاؤ۔"

"میں...... اکیلی؟" وہ گھبرائی۔

"عاشق کے لیے بھی تو اکیلی ہی نکلی تھی گھر سے...... یہ تو پھر اولاد ہے۔" آپا زرینہ نے آنکھ کا کونہ دبا کر اسے چھیڑا اور نجانے کون کون سے زخم کھول کے رکھ دیے۔ حلق میں اٹکا آنسوؤں کا نمکین گولہ اندر ہی اندر دھکیل کر اس نے منی کو اچھی طرح لپیٹا، چادر اوڑھی اور گھر سے باہر نکل آئی۔

"چلو تمہیں راستہ دکھائے دیتی ہوں۔" آپا زرینہ اس کے ساتھ ہولی۔

آسمان ابھی بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بادل زمین پہ جھکے آ رہے تھے۔ یوں جیسے ابھی برس کر ہر چیز تہ و بالا کر دیں گے۔

موسم کے تیور دیکھ کر آپا زرینہ راستے سے ہی لوٹ گئی...... وہ چادر سے منہ ڈھانپے، منی کو سینے سے لگائے فری کیمپ تک پہنچ گئی۔ کھلے آسمان، تلے ہی ٹینٹ لگا کر دو، چار ڈاکٹر اور عملہ دھڑا دھڑ بچوں کو چیک کر کے مفت ادویات دیتے جا رہے تھے۔ ایک لمبی قطار تھی جس میں وہ بھی جا کھڑی ہوئی...... کھڑے کھڑے ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ عورتوں کے دھکے، بچوں کا رونا پیٹنا...... بادلوں کی گڑگڑاہٹ......

"بارش شروع ہونے کو ہے، ڈاکٹر صاحب اسکول کی بلڈنگ میں جا رہے ہیں، مریض وہیں آ کر چیک کرائیں۔"

زرناب کو بے بسی کا شدید احساس ہوا۔ "یااللہ!" اس نے منی کی بند آنکھوں کو دیکھا...... کتنی دیر سے سو رہی تھی...... نہ دودھ کا گھونٹ پیا تھا نہ پانی۔

وہ فوراً قطار میں سے نکل کر ایک طرف ہو بیٹھی۔ بوتل کا ڈھکن کھول کر چند قطرے پانی منی کے منہ میں ٹپکائے تو عجیب سا احساس ہوا۔ وہ ڈھنگ سے سانس نہ لے رہی تھی۔ پانی کے چند قطرے جو ٹپکائے تھے وہ بھی ہونٹوں کے کناروں سے باہر بہہ نکلے۔

"منی...... منی...... منی......" اس کے قدموں تلے سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔ "منی آنکھیں کھولو...... پانی پی لو...... منی...... میری بچی...... آنکھیں کھولو...... ماں کو دیکھو......" منی جوں کی توں سو رہی تھی۔

وہ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھائے بھاگی۔

"ڈاکٹر صاحب...... میری بچی کو دیکھیں......

"پلیز...... پلیز اسے دیکھیں...... آنکھیں نہیں کھول رہی......"

اس سے قبل کہ ڈاکٹر اٹھتا' وہ اس کے سر پہ جا کر چلّائی تھی۔

ایسا کرب تھا لہجے میں کہ ڈاکٹر نے جھٹ سے منّی کو اس کے ہاتھوں سے لے کر اپنے سامنے لٹا لیا تھا۔ وہ منّی کی نبض چیک کر رہا تھا، آنکھوں کے پپوٹے کھول رہا تھا...... اسٹیتھسکوپ سینے سے لگا رہا تھا اور وہ منتظر تھی...... منی ابھی آنکھیں کھولے گی...... اسے دیکھے گی......

ڈاکٹر نے اچھی طرح اپنی تسلی کرنے کے بعد منّی کو اسی اوڑھنی میں اچھی طرح لپیٹ دیا تھا جس میں زرناب اسے لپیٹ کر لائی تھی۔

"آئم سوری...... اس کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

ڈاکٹر کی بے حد مدھم آواز۔ زرناب کے ہاتھ سے چادر کا پلو پھسل گیا۔

"یہ کیا کہا ہے ڈاکٹر نے......؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی اور ڈاکٹر اسے......

دونوں طرف بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"مر گئی......؟؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے...... منّی......!!" اس نے پکارنا چاہا لیکن سانس اور آواز دونوں ہی سینے میں اٹک گئی تھیں۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے چہار اطراف دیکھا۔

لوگ بول رہے تھے، بچے رو رہے تھے۔ بادل گرج رہے تھے۔ اک شور تھا، ہنگامہ تھا، لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

لاچار سی نظروں سے اس نے ڈاکٹر کو دیکھا جو حیرت کی انتہاؤں پہ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"زرناب...... یہ تم ہو؟"

اور اس کے ساتھ ہی زرناب کے تمام حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے...... اس سے قبل کہ وہ لہرا کے گرتی، ڈاکٹر فواد حسن اسے دونوں بازوؤں میں سنبھال چکے تھے۔

☆☆☆

اتنا روئی تھی وہ، اتنا کرلائی تھی کہ آسمان کا سینہ بھی شق ہو گیا...... ایسا برسا کہ گلیاں و بازار گھٹنوں گھٹنوں پانی سے بھر گئے...... مائی خیراں منّی کے غم میں روتی' اپنے صحن میں بھرتے پانی اور ٹپاٹپ برستی چھت کو دیکھتی تھی۔

گھر خالی اور سنسان ہو گیا تھا...... منّی خالق حقیقی سے جا ملی اور زرناب کی غیر ہوتی حالت کے پیش نظر نیند کا انجکشن لگا کر ڈاکٹر فواد حسن اپنے ساتھ لے گئے۔ مائی خیراں منی کے رنگ برنگی کترنوں سے سلے فراک اپنے سامنے پھیلائے بیٹھی رہی۔ بارش تھم گئی تھی، لیکن کمرے کی چھلنی چھت تھی کہ ابھی تک ٹپاٹپ برسے جا رہی تھی' مائی خیراں نے سارے فراک ٹرنک میں بہت سنبھال کر رکھے اور صحن میں بھرے پانی کو بالٹی کی مدد سے باہر گلی میں نکالنے لگی۔

☆☆☆

اور...... وہ وہاں تھی جہاں وہ صرف اور صرف مر کر ہی واپس آنا چاہتی تھی...... باہر آنگن میں ہلچل مچی تھی، ستارہ اور عمارہ آئی تھیں...... پھوپھی نصرت بھی تھیں...... کمرے کے دروازے سے جھانک کر چلی گئی تھیں، اندر نہیں آئیں...... وہ دونوں بازوؤں میں منہ دیے پڑی تھی۔

"ابھی تو منی کے غم میں بہت سا رونا تھا فواد حسن! تم مجھے یہاں کیوں لے آئے؟ میں تو بھولی بسری ہو گئی تھی سب کے لیے...... تم درد اور تکلیف بھری یاد بنا کر پھر سے لے آئے مجھے...... کس زعم میں نکلی تھی یہاں سے...... کس کسمپرسی میں لوٹی ہوں۔ بیٹی کو کھو کر آئی ہوں تو باپ بھی چھن چکا ہے۔ ماں پہچاننے سے انکاری ہے...... زندگی کا یہ کون سا رخ ہے میرے مولا......! محبت اگر گناہ ہے تو گناہ کی سزا اتنی کڑی......؟" اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس غم کو روئے۔

☆☆☆

کتنے دن بیت گئے...... وہ نڈھال پڑی رہی۔ لوگ آئے اور اس کی حالت زار پہ تاسف کا اظہار

کرتے لوٹ گئے۔ ملنے کی خواہش کرتے تو رودابہ فرشتہ بن کر دروازہ بھیڑ دیتی۔

''بیٹی فوت گئی......اسی کے غم میں نڈھال پڑی ہے۔''

''لو......خوامخواہ......غم کیسا......؟ شکر کا کلمہ پڑھے...... رب سوہنا جو کرتا ہے، ٹھیک ہی کرتا ہے۔''

''اچھا ہوا جو پلا جھاڑ کر آئی ہے...... کسی نئے کھونٹے سے باندھنے میں آسانی ہوگی۔''

''پرائے مال کی ذمہ داری کون اٹھاتا ہے؟''

اور پھر بھاگی ہوئی عورت کی اولاد......اللہ توبہ......!

''اب نہ مرتی تو زمانہ طعنے — دے دے کر مار دیتا......''

پتا نہیں، کیسی بے درد اور ظالم زبان تھی بولنے والوں کی۔ روداہہ سر تھام کر بیٹھی رہی...... کیا کرتی......؟ ہر دکھ درد میں دوا دارو کرنے والے یہی لوگ تھے...... انہیں جھڑک نہیں سکتی تھی...... کہ ان کے احسانوں کا ٹوکرا بہت بھاری تھا، جو سر پہ دھرا تھا اور وہ ظرف کی ماری مجبور تھی......دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھتی تھی۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد وہ کمرے سے نکلی تھی۔

چہرے کی جھلسی ہوئی رنگت، بدرنگ بال' حسن کی چمک اور نرمی کھو چکی تھی، سیاہ پڑتے ہونٹ، میلی پھٹی ہوئی ایڑیاں...... گھسا ہوا لباس......

روداہہ کے اصرار پر اس نے نہا کر پیناپرانا جوڑا پہن لیا تھا اور اس جوڑے میں زرناب تھی کہ پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی، میلی سی، بدرنگ، اجڑی ہوئی زرناب...... اور زرناب (خالص سونا) تھی کہاں؟ وہاں تو بس پیتل ہی پیتل تھا۔ روداہہ برداشت نہ کر پائی تو آنکھوں میں آئی نمی کو لیے کمرے میں جا چھپی...... زرناب بہن کی اس محبت پر احسان مند ہوئی۔

کتنی عجیب بات تھی، ابھی تک کسی نے اس سے کوئی سوال ہی نہ کیا تھا یا شاید ضرورت ہی نہ تھی۔

فواد حسن' مائی خیراں کی زبان سب کہانی سن چکا تھا۔ زرناب کے ساتھ آئے کل سامان میں صرف اس کا طلاق نامہ اور منی کا مردہ وجود تھا۔ پھر پوچھنے کو باقی کیا رہ گیا تھا؟

وہ روزانہ چلا آتا اور کن اکھیوں سے زرناب کو دیکھا کرتا...... یہ وہ لڑکی تھی جس کے لیے ماموں نے اس کے رشتے کی بات کی تو وہ دل ہی دل میں اپنی قسمت پر مغرور ہوا تھا۔

اور آج......وہی لڑکی......

اطلس و کم خواب جیسی لڑکی، کسی پھٹے، پرانے، میلے لباس کا ایک چیتھڑا معلوم ہوتی تھی۔

فواد حسن کو ایک انتہائی قدم اٹھانا تھا، آخری فیصلہ کرنا تھا جسے کرنے اور نہ کرنے کے بیچ وہ معلق تھا۔

ہر روز آتا، دیکھتا، سوچتا اور لوٹ جاتا......

پھوپھی نصرت اپنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے سپوت کے انداز دیکھ رہی تھیں، لیکن چپ سادھے بیٹھی تھیں۔ انہیں وقت کے فیصلے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

''وہ پیاری نہیں تھی، لیکن مجھے بہت پیاری لگتی تھی...... بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹی سی ناک، کٹاؤ والے ہونٹ، چھوٹی سی ٹھوڑی...... میں اسے دودھ پلاتی تو ٹکر ٹکر مجھے دیکھا کرتی تھی، کبھی کبھار یوں ہی مسکرا دیتی تھی۔'' وہ روداہہ کو منی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

'' سیاہ گھور آنکھیں تھیں، پر چمکتی ہوئی اور اب تو دو دانت بھی جھلک دکھانے لگے تھے۔'' آنسو ایک لکیر کی صورت اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

''اچھا اب غم مت کرو...... بھولنے کی کوشش کرو سب۔'' روداہہ بڑے سبھاؤ سے کہہ رہی تھی۔

وہ بے بسی سے مزید رو دی۔ '' کیسے بھولوں اسے روداہہ...... بھولتی ہی نہیں...... پورے نو ماہ کھلایا ہے میں نے اپنی گود میں اسے......نو ماہ کوکھ میں اور نو

ماہ گود میں...... کل اٹھارہ ماہ۔"

زلیخا خاتون قریب بیٹھی تھیں۔ ان کی آواز پر دونوں چونکیں۔

"میں نے تجھے اٹھارہ سال پالا تھا۔"

زرناب سُن ہو کر رہ گئی...... زلیخا خاتون معمول کے سب کام انجام دیتی تھیں، لیکن بولتی نہ تھیں۔

"جس نے جانا ہوتا ہے، وہ چلا جاتا ہے۔ سال اور مہینے تو پیچھے رہ جانے والے گنتے ہیں۔" اب وہ بول رہی تھیں۔

"وہ بہت چھوٹی تھی اماں...... اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا...... مجھے پتا ہی نہیں چلا...... میں بے خبر ہی رہ گئی اماں۔"

"میں بھی بے خبر ہی رہ گئی تھی۔ مجھے بھی پتا نہیں چلا تھا۔" وہ دونوں اپنا اپنا غم رو رہی تھیں۔

"اس کا چہرہ میری آنکھوں سے جاتا ہی نہیں...... ہر طرف وہ ہی وہ دکھائی دیتی ہے۔"

"مجھے بھی تم ہی تم دکھائی دیتی تھیں...... چلتے، پھرتے، ہنستے، بولتے......" وہ اتنی زور سے چلّائیں کہ زرناب رونا بھول گئی تھی۔

"وہ اٹھارہ ماہ کی بچی تمہیں حال سے بے حال کر گئی اور جنھوں نے اٹھارہ سال تمہیں پالا پوسا، تمہارے ناز، نخرے اٹھائے، تمہیں محبت، چاہت سے نوازا...... تمہارے لیے دن رات ایک کیے۔ تمہیں ان کا خیال نہیں آیا۔"

زرناب خوف زدہ ہو کر ماں کو دیکھ رہی تھی جو آج وحشت زدہ تھی...... بول رہی تھی...... اسے آئینہ دکھا رہی تھی۔

"اٹھارہ ماہ کی بیٹی کو کھو کر اس کی جدائی کا غم پالنے بیٹھی ہو...... پہلے میرے غم کا حجم دیکھو...... میں نے اٹھارہ سال کی بیٹی کھوئی۔ میں نے اپنے شوہر کو کھویا...... اپنی تربیت کا مان، فخر، غرور کھویا...... عزت گنوا دی ہم نے...... ہم نے سر اٹھا کر جینا کھو دیا اور تم کیا جانو زرناب، ہم نے تمہارے پیچھے کیا کیا کھو دیا۔ تم نے ہمیں مٹی کر دیا زرناب...... تمہیں کیا خبر......؟ میری ہیرا بیٹیاں صدقے کے پیسوں کی طرح لوگوں کی جھولیوں میں ڈالی گئیں...... تمہیں کیا خبر زرناب......! ہم نے تمہاری محبت کے عوض کیا کیا کھو دیا......؟"

سارے نوحے...... سارے بین...... ایک ایک کر کے زرناب کی جھولی میں گرتے چلے گئے۔ بوجھ تھا بہت اور وہ ناتواں......

کیسے سہنا تھا......؟ وہ نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

آج کی رات ادراک کی رات تھی...... آگہی کے عذاب کے ساتھ اُتری تھی۔

"تو بس پھر...... میرے ساتھ یہ ہی تو ہونا تھا......" وہ کھلے آسمان تلے کہر آلود رات میں بیٹھی ٹھٹھرتی تھی اور اٹھنے کا یارا نہ تھا۔

بہت کچھ یاد آ رہا تھا، بہت کچھ سمجھ میں بھی آ رہا تھا۔

وہ ماں کا تھپڑ سہ نہ پائی تھی...... قدرت نے اسے حالات کے تھپیڑوں پہ رکھ دیا۔

اس نے ماں، باپ کی محبت کو ٹھوکر ماری تھی...... سلطان اس کی محبت کو ٹھکرا کر چلا گیا۔

اس نے گھر چھوڑا، دربدری مقدر ہو گئی۔

بیٹی کا غم دیا...... اور...... بیٹی کا غم مل گیا۔

وہ بے چین روح...... ننگے پاؤں صحن کی برف زمین پر چکرا رہی تھی۔

"ابا اس دنیا سے چلے گئے...... ورثے میں احساس جرم مجھے دان کر گئے۔ یہ ورثہ صرف میرے حصے میں آیا ہے، تقسیم نہ ہو گا۔ کہاں سے ڈھونڈوں میں آپ کو ابا!

میرے پیارے ابا! میں کیسے آپ کو واپس لاؤں...... کیسے معافی مانگوں آپ سے...... کیسا غم دیا میں نے آپ کو...... جو سہ نہ پائے۔ کس بوجھ کو دل میں لیے اٹھ گئے آپ۔ آخری لمحوں میں کیا سوچا ہو گا میرے بارے میں...... کون سی بددعا دی ہو گی...... کیسا شکوہ آیا ہو گا زبان پہ......

یہ میں نے کیا کیا میرے اللہ......! یہ میں نے کیا کر دیا۔" وہ دو زانو بیٹھی رو رہی تھی، بلک رہی تھی۔

لیکن جو وقت گزر چکا ہو، واپس کب آتا ہے؟

☆☆☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ زلیخا خاتون بند آنکھوں سے جاگ رہی تھیں۔ اس کی سسکیاں سن رہی تھیں۔ تب ہی کھٹکا سا ہوا تھا۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ چارپائی کی پائنتی تھامے زمین پر بیٹھی تھی۔ آنسوؤں سے تر گال ان کے پاؤں کے تلوؤں سے رگڑتی التجا کر رہی تھی۔

"معاف کردو اماں! خدارا...... تم تو معاف کردو۔ میری سزا کے لیے میرے باپ اور بیٹی کی قبر ہی کافی ہے ماں...... تم معاف کردو۔"

زلیخا خاتون تڑپ کر اٹھیں اور اسے دبوچ کر بکل میں چھپا لیا۔ "میری رانی! میری پیاری...... بیٹی......مت رو...... ماں صدقے، ماں قربان...... نہ رو...... میں ہوں نا۔" اسے سینے میں بھینچے وہ روئے جاتی تھیں...... اور زرناب بھی۔

☆☆☆

صحن میں خوب رونق تھی۔

یہ پہلا دن تھا کہ ستارہ اور عمارہ اپنے بچوں کو ساتھ لائی تھیں۔ وہ بھاگتے دوڑتے شور مچاتے تھے اور بڑے ان کی دیکھ بھال میں شور مچاتے، ہلکان ہو رہے تھے۔ پھپھی نصرت اور ان کا پورا گھرانہ......

فواد حسن نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ رودابہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ سب نے سنا اور اس کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ یہ ہی ہونا تھا۔ جیسے سب ہی کو معلوم تھا۔

"میں سب کچھ بھول کر زرناب کو اپنا بھی لوں۔ اپنے ظرف کو آزما بھی لوں...... تو آئندہ آنے والی نسلوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ زرناب اچھی بیٹی ثابت نہیں ہوئی...... تو اچھی ماں کیسے ثابت ہوگی؟

رودابہ نے مشکل وقت کو جس عزت، آن، خودداری اور حوصلہ مندی سے برداشت کیا ہے...... کیا وہ حق نہیں رکھتی کہ عزت، محبت اور خوشیوں بھری زندگی اسے نصیب ہو؟"

پھپھی نصرت نے جواباً ایک لفظ نہ کہا۔ مٹھائی منگوائی اور بیچ آنگن میں بٹھا کر رودابہ کا منہ میٹھا کرا دیا۔

زرناب باورچی خانے میں تھی۔ ستارہ اور عمارہ نہ جانے کیوں آج اتنی مصروف تھیں۔ وہ چوکی پہ بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔ اماں چائے کے لوازمات اسے تھما گئی تھیں۔

"تم برتن نکالو۔ میں چائے لے جاتی ہوں۔"

وہ اسے بچا بچا کر رکھنا چاہتی تھیں۔ "کہیں ستارہ، عمارہ کے بچوں کو دیکھ کر اپنی بچی کو یاد نہ کرتی رہے۔ تینوں بہنوں کو آسودہ دیکھ کر اپنے غم کا ملال نہ کرے۔"

وہ سب سمجھتی تھی۔ چولہے کے پاس بیٹھی ماچس کی تیلیوں کو جلا جلا کر ڈھیر کرتی رہی۔

باہر خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

اور اندر...... درد ہی درد تھا...... جو دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ بدن میں سفر کرتا تھا۔ یہ درد کب ٹھہرے گا، زرناب نہیں جانتی تھی۔ صرف وقت تھا، جسے ہر زخم مندمل کرنا تھا اور صرف قدرت تھی جو جانتی تھی کہ درد کے قافلے کب خوشیوں بھری وادی میں اتریں گے اور اس کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

☆

صدف ثنار

اسے ہم عرض کرتے ہیں

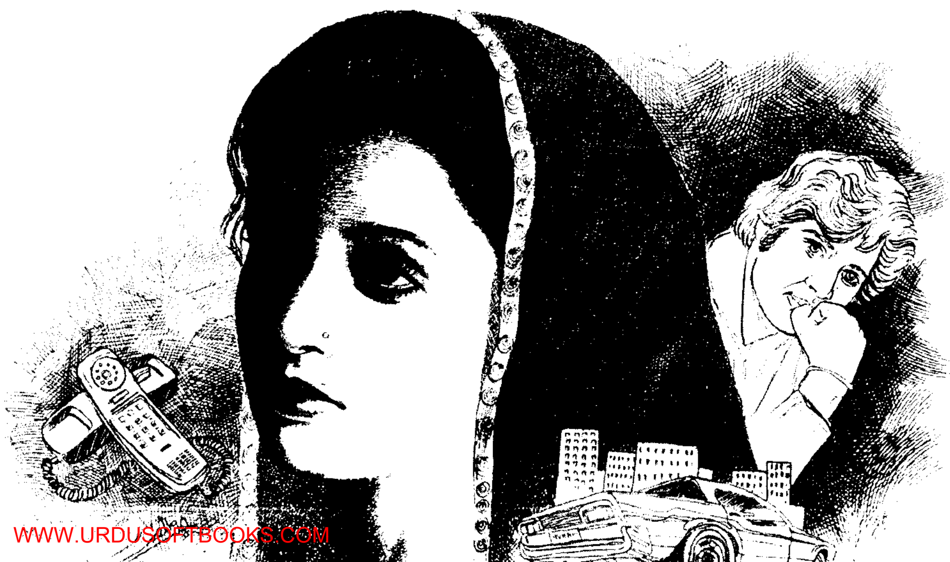
عائزہ اپنے دو بچوں کے ساتھ اپنے بھائی ابراہیم کے پاس چھٹیاں گزارنے آتی ہے۔ ابراہیم کی بیوی یوشان نے اپنے کیریر کی وجہ سے ابارشن کرالیا تھا۔ یہ بات جب ابراہیم کو پتا چلتی ہے تو وہ اسے طلاق دے دیتا ہے۔

فاروق اور رخشندہ کے چار بچے ہیں۔ ثمن کا رشتہ حاشر زمان سے طے ہے۔ حاشر' ثمن کی دوست کا بھائی ہے' جس کی بناء پر خالا نے ہر جگہ ثمن کے جھوٹے افیئر کو مشہور کر دیا ہے۔ ثمن کے بھائی اور والد اس بات سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔

ثمن کی بڑی بہن سمیعہ کا رشتہ دبئی میں فائق سے طے ہے۔ ثمن سب گھر والوں کے ساتھ دبئی جاتی ہے جہاں وہ ابراہیم کو پسند آ جاتی ہے۔ ابراہیم رشتہ دیتا ہے' مگر ثمن اسے اپنی منگنی کا بتاتی ہے وہ ٹوٹے دل کے ساتھ واپس ساؤتھ افریقہ چلا جاتا ہے۔

واپسی پر حاشر زمان' ثمن سے باہر ملنے کی خواہش کا بار بار اظہار کرتا ہے مگر ثمن کے انکار پر ناراض ہو جاتا ہے۔ مکتب خان اور نسوار خان ایک بوتیک میں چپڑاسی ہیں۔ ثمن کے گھر والوں کو ثمن کی نسوار خان کے ساتھ نازیبا تصاویر موصول ہوتی ہے۔ ثمن کے والد کو صدمے سے ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ حاشر رشتہ ختم کر دیتا ہے۔ ثمن کے بھائی اسے مارتے ہیں اور نسوار خان کو ڈھونڈ کر زبردستی اس کے ساتھ شادی کروا دیتے ہیں۔

مکمل ناول



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM



WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دوسری اور آخری قسط

وہ جسے ایک ڈاکٹر کی بیوی بننا تھا۔ وہ ڈاکٹر جس کے دو بہترین علاقوں میں اپنے گھر تھے۔ گاڑی تھی، اچھا نام تھا، پیسا تھا۔ وہ ڈاکٹر جو اس کا دیوانہ تھا محبت کا دعوے دار تھا۔ وہی ثمن اب ایک پیون کی بیوی بن گئی تھی۔ جو نہ صرف ایک بوتیک پر پوچا لگاتا تھا بلکہ شاید وہ ایک کباڑیا تھا۔ وہ لوگوں کے آرڈر سنتا تھا۔ لوگوں سے ڈانٹ کھاتا تھا۔

یہ گھر جہاں وہ اس وقت بیٹھی ہوئی تھی...... اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ وہ عورتیں جو اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔ دف بجا رہی تھیں پشتو گیت گا رہی تھیں۔ انہوں نے پٹھانوں کی مخصوص فراکیں اور گھیر دار شلواریں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھ پیر مہندی سے رنگے۔ عجیب سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے میں دروازہ بجا۔ سب عورتوں نے اپنے دوپٹوں سے اپنے چہرے ڈھانپے۔ رستم خان آئے تھے ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ جسے وہ پہچانتی نہ تھی۔ رستم خان کو یوں پہچانتی تھی کہ وہ نکاح سے لے کر رخصتی تک ہر چیز میں پیش پیش تھے۔ انہیں سب رستم بابا کہہ کر پکار رہے تھے۔

رستم بابا اس کے پاس آئے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''تم آج سے امارا بیٹی اے۔ یہ شرارتی اگر تمہیں تنگ کرے تو ام سے شکایت لگانا۔ ام اس کے کان کھینچے گا۔ کوئی بھی چیز کا ضرورت ہو ہمیں بتاؤ۔ ابی تم آرام کرو۔'' پھر عورتوں کی طرف منہ کر کے کچھ پشتو میں بولے۔

ساری عورتیں اپنے گھونگھٹ پکڑ کر یوں جھک کر دوڑیں گویا اس صحن میں سانپ آ گیا ہے۔ ان کے بھاگنے کے انداز سے ثمن کو لگا وہ کوئی پشتو فوک ڈرامہ دیکھ رہی ہو۔ کیا یہ سب کچھ واقعی اس کے ساتھ ہو چکا تھا؟

عورتیں گئیں تو ان کے پیچھے رستم بابا چلے گئے۔ وہ ایک پٹھان رک گیا تھا۔ پھر وہ بھی ان کے پیچھے گیا، مگر باہر نہ گیا تھا۔ دروازہ بند کر کے پلٹ آیا تھا۔

یہ کون تھا؟ کیا یہ ہی......؟'' ثمن نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ کیا یہ اس کا شوہر تھا؟

وہ اس کے قریب آنے لگا۔ ثمن کی گھگھی سی بندھ گئی۔ اسے درحقیقت اس آدمی سے خوف آیا۔ لمبا قد، بھاری ڈیل ڈول اور اتنی بڑی توند تیل سے چپڑے بال اور الجھی ہوئی سی ڈاڑھی جسے سلجھانے کی شاید کوشش کی گئی تھی۔ ایک موڑھے پر ثمن بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرا موڑھا اس کے مقابل رکھ کر وہ بھی بیٹھ گیا۔ کڑوے تیل کی خوشبو، عطر کی خوشبو میں مکس ہو کر عجیب سی محسوس تھی۔ ثمن کو لگا اس کا سانس بند ہو رہا تھا۔

لاشعوری طور پر وہ قدرے سمٹی۔ وہ پٹھان نیلی آنکھوں سے اسے یوں دیکھنے لگا کہ وہ باقاعدہ کانپنے لگی تھی۔

''تمہارے منہ سے بار بار یہ سننا کہ میرے گھر والے نہ دیکھ لیں، میرے گھر والوں نے ہمیں بات کرتے دیکھ لیا تو یہ ہو جائے گا۔ وہ ہو جائے گا تمہارا ہر وقت اپنے پیرنٹس سے ڈرنا مجھے حیران کر دیتا تھا، مگر آج...... میں مان گیا ہوں ثمن! تمہارا ہر خوف، ہر ڈر سچ تھا۔ تمہارا اپنے پیرنٹس سے ڈرنا سچ تھا۔''

ثمن نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ یہ کون تھا؟ اس کی آواز، اس کا لہجہ اس کی شخصیت سے میل نہ کھاتا تھا۔ یہ کون تھا؟

تو نے کیا سوچ کر چھوڑا تھا کہ مر جاؤں گا میں؟

ارے پاگل، جو اللہ تیرا ہے وہی اللہ میرا ہے۔

ثمن کا حیرت سے منہ کھل گیا۔

''میں نے چار مہینے پہلے تم سے اپنا تعارف کروایا تھا۔ آج پھر کروا رہا ہوں۔ میرا نام ابراہیم خان ہے۔ ساؤتھ افریقہ میں رہتا ہوں۔ بزنس ہے وہاں اپنا اور میرے فورفادرز پاکستان کے علاقہ وزیرستان کے رہائشی ہیں۔ اس حساب سے میں بھی

وزیرستانی ہوں۔"

"ابراہیم...... آپ...... یہ سب آپ نے کیا؟" وہ بے یقین ہوئی۔

"میں جانتا تھا' تم یہ ہی سوچوگی۔ یہ ہی سمجھوگی، مگر صرف اس لیے میں اپنی حقیقت تم سے چھپا نہیں سکتا تھا۔ تم اس شخصیت کے ساتھ بالکل کمفرٹیبل نہ رہتیں۔" اس نے اپنے ظاہری حلیے کی طرف اشارہ کیا۔

"ابراہیم بولیے! یہ سب آپ نے کیا؟" ضبط کی انتہا پر کھڑی وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ میں نہیں کیا۔ میرے پاس اپنی بے گناہی کا ثبوت نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اپنے گھر والوں کے سامنے تمہارے پاس یقیناً نہیں تھا۔ تمہارے گھر والوں نے تمہارا یقین نہیں کیا۔ تمہارا سوجا ہوا ہونٹ اور گالوں پر انگلیوں کے نشان اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمہارے گھر والوں نے تمہارا اعتبار نہیں کیا، مگر تم میرا اعتبار کرلو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ابراہیم کسی دوسرے کی ملکیت پر نظر نہیں ڈالتا۔ ہاتھ ڈالنا تو بہت دور کی بات ہے۔ پھر بھی تم میرے پاس ہو۔ یہ اللہ کا مجھ پر کرم کے سوا کچھ نہیں۔ میں اسے اپنے عشق کی سچائی کہتا ہوں۔ صرف عشق کی سچائی۔"

ثمن پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "پھر یہ کس نے کیا ہے؟ ایک منٹ...... آپ پاکستان میں...... اس حالت میں کیوں ہیں؟ کیا کررہے ہیں؟" وہ رونا بھول کر بولی۔

"یہ بات میں تمہیں یہاں نہیں بتا سکتا۔ کمرے میں آؤ۔" وہ اس گھر کے اکلوتے کمرے کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

شکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں کمرے میں چلے گئے۔ ابراہیم نے دروازہ مقفل کردیا۔ ثمن کو وحشت سی ہوئی۔ کمرے میں ایک چارپائی' اس پر پرانا سا بستر تھا۔ ایک موڑھا، کونے میں ایک ٹرنک جس پر تالا لگا ہوا تھا اور ایک لکڑی کا پرانا سا ٹیبل پڑا ہوا تھا۔ وہ کھڑی رہی۔

"تمہارے شایان شان یہاں کچھ نہیں ہے، لیکن بیٹھ جاؤ۔" ابراہیم نے کہہ کر موڑھا کھینچ کر چارپائی کے سامنے رکھا اور بیٹھ گیا۔ وہ کھڑی رہی۔

"ارے یار بیٹھ جاؤ۔ ہم اس گھر میں زیادہ دن نہیں رہیں گے۔" وہ بیٹھ گئی۔

"دیکھو! میں...... اب تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ ہائپر یا ایکسائیٹڈ مت ہوجانا۔ میں یہاں پاکستان میں اس لیے ہوں کیونکہ یہ جس بوتیک میں، میں کام کرتا تھا۔ اس کا مالک اظہر گیلانی میرے دوست کا ماموں ہے۔ یہ پہلے ساؤتھ افریقہ میں رہتا تھا۔ میرے دوست کی والدہ کا انتقال ہوا تو یہ اپنی بہن کی پراپرٹی بیچ کر بھانجے کا حصہ لے کر یہاں پاکستان آ گیا۔ میرے دوست نے اس پر کیس کیا ہے، مگر دو ملکوں کی بات ہے۔ مسئلہ کچھ زیادہ بن گیا۔ تو میرے دوست کو اپنے ماموں کی انفارمیشن لینے کے لیے ایک جاسوس ہائر کرنا پڑا۔ مجھے بچپن سے جاسوسی کا بہت شوق رہا ہے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ وہ یہ کام مجھے کرنے دے۔ تھوڑی پس وپیش کے بعد وہ مان گیا۔ تو اس طرح میں یہاں جاسوس ہوں۔"

"یہ کیا ڈرامائی کہانی ہے؟" ثمن نے بالکل بھروسا نہ کیا۔

"تو میڈم ویسے ہماری زندگی میں ابھی تک کون سی چیز نارمل ہوئی ہے؟ یہ جو آج ہوا ہے۔ جس کو عرف عام میں نکاح کہا جاتا ہے۔ کیا یہ بہت ڈرامائی انداز میں نہیں ہوا؟"

ثمن رونے لگی۔

"مجھے جب پتا چلا کہ پاکستان جانے کا چانس مل رہا ہے تو میری صرف ایک ہی خواہش تھی کہ تمہیں ایک بار دیکھ لوں۔

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

آہ گر بن بازبینم روئے بار خویش را
میں صرف ایک بار تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اللہ سے دعا کرتا تھا۔ پھر اس دن بوتیک میں آئیں تم......" ابراہیم نے آنکھیں بند کرکے اس منظر کو پھر سے تصور میں دہرایا تھا۔

"اس کے بعد تو بس مجھے شکر کرنا تھا۔ تاقیامت......صرف شکر۔ میں تمہارے ساتھ اتنا برا کیسے کرسکتا تھا۔"

"ابراہیم!" اس نے روتے ہوئے ابراہیم کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "آپ کو اللہ کا واسطہ! پتا کریں کہ یہ شرارت یا دشمنی میرے ساتھ کس نے کی، پلیز ابراہیم۔"

"دیکھو تم گھبراؤ نہیں۔" ابراہیم نے اسے تسلی دی۔ "ہم آٹھ لوگوں کی ٹیم ہے جو یہاں اظہر گیلانی پر کام کر رہے ہیں۔ یہ معاملہ بھی دیکھ لیں گے، مگر میں ایک بات سمجھ نہیں پایا۔ حاشر زمان کا سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے تم پر بھروسا نہیں کیا، مگر تمہارے گھر والوں نے کیوں نہیں کیا؟ ایک تصویر کی وجہ سے اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کون کرتا ہے؟"

"کیونکہ...... ہمارے گھر میں پاپا اور اطہر کے علاوہ سب سوتیلے ہیں میرے۔ اطہر بھی ماما کی طرف سے سوتیلا اور پاپا کی طرف سے سگا بھائی ہے۔ میں چار سال کی تھی کہ ماما چلی گئیں اللہ کے پاس۔ پاپا نئی ماما لے آئے۔ ماما کے ساتھ طاہر بھائی اور سمعیہ آپی بھی ہمارے گھر آئے۔ ایک سال بعد اللہ نے اطہر کو بھیج دیا۔ میری سوتیلی خالہ ہمیشہ ہمارے گھر میں رہتیں۔ تابندہ خالہ۔ پتا نہیں وہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں۔ اتنی تو ماما نہیں کرتیں۔ ان کی نظریں......سرد، جامد میری روح تک کو ہلا دیتیں، مگر خالہ......وہ مارتی تھیں۔" ابراہیم منہ پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"تو کہیں یہ تمہارے گھر والوں کا کام تو نہیں؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"نہیں۔ ان لوگوں نے محبت نہیں کی تو کبھی نفرت بھی نہیں کی۔ خالہ کے علاوہ سب......ٹھیک تھے، اچھے تھے......صرف پاپا بدل گئے تھے۔ ماما سے زیادہ وہ سوتیلے ہوگئے تھے۔ ان کو میں کبھی یاد نہیں رہی، مگر...... یہ جو کچھ ہوا اس میں میری فیملی کی بہت انسلٹ ہوئی۔ آخر وہ لوگ اپنی انسلٹ کیوں کرواتے......اور کوئی وجہ نہیں۔"

"او کے! دیکھ لیتے ہیں۔ یہ بتاؤ۔ کھانا کتنے دن سے نہیں کھایا؟"

"مجھے نہیں کھانا۔" وہ ضدی انداز میں بولی۔

"یہ کیا؟ صرف اپنی منواؤ گی؟ دیکھو میں تمہاری ہر بات مانتا ہوں۔ تو کچھ تو تمہیں بھی ماننی پڑیں گی۔"

ثمن نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ابراہیم کو اپنے کمرے سے جانے کو کہا تھا۔ وہ واقعی چلا گیا تھا۔ اپنی زندگی سے جانے کو کہا تھا' وہ چلا گیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور پھر ابراہیم کی طرف سے نظریں چرا کر بولی۔

"ہاں۔ بھوک تو لگی ہے۔" وہ یوں بولی جیسے بھوک بھی اس کا جرم ہو۔ ابراہیم زیر لب ہنسا۔

☆☆☆

شام ہو چکی تھی۔ ابراہیم برآمدے میں رکھے لکڑی کے ٹوٹے ہوئے تخت پر بیٹھا ہوا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ کمرے میں کھڑی تھی۔ کمرے میں موجود ایک چھوٹی سی کھڑکی سے ابراہیم کو دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ سن رہی تھی' ابراہیم کہہ رہا تھا۔

"میں نے عمران کے ہاتھ جو تصویر بھیجی ہے وہ ملی؟"

"یہ آج سے مسز ابراہیم خان ہیں۔"

"یار آج کا دن بہت مشکل تھا۔"

ثمن صرف وہ باتیں سن سکتی تھی جو ابراہیم کہہ رہا تھا۔ وہ بالکل اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ کمرے اور برآمدے کی ایک ہی دیوار تھی جس میں کھڑکی تھی۔

"نہیں! یار مجھے تو کوئی یہاں جانتا ہی نہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے۔ شرارت یا جو کچھ بھی...... یہ اس کے

ساتھ ہی ہوا ہے۔ آج جمعہ ہے۔ اگلے ہفتے تک مجھے واپس جانا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ اب تم دیکھو۔ پتا کرو یہ کس کا کام ہے؟''

''یار...... میں انفارمیشن بھیجتا ہوں تمہیں۔ اصل میں اس کی مدر، خالہ ایک بڑا بھائی اور بہن سوتیلے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یا تو یہ ان کا کام ہے یا پھر یونیورسٹی کی کسی دشمنی کا نتیجہ ہے یہ۔''

''نہیں ثمن کو کسی پر شک نہیں۔''

''نہیں اپنے گھر والوں کا وہ بالکل نام نہیں لے رہی۔ کہتی ہے اس میں کوئی ریزن یا لا جک نہیں۔''

''چلو میں تمہیں بھیجتا ہوں۔''

''ہاں اطہر کے بارے میں تقریباً ساری انفارمیشن اکٹھی ہوگئی ہے۔ بس ایک دو باتیں رہ گئی ہیں۔ مکتب خان ہے نا۔ اب کی بار بھی وہی انفارمیشن دے گا۔ پیسے نہیں لوٹنے اس نے نسوار خان سے۔'' ابراہیم ہنسا۔

''چل یار پھر بات کرتے ہیں۔''

''نہیں مکتب خان کے پاس اب منڈے کو جاؤں گا۔ ویسے اسے اطلاع دی ہے۔ تم بھی آنا۔ اتوار کو یہاں نسوار خان کے ولیمے کی تقریب ہے۔''

''ہاں۔ سب کو لانا۔ مل کر کھانا کھائیں گے، مگر یہاں کے حلیے کے مطابق آنا۔''

''چل اللہ حافظ۔''

☆☆☆

ابراہیم برآمدے میں سویا تھا اور ثمن کمرے میں۔ اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ وہ روتی رہی، پاپا سے شکوے کرتی رہی۔ صبح اٹھی تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ منہ ہاتھ دھونے پر بھی ٹھیک نہیں ہوئیں۔ ابراہیم نے تخت پر ناشتا رکھا۔ نظریں اس پر ہی تھیں۔

''آؤ۔ کافی رو لیا ہے۔ اب ناشتا کرلو۔'' انداز ڈانٹنے والا تھا۔

وہ شرمندہ سی اس کی طرف آئی۔ ''سوری یہ کام مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' اس کا اشارہ ناشتے کی طرف تھا۔

ابراہیم ہنسا۔ ''کوئی بات نہیں جان ابراہیم! آگے یہ کام تمہیں ہی کرنے ہیں۔'' اس کی گہری نظر خود پر محسوس کر کے ثمن نے نظر چرائی اور تخت پر بیٹھ گئی۔ دوسری جانب وہ بیٹھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ثمن! کہ تم میری ہوچکی ہو۔ پورے حق کے ساتھ تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم سے بات کرسکتا ہوں۔ مجھے حق ہے کہ تم اٹھ کر جانا چاہو تو ہاتھ پکڑ کر روک لوں تمہیں۔ مجھے......''

''پلیز ابراہیم۔ پلیز! ابھی ایسی باتیں نہ کریں۔ ابھی میرا ذہن یہ سب باتیں قبول نہیں کررہا۔'' وہ پھر سے رودی۔

''اچھا روؤ نہیں۔ نہیں روؤ۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کرتا۔ تم ناشتا کرو۔ پھر مجھے ایک دو کام ہیں، میں لنچ لے کر آؤں گا۔ کیونکہ اس گھر میں برائے نام کچن تو ہے، مگر پکانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

ثمن نے اسے دیکھا۔ سفید انتہائی کم قیمت معمولی لباس میں وہ ملبوس تھا۔ ابھی شاید نہایا تھا وہ۔ بال گیلے تھے۔ کافی بڑھ چکے تھے۔ ڈاڑھی بھی اچھی خاصی لمبی ہوچکی تھی، مگر...... توند کہاں گئی تھی؟ دانتوں سے نسوار کا رنگ بھی غائب تھا۔ شاید وہ یہ چیزیں مصنوعی استعمال کرتا تھا۔ اس کا ناشتا کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر وہ جانتی تھی ابراہیم ناشتا کیے بغیر اٹھنے نہیں دے۔

سارا دن محلے کی عورتیں نئی نویلی دلہن کو دیکھنے آتی رہیں۔ ساتھ گندے مندے بچے بھی، مگر اس میں تو دلہن والی کوئی بات نہ تھی۔ ہاں یہ تھا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج قدرے مطمئن تھی۔ اسی نیلے لباس میں ملبوس۔ دوپہر کو ابراہیم آیا۔ کھانا اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور واپس چلا گیا۔ وہ اداس سی بیٹھی رہی۔

شام کو رستم بابا اور ابراہیم اکٹھے گھر میں داخل ہوئے۔ رستم بابا اس کا حال پوچھنے آئے تھے۔ اس نے انہیں موڑھا پیش کیا۔ بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ باتیں

کرتے رہے۔

"امارا بیٹی کو کچھ چاہیے تو نہیں۔ کل ولیمہ کے لیے جو چاہیے وہ ام کو بتاؤ۔" جانے سے پہلے وہ بولے۔

"نہیں بابا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بہت شکریہ۔"

اس نے ابراہیم کی طرف ایسے ہی لاشعوری طور پر دیکھا۔ ابراہیم نے اسے دیکھ کر آنکھ دبائی۔ اس نے نظر چرائی۔ "پانی لاتی ہوں آپ کے لیے۔" وہ کھسک لی۔

☆☆☆

اس گھر میں راتوں سے اسے خوف آنے لگا تھا۔ کل رات بھی وہ سو نہ سکی اور آج رات بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ کل ولیمہ تھا۔ اسے یاد آیا۔ وہ لاؤنج میں حوریہ، سمعیہ، مہوش کے ساتھ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ڈرائنگ روم سے رستم بابا کی آواز آرہی تھی۔ وہ کافی اونچا بول رہے تھے۔

"تم کیسا لوگ ہے۔ اپنا گھر کا بندہ پر بھروسا نہیں کرتا ہے، مگر ام کو اپنا بیٹا پر بھروسا ہے۔ ام کو ابراہیم خان پر بھروسا ہے۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرسکتا' اس بچی کو ام اپنا بیٹی بنا کر لے جائے گا۔ آپ سب کو پرسوں اتوار کا دن ابراہیم خان کی ولیمہ کا دعوت ہے رستم خان کی طرف سے۔ آپ لوگ ضرور آنا۔"

رستم بابا مومن تھے۔ مرد مومن۔ اللہ تعالیٰ کا سورہ النور میں مسلمانوں کے لیے حکم ہے جس کا مفہوم ہے کہ اگر کسی مومن پر تہمت لگے تو اس کے آس پاس کے لوگوں کو یہ گواہی دینی چاہیے کہ انہوں نے ایسا عیب مذکورہ انسان میں کبھی نہیں دیکھا۔ مگر ثمن کے لیے گواہی دینے کے لیے کوئی نہ اٹھا تھا۔ وہ سب ماڈرن لوگ تھے۔ دوسروں کو معاملات میں نہ پڑنے والے۔ پرائیویسی قائم رکھنے والے۔

مگر رستم بابا غریب بستی کے رہائشی تھے۔ جہاں کوئی پرائیویسی نہیں ہوتی تھی۔ ایک انسان کا مسئلہ پورے محلے کا مسئلہ ہوتا۔ ایک انسان کی خوشی پورے محلے کی خوشی ہوتی۔ سب اکٹھا ہوتا اور ابراہیم...... ہاں انہوں نے ابراہیم خان لفظ بولا تھا۔ انہوں نے نسوار خان کا اصل نام لیا تھا۔ ثمن تو دھیان دینے کی صورت حال میں نہ تھی۔ باقی، ابراہیم کو کون جانتا تھا۔ دبئی میں اس کی بات چیت صرف ثمن سے ہوئی تھی۔ حوریہ اسے صرف پہچانتی تھی، مگر ابراہیم کا حلیہ بے حد بدلا ہوا تھا۔

☆☆☆

اس کے ولیمے کے لیے لباس رستم بابا کی بیوی گل جان لائی تھیں۔ ان کی بیٹیوں اور بہوؤں نے اس کو مہندی لگائی اور تیار کیا۔ بالوں کی مینڈھیاں بنائیں۔ ثمن کو مہندی کچھ اچھی نہ لگی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کی ہتھیلیاں بے ڈھنگے انداز میں رنگ دی گئی تھیں، مگر لباس بہت اچھا تھا۔ مخصوص پشتو لباس۔ بڑی سی گھیر والی فراک اور مخصوص طرز کی شلوار۔ پیروں میں کھسّہ، جب اسے دوپٹا اوڑھا کر آئینہ دکھایا گیا تو وہ اپنے آپ کو دیکھ کر ایک لمحے کو تو ڈر گئی۔ آئی شیڈ، بلش آن اور لپ سٹک ایک ہی رنگ کے اور ایک ہی مقدار میں لگائے گئے تھے۔ گہرے سرخ۔ آنکھوں میں سرمے کا پورا ٹرک تھا جیسے' بالوں کی مینڈھیوں کو آگے سیٹ کیا گیا تھا، مگر ثمن نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ نہ دکھی ہوئی تھی نہ بددل۔ وہاں کی عورتوں نے بہت محبت سے اسے دلہن بنایا تھا۔ انہیں یہ ہی کرنا آتا تھا۔ جو انہوں نے کردیا۔ ثمن نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

ولیمہ اچھے انداز میں ہوگیا تھا۔ جتنے اچھے انداز میں ہوسکتا تھا۔ اس نے وہاں رخشندہ اور طاہر کو دیکھا تھا۔ ثمن کے گھر سے ان لوگوں نے شرکت کی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ آپس میں کوئی بات نہ ہوئی۔ عصر تک ولیمے کی تقریب ختم ہوگئی تھی۔ مہمانوں کی رخصتی کے بعد ابراہیم اور وہ کھانا کھا رہے تھے۔ وہ منہ دھو کر میک اپ صاف کرچکی تھی۔ اور برائے نام ہی کھا رہی تھی۔

"صحیح سے کھاؤ سوئیٹ ہارٹ! بہت کمزور ہوگئی ہو۔"

ثمن نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ''دل نہیں چاہ رہا...... میرا دل نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔''
وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ''ابراہیم...... ایک بات پوچھوں؟''
''پوچھو۔'' اس کے لہجے میں کتنی مٹھاس تھی۔ کتنا پیار تھا۔ ثمن نے محسوس کیا۔
''کب تک معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس نے کیا؟'' اس نے بڑی آس سے ابراہیم کو دیکھا۔
''یار تھوڑا وقت تو لگے گا۔ یہ شرارت ہے، دشمنی یا سازش...... تھوڑا وقت لگے گا معلوم کرنے میں۔'' وہ سابقہ لہجے میں بولا۔
''ایک اور بات پوچھوں؟'' اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔
''پوچھو میری جان!''
''میں آپ کو ابراہیم نہیں کہنا چاہتی۔ خان کہہ لیا کروں؟''
''بالکل کہو۔ تم ان شاء اللہ ایک نئی زندگی شروع کرو گی۔ ہم دونوں نئی زندگی شروع کریں گے۔ ساری پرانی باتیں، دکھ، حاشر زمان ——...... سب بھول جاؤ گی تم۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔''
وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ آنسو پیتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔
''ان شاء اللہ۔''
''مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا پاسپورٹ اور ویزا کہاں ہے؟ ابھی پاس ہے یا گھر پر ہے؟''
''وہ میرا گھر نہیں ہے۔ مجھے وہاں سے نکال دیا گیا ہے۔ سب کچھ وہیں رہ گیا ہے۔''
''اچھا۔ مجھے تمہارا پاسپورٹ اور ویزا آج شام تک چاہیے۔ اب کیسے ملے گا؟'' وہ سوچنے لگا۔
''میں خود جا کر لاؤں گی۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے؟'' وہ مضبوط انداز میں بولی۔
''میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوں، مگر تم انہیں فیس کر لو گی کہیں گھبرا نہ جاؤ۔''
''میرا شوہر میرے ساتھ ہے۔ ان کی کیا جرأت کہ وہ مجھے کچھ بھی کہیں۔ اب میں اپنے گھر والی ہوں۔ خالہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتیں۔''
ابراہیم نے اسے دیکھا۔ ''پھر ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد چلتے ہیں۔''

☆☆☆

گھنٹی بجنے پر ملازم نے دروازہ کھولا تھا۔ ثمن کو دیکھ کر خوشی سے سلام کیا۔ وہ اندر آ گئی۔ ملازم شاید رخشندہ کو اطلاع کرنے اندر چلا گیا۔ ثمن نے بھی انتظار نہ کیا۔ وہ بھی تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یہ بات وہ گھر پر طے کر کے آئے تھے۔ ابراہیم بھی اندر داخل ہوا، مگر دروازے کے قریب کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بھونچکا ہوئی رخشندہ اور تابندہ وہاں آ پہنچیں۔
''تم......'' انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔
''ثمن کہاں ہے؟''
''وہ اپنی سامان لینے آیا ہے۔'' درحقیقت ابراہیم کو غلط اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ یہ سب غلطیاں وہ اپنے اندازے سے کرتا تھا۔
''حد ہو گئی ہے رخشندہ! تم نے ابھی تک ملازمین کو ہدایت نہیں کی کہ ثمن کو اندر نہیں آنے دینا۔'' تابندہ نے رخشندہ پر غصہ کیا۔
''غلط جگہ پر غصہ کرتی ہو تم تابندہ۔ تحمل نہیں ہے نا تم میں۔'' وہاں حوریہ اور سمعیہ بھی آ گئیں۔
دیکھو لڑکیو! تمہارے دولہا بھائی آئے ہیں۔ ان کی خاطر داری کرو کچھ۔'' تابندہ اپنی بات کا مزہ لے کر بولی۔
''مجھے تو ویسے بھی دولہا بھائی پہچانتے ہی ہوں گے۔'' سمعیہ ہنسی۔ ''یاد ہے نا جب بوتیک میں ملے تھے ہم دولہا بھائی۔'' ابراہیم جانچتی نظروں سے ہر چیز اور ہر ایک کا رویہ پرکھ رہا تھا۔
''بہت اچھا یاد ہے تم ام کو۔'' یاد تو اسے حوریہ بھی تھی۔ دبئی میں دیکھا تھا اسے۔
''ہاں دولہا بھائی نے ڈانٹ کھائی تھی مجھ سے۔'' سمعیہ اور ہنسی۔

"ارے کچھ اور خاطر مدارت کرو پھر اپنے دولہا بھائی کی۔" تابندہ نے ہنس کر کہا۔ ابراہیم بھی زیرلب مسکرایا۔ گھر میں اس وقت یقیناً کوئی مرد نہیں تھا۔

"دولہا بھائی۔ نسوار آپ بہت کھاتے ہیں۔ آپ کے پیارے سے دانتوں کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ بہت نسوار کھاتے ہیں۔"

"آپ کا نسوار کا دکان ہے کیا؟"

"نہیں۔ سوچا آپ کی خاطر کرنی ہے تو نسوار سے ہی کر دی جائے۔" وہ زور سے ہنسی۔

"مطلب آپ کھاتا ہے نسوار۔ اسی لیے تو رکھا ہوا ہے اپنے پاس۔"

"میں نہیں کھاتی۔" سمعیہ کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہوئی۔ یہ تو بہت بدتمیز تھا۔

"پھر رہنے دو۔ تم امارہ فکر نہ کرو۔"

"ویسے یہ وہ تصویر والا خان ہے کیا؟ تھوڑا مختلف لگ رہا ہے۔" تابندہ نے پوچھا۔

"آج اس کا ولیمہ ہوا ہے خیر سے۔ مختلف تو لگے گا۔" رخشندہ ہنسیں۔

"دھیان رکھنا خان صاحب! تمہارے ساتھ بھی ہمارے والا معاملہ نہ ہو۔ تم آرام سے بیٹھے ہو اپنے جھونپڑے میں اور تمہاری بیوی کی تصویر آجائے کسی اور خان کے سا......"

"او خبیث کا بچی!" ابراہیم چلایا۔ وہاں پر سب ہی خواتین ڈر گئیں حتیٰ کہ ثمن بھی جو اپنے کمرے سے نکل کر ہاتھ میں سفری بیگ تھامے ابھی وہاں پہنچی تھی۔

"تم امارا بیگم کا فکر نہ کرو۔ اپنا لمبا زبان کا فکر کرو۔ کیسا گندہ زبان والا عورت ہو تم۔ اللہ کی پناہ۔"

"او خان! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں کھڑے......" رخشندہ نے اسے ڈانٹنا چاہا۔

"ساسو ماں تم ایک اور غلط بات امارہ گھر والی کو بولو پھر امارہ ہمت دیکھو۔" وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

ثمن یوں کھڑی تھی جیسے اس کے گرد لوہے کی مضبوط دیواریں تن گئی ہوں' جنہوں نے اسے ہر چیز سے محفوظ کر دیا ہو۔ ان دیواروں کا نام ابراہیم خان تھا۔

"دیکھ چکے ہیں تمہارا گھر بھی اور گھر والی بھی۔ ثمن تم اپنا سامان سمیٹو اور اس جانور کو یہاں سے لے کر جاؤ اور آئندہ کبھی اس گھر کا رخ مت کرنا۔ اس گھر کے دروازے تم پر بند ہیں۔" رخشندہ سختی سے بولی۔

"کس نے کیے ہیں؟" وہ اطمینان سے پوچھنے لگی۔ اس کے اطمینان پر سب نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"یہ گھر میرے والد کا ہے۔ مجھے یہاں آنے سے آپ کیسے روک سکتی ہیں ماما؟"

"اوہ! ہاں واقعی۔ یہ تو تمہارے والد کا گھر ہے، مگر تم شاید بھول گئی ہو کہ یہ تمہارے والد ہی تھے جنہوں نے تمہارے ساتھ اپنا مرنا جینا ختم کر دیا تھا۔" تابندہ نے اسے یاد دلایا۔

"خالہ! میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ہمارے گھر کے معاملات میں مت بولا کریں اور جہاں تک بات ہے کہ پاپا نے میرے ساتھ مرنا جینا ختم کیا تھا، مگر میں نے ان کے ساتھ مرنا جینا ختم نہیں کیا۔ مجھے اس گھر میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں پھر آؤں گی۔ چلیے خان۔"

وہ مڑی تو ابراہیم بھی کینہ توز نظروں سے سب کو گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

"جس کا دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر اندر آجاتا ہے۔ فاروق سے کہتی ہوں۔ گیٹ پر گارڈ رکھے۔" رخشندہ نے غصے سے جان بوجھ کر زور سے کہا' تاکہ ثمن سن لے۔ مگر وہ جا چکی تھی۔

"کس قدر لمبی زبان ہو گئی ہے اس لڑکی کی۔ اس دو ٹکے کے کباڑیے کے بل پر۔ حاشر کے ساتھ شادی ہوتی تو یہ تو ہمیں نوچ کھاتی۔" تابندہ نے رخشندہ کو اور بھڑکایا۔

"آنے دو فاروق کو۔" رخشندہ بہت غصے میں تھی۔ فاروق گورنمنٹ جاب کرتے تھے۔ اعلا

عہدے دار تھے۔ ملازم رخشندہ کا موبائل لایا تھا۔ اس کا فون بج رہا تھا۔ ''لو آ گیا فاروق کا فون۔'' رخشندہ فخر و غرور سے بولی اور ہنسی۔

''ہیلو......''

''ہیلو! آپ مسز فاروق بات کر رہی ہیں۔'' یہ تو فاروق نہ تھے۔ کوئی اور تھا۔

''مسز فاروق میں فاروق صاحب کا کولیگ بات کر رہا ہوں۔ فاروق صاحب اسپتال میں ہیں۔ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ آپ لوگ جلدی آ جایئے۔'' اس آدمی نے اسپتال کا ایڈریس دیا تھا۔ رخشندہ گھبرا کر سب کو آوازیں دینے لگی۔ سب اسپتال کے لیے بھاگے تھے۔

☆☆☆

ثمن اور ابراہیم کی فلائٹ بدھ کو تھی۔ انہیں کراچی سے بیٹھنا تھا۔ اس لیے پیر کو انہیں ٹرین کے ذریعے کراچی جانا تھا۔

طاہر کو یہ موقع بہت پسند آیا۔ باپ اسپتال میں تھا تو اس نے تجوری کھولنے کی کوشش کی۔ پاس ورڈ اس کو رخشندہ نے بتایا تھا۔ طاہر کے غصے کی انتہا نہ رہی، جب بار بار کی کوشش کے باوجود وہ تجوری کھولنے میں ناکام رہا۔ وہ ماں کے پاس چلا آیا۔ فاروق کی طبیعت ابھی بھی بہت خراب تھی۔

رخشندہ کو معلوم ہوا تو وہ بے حد حیران ہوئی کہ فاروق نے تجوری کا کوڈ کس وقت بدلا؟'' اس کی حیرت غصے میں بدل گئی۔

''یہ ذرا ٹھیک ہو کر گھر چلیں، ان سے میں پوچھوں گی۔ ایسا ہوا تو ہوا کیسے؟'' وہ آگ بگولہ تھی۔

☆☆☆

ثمن ٹرین کے اس لمبے سفر سے اب تھک گئی تھی، مگر منزل قریب نہیں آ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کتنی بار سوئی، کتنی بار جاگی۔ تب شکر کیا جب منزل قریب آئی۔

وہ کراچی اسٹیشن پر اُترے تھے۔ نہایت عمدہ ہوٹل میں انہوں نے پہلے سے بکنگ کرا رکھی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ اپنے کمرے میں آ گئے۔ ثمن کو لگا جیسے اس نے بہت دن بعد سانس لیا ہو۔ آج منگل تھا۔ گیارہ دن بعد جیسے اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے دیکھا ابراہیم بھی صوفے پر بہت آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔

''خان......'' اس نے پکارا۔ ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ شاور لیں گے پہلے یا میں لے لوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم جاؤ پہلے۔'' اس نے ریموٹ اٹھا کر ایل ای ڈی آن کی۔ وہ کپڑے نکال کر شاور لینے چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی۔ تو وہ ایک اسپورٹس چینل لگائے بیٹھا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بال سلجھانے لگی۔ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بھیگے بالوں سے اس کی کمر چھپ چکی تھی۔ بال سلجھا کر وہ صوفے پر اس کے مقابل آ بیٹھی۔

''میں نے کافی آرڈر کی ہے۔ تم تو چائے پیو گی نا؟'' ''جی......''

''میں جانتا تھا۔ تمہارے لیے چائے آرڈر کی ہے۔''

''شکریہ......'' وہ مسکرائی۔

''ایک بات بتاؤ۔ تمہیں لمبے بال پسند ہیں؟''

''ہیں!!'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''پتا نہیں، میں نے کبھی نہیں سوچا کہ مجھے پسند ہیں کہ نہیں۔''

''پھر تمہارے بال لمبے کیوں ہیں۔''

''میری امی کو پسند تھے۔ زیادہ تو یاد نہیں مگر وہ بس چھوٹی چھوٹی باتیں۔ ان کا ہنسنا۔ وہ کہتی تھیں کہ پرنسس کے بال لمبے ہوتے ہیں۔ اس لیے میری پرنسس کے بال لمبے ہیں۔ تو میں نے کبھی بال نہیں کٹوائے۔ یعنی......کٹوائی تو ہوں۔ یہ جتنے ابھی ہیں اس سے لمبے نہیں ہونے دیتی۔'' وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''کوئی پکچر ہے ان کی تمہارے پاس؟ ہے تو دکھاؤ۔''

ثمن حیران ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔ ہونٹوں پر بے یقین مسکراہٹ۔ شاید اس سے یہ فرمائش پہلی بار کسی نے کی تھی۔

وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے بیگ کی طرف گئی۔ اس میں سے ایک چھوٹا البم نکال کر لائی۔

''ان تصویروں میں سے دو تصویریں میری امی کی ہیں۔ یہ دیکھیں۔'' ایک تصویر کسی تقریب کی تھی۔ دھندلی سی تصویر۔ ثمن کی والدہ بہت ساری خواتین کے درمیان موجود تھیں۔ دوسری تصویر میں وہ فاروق کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرون اور سبز ساڑھی پہنے۔ گود میں دو، تین سال کی بچی تھی۔

''یہ میری امی، یہ پاپا اور یہ میں......'' وہ بہت خوشی سے بتا رہی تھی۔

''یہ تو لگ رہا ہے ثمن ہی بیٹھی ہوئی ہے۔'' وہ ہنسا۔ ہنس کر اسے دیکھا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ تصویر دکھانے کے لیے وہ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بالوں کی خوشبو بہت مسحور کن تھی۔ ابراہیم کو عجیب سا احساس ہونے لگا ہے۔ اس نے سر جھٹکا۔ ''یار تم تو بالکل اپنی مدر پر ہو۔''

''ہاں! میں ان ہی جیسی پیاری ہوں مجھے پتا ہے۔'' وہ جیسے بے دھیانی میں بولی۔ پھر اسے دیکھ کر جھینپ گئی۔ وہ بھی ہنسا۔

''تمہیں پتا ہے انگریز خواتین جو بلائنڈ ہوں۔ وہ اپنے بال اکثر لمبے رکھتی ہیں۔ پیلے رنگ کے بال مجھے بالکل پسند نہیں۔ براؤن بال میں نے لمبے کبھی نہیں دیکھے۔ فرسٹ ٹائم تمہارے دیکھے ہیں۔ تم باندھ کر رکھتی ہو۔ کبھی کھولو نا۔'' یہ باقاعدہ فرمائش کی گئی تھی۔ وہ نظریں چرا گئی۔

''کبھی کبھی۔'' اس نے جیسے تسلی دی کہ روز، روز کی فرمائش نہیں ہے۔ ثمن نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''ایک اور بات۔'' اب ثمن نے اس کی طرف دیکھا ''ہمارے ہاں اس چیز کو سرمہ کہتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ تمہاری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ پھر لگا سکتی ہو؟'' ثمن کے تاثرات میں انکار نہ تھا۔ مگر وہ جواب میں خاموش رہی۔ کچھ لمحے گزرے۔ چائے اور کافی آ گئی۔

''یار! میں کافی ختم کر کے کچھ دیر کے لیے باہر جاؤں گا۔ کٹنگ کروانی ہے۔ شیو کروانی ہے۔ تم یہاں بور تو نہیں ہو جاؤ گی۔'' ثمن نے نفی میں سر ہلایا۔

''چلو میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔'' ابراہیم چلا گیا۔ ثمن کافی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں ابراہیم ابھی بیٹھا ہوا تھا

ابراہیم باہر گیا تھا۔ پہلے ایک جگہ سے کچھ کپڑے لیے۔ پھر ایک سیلون چلا گیا۔ کٹنگ کروائی۔ شیو بنوائی۔ لباس بدلا۔ ہوٹل کے بیسمنٹ ایریا میں اسنوکر گیم تھی۔ اس نے کچھ ٹائم وہاں گزارا۔ پھر وہ کمرے میں واپس آ گیا۔ ثمن اس کو دیکھ کر کچھ پل کے لیے ساکت رہ گئی۔ وہ واقعی ابراہیم تھا۔ ابراہیم اس کے سامنے تھا۔ وہ ابراہیم جس کی ہر حرکت اسے حیران کر جاتی تھی۔ جس نے کبھی اسے کسی مشکل میں ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ جو......

ابراہیم اسے دیکھ کر مبہوت ہوا تھا۔ بھورے لمبے بال ثمن کی پشت کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ آگے سے بندھے ہوئے تھے۔ کچھ لٹیں چہرے کے اردگرد تھیں۔ کاجل سے سجی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ اندر آ گیا، مگر نظریں اس پر ہی تھیں۔ وہ اس کی ان نظروں سے کچھ نروس اور کچھ گھبرا رہی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹنے لگی، تو ابراہیم نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ وہ مزید گھبرائی۔ اتنی خوب صورت آنکھوں میں گھبراہٹ دیکھ کر وہ جیسے ہوش میں آیا۔ اس کا بازو چھوڑ دیا۔

''کہیں باہر چلیں۔'' نرمی سے پوچھا۔

''اس وقت؟ یہ کھانے کا وقت ہے؟'' وہ اب اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

''باہر چل کر کھاتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں فرمائش تھی۔ وہ مان گئی۔ وہ لوگ باہر آ گئے۔ کچھ دیر واک کی۔ پھر ابراہیم کے کہنے پر ڈائننگ ہال میں

آ گئے۔ ابراہیم کی نظریں اب بھی اس پر ہی تھیں۔ وہ کچھ دیر اس کی نظریں برداشت کرتی رہی، پھر بولی۔

''آپ گھور کیوں رہے ہیں مجھے۔'' ابراہیم ہنس دیا۔

''عورت کی خوب صورتی اور فرماں برداری ایک مرد کو اس کا دیوانہ کر دیتی ہے اور تمہاری شخصیت میں یہ دونوں چیزیں بہت زیادہ ہیں۔ میں ابھی تک سنبھل نہیں سکا۔''

''پلیز آپ ایسی باتیں نہ کریں مجھ سے۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی، مگر لہجہ سادہ تھا۔

''میں کون سا خود کر رہا ہوں۔ میری زبان، میری نظر، میرا دل کچھ بھی اس وقت میرے تابع نہیں ہے۔'' اس کی آواز تک بوجھل تھی۔ ''بچپن سے ایک محاورہ سن رہا ہوں کہ زر، زن اور زمین ہی اس دنیا میں اصل فساد کی جڑ ہیں۔ مجھے زر اور زمین سمجھ میں آتی تھیں۔ زن کبھی سمجھ میں نہ آئی۔ عورتوں کے چہرے مختلف سہی۔ مگر ہوتی تو سب عورتیں ہی ہیں۔ ان کے لیے کوئی پاگل کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر آج تمہیں سامنے دیکھ کر لگ رہا ہے، تم تو کئی ملکوں میں جنگ کروا سکتی ہو۔ تمہارے لیے قبیلوں کے قبیلے لڑ مر جائیں۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے۔ مجھے واپس روم میں جانا ہے۔'' اسے ایک یہ ہی حل نظر آیا۔

''سوچ لو۔ انسانوں کے اس جم غفیر کا لحاظ کر رہا ہے میرا دل۔ تنہائی میں یہ دل بے قابو ہو گیا اور مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی تو تم مجھے الزام نہیں دینا۔''

''آپ کو آج کیا ہو گیا ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ وہ اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کو دیکھتا رہا۔ کھانا سرد ہو گیا۔

''اچھا سنو...... کیپ ٹاؤن جا کر تمہیں عائزہ کے گھر رہنا ہوگا۔'' انہوں نے کھانا شروع کیا۔

''عائزہ آپ کی بہن؟'' اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

''ہاں......''

''مگر...... ان کے گھر میں تو ان کے ہسبینڈ بھی ہوں گے۔'' وہ اپ سیٹ ہو گئی۔

''مجھے وہاں نہیں رہنا پلیز۔''

''یار! بلال بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔ وہاں عائزہ ہے، بچے ہیں۔''

''میں کمفرٹیبل نہیں رہوں گی پلیز۔'' وہ کھانا چھوڑ چکی تھی۔

''سوچ لو۔ میرا دل دن بہ دن باغی ہو رہا ہے۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''پلیز...... آپ مذاق مت کریں۔'' وہ نروٹھے انداز میں بولی۔

''تم میرے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ میں وہاں بچپن سے رہ رہا ہوں۔ نمازی پرہیزگار بندہ ہوں۔ میں ایک جوان اور اس قدر حسین لڑکی کو بغیر کسی توجیح کے کیسے رکھ سکتا ہوں؟ لوگوں کو کیا جواب دوں گا؟''

''مگر میں کسی غیر آدمی کے گھر نہیں رہوں گی۔ میں اس کنڈیشن میں نہیں ہوں کہ کسی پر بھروسا کر سکوں۔''

''مجھ پر کیسے کر رہی ہو؟'' ابراہیم نے اسے دیکھا۔ اس نے خفگی سے اسے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔

"ہو جائے گفتگو اگر تیری نگاہوں سے ابراہیم۔
تیری سادگی کی قسم ہم زبان سے کلام کرنا چھوڑ دیں گے۔"

''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے دھمکی دی۔ دراصل اب اسے ابراہیم سے شرم آنے لگی تھی۔

''اچھا ایک کام کرتے ہیں۔ ہم اپنی شادی ڈکلیئر کر دیتے ہیں، کیا خیال ہے؟ میں تو صرف یہ انتظار کر رہا تھا کہ تم دل سے اس رشتے کو قبول کر لو، پھر ہم اسے سب کے سامنے واضح کرتے۔ اس کے لیے کرنا صرف یہ ہے کہ فیس بک پر اپنی میرڈ ٹائپ ایک، دو تصاویر اپ لوڈ کرنی ہوں گی اور کیپ ٹاؤن جا کر شادی کا ریسپشن کر لیں گے۔ سمپل۔'' وہ بالکل خاموش سی ہو گئی۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔

''تمہارے پاس کوئی ریڈ لباس تو نہیں ہوگا،

دلہن جیسا۔" اس کی آواز پر وہ چونکی اور پھر سے نظر جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو لے لیتے ہیں۔ یہ تصویر آج ہی فیس بک پر اپ لوڈ ہونی چاہیے۔ اس سے میرے سرکل کے سارے لوگ میری شادی کے بارے میں جان جائیں گے۔" وہ خاموش رہی۔

کھانے کے بعد وہ لوگ شاپنگ کرنے گئے۔ دونوں نے لباس عروسی خریدا تھا۔ ابراہیم کسی پارلر کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں گائیڈ کیا۔ وہ لوگ پارلر گئے۔ ابراہیم اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

جب وہ اسے لینے آیا تو ثمن نے دیکھا وہ بھی تیار تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پارلر کے ساتھ اسٹوڈیو بھی تھا۔ انہوں نے وہاں کچھ تصاویر بنوائی تھیں۔ فوٹوگرافر ان کی ایک کے بعد ایک تصویر بنا تا رہا۔

ادائیگی کر کے وہ لوگ ہوٹل واپس آ گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ثمن آگے تھی۔ ابراہیم پیچھے۔ ابراہیم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عائزہ کو کال ملائی۔

"خور......"

"پوا خبرا دے تا کوں۔" (آپ کو ایک بات بتانی ہے۔)

"تم پشتو میں کچھ بتاتے ہو تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ابراہیم! سب ٹھیک ہے نا؟" اسے عائزہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ بھی پشتو میں بولی تھی۔ ثمن بیگ رکھ کر واش روم میں جانے لگی۔ اسے چینج کرنا تھا۔ ابراہیم نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑلی۔ وہ کچھ گھبرا کر ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ پشتو میں بات کررہا تھا۔ جس کا ظاہر ہے ایک لفظ بھی ثمن کے پلے نہ پڑ رہا تھا۔ مگر اس گفتگو کے دوران ابراہیم کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کسمسا کر اپنی کلائی چھڑوانے کی کوشش کی۔ وہ درحقیقت اس کی بولتی آنکھوں سے خائف بھی ہو رہی تھی اور نروس بھی۔ وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ وہ اس قدر خوبرو لگ رہا تھا کہ وہ اس کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنی کیفیت کو خود بھی سمجھ نہ پا رہی تھی۔

ابراہیم کی آواز بھاری تھی۔ اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔ جب وہ بولتا تو اکثر لاشعوری طور پر ثمن کو محسوس ہونے لگتا جیسے وہ کسی گہری جھیل میں بہہ رہی ہو۔ جب وہ ہنستا...... ثمن کا دل چاہتا کہ وہ اپنے کان بند کرلے۔ وہ اپنے ہوش وحواس نہیں کھونا چاہتی تھی۔ اب بھی وہ آف وائٹ شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی سفید رنگت دمک رہی تھی۔ شہد رنگ بال ——— تراشیدہ سیٹ تھے۔ خود پر جمی اس کی نیلی آنکھیں۔ ثمن کو لگا وہ ہپناٹائز ہو جائے گی۔

"اللہ پامان۔" (اللہ حافظ) وہ اسے دیکھ رہا تھا، جو مسلسل اپنی کلائی چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"درد ہونے لگا ہے ہاتھ میں اب تو۔" وہ نروٹھے انداز میں بولی۔

"مجھ سے دور جانے کی کوشش کرو گی تو درد تمہیں بھی ہوگا، یہ یاد رکھنا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"نہیں جا رہی۔ ہاتھ تو چھوڑ دیں، چوڑیاں چبھ رہی ہیں۔" وہ لجاجت سے بولی۔ ابراہیم نے اس کی کلائی چھوڑ کر اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔

"میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ مگر تم میری دلہن ہو۔ یار! کچھ تو احساس کرو۔" وہ اس کے مقابل کھڑا تھا۔ ثمن اس کی طرف دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔

"میں تھک گئی ہوں۔ چینج کرنا چاہتی ہوں۔" وہ سر جھکائے ہی بولی۔

ابراہیم نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے پر اپنے ساتھ بیٹھا لیا۔

"خان! مجھے سچ میں نیند آرہی ہے۔"

"تمہیں پتا نہیں کیسے نیند آ جاتی ہے۔" اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"آپ مجھے حیران کر دیتے ہیں خان۔ آپ ساؤتھ افریقہ کے رہائشی ہیں یا پیچو کی ملیاں کے؟"

ابراہیم نے بلند قہقہہ لگایا۔ ثمن کو لگا بھاری مردانہ قہقہے سے در و دیوار جھوم اٹھے ہوں۔

"کہاں کا رہنے والا ہوں۔ دوبارہ بولنا۔"

"پیچو کی ملیاں کے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے۔ بڑا مزے دار نام ہے۔"

"یہ ایک گاؤں کا نام ہے۔"

"تو ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔" وہ پھر ہنسا۔

"میں سمجھ نہیں پائی...... آپ...... ساؤتھ افریقہ میں تو بہت خوب صورت اور ماڈرن لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ جو......" اب آگے کیا بولتی؟

"تم بے پردگی اور خوب صورتی میں فرق کرنا سیکھو۔ ہاں مجھے بھی لگتا ہے کبھی کبھی کہ یہ لڑکی ثمن کیا سوچے گی۔ ابراہیم کی حرکتیں ایسی ہیں جیسے زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی دیکھی ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ تم دوسری عورت ہو جس کی خوب صورتی نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔ پہلی میری امی تھیں۔ وہ بہت خوب صورت تھیں۔ تم سے بھی زیادہ۔"

وہ مسکرا دی۔ شادی کے بعد وہ شاید پہلی بار ایسے مسکرائی تھی۔ کچھ دیر ابراہیم اسے دیکھتا رہا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ روٹھی ہو کر بولی۔

ابراہیم نے پھر سے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

وہ نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھی۔ ابراہیم نماز سے فارغ ہو کر ـــــ کمرے میں آیا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر چھت کو دیکھا۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آگے پیچھے دیکھا اور...... سن سی ہو گئی۔ وہ ایک دفعہ بھی ابراہیم کی طرف نہ دیکھ پائی۔ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ اور دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا لیا۔ لو دیتی نیلی آنکھیں اس پر مرکوز کیے، ہاتھ سینے پر باندھے، دیوار سے ٹیک لگائے وہ کھڑا تھا۔ پتا نہیں کب سے...... چہرا بھی کب تک چھپائے بیٹھی رہتی۔ آخر گھڑی کو دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔

"میں نے سات بجے کا الارم لگایا تھا۔ پتا نہیں بجا کیوں نہیں۔" ابراہیم نے لمبا سانس لیا اور سیدھا کھڑا ہوا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔

"آپ کب سے کھڑے ہیں اس طرح؟"

اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور پوچھا۔

"یاد نہیں۔" وہ یوں بولا۔ جیسے نشے میں ہو۔

اس نے ناسمجھی سے ابراہیم کو دیکھا۔ "یاد کیوں نہیں؟"

"بس اتنا یاد ہے کہ مجھے عشق ہوا تھا۔

پھر کیا ہوا، اس کی مجھے خبر نہیں۔" ثمن کو اس کے انداز پر پریشانی ہوئی۔

"آپ نے نشہ کر رکھا ہے خان؟" وہ بے یقین تھی۔

"تیرا چہرا دیکھنے والا، سنا ہے۔

کوئی اور نشہ نہیں کرتے۔"

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ابراہیم چونک کر ہوش میں آیا تھا۔

"جو بھی باہر آیا ہے۔ انعام کا حق دار ہے۔" وہ ہنسا۔

باہر ویٹر تھا۔ ان کے لیے ناشتا لایا تھا اور حقیقتاً بھاری ٹپ لے کر گیا تھا۔ جب تک ثمن فریش ہو کر ناشتا کرنے آتی۔ وہ فون پر اپنے آفس اور دیگر معاملات دیکھنے لگا۔ یہ سب کام بھی بہت ضروری تھے۔ پھر آخر میں اس نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا۔ کل رات اس نے اپنی اور ثمن کی شادی کی تصاویر اپ لوڈ کی تھیں۔ وہ فرینڈز اور خاص طور پر عائزہ اور بلال کا رسپانس دیکھنا چاہتا تھا۔

کل رات اس نے عائزہ کو فون کر کے یہ ہی بات بتائی تھی۔ عائزہ درحقیقت بری طرح پریشان

اور دکھی ہوئی تھی۔ پریشان اس لیے کہ آخر اتنی ایمرجنسی کس بات کی تھی کہ نکاح کرنا پڑ گیا اور دکھی اس بات پر کہ کیا بوشان والا تجربہ ایک بار پھر دہرایا جائے گا۔ پتا نہیں یہ لڑکی کیسی تھی کہ اتنی ایمرجنسی بن گئی تھی۔

بہن ہونے کے ناتے بہت ساری سوچوں نے اس کے دل و دماغ کو گھیر لیا تھا۔

ان چار تصاویر پر چھ سو بارہ کمنٹس آئے تھے۔ اس کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ ویسے جاننے والے بھی کافی تھے۔ وہ نام دیکھتا گیا۔ کمنٹس سب کے نہیں پڑھ رہا تھا۔ سوائے ان کے جن کے کمنٹس سے واقعی دلچسپی تھا۔ جن کی رائے وہ جاننا چاہتا تھا۔ بلال نے نئی زندگی کی مبارک باد دی تھی۔ عائزہ کا کہنا تھا کہ وہ ان دونوں کا انتظار کر رہی ہے، وہ جلد آئیں۔ اس دوران ثمن بھی وہاں آ گئی تھی۔ اور کئی کمنٹس کے بعد اس نے دیکھا۔ بوشان کا کمنٹ بھی آیا ہوا تھا۔

''نان سینس۔'' اس نے واٹس ایپ سے اسے بلاک کیا تھا۔ فیس بک کی طرف دھیان ہی نہ گیا تھا۔ کیوں کہ زیادہ فیس بک وہ استعمال ہی نہیں کرتا تھا۔

''بوشان شا...... تمہارے پچھتاوے کے دن شروع ہونے والے ہیں بے بی۔'' بوشان کو اپنے حسن پر بے حد غرور تھا۔ ابراہیم نے سامنے بیٹھی ثمن کو دیکھا۔ وہ چائے پی رہی تھی۔

کاجل سے سنوری بڑی بڑی آنکھوں میں لاپروائی تھی۔ کل رات جب وہ عروسی لباس خریدنے گئے تھے۔ تب انہوں نے کچھ اور لباس بھی لیے تھے۔ ان ہی میں سے ایک لباس وہ اس وقت پہنے ہوئی تھی۔ بڑے شوخ سے رنگ تھے لباس کے۔ سر پر دوپٹا تھا۔

ثمن، بوشان کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے علم ہونا ضروری تھا۔ ساؤتھ افریقہ میں جا کر کوئی بتاتا تو وہ ہرٹ ہوتی۔ ابراہیم خود اسے یہ بات بتانا چاہتا تھا۔

''ہماری فلائٹ کب کی ہے خان؟'' اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

''تھوڑی دیر میں نکلیں گے' ان شاء اللہ۔'' ابراہیم اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں ایک اہم بات بتانا ہے۔''

''معلوم ہو گیا۔ میرے ساتھ وہ کس نے کیا تھا؟'' اس نے ابراہیم سے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں سوئٹ ہارٹ۔ اس پر کام چل رہا ہے۔ آدھی چیزیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ کچھ ابھی سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں تمہیں کچھ اور بتانا چاہتا ہوں۔'' ثمن چپ رہی۔

''دبئی میں جب میں تم سے ملا تھا۔ اس سے تقریباً دو ہفتے پہلے میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی۔ یعنی تم میری دوسری بیوی ہو۔''

''واٹ؟'' ثمن کو حقیقتاً دکھ ہوا۔

''جب میں تم سے ملا۔ تب وہ میری بیوی نہیں تھی۔ میں طلاق شدہ تھا۔''

''آپ مرد بہت عجیب ہوتے ہیں۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ''آپ کو ایک لڑکی سے محبت ہوتی ہے۔ شادی کرتے ہیں۔ علیحدہ ہوتے ہی نئی محبت ہو جاتی ہے۔ اپنی بیوی کو طلاق دینے کے دو ہفتے بعد ہی آپ کو مجھ سے محبت کیسے ہو گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ جو محبت اس سے تھی، وہ کہاں گئی۔ رشتے کے خاتمے کے ساتھ اس سے محبت بھی ختم ہو گئی؟''

ابراہیم ہنسا۔ ''تم ایک بات بتاؤ میری جان۔ تمہیں غصہ کس بات پر آ رہا ہے۔ میری پہلی بیوی کا سن کر؟ یا میری طلاق کا سن کر؟''

وہ غصے سے بیٹھی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ذات کی پوری عمارت دھڑام سے گر گئی ہو۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ اب وہ کیا کرے گی؟ کیا ابراہیم کی محبت سچ نہ تھی؟ کیا جیسے اس نے پہلی بیوی کو چھوڑا، ایسے ہی وہ اسے بھی چھوڑ سکتا تھا؟ اس نے سرخ آنکھوں سے ابراہیم کو دیکھا۔

''ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری محبت دو ہفتے بعد ہی ہوگئی آپ کو؟ اتنی عارضی محبت تھی آپ کی؟ مگر مجھے یہ بتائیں، اس سے محبت عارضی تھی یا مجھ سے محبت عارضی ہے؟''

ابراہیم نے حقیقتاً جان دار قہقہہ لگایا تھا۔''میری جان کی خفگی کی اصل وجہ یہ ہے۔'' پھر ہنسا اور بمشکل ہنسی روک کر بولا۔''سنو! جیلس ہو رہی ہو؟''

ثمن اٹھ کر جانے لگی۔ ابراہیم نے فوراً ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''چھوڑیں مجھے۔''

''سچ یہ ہے کہ تم محبت کرتی ہو مجھ سے۔ بس چھپاتی ہو۔ ہے نا۔''

''خان! ہاتھ چھوڑیں میرا۔'' وہ غصے میں تھی۔

''پوری بات تو سن لو۔ لمبی بات ہے، اس لیے بیٹھ جاؤ۔'' ابراہیم نے اسے زبردستی بٹھایا۔

''اس کا نام بوشان شا ہے۔ ہماری ملاقات شاپنگ کے دوران ہوئی......'' وہ بولتا گیا۔ وہ پھولے منہ کے ساتھ سنتی رہی۔ جیسے جیسے بات کی وضاحت ہوتی گئی، اس کے اعصاب نارمل ہونے لگے۔

''اس نے بہت کوشش کی۔ جتنے جاننے والے تھے سب سے سفارش کروائی کہ ہم میں علیحدگی نہ ہو، مگر میں جانتا تھا مجھ سے شادی کرنے کی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ مجھے لکی چارم سمجھتی تھی۔ مگر میں سمجھ نہیں سکا کہ میں اسے کیا سمجھتا تھا۔ مجھے عورتوں کا چھوٹا لباس پہننا پسند نہ تھا۔ مگر میں نے کبھی اسے اس بات پر منع نہیں کیا۔ وہ شامیں باہر گزارتی۔ لیٹ نائٹ آتی۔ مجھے بھی پروا نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی ہم اکٹھے آپا کے گھر جاتے تو وہ بھی محسوس کرتیں۔ پوچھ لیتیں کہ جب تم انٹرسٹڈ نہیں تھے تو شادی ہی کیوں کی؟ تب میں کہتا کہ کسی سے تو کرنی تھی۔ محبت لفظ کا مطلب ہی نہ پتا تھا۔ یوں جیسے...... ایک مشین جیسی زندگی تھی۔ جس کی ساری منازل طے ہو رہی تھیں۔ دل اور دماغ بند ہو چکا تھا۔ کھلا تب جب...... اپنی اولاد کے جانے کا سنا۔ جو ابھی دنیا میں آئی بھی نہیں تھی۔'' ابراہیم نے تکلیف سے آنکھیں لمحہ بھر کو موند لیں۔ ثمن نے دکھ سے اسے دیکھا۔

''اس سے علیحدگی کے فوراً بعد دبئی آنا پڑا۔ تب تمہیں دیکھا۔ تب سمجھ میں آیا اچھا...... زندگی بھی کسی چیز کو کہتے ہیں۔ ایک لفظ ہے محبت...... جس کی تشریح ہے ایک حسین طوفان۔ اپنی محبت کے ساتھ شادی کی جاتی ہے اور...... بس یہ ہی کہانی ہے میری پہلی زندگی کی۔ مجھے اس سے بھی محبت نہ تھی۔ جو ختم ہوتی یا شروع ہوتی۔ جو کچھ بھی ہے ثمن...... تم سے ہے۔ تم سے شروع، تم پہ ختم، سب کچھ صرف تم ہو۔''

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور سر پر ہاتھ ماتھے کی طرف سے رکھا ہوا تھا۔ کس قدر شرمندہ تھی۔ آخر ہاتھ ہٹایا اور بولی۔

''کاٹ کاٹ کر بات سنانے کی کیا ضرورت تھی؟ پوری ایک ساتھ سنا دیتے۔ میں ہائپر نہ ہوتی۔''

وہ ہنسا۔''ایسے بات سنانے کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ تمہاری محبت مجھ پر واضح ہوگئی اور یہ بھی کہ...... مانتی ہو میری محبت کو اور تمہیں بھی کچھ اندازہ ہوا ہوگا اپنی فیلنگز کا؟ تو بتاؤ سچ میں محبت کرتی ہو مجھ سے؟''

''میں کچھ نہیں بتا رہی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیکھو! اب تم پھر مجھے مجبور کر رہی ہو کہ تمہیں تھام کر بٹھاؤں۔'' ابراہیم نے شرارت سے کہا۔ وہ پھر بھی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

ایئرپورٹ پر صرف عائزہ آئی تھی انہیں لینے۔ وہ درحقیقت عائزہ سے ڈر رہی تھی۔ کوئی بہن پسند نہیں کرتی کہ اس کا بھائی ایک لڑکی کو ساتھ لائے اور کہے کہ یہ میری بیوی ہے۔ ثمن کو اندازہ تھا۔ مگر اس کے خوف کے برعکس عائزہ کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ لوگ عائزہ کے گھر گئے۔

شام تک بچے اور بلال بھی آگئے۔ سب نے خوشی خوشی اس کا استقبال کیا۔ ساتھ کھانا کھایا۔

ابراہیم، بہن کے ساتھ رہا اور اسے بتاتا رہا کہ پوری بات کیا ہوئی تھی۔

''ہاں! میں سوچ رہی تھی کہ اسے کہیں دیکھا تو ہے میں نے۔ اچھا......اب یاد آیا۔ دبئی میں دیکھا تھا۔''

''آپ کو یاد نہیں آیا۔ میں نے آپ کو یاد کروایا ہے۔'' ابراہیم کے ہر انداز سے خوشی واضح تھی۔

''تم مجھے ایک بات بتاؤ ابراہیم! خوش ہو؟''

عائزہ نے جانچا تھا اسے۔

''آپ کو کیا لگتا ہے۔'' اس نے مسکراہٹ کے ساتھ بہن کو دیکھا۔

''تم نے پھر مجھے دبئی میں کیوں نہیں بتایا تھا کہ پسند کرتے ہو اسے؟'' عائزہ نے دور لاؤنج میں بچوں کے ساتھ بیٹھی ثمن کو دیکھا۔

''پہلے اس سے بات کی تھی نا۔ اس نے بتایا یہ انگیجڈ ہے۔ ابھی تو ساری بات بتائی ہے آپ کو۔''

''اچھا چلو، دعا کرتی ہوں کہ خوش رہو۔'' وہ مطمئن ہوئی تھی۔

''اپنی دعا قبول ہوتی ہوئی لگ نہیں رہی آپ کو؟'' وہ ہنسا۔ عائزہ کو لگا کہ اس نے ابراہیم کو اس سے پہلے اتنا خوش کبھی نہ دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ لوگ اپنے گھر آ گئے تھے۔ رات ہونے کے باعث وہ علاقہ نہ دیکھ پائی تھی۔ گھر کے اندر آ کر لائٹ آن کی۔ بے حد خوب صورت گھر تھا۔ اتنا آرٹسٹک، پھولوں سے، پودوں سے سجا سنورا۔ ابراہیم اسے گھر دکھانے لگا۔

''یہ کمرہ ابھی میرا ہے۔ کچھ دن بعد ہمارا ہوگا۔'' وہ عجیب احساسات کے زیر اثر تھی۔ اس نے دوسرا کمرہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اسے زیادہ نیند نہیں آ رہی تھی۔ مگر بستر میں آتے ہی وہ یوں سو گئی جیسے صدیوں سے نہ سوئی ہو۔ صبح فجر کے وقت جاگی۔ نماز پڑھ کر کمرے سے باہر آئی تو دروازے کا ہینڈل گھومتا محسوس ہوا۔ وہ ڈر گئی۔ دروازہ کھلا، وہ ابراہیم تھا۔

''آپ اس وقت کہاں گئے تھے؟''

''نماز پڑھنے۔'' اس نے اندر آ کر دروازہ لاک کیا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا اور ثمن اس کی اس بات سے بہت متاثر ہوتی تھی۔ اس نے درحقیقت پانچ وقت کی نماز ابراہیم کو دیکھ کر شروع کی تھی۔ پہلے وہ نہیں پڑھتی تھی۔

''میں ناشتا بنا دیتی ہوں۔''

''اتنی صبح؟ آؤ جاگنگ کے لیے چلتے ہیں۔''

''نہیں، مجھے نہیں جانا۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوا۔

''ایسے ہی۔ کل جاؤں گی۔'' ثمن کو اس کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ مگر کہتی کیا؟

''مجھے جم بھی جانا ہے۔ بہت دن ہو گئے ہیں، نہیں گیا۔ میں لیٹ ہو جاؤں گا۔ تمہیں بتانے آیا تھا، ورنہ نماز سے واپسی پہ جم چلا جاتا ہوں۔''

ثمن نے سر ہلایا۔ اس کی واپسی تک وہ ناشتا بنا چکی تھی۔ فریش ہو کر وہ آیا۔ دونوں نے ناشتا شروع کیا۔

''تم نے کیا سوچا ہے؟ کیا مصروفیت سوچی ہے اپنے لیے۔ تمہارا ماسٹرز مکمل نہیں ہو پایا تھا۔ یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے لو۔''

''مجھے ابھی فی الحال کچھ نہیں کرنا۔''

''کیوں؟ گھر پر رہ کر بور نہیں ہو جاؤ گی۔''

''مجھے پہلے یہ جاننا ہے کہ اس معاملے کا کیا ہوا۔ ان تصاویر کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ جب تک میں اپنے مجرم کو اپنے سامنے دیکھ نہیں لیتی۔ میرا دماغ کسی بھی چیز کے لیے نہیں سوچ سکتا۔'' وہ دوٹوک بولی۔

''میری جان! ابھی دس دن بھی نہیں گزرے۔ کام ہو رہا ہے، تم فکر مت کرو۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے اور لگیں گے۔ مجرم ضرور سامنے آئے گا۔ پھر اسے سزا تم خود دینا۔ یا قانون کے حوالے کرنا۔ یہ تم پر منحصر ہے۔'' وہ خاموش رہی۔ وہ آفس کے لیے

نکلنے لگا۔ ''تم اکیلی ڈرو گی تو نہیں؟''

''نہیں۔''

''اگر کہو تو رک جاؤں؟''

''نہیں آپ جائیں۔'' وہ اس سے جب بات کرتی تو لہجہ بے لچک ہوتا۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ بے زار ہو گئی ہو مجھ سے۔'' ابراہیم نے حقیقتاً اسے بلیک میل کیا تھا اور وہ جذباتی طور سے بلیک میل ہو بھی گئی۔

''نہیں خان بے زار نہیں ہوں۔'' بے لچک لہجے کا نقاب اترا تھا۔

''اصل میں...... مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے آپ کی باتوں سے۔ وہ......'' وہ حقیقتاً گھبرا گئی تھی۔ کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گیا۔ ابراہیم باقاعدہ ہنسا تھا۔ عورت ذات کس قدر معصوم ہوتی ہے۔

''تم نے واقعی پرسوں کے بعد کاجل نہیں لگایا۔'' اس نے ہنسی روکی۔

''اب نہیں لگاؤں گی۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

ابراہیم پھر ہنسا۔

''خان!'' وہ خفگی سے بولی۔

''اوکے...... اوکے۔'' وہ ہنسا۔ ''یار خواہ مخواہ خفا ہوئی ہو۔ میں نے کیا، کیا ہے۔ مجھ جیسا شریف انسان تمہیں دنیا کے کسی براعظم میں نہیں ملتا۔ چلتا ہوں۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے۔ ثمن نے نظر بھر کر اس کی پشت کو دیکھا۔ وہ یوں اس کے لاڈ اٹھاتا تھا، جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔

جب ابراہیم اس کی ہر بات مانتا تب اسے حاشر کی من مانی کرنے والی عادت یاد آتی۔ وہ ہر وقت ایک ہی بات کی رٹ لگاتا 'اسے بہت پریشرائز کرتا تھا۔ ذہنی طور پر اذیت دیتا تھا اور ابراہیم...... وہ اس کے نکاح میں تھی۔ اس کی بیوی تھی۔ اس کے ساتھ رہتی تھی...... مگر...... وہ جیسے اسے دیکھتا بھی اس کی اجازت سے تھا۔ اس کے زخموں پر پھاہے رکھتا تو اس شرارتی انداز میں کہ اسے علم بھی نہ ہو پاتا اور زخم مندمل بھی ہو جاتا۔ وہ کون تھا؟

ایک لمحے میں وہ سوچ کے کس کس جہان سے ہو آئی تھی۔ ابراہیم نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا کہ گھنٹی بجی۔ ایک انگریز تھا دروازے پر۔ ہاتھ میں سرخ گلابوں کا بکے اور ایک خط لیے۔ ثمن نے غور کیا تو اندازہ ہوا۔ اس نے ڈاکیے کی وردی پہن رکھی تھی۔ ابراہیم نے دستخط کر کے دونوں چیزیں لے لیں۔ پھول ایک طرف رکھے۔ خط کا لفافہ کھولا۔ مختصر تحریر تھی۔

''اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ آخری سانس تک تمہاری، تمہاری اور صرف تمہاری......

''بوشان شا ابراہیم خان۔''

ابراہیم نے خط ہاتھوں میں مسلا۔

''کیا ہے یہ؟'' اس نے پوچھا۔ ابراہیم نے خط کھول کر سیدھا کیا اور اسے دکھایا۔ ثمن کی آنکھیں پھیلیں۔

''نان سینس۔ اس عورت کی ہمت کیسے ہوئی؟'' ثمن بے یقین انداز میں بولی۔

اس کے غصے پر ابراہیم کو بہت مزا آیا۔ اس نے بمشکل ہنسی روکی۔

''یار تم جیلس تو نہیں ہو رہی نا؟''

''ابراہیم...... آپ کو غصہ نہیں آ رہا؟'' اس نے ابراہیم کو غصے سے دیکھا۔

''غصہ الگ چیز ہے، جیلسی اور...... تمہیں جیلسی تو نہیں ہو رہی نا؟''

''جو مرضی سمجھیں۔ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے۔''

''نہیں دیر ہو تو نہیں رہی۔ تم زبردستی بھیج رہی ہو تو اور بات ہے۔'' اس نے پھر سے دروازہ کھولا۔

''اس کچرے کو بھی ساتھ لے کر جائیں۔'' اس کی سانس الجھنے لگی تھی۔

''سوئپر گھر پر آتا ہے۔ باہر والے ڈبے میں

ڈال دو۔ لے جائے گا۔ میں کہاں لے کر پھرتا رہوں اسے؟''

''آپ کی سابقہ بیوی کا ہے یہ۔ آپ ڈالیں باہر کے ڈبے میں۔''

ابراہیم نے دونوں چیزیں اٹھائیں۔ اس کی طرف دیکھا۔ ''لڑاکا بلی۔'' کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ فوراً کھڑکی کی طرف آئی تاکہ دیکھ سکے۔ کیا واقعی ابراہیم نے وہ پھینک دیے۔ ابراہیم نے باہر والے ڈبے میں وہ پھول اور کاغذ پھینکا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ثمن کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔ لمبا سانس لیا۔ غصہ کچھ کم ہو چکا تھا۔ پھر ابراہیم کے الفاظ پر دھیان دیا اور حیران ہوئی۔

''میں لڑاکا بلی؟'' اسے احساس ہوا۔ اس نے واقعی اس سے لڑائی کی تھی۔

☆☆☆

آج ابراہیم اور ثمن کی شادی کے سلسلے میں ایک تقریب رکھی گئی تھی۔ ساؤتھ افریقہ کے لباس کے حساب سے وہ سفید برائیڈل گاؤن میں ملبوس تھی۔ ابراہیم بلیو ڈنر سوٹ میں تھا۔

ابراہیم، عائزہ اور بلال کا تمام حلقہ احباب' کاروباری دوست سب ہی مدعو تھے۔ تقریب بہترین ہوئی تھی۔ ابراہیم کا کمرہ عائزہ اور بلال نے انٹیریر ڈیکوریٹر سے بہت بہترین اور خوب صورتی سے سجوایا تھا۔ اپنی مشرقی روایات کے پیش نظر جیسے انہوں نے ثمن کے لباس میں پردے کا پورا خیال رکھا تھا۔ اس طرح بلال کے کمرے میں پھولوں کی باقاعدہ سیج سجائی گئی۔ کمرہ پھولوں سے بھر گیا تھا۔

مہمان چلے گئے تھے۔ عائزہ اور بلال اور بچے رہ گئے تھے۔ انہیں اگلے دن جانا تھا۔ عائزہ کی موجودگی کے باعث ثمن کو ابراہیم کے کمرے میں ہی آنا پڑا۔ ابراہیم اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ چینج کرنے واش روم جانے لگی تو ابراہیم نے بازو سے پکڑ کر اسے روک لیا۔ ثمن کا دماغ جیسے اب حاضر ہوا تھا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ کچھ بھی تھا آخر ابراہیم اس کا شوہر تھا۔ دل میں لاکھ دکھ سہی' اس کا رشتہ بھی تھا ابراہیم سے۔ جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق بنا تھا۔ اب اس حوالے سے اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی تھیں۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔

☆☆☆

وہ اگلے دن اس کا رویہ دیکھ کر قدرے حیران سی تھی۔ عائزہ، بلال اور بچوں کی موجودگی میں وہ چہکتا رہا اور ان کے جاتے ہی وہ جیسے کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے ثمن سے باقاعدہ معذرت کی تھی۔ وہ کل رات ہونے والے واقع پر شرمندہ تھا۔

''یار! میں تمہاری خوشی کے انتظار میں تھا کہ تم دل سے مجھ تسلیم کرو۔ مگر......'' وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ آخر کس دنیا کا باسی تھا۔ وہ آفس جا رہا تھا تو اس نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ ایک گفٹ پیک پڑا تھا۔

''واپس آؤں تو پھر گفٹس کھولیں گے۔ ویسے ہمیں ایک ہی گفٹ ملا ہے؟''

''باقی دوسرے کمرے میں ہیں...... یہ......''

اس نے پیکٹ اٹھایا۔ سرخ شیٹ سے پیک ہوا وہ ڈبہ...... اوپر بوشان ابراہیم خان لکھا تھا۔ اس نے جتاتے انداز میں اسے دیکھا۔ ابراہیم نے جو اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اب گہری نظر سے اسے دیکھا اور ہنس دیا۔ ''تم ان چیزوں کو سیریسلی لیتی ہو؟''

''وہ آپ کا نام کیوں استعمال کرتی ہے اب بھی؟'' وہ تیکھے انداز میں بولی۔

''وہ تو تب میرا نام استعمال نہیں کرتی تھی جب میری بیوی تھی۔ اب وہ صرف تنگ کرنے کے لیے کرتی ہے ایسا اور میری جان تنگ ہو بھی جاتی ہے۔ کھولو ذرا۔ میں گارنٹی سے کہتا ہوں، کوئی ایسی چیز ہو گی جس سے تمہیں غصہ آ سکے۔''

ثمن نے پھاڑنے والے انداز میں کھولا۔ اندر سے سفید عروسی لباس نکلا تھا۔ جس پر رسید تھی۔

ابراہیم نے وہ رسید اٹھائی۔ یہ لباس آج سے تقریباً پونے دو سال پہلے ابراہیم کے نام سے خریدا گیا تھا۔ یہ وہ لباس تھا جو اپنی شادی کے دن بوشان نے پہنا تھا۔ رسید کے پیچھے لکھا تھا۔ ''میرا فون نمبر ابھی بھی وہی ہے ابراہام۔''

''کتنی تھرڈ کلاس حرکتیں کرتی ہے یہ عورت۔'' ثمن کو غصہ آیا۔

''اس کے بوائے فرینڈ کو پتا لگے تب مزا آئے۔'' وہ ہنسا۔ ثمن بھی مسکرائی۔

☆☆☆

یہ دو دن بعد کی بات تھی۔ صبح آفس جانے سے پہلے ابراہیم اسے بتا کر گیا تھا کہ وہ اس کے آنے تک تیار رہے۔ انہیں کہیں جانا ہے اور اس کے لیے لباس وہ خود منتخب کر کے گیا تھا۔ وہ واپس آیا تو وہ تیار تھی۔ وہ لنچ آفس میں کرتا تھا۔ گھر آ کر چائے پیتا تھا۔ اس نے چائے ثمن کے ساتھ پی۔ ثمن نے کہا کہ ریسٹ کر لیں، تو پھر چلیں گے۔ مگر وہ بہت پر جوش تھا، نہیں مانا۔ اس کا ہاتھ تھام کر گاڑی تک لایا۔ وہ بے تاثر تھی۔ ثمن اس کی محبت کو محسوس کرتی تھی، مگر نہ جانے...... خوش کیوں نہ ہوتی تھی۔ پتا نہیں...... حالانکہ جانتی تھی کہ وہ مخلص ہے، پھر کیوں......؟

اچھا خاصا فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ ''ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''سرپرائز ہے۔'' ابراہیم نے گاڑی روکی۔ اس کی طرف آ کر اس کی جانب کا دروازہ کھولا۔

''ثمن، میں تمہاری آنکھیں بند کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے جیب سے ______ یہ ایک کالے رنگ کا کپڑا نکالا۔ ثمن نے کچھ نہیں کہا۔ ابراہیم نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کالے رنگ کا چشمہ پہنا دیا، تاکہ کوئی محسوس نہ کر سکے اور اسے پھر سے گاڑی میں بٹھایا۔

کافی دیر گاڑی چلنے کے بعد رکی۔ ابراہیم گاڑی سے اُتر کر اس کی طرف آیا۔ ہاتھ پکڑ کر اسے باہر آنے میں مدد دی۔

''اب آنکھیں کھولو۔'' اس نے ابراہیم کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر مندی مندی آنکھوں سے آگے پیچھے دیکھا۔ پھر...... حیران رہ گئی۔

وہ ایک جنگل تھا۔ گھنا جنگل، سبز درختوں اور پھولوں سے بھرا ہوا۔

''اوہ...... یا اللہ اتنے پھول۔'' وہ خوشی سے چیخیں مارتی کبھی ادھر بھاگتی، کبھی ادھر۔ پھر بے یقینی سے ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔

ابراہیم اسے کہاں لے آیا تھا اتنے پھولوں میں؟ بے یقینی اور خوشی سے پھولوں کو دیکھتے ہوئے اس نے ابراہیم کو دیکھا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ وہ پٹی نما کپڑا تھا۔ جس سے ثمن کی آنکھیں بند کی تھیں اس نے۔

وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''آپ کو کیسے پتا لگا کہ مجھے جنگل بہت پسند ہیں۔''

'اچھا تمہیں بھی پسند ہیں؟ ایکچو لی مجھے بہت پسند ہیں، تو سوچا چلتے ہیں'۔ ثمن نے اس کی طرف دیکھا۔

''بتائیں نا۔''

''کیا بتاؤں۔'' وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے جنگل پسند ہیں؟''

''یار نہیں پتا تھا۔ مجھے اب تم بتا رہی ہو۔''

''خان!'' اب کی بار وہ خفگی سے بولی۔

اب ابراہیم نے ادھر ادھر دیکھنا چھوڑ کر براہ راست اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے۔ وہ کچھ دیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

''اور یہ...... آپ کے پاس کیسے؟ یہ تو میرے ہاتھ میں تھی۔'' اس نے پٹی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہر چیز پر نظر ہے۔ ہر چیز کا جواب چاہیے۔ میری جان کوئی جاسوس ہے کیا؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''بتائیں نا۔''

"کیا بتاؤں؟" اس نے بہت پیار سے اس سے پوچھا۔

"آپ یہ بتائیں کہ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"اف۔" اس نے زچ ہونے کی اداکاری کی۔

"بتائیں نا۔ ابراہیم میں کب سے پوچھ رہی ہوں۔" اس نے آنسوؤں سے بھرے لہجے میں دھونس جمائی۔

"ایک دن ...... ایل ای ڈی دیکھتے ہوئے تمہارا انٹرسٹ دیکھا تھا۔ پھر ایک دن باتوں کے دوران اندازہ ہوا۔" آخر اس نے بتا دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"یار! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں تمہیں اس لیے نہیں لایا تھا۔ اگر تم کسی بات سے ہرٹ ہو گئی ہو تو بتاؤ۔ واپس چلتے ہیں۔" ابراہیم کو لگا تھا کہ اسے یہاں آنے سے شاید ماضی کی کوئی بات یاد آ گئی ہے۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کی طرف لے آیا۔ وہ روتے ہوئے ساتھ چلتی رہی اسے بٹھا کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"اب بولو۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟" اس نے ثمن کی طرف رخ موڑا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ بس یقین نہیں آیا۔ کوئی میری خوشی کے لیے بھی اتنا کچھ کر سکتا ہے؟"

"کیوں؟ محبت اور محبت کے اظہار پر تمہارا کوئی حق نہیں جو تم اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہو۔"

"ہاں یہ سچ ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ میرا حق کیا ہے مجھے صرف اپنے فرائض پتا ہیں۔ میرے لیے تو کبھی میرے باپ نے اتنا کچھ نہیں کیا۔ ان کو نہیں پتا کہ مجھے جنگل پسند ہیں۔ آپ کو کیسے پتا لگ گیا۔ میرے پاپا تو بس ...... ماما کے ہاتھ کی کٹھ پتلی۔ ان کی نظر سے دیکھتے، ان کی نظر سے بولتے۔ میں نافرمان، بدزبان، چور اور آخر میں ...... ایک بدکردار بیٹی تھی ان کی' جسے سر سے اتار کر پھینک دیا تھا انہوں نے۔ میں ان کا خون تھی۔ آپ کے لیے کیا ہوں بولیں؟ کیا رشتہ ہے ہمارا۔ ایک کاغذ اور تین بولوں کا رشتہ۔ جو تین بولوں سے ہی ختم بھی ہو سکتا ہے پھر آپ......؟" وہ روتی رہی۔ ابراہیم اب سمجھا۔

"پاگل ہو تم تو بالکل ہی۔" ثمن کے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے۔ مگر اس کا رونا بھی ضروری تھا۔

"اللہ نے جب انسانوں کو بنایا تو ماں اور بیٹی یا باپ اور بیٹے کو نہیں بنایا تھا۔ ایک مرد اور اس کی بیوی کو بنایا تھا۔ یہ جس رشتے کو تم تین الفاظ کا رشتہ کہہ رہی ہو نا۔ میرا اور تمہارا یہ رشتہ آسمان پر بنا تھا۔ میری بیوی ہو۔ میری ہو۔ اول دن سے۔ میں ساؤتھ افریقہ کا رہائشی اور تم پاکستان کی۔ ہم کیسے ایک ہوئے؟ ہمیں ایک ہونا ہی تھا۔ میرا اور تمہارا رشتہ سب رشتوں سے زیادہ پائیدار ہے۔ تمہارے فادر تمہارے لیے کچھ کیوں کریں؟ میں تمہارے فادر کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ تمہیں پیار سے دیکھیں۔"

وہ روتی رہی۔ وہ اس کے آنسو صاف کرتا رہا۔

"ہمیشہ ایسے ہی پیار کریں گے نا مجھ سے؟"

ابراہیم نے اس کا یہ لہجہ پہلے نہ سنا تھا۔

میں جس کی خاطر محبتوں کی ہر ایک حد سے گزر گیا ہوں
وہ اب بھی مجھ سے پوچھتا ہے کہ سچ بتاؤ وفا کرو گے

وہ روتے روتے ہنس دی۔

"میرا عشق سودا نہیں ہے۔ تم چاہے مجھ سے عشق نہ بھی کرو۔ بس یہ کرنا کہ میرے عشق کو عشق سمجھنا۔ کبھی شک مت کرنا کہ میں کسی اور کی طرف متوجہ ہوں۔ میرا عشق صرف تم ہو۔ اس میں کھوٹ کبھی محسوس نہ کرنا۔ خاص کر بوشان کے معاملے میں۔ وہ صرف تمہیں اور مجھے پریشان کرنا چاہتی ہے۔" وہ اس کے کندھے سے لگ گئی۔ رونا بند کر دیا مگر ابھی بھی سسک رہی تھی۔

وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ اس نے ٹیبل پر اپنا بیگ رکھا اور اس کی جانب مڑی۔ وہ اپنی

جیکٹ اتار رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ کچھ چھیڑنے والے انداز میں، کچھ معنی خیز انداز میں وہ مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ سادہ سی مسکراہٹ۔ اشتیاق سے بھری۔

ابراہیم نے اسے ساتھ لگالیا۔

''آئی لو یو خان۔''

ابراہیم کو یقین نہیں آیا۔ اس نے ثمن کو ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ''سچ ؟''

وہ شرمائی۔ ''میرے لیے مان، فخر اور غرور کی بات ہے کہ آپ جیسا انسان مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔ ابراہیم خان کی۔ کبھی مذاق میں بھی نہ کہنا کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ میں کھڑے کھڑے مر جاؤں گی۔''

ابراہیم نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔

''آئندہ ایسا کہا تو سزا ملے گی۔'' وہ ہنسی۔

''یہ معجزہ تو نہیں ہے مگر ہوا کیسے؟ یہ جنگل تو بہت مبارک ثابت ہوا۔'' وہ اب بھی بے یقین تھا۔

''جنگل نہیں خان!'' وہ سنجیدہ ہوئی۔

''پھر؟'' اس سے پہلے کہ وہ ابراہیم کی بات کا جواب دیتی' ابراہیم کا فون بجا تھا۔

☆☆☆

''ماما! کچھ اندازہ ہے آپ کو؟ صرف انیس دن بچے ہیں میرے پاس۔ صرف انیس دن۔ ان انیس دنوں میں، میں کیا کروں گا؟ ماما' اب تو پاپا کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے آپ پاپا سے تجوری کا کوڈ پوچھیں' پلیز پوچھیں ماما ۔۔۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ ورنہ مجھے کسی کو بلا کر تجوری تڑوانی پڑے گی۔ پاپا تو یہاں سے ہلتے نہیں۔ تڑواؤں کیسے یا اللہ میں کہاں پھنس گیا؟''

طاہر بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

رخشندہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ کیا ضروری تھا کہ فاروق اس قدر بیمار پڑ جاتے۔ انہیں تو بیٹی کی کبھی بھی اتنی پرواہ نہ تھی پھر اب، مگر دنیا بھی تو باتیں سناتی تھی۔

''تم فکر مت کرو طاہر۔ چھوڑو کوڈ کو۔ ایک ہفتے کے بعد فاروق کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔ تم اسی دن تجوری تڑوالو۔ کہہ دیں گے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔'' رخشندہ کا لاجواب مشورہ۔ طاہر کی آنکھیں چمکیں۔

☆☆☆

صبح جب وہ اٹھا۔ وہ کمرے میں نہ تھی۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں روشنی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کو دیکھا۔ بجھی ہوئی کینڈلز، جابجا بکھرے اور سجے ہوئے پھول۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ جب ثمن عجلت میں اندر آئی۔

''آپ جلدی سے فریش ہو جائیں خان! ناشتا تیار ہے۔'' آج اس کا ہر انداز مختلف تھا۔ وہ خوش تھی، خود اعتماد تھی۔ گلابی جینز کے ساتھ سفید کرتے میں ملبوس تھی۔ ساتھ دوپٹہ جس میں ہر رنگ تھا۔ پہلے وہ چاہے بال کھولتی لیکن ہاف کلپ ضرور رکھتی تھی مگر آج اس کے بال بالکل کھلے تھے۔ خوب صورت بال اس کے سر کی ہر حرکت پر حرکت میں آنے۔ اسے ناشتے کا کہتی وہ باہر چلی گئی۔

وہ نہا دھو کر باہر آیا۔ ثمن بالوں میں ہاتھ چلاتی ٹیبل کے قریب کھڑی تھی۔

ابراہیم کے لیے یہ ایک بے حد حسین صبح تھی۔

ناشتے کی میز پر سجے لوازمات رکھ کر وہ خوش ہو گیا۔

''بہت خوب'' اس نے اسے سراہا۔ ثمن ابراہیم کو ہر چیز سرو کر رہی تھی۔ مگر اسے ابراہیم کچھ الجھا ہوا سا لگا۔

''خان کیا بات ہے؟ آپ کچھ اپ سیٹ ہیں؟''

''ہاں!'' وہ چونکا ''نہیں اپ سیٹ نہیں ہوں۔ اتنی خوب صورت صبح میں اپ سیٹ کون ہو سکتا ہے؟''

''صبح کی تعریف ...... ناشتے کی تعریف ...... کوئی اور بھی ہے یہاں پر۔'' اس نے اٹھلا کر بال کان کے پیچھے کیے۔ ابراہیم زور سے ہنسا۔ ثمن مسکراہٹ دبائے اس کی ہنسی سے محظوظ ہوتی رہی۔ پھر اٹھ کر جانے لگی۔

''کہاں؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''میں پیکنگ کرنے جا رہی ہوں۔''

''یار! تمہیں کچھ بتانا ہے۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''کیا بات ہے۔ کیا سب کچھ معلوم ہو گیا؟'' وہ بھی سنجیدہ ہوئی۔

''ہاں۔'' ابراہیم نے گہری سانس لی۔ ''کل رات میں نے ٹکٹس کنفرم کروالی ہیں۔ آج شام کی ہماری فلائٹ ہے۔'' ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''خان مجھے بتایے ...... یہ کس نے کیا میرے ساتھ؟''

''تمہارے پاپا اور اطہر کے علاوہ باقی تمہاری اپنی پوری فیملی نے۔'' سرخ چہرہ، سرخ بے یقین آنکھیں......وہ یہ سن کر گرنے لگی تھی۔ ابراہیم نے اسے تھام لیا۔

''پاپا اور اطہر کو ہٹایا جائے تو باقی طاہر بھائی، ماما اور سمعیہ آپی بچتے ہیں۔'' وہ ابراہیم کے گلے لگ کر بری طرح روئی۔

وہ پاکستان آ گئے تھے۔ اسی محلے اور اسی گھر میں ابراہیم نے وہی حلیہ بنا رکھا تھا۔

رستم بابا کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔

''ام نے تم کو دعوت دینا تھا۔ تم نے اپنا کوئی اتا پتا ہی نہیں دیا تھا۔''

''مگر پھر بھی دیکھ لیں۔ بہن کی شادی پر بھائی آ ہی گیا۔'' رستم بابا کی بیوی نے ہنس کر کہا۔

''خالہ ٹھیک کہتی ہیں۔ بابا میری طرف سے بہن کے لیے تحفہ ہے۔ اس نے کچھ رقم ان کی جانب بڑھائی۔

''اتنے پیسے؟'' رستم بابا حیران ہوئے۔

''زیادہ نہیں ہیں بابا۔ دو لاکھ ہیں۔ میری زمین بک گئی ہے اور بہن کا حق تو پہلے ہوتا ہے نا۔''

''نہ مڑا! یہ بہت زیادہ ہیں۔''

''قرض سمجھ کر رکھ لیں بابا۔ اگر تحفہ نہیں لینا تو......''

''ام کو پیسے کی ضرورت تو ہے۔ مگر ام واپس دے گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ مان گیا۔ جانتا تھا کہ اب کہاں ملے گا ان سے۔

☆☆☆

دروازے پر مسلسل دستک بھی ہو رہی تھی اور گھنٹی بھی بج رہی تھی۔ فاروق اسپتال سے گھر آ گئے تھے۔ طاہر اور اطہر بھی گھر پر تھے اور تابندہ کی فیملی تو زیادہ تر ہوتی ہی یہاں تھی۔

فاروق کے سامنے ماحول الگ اور ان کی غیر موجودگی میں گھر کا ماحول الگ ہوتا تھا۔ سسٹم مزے سے چل رہا تھا۔ آیندہ کے لیے بھی لائحہ عمل طے پا چکا تھا۔ آج چھٹی تھی۔ بارہ بج رہے تھے جب زور سے دستک ہونے لگی۔

''کون جنگلی ہے یہ؟'' طاہر کو غصہ آیا۔ وہ یوں بھی بلا کا غصیلا تھا۔ فاروق باہر چلے گئے۔ وہ اب کافی بہتر تھے۔ چلتے پھرتے تھے۔ فاروق نے دروازہ کھولا تو ساکت رہ گئے۔

بھورے رنگ کا ملگجا لباس، گریبان کے بٹن کھلے ہوئے، تیل لگے بکھرے بال، سر پر پشاوری ٹوپی بے ڈھنگے انداز میں پہنے، منہ کھولے نسوار زدہ دانتوں کی نمائش کرواتا وہ پٹھان سامنے کھڑا تھا۔ جس کا نام تک گھر والوں کو یاد نہ تھا۔ نکاح نامہ تک وہ لوگ کہیں رکھ کر بھول چکے تھے۔

''کون ہے پاپا؟'' طاہر آ گے آیا۔ ابراہیم خان کو کھڑا دیکھ کر اس کا خون مزید کھولا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس دروازے پر آنے کی؟'' اس سے پہلے کہ وہ ابراہیم کا گریبان پکڑتا۔ ابراہیم نے اچھا خاصا زور کا ہاتھ اس کے سینے پر مار کر اسے پیچھے پھینکا۔ طاہر گر گیا۔ سب گھر والے باہر لان میں آ گئے۔ ابراہیم گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

''السلام علیکم یا سسرال۔'' ابراہیم سب سے بولا۔ اتنے میں دروازے پر دوبارہ گھنٹی بجی۔ اب کی بار دروازہ ابراہیم نے کھولا۔ باہر پوسٹ مین کھڑا تھا۔

''سارا فاروق آفندی کے نام رجسٹری ہے۔''
ابراہیم نے وہ بھورا کاغذ پکڑ لیا۔ جو ایک لفافہ تھا۔
''رجسٹری وصول ہوا۔ سر جی آپ اپی سائن مائن کر دو۔'' اس کی اس دیدہ دلیری پر سب ہی حیران ہوئے۔ فاروق صاحب دستخط کر رہے تھے۔ اتنے میں ابراہیم نے لفافہ پھاڑا۔ اس میں سے کچھ تصاویر نکلیں۔ جو ابراہیم کے ہاتھ سے چھوٹیں یا اس نے گرائیں۔ کوئی سمجھ نہ پایا۔ کیونکہ سب کا دھیان تصویروں پر تھا۔ حتیٰ کہ پوسٹ مین کا بھی۔ سب سے اوپر والی تصویر دیکھ کر ہی پوسٹ مین گھبرا گیا اور سائن لے کر جلدی سے چلا گیا۔

ایک تصویر فاروق صاحب نے اٹھائی' دوسری زبیر نے تیسری ابراہیم نے۔ تابندہ نے تصویر دیکھ کر سر پکڑ لیا۔

تصاویر ایک دوسرے کے ہاتھ میں منتقل ہونے لگیں۔ جو ایک آدھ بندہ محروم رہ گیا۔ اسے ابراہیم نے دے دی۔

''آپ یہ لے لو بھائی صاب یہ سارا فوٹو ایک ہی ہے۔''

ایک ہی تصویر کی تین کاپیاں تھیں۔ تصویر میں طاہر اور اطہر نے ابراہیم پر پستول تان رکھے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک پستول تھا۔ ابراہیم نے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ چہرے پر خوف تھا۔ طاہر اور اطہر کے چہروں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ تصویر میں سب کے چہرے واضح تھے۔ طاہر اب سینے کا درد بھلائے کھڑا تصویر دیکھ رہا تھا۔ اطہر کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''تم لوگوں کے پاس اس اسلحے کا لائسنس ہے کیا؟'' ابراہیم نے غلط سلط اردو میں ان سے پوچھا۔

''کون سا اسلحہ؟ یہ تصویر جھوٹی ہے پاپا۔ ماما یہ تصویر نقلی ہے۔ یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے۔'' طاہر باپ سے بولا۔

''یہ فوٹو جھوٹ ہے؟'' ٹھنڈے انداز میں ابراہیم وہ تصویر طاہر کے سامنے کر کے بولا تھا۔

''ہاں یہ نقلی تصویر ہے۔ ماما' پاپا آپ خود سوچیں ہمارے پاس اسلحہ کہاں سے آئے گا؟'' طاہر گھبرائے انداز میں بولا۔

''بے وقوفو! آہستہ بولو۔ صحن میں کھڑے اسلحہ اسلحہ کر رہے ہو۔ بہتر ہو گا کہ ہم اندر چل کر بات کریں۔'' زبیر نے بھنا کر اندر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔

''واہ وا۔ تم تو بہت ہی سمجھ دار ہے یارا۔''
ابراہیم نے باقاعدہ تالی بجائی زبیر کے لیے۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ فاروق کی چال بے حد سست تھی۔ مگر اس پر دھیان دینے کا وقت کسی کے پاس نہ تھا۔ دروازے کی اوٹ میں حوریہ اور سمعیہ کھڑی تھیں۔ رخشندہ اور تابندہ ڈرائنگ روم میں ہی تھیں۔

''دیکھو خان! تم بہت غلط جگہ پر اپنی بدمعاشی دکھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میرے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ یہ جھوٹی تصویریں دکھانے کیا مقصد ہے تمہارا؟'' زبیر نے ابراہیم پر رعب ڈالنے کی کوشش کی۔ ابراہیم صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ام کیا بدمعاشی کرے گا چاچا جی! ام تو یہ فوٹو لے کر تھانے جانے والی ہے۔ آتے آتے راستے میں پیاس لگ گیا تو ایک گلاس پانی پینے رکی ہے آپ کے گھر۔ خالہ جی! کیا ایک گلاس پانی دے گا تم ام کو؟'' وہ لاپروائی سے بول رہا تھا' آخر میں تابندہ سے بولا۔

''دیکھو تم چاہتے کیا ہو؟'' رخشندہ تے تڑخ کر پوچھا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس پٹھان کو دیکھ کر فاروق صاحب کی کیفیات اتنی عجیب ہو گئی تھیں کہ وہ کچھ بھی نہ بول پا رہے تھے۔ ایک طرف صوفے پر سر جھکا کر بیٹھ گئے تھے۔

''کیوں تم جھوٹی تصویریں دکھا رہے ہو؟ مقصد کیا ہے تمہارا؟'' رخشندہ کا بس نہ چل رہا تھا کہ نوچ کھاتی اسے۔

''جھوٹا فوٹو؟'' ابراہیم کا انداز مطمئن اور ٹھنڈا

تھا۔ ''کون بولی۔ یہ جھوٹا فوٹو ہے؟ یہ دیکھو یہ ام یہ تمہارے بیٹے۔ کون بولی کہ یہ فوٹو جھوٹ ہیں؟''

''میرے بیٹے ایسا نہیں کر سکتے۔ نہ ہی ان کے پاس کوئی اسلحہ ہے۔'' اس نے بیٹوں کی گواہی دی۔

''اچھا وہ!'' اس نے دروازے کے پاس کھڑی پریشان سی سمعیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارا وہ خوب صورت بیٹی۔ کیا وہ یہ کر سکتا ہے؟'' اس نے جیب سے ایک اور تصویر نکال کر میز پر پھینکی۔ رخشندہ نے فوراً اٹھالی اب سمعیہ بھونچکا کر اندر آ گئی۔ سب تصویر پر جھکے۔ تصویر میں ایک سیر گاہ تھی۔ کوئی پارک وغیرہ دائیں بائیں درخت درمیان میں بنی گزر گاہ میں سمعیہ اور ابراہیم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بڑے پیار سے چل رہے تھے۔ جیسے خوب صورت، ماڈرن ٹمن ایک پیون کے ساتھ کھڑی اس تصویر میں لگ رہی تھی۔ ویسی ہی عجیب سمعیہ اس تصویر میں لگ رہی تھی۔

''یہ فوٹو تمہارا دونوں بیٹے نے دیکھا اور میرے اوپر بندوق تان لیا۔ ام بوت (بہت) ڈری۔ خالہ ام جانی ہے۔ بس ام کو پانی دے دو۔''

''اوئے۔'' طاہر تصویر دیکھ کر بھڑکا۔ ''میری بہن کی طرف اگر آنکھ اٹھا کر دیکھا تو۔'' طاہر نے ابراہیم کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اطہر بھی مارنے کو لپکا۔ زبیر روکتے رہ گئے۔

ابراہیم نے طاہر کو ایک دفعہ پھر دھکا دیا۔ دبلا پتلا اطہر بھائی کو گرتے دیکھ کر خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔ ابراہیم نے نیفے میں اڑسا ہوا پسٹل نکال لیا۔ کسی پر تانا نہیں، پسٹل کو گھورنے لگا جو جہاں تھا وہیں رک گیا۔

''بڑے پھرتیلے سالے ہیں تمہارے خانا۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔ پھر ان کی طرف دیکھا۔

''اپنے بہنوئی سے ایسا سلوک کرتی ہے تم لوگ' بھول گئے؟ ام پہلے بھی تمہارا ایک بہن کی طرف دیکھ چکی ہے۔ ابی ام چاہتی ہے تم سارا لوگ آرام سے ان صوفوں پر بیٹھ جاؤ جیسے سسر جی بیٹھا ہے۔ چپ کر کے۔ بیٹھ کر بات کرلے گا ابی ام لوگ۔'' مارے باندھے سب بیٹھے۔

''دلبرا! تم کیوں کھڑا ہے؟ تم بھی بیٹھونا۔'' اس نے سمعیہ سے کہا۔ اس خطاب پر سب ہی نے دانت پیسے۔

''کیا بات ہے؟ تم نے اپنا نسوار کا دکان بیچ دیا جس سے ہمارا خاطر کرنا تھا تم نے۔ آج خاطر نہیں کرے گا؟'' سمعیہ کے چہرے پر پستول کا خوف، کچھ انہونی ہو جانے کا خوف اور ابراہیم کے لیے گھن، نفرت سب تاثرات تھے۔

''دیکھو خان! ہمارے گھر کی بیٹیوں پر بری نظر مت رکھو۔ تم پہلے ہی ہمارا بہت نقصان کر چکے ہو۔ اب کیا چاہتے ہو۔'' تابندہ بولی۔

''ام کیا کرے؟ تمہارا بیٹیاں ام پر عاشق ہیں۔ تم کو لگتا ہے یہ فوٹو ام نے اس کے ساتھ زبردستی بنایا۔ دیکھو۔ اس میں امارا دلبرا ہنس رہا ہے۔''

''بکواس بند کرو اپنی۔'' اطہر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''یہ تصویر نقلی ہے۔''

''یارا۔ تم بار بار ایک ہی بات کرتی ہے۔ نقلی فوٹو، نقلی فوٹو...... کون بولتی ہے یہ فوٹو نقلی ہے۔ کون بولتی ہے وہ فوٹو نقلی ہے؟'' ابراہیم نے باری باری دونوں تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم کہتے ہیں۔'' رخشندہ بولی۔

''کیا ثبوت ہے کہ یہ تصویریں اصلی ہیں؟'' تابندہ بولی۔

''واہ...... واہ۔'' ابراہیم نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''ڈیڑھ مہینے میں ہی...... یا سسرال تم لوگ تو بڑا عقلمند ہو گیا۔ خیر کرواؤ۔ شوق سے تحقیق کرواؤ۔ ام تو جا رہا ہے تھانے۔ مڑا ام کو تو خطرہ ہے اپنے سالوں سے یہ فوٹو تم لوگ رکھ لو۔ امارا پاس اور بھی فوٹو ہے۔ ان سب کا اور کاپی ہے۔''

''دیکھو خان! تم چاہتے کیا ہو؟'' زبیر نے

پوچھا۔

''مہینہ پہلے ایک فوٹو دکھا کر، پولیس کی دھمکی دے کر تم لوگوں نے اپنا چھوٹا بیٹی کی شادی ام سے کیا۔ اب یہ فوٹو دیکھ، پولیس کی دھمکی سن کر اپنا بڑا بیٹی کا شادی ام سے کرو۔ تمہارا بڑا بیٹی بھی ام سے پیار کرتا ہے۔'' وہ اطمینان سے ان کو بے اطمینان کر گیا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟ خبردار جو سمعیہ کا نام بھی لیا تو۔'' رخشندہ باقاعدہ چلائیں۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہوا۔

''میری بیٹی سے شادی کرنے کی اوقات ہے تمہاری؟'' وہ غصے میں بولیں۔

''کیوں؟'' وہ سابقہ انداز میں حیران تھا۔

''تمہارا چھوٹی بیٹی کی اوقات تھی مجھ سے شادی کرنے کی؟ اس کی شادی ام سے کرواتے ہوئے تو تم معصوم بنی' منہ میں دہی جما کر بس چپ رہی۔ اب بڑی بیٹی کی باری تم میرا اوقات دیکھتا ہے؟ کیوں؟ ام' بتاتا ہے۔ کیونکہ ثمن سوتیلا تھا۔ سمعیہ سگا ہے۔ ہیں نا؟'' سب کو سانپ سونگھ گیا۔ فاروق صاحب پر جیسے بجلی گری۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سب نے کہا...'' تابندہ کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''سب کون خالہ؟ سب کون؟ ابھی لڑکوں کے اسلحہ کا بات تھا۔ تب تمہارا مرد نے کہا اندر چلو اندر۔ اس وقت بیٹی کا بات بازاروں میں جا کر کیا۔ ہر جگہ فوٹو اچھالا۔ اس فوٹو کا تحقیق کیوں نہ کرایا۔ اس فوٹو کے لیے شور کیوں نہ مچایا؟ پھر تم کہتا ہے سب نے کہا۔ ام پوچھتا ہے سب کون؟ اب بولتا ہے۔ نقلی فوٹو کا اس وقت تحقیق کیوں نہ کیا؟ کیوں نہ کہا کہ یہ فوٹو نقلی ہے۔ ام تحقیق کروائیں گے؟'' اس نے اپنی اور ثمن کی تصویر نکال کر میز پر پھینکی۔

''ام بتاتا ہے۔ تب بات سوتیلا کا تھا۔ اب بات اپنی بیٹی کا ہے۔ ہے نا خالہ۔'' تابندہ اور رخشندہ نے فاروق صاحب کو دیکھا۔ وہ بے حس صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' فاروق صاحب نے پوچھا۔

''اپنی دلبر سے شادی۔'' اس نے سمعیہ کی طرف اشارہ کیا۔

''بکواس بند کروانی۔'' اب وہ بولی۔

''کیوں؟ تم پیار نہیں کرتا ام سے؟ پھر یہ کیا ہے؟'' اس نے فوٹو کی طرف اشارہ کیا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ نقلی تصویر ہے۔ سب جانتے ہیں۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''چھوڑو دلبر تمہارا گھر والا کبھی فوٹو کو غلط نہیں سمجھتا۔ تم جو مرضی کہو۔ یہ لوگ نہیں مانیں گے۔ امارا شادی ضرور ہوگا۔''

''بکواس بند کرو۔ کیوں یہ تماشا کر رہے ہو؟'' تابندہ بولی۔

''مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اتنی بحث کر رہے ہو؟ جو وہ کہہ رہا ہے' مان جاؤ۔'' فاروق صاحب بولے۔

''فاروق پلیز! لوگوں کی باتیں سن کر اور آپ کی بیماری دیکھ کر ہم گھبرا گئے تھے۔ ثمن کے معاملے میں کچھ غلطی ہم سے ہوگئی۔ مگر غلطی دہرانا کہاں کی عقلمندی ہے۔'' رخشندہ لجاجت سے بولیں۔

''تم لوگ مان گئے تھے کہ ثمن ہی غلطی پر ہے اور اب میں مان رہا ہوں کہ سمعیہ غلطی پر ہے۔ شادی تو ضرور ہوگی۔'' فاروق کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''پاپا پلیز! اسٹاپ اٹ میں جانتی ہوں۔ آپ اپ سیٹ ہیں مگر اس آدمی کی بات مت سنیں۔'' سمعیہ بولی۔

''میں نے تو ہمیشہ صرف تمہاری ماں کی سنی۔ یہ ڈبل اسٹینڈرڈ تمہاری ماں کا ہے۔ مجھے یہ آدمی ثمن کے لیے برا نہیں لگا تو تمہارے لیے برا کیوں لگے گا؟''

''پلیز پاپا! خدا کے لیے' میری منگنی ہو چکی ہے۔''

''پاپا یہ آدمی فراڈ ہے۔ سمعیہ آپی اس لوسٹینڈرڈ بندے کو کیوں پسند کریں گی۔ آج

ٹیکنالوجی بہت جدید ہے۔ نقلی تصویریں بن جاتی ہیں۔'' اطہر نے جیسے باپ کو سمجھایا۔

''اطہر! کیا یہ بات تمہیں ثمن آپی کی دفعہ میں پتا نہیں تھی کہ ٹیکنالوجی بہت جدید ہے؟'' فاروق ڈھے سے گئے۔ زبیر نے صوفے پر بیٹھ کر انہیں سنبھالا۔ اطہر کچھ بول نہ پایا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے ہمیشہ ماں کی زبان بولی تھی۔ ماں کے دماغ سے سوچا تھا۔

بہت ہی عجیب سی صورت حال ہوگئی تھی۔

فاروق اپنی جگہ سے اٹھے' ابراہیم کے پاس گئے اور جا کر ہاتھ جوڑ دیے۔ ''کیا تم ایک دفعہ مجھے ثمن سے ملوا سکتے ہو؟ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت خفا......''

''نہیں بابا جی! ام نہیں ملوا سکتی۔'' اس نے منہ پھیر لیا۔

''دیکھو میں ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔'' ان کی آواز شکستہ ہوگئی۔

''ام نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔''

''دیکھو کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں نے اس کی شادی تم سے کروائی تھی۔ تم کیسے نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے؟''

''ام سے کرائی تھی شادی؟ ام کون ہے؟ نسوار خان کون ہے؟''

''تمہارا نام ابراہیم خان ہے۔ اتنا تو میں جانتا ہوں۔'' ان کی آواز گھٹ گئی۔

''ابراہیم خان کون ہے؟'' وہ اب بھی لاپروا تھا۔

''دیکھو میں بھیک مانگ رہا ہوں۔''

''ام نے ...... ثمن کو بیچ دیا۔'' وہ ہچکچا کر بولا۔

''کیا؟'' سب دنگ رہ گئے۔

''ہاں! تمہارا بیٹی بہت خوب صورت تھا۔ لمبے بالوں والا' موٹی آنکھوں والا' گورا میم لگتا تھا۔ بہت اچھا دام ملا تھا اس کا۔''

''دام؟ کیا وہ کوئی بھیڑ بکری تھی جس کا دام لگایا تم نے؟''

''آپ نے اسے کیا سمجھا تھا جب ایک کباڑیے کو دے دیا تھا سر جی؟ وہ رو رو کر یقین اور اعتبار کی بھیک مانگتی رہی اپنے باپ سے' تو باپ کیوں اندھا بہرا بن گیا؟ بیٹی کو فالتو چیز سمجھ کر باہر پھینک دیا۔ ایک کباڑیے کو دے دیا تو کباڑیا اس کے ساتھ کیا کرتا بولو؟ دام ہی لگانا تھا نا۔ بیٹی کی سوتیلی ماں نے جو کہا تب آپ نے کہا بیوی تم ٹھیک کہتا ہے۔ بیوی بولا ثمن چور' آپ نے کہا بیوی تم ٹھیک۔ بیوی بولا ثمن برے کردار کا۔ تب بھی تم بولا بیوی تم ٹھیک؟ ایک بار تم نے نہ سوچا کہاں تمہارا شہزادی جیسا بیٹی۔ کہاں میں ایک کباڑیا؟ بس بیوی بولا بیوی کی بہن بولا اور تم مان گیا۔

تم بے وقوف ہے یا بننے کی اداکاری کرتا ہے؟ تم باپ ہے یا صرف باپ بننے کی اداکاری کرتا ہے؟ اور تم باقی لوگ دو دن ہیں۔ یا تو امارا شادی اس لڑکی سے کرواؤ' ام اس کو بھی بیچے گا۔ یا پھر ثمن کو تم لوگ جہیز نہیں دیا تھا نا۔ اس کے جہیز کا جو پیسہ بنتا ہے وہ کیش میں تیار رکھو ایک کروڑ۔ ورنہ پولیس کو سمجھانا کہ اسلحہ کا یہ صرف فوٹو ہے۔ اور یہ نقلی ہے۔'' دھمکی دے کر اس نے پستول نیفے میں اڑسا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

جو جہاں تھا وہیں کھڑا تھا۔

☆☆☆

ان لوگوں نے ثمن کے لیے یہ کبھی نہ چاہا تھا کہ اسے بیچا یا خریدا جاتا۔ انہوں نے تو سوچا تھا کہ چپڑاسی کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں رہتی یا حالات بدل جاتے۔ وہ چپراسی کے دس بارہ بچوں کی ماں بنتی یا بانجھ نکل آتی۔ مگر یہ ہرگز نہ سوچا تھا کہ ثمن کے ساتھ یہ ہوگا۔ سمعیہ کچھ اپنی ہی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ پریشان ہوگئی تھی یا دکھی ہوگئی ثمن کے لیے؟ نسوار خان کے ساتھ ثمن کی شادی کا آئیڈیا سمعیہ کا تھا۔

وہ ایک گرم مگر ہوادار شام تھی۔ تب ہی سمعیہ جان بوجھ کر ثمن کو لے کر گھوم رہی تھی۔ گھومتی پھرتی

تبھی تو آئیڈیا آتا۔

اس آئیڈیے کے لیے اس سے طاہر نے کہا تھا۔ طاہر کو معلوم ہو گیا تھا کہ ثمن ایک سونے کی چڑیا ہے۔ ثمن کی ماں سعدیہ نے اور ثمن کے نانا نے ثمن کے لیے ایک پلاٹ لیا تھا۔ یہ تب کی بات تھی جب ثمن ابھی صرف دو تین سال کی تھی۔ پاور آف اٹارنی سعدیہ کے نام اور سعدیہ کی وفات کے بعد فاروق کے نام ہو گئی تھی۔ فاروق یہ پلاٹ ثمن کو اس کی حاشر کے ساتھ شادی پر دینے والے تھے۔ کہ ایک دن طاہر کو ایک بندہ ملا۔ اس کے پاس ایک پروپوزل تھا۔ شہر کا نامی گرامی امیر کبیر بندہ ایک پلازہ بنانا چاہتا تھا ثمن کا حد بندی کیا گیا پلاٹ پلازے کے بیچوں بیچ آ رہا تھا۔ اس نے طاہر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اپنے باپ سے پلاٹ بیچنے کی بات کرے۔

طاہر نے گھٹیا منصوبہ بنایا اور گھر پر جا کر بات ہی نہ کی اور اس آدمی کو کہہ دیا کہ گھر والے نہیں مانتے۔ منہ مانگی قیمت لینے پر رضامند نہیں۔ کچھ دن اس آدمی کے بھیجے قاصدوں کو ٹرخانے کے بعد اس نے مالک سے روبرو ہونے کی فرمائش کی اور روبرو ہو کر مالک کو آفر کی کہ وہ اسے یہ پلاٹ دلوا سکتا ہے۔ دونوں میں یہ ڈیل ہوئی کہ تین ماہ کے اندر اندر طاہر پلاٹ کے کاغذات مالک کو لا کر دے گا اور مالک غیر قانونی طریقے سے زمین لے لے گا۔ بدلے میں طاہر کو پانچ کروڑ دے گا۔ پچاس لاکھ ایڈوانس لیکن اگر طاہر تین ماہ میں کاغذات نہ لا سکا تو طاہر کو ایڈوانس کا ڈبل دینا ہو گا۔ یعنی ایک کروڑ نہ دینے کی صورت میں مالک جو چاہے سلوک طاہر کے ساتھ کرتا۔ مگر طاہر پُراعتماد تھا کہ وہ یہ کام کر لے گا۔

اس نے پینتالیس لاکھ کی اپنے لیے گاڑی لی اور گھر جا کر اپنے ٹھاٹ باٹ سے سب کو یہ یقین دلایا کہ اس نے دوست کے ساتھ مل کر ایک کاروبار شروع کیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے ماں اور بہن کو اعتماد میں لے کر ساری بات بتا دی۔ اور ساتھ اپنا پلان بھی۔

پلان کے مطابق حاشر اور ثمن کی منگنی تڑوا کر ثمن کی شادی کسی ایسے آدمی سے کی جائے جو بالکل جاہل گنوار اور اجڈ ہو۔ ثمن کو اس قدر بدنام کر دیا جائے کہ اس کی شادی کسی سے بھی جلد از جلد کروا دی جائے۔ ثمن اس قدر بدنام ہو جائے کہ زندگی کی رمق اس میں سے ختم ہو جائے، وہ اور فاروق اس پلاٹ کو بھول ہی جائیں۔ ثمن غربت، افلاس اور بدنامی کی زندگی میں گم ہو جائے۔

اس پلان پر رخشندہ قدرے جُزبز ہوئی تھی مگر سمعیہ کو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس نے طاہر کا پورا پورا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ سمعیہ کو اپنی بے حد خوب صورت سوتیلی بہن سے نفرت تھی۔ یہ عام سی بات تھی، کوئی انہونی نہ تھی۔ ثمن گڑیا جیسی تھی بہت خوب صورت۔ کم سمعیہ بھی نہ تھی مگر اس میں ثمن والی بات نہ تھی۔ وہ تو دبئی جانے والی تھی اور طاہر بھی سیٹ ہو جاتا۔ ابھی تک کوئی بندہ نہ ملا تھا کہ یہ دونوں اس بوتیک جا پہنچیں پیون اچھا خاصا میلا کچیلا ہٹا کٹا موٹا سا تھا۔ اس نے ثمن کو بہت گہری نظر سے دیکھا تھا۔ تب ہی سمعیہ نے طے کر لیا تھا۔ وہ دل میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ ''لگتا ہے یہ پنجابی بیوٹی اچھی لگی ہے تمہیں خان۔ چلو کیا یاد کرو گے۔ کہ کسی پنجابی نے مہمان نوازی کی تھی۔ میری طرف سے یہ لڑکی تمہاری ہوئی۔ اسی سے شادی کرواؤں گی تمہاری۔ کیا یاد کرو گے۔''

پھر وہی ہوا۔ نقلی تصاویر بنیں۔ خود ہی انہیں گھر بھجوایا گیا۔ بانٹا گیا۔ حاشر کو بھیجا گیا۔ سوشل میڈیا پر ڈال دی گئیں۔ جو انہوں نے چاہا، سب وہ ہو گیا۔

نسوار خان کو بلیک میل کیا گیا۔ نکاح کروایا گیا۔ ولیمے پر جا کر ثمن کی ایک دو تصاویر بھی لی گئیں۔ انہیں دیکھ کر سمعیہ خوب ہنسی جیسا حلیہ ثمن کا ہو گیا تھا۔ مگر سر پیٹ کر تب رہ گئے جب معلوم ہوا کہ فاروق نے تجوری کا کوڈ بدل دیا تھا اور خود بیمار ہو کر ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔ اب طاہر کہتا تھا کہ ماما آپ پاپا سے کوڈ پوچھیں۔ رخشندہ کہتی تھی کہ نفسیاتی اور جسمانی طور پر فاروق اس قابل نہیں ہیں کہ میں کوڈ پوچھوں

اور اگر فاروق ناراض ہو گئے کہ تم لوگوں کو کوڈ کی پڑی ہے تو؟ معاملہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ خیر رخشندہ نے تجوری توڑنے کا فیصلہ کر ڈالا تھا۔ پلاٹ کے کاغذات تجوری میں ہی تھے۔

☆☆☆

ابراہیم کو اپنی ٹیم کے ان ممبران، جن کو اس معاملے پر لگایا ہوا تھا اور جو ثمن کے گھر پر چھپ کر پہرا دے رہے تھے ان سے معلوم ہو گیا تھا کہ راستہ صاف ہے۔ وہ اگلے ہی دن پھر سے آ گیا تھا۔

گھر ویران ہو گیا تھا۔ سمعیہ کو فوراً دور کے رشتہ داروں کے گھر منتقل کر دیا گیا تھا۔ طاہر اور اطہر بھی وقتی طور پر روپوش ہو گئے۔ رخشندہ بھی فاروق سے کوئی بات نہ کر پائیں اور انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر تابندہ اور فاروق کے ساتھ ان کے گھر چلی گئیں۔ ساتھ آنے کی آفر فاروق کو بھی کی تھی مگر وہ تو پتھر کا بت بن چکے تھے نہ مانے اسی دن سب بھاگ گئے۔

یہ اگلے دن کی بات تھی۔ فاروق کو کچن کے دراز سے بسکٹ کا ایک پیکٹ ملا تھا۔ وہ پانی کے ساتھ کھایا تھا۔ فریج میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں۔ وہ نہ کھا سکے تھے مگر پیٹ کی آگ بجھانا بھی ضروری تھی۔ اب وہ کسی بے جان لاش کی طرح دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چوکھٹ کو پکڑے۔ حالانکہ جانتے تھے کہ ابراہیم خان نے آج نہیں آنا تھا۔

مگر وہ آ گیا تھا۔ دروازہ بند نہ تھا۔ ادھ کھلا تھا۔ اس نے دستک دی اور اندر آ گیا۔ فاروق کو ایسے بیٹھا دیکھ کر حیران نہ ہوا۔ جو بھی تھا۔ فاروق لاپروا سہی مگر باپ تھے۔ کوئی باپ اپنی بیٹی کی ایسی حالت کا جان کر کبھی لاپرواہ نہیں رہتا۔ اسے دیکھ کر وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا تھا۔

''دیکھو خان! میں تم سے بھیک مانگتا ہوں۔ میری بیٹی تم نے کس کو بیچی؟ کچھ تو خبر ہو گی تمہیں کہ وہ کہاں ہے۔ میری ریٹائرمنٹ کا پیسہ اور یہ گھر بیچ کر، میری گاڑی بیچ کر، میرا بنک بیلنس میرا سب کچھ لے کر تم مجھ سے وہ رقم لے لو۔ جن کو میری بیٹی بیچی ان کو دے دو۔ میری بیٹی مجھے واپس لا دو۔'' فاروق نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔

''اوئے سسر جی! ام کو اندر تو آنے دو۔ تمہاری شیر بیٹے سے ملنے تو دو۔''

''کوئی نہیں ہے گھر پر، سب بھاگ گئے۔ خان دیکھو تم......''

''کوئی نوکر وغیرہ بھی نہیں ہے گھر میں؟''

''خان۔ مجھے میری بیٹی لا دو۔ تمہیں تمہاری ماں کا واسطہ مجھے۔''

''سسر جی! میں آپ کی بیٹی کو ساتھ لے کر آیا ہوں باہر ٹیکسی میں بیٹھی ہے۔ آپ یہاں ٹھہریں۔ میں لے کر آتا ہوں اسے۔''

یہ ابراہیم نے کیا کہا تھا ان سے؟ فاروق کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

تھوڑی دیر بعد گھر کے اندر ایک پٹھان عورت داخل ہوئی تھی۔ وہ ایسے ہی لباس میں تھی۔ چادر سے منہ چھپا رکھا تھا۔ ابراہیم خان اس کے پیچھے تھا۔ فاروق کے سامنے آ کر اس عورت نے چادر ہٹائی تھی۔ وہ ثمن تھی۔

''ثمن!'' کپکپاتی ہوئی آواز میں فاروق بولے تھے۔ ثمن باپ کے گلے لگ گئی تھی۔ ابراہیم نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ آج اس نے بہتر لباس پہن رکھا تھا۔ وہ آرٹیفیشل رنگ جو وہ نسوار کے لیے دانتوں پر لگاتا تھا وہ بھی نہ لگا رکھا تھا۔ بال درست طریقے سے بنے تھے۔ شیو بہتر تھی۔ ٹوپی بھی اس نے سر سے اتار دی تھی۔

☆☆☆

''میں تمہارا گناہ گار ہوں بیٹی۔ میں نے باپ ہونے کا فرض کبھی ادا نہ کیا۔''

رخشندہ، طاہر اور سمعیہ کی حقیقت جان لینے کے بعد، تابندہ بھی ہر چیز میں شامل تھی۔ یہ جان لینے کے بعد، ابراہیم کی حقیقت جان لینے کے بعد فاروق اس بات سے مطمئن اور بے حد خوش تھے کہ ثمن محفوظ ہے۔ بلکہ باپ کے گھر سے زیادہ محفوظ اور خوش ہے۔

”نہیں پاپا! ایسا نہ کہیں۔ آپ کی کوئی غلطی نہیں یہ سب تو میری قسمت میں تھا۔ مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں نا۔ اس دنیا کے ہر انسان نے مجھے برباد کرنے کی کوشش کی۔ ہر طرح سے میرا نصیب خراب کرنے کی کوشش کی۔ مگر میرا نصیب وہ تھا جو اللہ نے لکھ دیا — تھا۔ میرے اللہ کا لکھا میرے اردگرد کا کوئی انسان نہ بدل سکا۔ اور اچھا ہوا جو میری جاشر سے جان چھوٹ گئی۔“

”میری بیٹی! میں تو دعاؤں کے علاوہ تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔“ وہ بے حد دکھی تھے۔

”نہیں پاپا۔ کچھ ہے جو آپ سے لینا ہے مجھے میرا گھر مجھے دیں پاپا۔ وہ پلاٹ کے کاغذات مجھے چاہئیں۔“ فاروق نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

فاروق نے رخشندہ کو کال کی تھی اور بہت خوشی خوشی بتایا تھا کہ اس خان سے جان چھوٹ گئی ہے۔ انہوں نے اپنے کسی جاننے والے وکیل کے ذریعے خان پر دباؤ ڈلوایا تھا اور دھمکایا تھا کہ ثمن کا کیس اس پر کر دیں گے۔ تب خان مان گیا تھا کہ تصاویر نقلی ہیں۔ اس کا بیان بھی قلمبند ہو گیا تھا۔ اب وہ تنگ نہیں کرے گا۔ سب واپس آجائیں۔

سب لوگ گھر واپس آگئے تھے۔ وہ قدرے شرمندہ تھے۔ رخشندہ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی مگر فاروق نے منع کر دیا تھا۔

”جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ثمن کے معاملے میں، میری قسمت میں یہ ہی تھا۔ وہ تکلیف دہ باب اب میں نہیں کھولنا چاہتا۔ اللہ میری بیٹی پر رحم کرے گا۔“

رخشندہ مطمئن انداز میں پلٹ گئیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ ”میں آپ کے لیے کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔ آپ آرام کریں۔“

”ہاں ضرور۔“ فاروق نے چبھتی نظروں سے جاتی ہوئی رخشندہ کو دیکھا تھا۔ انہیں ابراہیم کے الفاظ یاد تھے۔ جو اس نے جاتے ہوئے کہے تھے۔

”انکل! جس وقت آپ چاہیں مجھے اس نمبر پر کال کر سکتے ہیں۔ ثمن کا نمبر آپ لے چکے ہیں۔ آپ جب چاہیں گے میں اسے آپ سے ملوانے لے آؤں گا۔

میں اور ثمن ڈنکے کی چوٹ پر اس گھر میں آسکتے تھے۔ مگر چھپ کر آئے۔ مقصد صرف یہ تھا انکل کہ آپ کی فیملی نے ثمن سے زیادہ آپ کی پیٹھ پر وار کیا ہے۔ آپ کے اعتبار کو ٹھیس پہنچایا۔ آپ کی بیوی اور بیٹی نے۔ طاہر تو یوں بھی آپ کے خلاف ہی تھا۔ اب اپنے مجرموں سے آپ اپنے طریقے سے ڈیل کریں۔ جیسے آپ چاہیں۔ بدلہ لیں یا معاف کر دیں۔ ہم چلتے ہیں۔“

فاروق کو سب سے زیادہ دکھ رخشندہ نے پہنچایا تھا۔ سمعیہ کو انہوں نے اللہ کے انصاف پر چھوڑ دیا تھا۔ مگر رخشندہ نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ساری زندگی ثمن کی طرف سے فاروق کو بدظن رکھا۔ ٹھیک ہے۔ مگر اتنا بڑا ظلم؟ فاروق نے انہیں معاف نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ طاہر کے مستقبل کے لیے رخشندہ نے ثمن کو بھیڑیے کے حوالے کیا تھا، ہاں یہ الگ بات تھی کہ بھیڑیا دراصل بھیڑیا نہ نکلا تھا صرف بھیڑیے کے بھیس میں تھا مگر وہ تو اللہ نے رحم کر دیا۔ کیا ہوتا جو ثمن کو واقعی بیچ دیا گیا ہوتا۔ اب نہ صرف طاہر کو بلکہ اطہر کو بھی۔ باپ کی طرف سے کوئی سپورٹ نہ ملنی تھی۔

☆☆☆

”آپ کہاں چلے جاتے ہیں خان؟ میں سارا دن بور ہو جاتی ہوں۔“ وہ جوتا پہن کر کھڑا ہوا تو ثمن نے اس کا ہاتھ پکڑا اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

”یار۔ وہ دوست کی جائیداد والا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ ثبوت سارے مل گئے ہیں مگر کچھ مسائل ابھی بھی باقی ہیں۔ ہم مل کر بس اس پر کام کر رہے ہیں۔“

”اپنی بیوی کا بھی کچھ خیال کریں۔ میں تو یاد ہی نہیں رہی — آپ کو۔“ اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

”تم سے زیادہ تو کچھ یاد نہیں مجھے۔“ اپنا ہاتھ

چھڑا کر ثمن کے ہاتھ تھام کر لبوں سے لگائے۔

وہ ناز سے ہنسی۔

"مجھے کچھ خریداری کرنی ہے۔ آپ آج فری ہوں گے؟"

"شام تک ممکن تو ہے۔"

"میں کھانا نہیں بناؤں گی آج۔" وہ ناز و ادا سے بولی۔

"ہم باہر کیسے کھا سکتے ہیں......؟"

"وہ مجھے نہیں پتا۔ بس آپ شام تک فری ہو جانا۔ میں ریڈی رہوں گی۔"

ابراہیم ہنسا۔

☆☆☆

اس نے چکن بریانی بنائی تھی۔ آج وہ بڑے موڈ میں تھی۔ دیگچہ اٹھا کر رستم بابا کے گھر لے آئی۔ اماں جی کو بتایا کہ وہ ان کے لیے دوپہر کا کھانا لائی ہے۔ ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ ساتھ ہی اسے یاد کیا۔ موبائل گھر چھوڑ آئی تھی۔ رستم بابا کی فیملی کے سامنے استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ ورنہ اس سے پوچھتی کہ لنچ کر لیا یا ابھی نہیں۔

لنچ کے بعد اس نے رستم بابا کی بیٹی سے فرمائش کی تھی کہ اپنے جیسی اس کی بھی بالوں کی مینڈھیاں بنا دے۔ شرمائی سی لڑکی فوراً بنانے لگی۔ یوں بھی اب اس لڑکی کی شادی بہت قریب تھی۔

ابراہیم جب واپس آیا تو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ بہت خوش ہوا۔ وہ روایتی سرحدی لباس میں ملبوس تھی۔ بال بھی ویسے۔ ماتھے اور ٹھوڑی پر ایسے نشان جیسے کھدے ہوں۔ یہ وہ لباس تھا جو ابراہیم نے اسے تحفتاً دیا تھا۔ میرون کلر کا۔

وہ دونوں بالکل پٹھان اور پٹھانی لگ رہے تھے مڈل کلاس طبقے کے۔ اس لیے کسی شاپنگ مال میں نہ جا سکتے تھے۔ کھانے پکانے کے سامان کی غرض سے ایک اسٹور میں آئے ابراہیم ٹرالی گھسیٹ رہا تھا اور وہ چیزیں رکھ رہی تھی جب اس نے جانی پہچانی آواز سنی۔

"ثمن...... یہ تم ہو؟" انگلش میں پوچھا گیا تھا۔

ثمن نے سامنے دیکھا۔ ہانی کھڑی تھی۔ ساتھ میں حاشر بھی تھا۔ وہ بھی یقیناً خریداری کر رہے تھے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اتنے گھیر دار فراک میں ثمن کا وجود جیسے چھپ سا گیا تھا۔ اتنا سارا عجیب ساز یور اور ساتھ میں وہ اس کا شوہر تھا کیا؟ لمبا تڑنگا سا آدمی براؤن کھلے سے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ سر پر پشاوری ٹوپی تیل میں ڈوبے عجیب رنگت کے بال، شیو تھی کہ بہت عجیب۔ وہ اتنا عجیب لگ رہا تھا یا نفرت میں محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نیلی آنکھیں ان پر جمائے کھڑا تھا۔

حاشر بھی ثمن کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کسی جھگی میں رہنے والی پٹھانی لگ رہی تھی۔ جسے شاید اردو بھی بولنی نہ آتی ہو۔

"ثمن یہ تم ہو؟" ہانی نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

"او ہیلو ہانیہ! کیسی ہو؟" ثمن نے اپنے ہاتھ چھڑوائے۔

"تم نے اپنی کیا حالت کر لی ہے؟ یہ کپڑے کیسے ہیں؟ اور بال۔" وہ باریک مینڈھیوں کو دیکھ کر بولی۔

"یہ ثمن، یہ ماتھے اور چن پر یہ نشان۔ یہ اصل ہیں؟ ثمن اتنا ظلم......"

"ریلیکس ہانی! تم اتنی ہائپر کیوں ہو رہی ہو۔ کیا تم نے سنا نہیں۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ میں ایک پٹھان کی بیوی ہوں۔ سرحد میں پٹھان عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"تم...... ثمن تم اس آدمی کے ساتھ کیسے رہ لیتی ہو۔ یہ......"

"ایک سیکنڈ ٹھہرو۔ کچھ بھی کہنے سے پہلے سوچ لینا۔ تم میرے شوہر کے بارے میں بات کرو گی۔ میں کوئی غلط بات برداشت نہیں کروں گی۔" وہ انگلش میں بولی۔

"ثمن۔ یہ تم نے کیا کر لیا اپنے ساتھ؟ اتنا اچھا منگیتر چھوڑ کر اس کو چن لیا؟" ہانی دکھ کی کیفیت میں

تھی۔

"کیوں ؟" ثمن ہنسی اور ایک نظر ابراہیم کو دیکھا۔"یہ زیادہ گڈ لکنگ نہیں ہے؟" وہ مسکرا رہی تھی۔ ہانی کو جیسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

"تم......" سمجھ نہ سکی کہ کیا کہے۔

"ہمیں ترس آ رہا ہے تم پر مسز خان۔ اتنی بہترین زندگی چھوڑ کر......" حاشر بولا تھا کہ ثمن نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ترس تم اپنی بیمار ذہنیت پر کھاؤ ڈاکٹر صاحب! جس کا علاج دنیا کا کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔" پھر ابراہیم کی طرف دیکھا۔"چلیں خان۔" اور ہانی کو ایک طرف کرتی آگے بڑھ گئی۔ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ابراہیم بھی ٹرالی گھسیٹتا چلا گیا۔ حاشر کا پھر سے خون کھول اٹھا۔ اس آدمی کو حاشر پر فوقیت دی تھی ثمن نے؟

وہ لوگ خریداری کر چکے تھے۔ اس نے گھر جانے کے لیے ٹیکسی روکی۔"آپ نے کہا تھا کھانا باہر کھائیں گے۔ میں نے کچھ نہیں بنایا۔" وہ بولی۔

"اس حلیے میں کہاں جائیں گے؟" ابراہیم نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر سامان رکھا۔

"کیوں ہمارے حلیے کو کیا ہوا؟"

"لوگ کہیں گے پٹھان اور پٹھانی کہیں سے ڈاکا مار کر آئے ہیں۔ کسی اچھے ہوٹل میں نہیں جا سکتے۔"

"کسی ڈھابے پر چلتے ہیں۔" ابراہیم اس کی بات سن کر حیران ہوا۔

"وہاں کیا کھاؤ گی؟"

"میں نے سنا ہے وہاں بہت چٹ پٹے سے کھانے ملتے ہیں۔ مجھے لے کر چلیں نا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے مگر......"

"آپ کبھی نہیں گئے؟ کسی ڈھابے پر؟"

"بہت دفعہ گیا ہوں مگر تم کیسے جاؤ گی؟"

"لے چلیں نا۔" اب اتنے پیار سے کی گئی فرمائش کو وہ کیسے رد کرتا۔

سامان ٹیکسی میں رہنے دیا۔ اور خود ڈھابے میں چلے گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی ساتھ لیا۔ ابراہیم کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ کسی کھانے کی جگہ پر ٹیکسی رکوائے۔ خود اندر جا کر کھانا کھائے اور ڈرائیور باہر بیٹھا انتظار کرے۔ ہاں البتہ بٹھایا اس کو الگ ہی تھا۔ ثمن نہ ہوتی تو ساتھ بٹھا لیتا۔ ڈھابے سے انہوں نے دال چاول اور مرغ چھولے کھائے۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

وہ ڈھابے سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے۔ جب اپنی گاڑی ریڈ سگنل کے پاس روکے حاشر نے انہیں ایک بار پھر دیکھا تھا۔ ہانی موبائل پر مصروف تھی۔ حاشر نے اس ڈھابے کو دیکھا جہاں سے وہ نکلے تھے۔ اس نے چہکتی ہوئی ثمن کو دیکھا۔ اس نے بے ترتیب داڑھی کی اوٹ سے ہنستے ہوئے اس چپڑاسی کے دانت دیکھے۔ جو تیز روشنیوں کے باعث نسوار زدہ دکھائی دیے تھے۔ اس کا بغیر بٹنوں والے کف والا ہاتھ ثمن کے ہاتھ میں تھا۔ اسے بے یقینی ہوئی تھی مگر سچ یہ ہی تھا۔ وہ جسے صرف ایک فیصد شک تھا کہ شاید دنیا جھوٹ بولتی ہو۔ ثمن کو پھنسایا گیا ہو۔ اسے یہ ایک فیصد امید بھی ختم ہو گئی تھی مگر ثمن کی چوائس یہ زندگی تھی؟ یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔

سگنل گرین ہو گیا تھا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں نے ہارن دیے تو حاشر ہوش میں آیا۔

☆☆☆

فاروق کے گھر چوری ہو گئی تھی۔ جب وہ ہاسپٹل سے واپس آئے تو گھر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ تجوری ٹوٹی ہوئی تھی۔ تابندہ اور رخشندہ نے رونا دھونا ڈالا۔ مگر فاروق نے انہیں منع کیا۔ تجوری میں صرف کچھ کاغذات اور دو چار ہزار روپے پڑے تھے۔ قیمتی سامان وہ لوگ بینک میں رکھواتے تھے۔

اصل پہاڑ تو طاہر کے سر پر گرا ــــ اس نے اپنے ــ دوست کے ہاتھوں چوری کروائے کاغذات میں سے مطلوبہ کاغذات کو نہ پایا۔ اس کو زمین آسمان گھومتے محسوس ہوئے وہ بھاگا بھاگا ماں کے پاس گیا۔ بپتا سنائی کیا فائدہ ہوتا۔ گھر کا کونہ کونہ

چھان لیا گیا۔ فاروق سے کہہ دیا گیا کہ سمعیہ کی شادی سے پہلے تفصیلی صفائی کر رہے ہیں۔ فاروق اصل بات سے آگاہ مزے سے بیٹھے تیز رفتار بیوی، سالی اور بیٹی کو دیکھتے۔ یہ بھی نہ پوچھتے کہ ملازمین صفائی کریں تم لوگ کیوں کر رہے ہو خیر۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پلاٹ کے کاغذات نے نہ ملنا تھا۔ نہ ملے تین مہینے مکمل ہونے والے تھے۔

"ماما، کہیں بینک میں تو نہیں؟" سمعیہ نے کہا۔

اگلے دن بینک کے لاکر دیکھے گئے۔ فاروق کا لاکر فاروق کا اور رخشندہ کا مشترکہ تھا۔ اس لیے رخشندہ نے وہ بھی چھان مارا۔ او خدایا...... اب؟

طاہر نے ماں کا زیور بیچا۔ کچھ بینک بیلنس بھی ڈال کر ایک کروڑ اکٹھا ہو گیا تھا۔ طاہر جب وہ پیسہ ان لوگوں کے حوالے کر رہا تھا تو اسے لگا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ وہ کاغذات چلے کہاں گئے تھے۔

سمعیہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ فاروق بیٹی کی شادی پر بہت خوش تھے۔

"دنیا دیکھے گی۔ فاروق اپنی بیٹی کی شادی ایسی دھوم دھام سے کرے گا۔" فاروق نے بے حد خوشی سے یہ الفاظ بولے تھے۔ سمعیہ کو نجانے کیوں شرمندگی سی ہوئی۔ جب سے اس ابراہیم خان نے بتایا تھا کہ اس نے ثمن کو بیچ دیا۔ تب سے سمعیہ گلٹی فیل کرتی تھی۔ دو مہینے پہلے اس پر ظلم توڑتے سمعیہ کو محسوس نہ ہوا تھا۔ طاہر آج کل بہت ڈپریسڈ پھرتا تھا۔

☆☆☆

سمعیہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ لوگ واقع اش اش کر اٹھے۔ تمام بینک بیلنس، تمام روپیہ پیسہ اس شادی پر لگ گیا تھا۔ ایسا بہترین انتظام، بہترین کھانا، بارات کا شاندار استقبال، ملبوسات سمعیہ کے زیورات بے تحاشا جہیز۔ مگر کیا سمعیہ خوش تھی۔

شادی کی پہلی رات...... وہ تمام رات انتظار کرتی رہی تھی۔ فائق کمرے میں نہ آیا تھا۔ صبح کے قریب وہ آیا۔ اور بتایا کہ اس کے دوست کا ایکسڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ لوگ تمام رات دوست کے ساتھ رہے۔ سمعیہ کو بہت برا لگا۔ وہ ایک شہزادی تھی اپنی نظروں میں اس نے ہمیشہ راج کیا تھا۔ ایسے میں فائق کی یہ حرکت کیا اس نئی نویلی دلہن کی یہ ویلیو تھی کہ وہ اسے یوں چھوڑ کر دوستوں کے ساتھ گھومتا رہا۔ سمعیہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ فائق کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ وہ پیر پکڑ کر معافی مانگے گا تب معاف کرے گی۔

سمعیہ کا ولیمہ دبئی میں تھا۔ اعظمیٰ یہاں اپنے رشتہ داروں کے گھر رکی تھی۔ بارات بھی وہاں سے ہی آئی تھی۔ دو دن کے بعد ان کی دبئی کی فلائیٹ تھی۔ فائق نے جتنی بار سمعیہ سے بات کرنے کی کوشش کی۔ سمعیہ بہت غصے میں رہی۔

دبئی وہ لوگ ہفتے کو پہنچے اور اتوار کو ولیمہ تھا۔ ولیمہ بھی کافی دھوم دھام سے ہوا تھا۔

ولیمہ گزر گیا۔ ایک دو دن آگے گزر گئے مگر سمعیہ اور فائق میں بات نہ ہوئی تھی۔ سب ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"فائزہ! سمعیہ کو بھی بلاؤ ناشتے کے لیے۔" اعظمیٰ نے بیٹی سے کہا۔

"ماما میں گئی تھی۔ مگر عجیب اکھڑ مزاج لڑکی ہے۔ دل کرتا ہے تو جواب دیتی ہے۔ دل نہ کرے تو جواب نہیں دیتی چاہے دس دفعہ بلاؤ۔ میں نوکر نہیں ہوں اس کی۔"

"کیا مسئلہ ہے تمہاری بیوی کے ساتھ؟" اب اعظمیٰ نے فائق سے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ اس لڑکی کو کیا مسئلہ ہے؟" فائق لاپروائی سے بولا۔ اتنے میں اس کے ساتھ والی چیئر پر سمعیہ آ بیٹھی۔ "مجھے ڈسکس کیا جا رہا ہے؟" خوش مزاجی سے اس نے طنز کیا۔

"یہ آپ کوئی نویلی دلہن لگتی ہے ماما؟ لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟ اتنی غصیلی اور سخت مزاج؟" فائق غصے سے بولا۔

"سیانے کہہ گئے ہیں۔ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔" سابقہ انداز میں کہہ کر وہ جوس پینے لگی۔

"وہ تو خیر دکھائی دے رہا ہے۔ تم سے شادی کرنا کچھ اتنا اچھا فعل نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں تمہیں جھیلنا پڑے گا۔ چلو اللہ مالک ہے۔" وہ مصنوعی افسردگی سے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔ وہ چھڑ بھی گئی تھی۔ کرسی گھسیٹ کر فوراً اٹھ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ مجھے جھیلنا پڑے گا؟ میں خود تمہاری زندگی میں نہیں آئی۔ تمہاری امی نے میرا رشتہ مانگا تھا۔ ورنہ تم سے کون شادی کرتا۔" اعظمیٰ فائزہ اور اظہر نے حیرت سے اس لڑکی کو دیکھا۔ جس کی ابھی کچھ دن پہلے شادی ہوئی تھی اور تن کر اپنے شوہر کے روبرو کھڑی تھی۔

☆☆☆

"آنٹی! فائق کہاں ہے؟" وہ اعظمیٰ کے پاس آئی تھی۔

"مجھے کیا پتہ شوہر تمہارا ہے پوچھ مجھ سے رہی ہو۔" اعظمیٰ اپنی الماری سیٹ کر رہی تھیں۔ مصروف انداز میں بولیں۔

"میرا شوہر ہونے سے پہلے وہ آپ کا بیٹا بھی ہے آنٹی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"شاباش ہے بچی!" اعظمیٰ پلٹیں۔ "ویسے تو کبھی تم لڑکیاں مانتی نہیں ہو کہ تم لوگوں کے شوہر کے پہلے بھی کوئی رشتہ دار یا ماں، بہن تھی۔ طنز کے وقت خوب یاد آتا ہے۔"

"ماما!" باہر سے فائق کی آواز آئی تھی۔

سمعیہ باہر لاؤنج میں چلی آئی۔ اعظمیٰ بھی آئی تھیں۔

فائق کی گود میں چھوٹا سا بچہ تھا۔ اعظمیٰ بچے کی طرف لپکی تھیں سمعیہ حیران۔ "یہ کون بچہ ہے۔" اس نے پوچھا۔

"آ جاؤ دادی کے لعل دادی کے پاس آ جاؤ۔" اعظمی صدقے واری جا رہی تھی۔

"یہ فواد ہے میرا بیٹا۔" فائق نے بتایا۔ سمعیہ تو جیسے زمین میں گڑ گئی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ تین چار مہینے کا گل گوتھنا بچہ وہاں کتنی دیر رہا۔ سب کتنے خوش ہوئے اسے کتنا پیار کیا۔ یا کیا ہوا۔ مگر لاؤنج خالی بھی ہو گیا تھا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

"دیکھو سمعیہ! اس لڑکی نے فائق کو پھانس لیا۔ جیسے ہی وہ یہاں دبئی آیا۔ کوئی ہندوستانی مسلمان ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ اگر تم فائق کا دل جیتنے کی کوشش کرو گی۔ اس کا خیال رکھو گی۔ تو وہ آہستہ آہستہ اس عورت کو بھول جائے گا۔"

سمعیہ کو لگا وہ پاتال میں گر گئی ہو۔ کیا وہ اتنی گھریلو بی بی تھی؟

کیا وہ اتنی گئی گزری تھی کہ شوہر کے پلٹنے کا انتظار کرتی تنہائی کاٹتی۔ فائق نے اسے پاکستان میں خواب دکھائے اور یہاں آ کر اسے کوئی اور مل گئی۔ اب اس دھوکے میں رکھ کر شادی کے بعد یہ اعظمی آنٹی چاہتی تھیں کہ اٹھارویں صدی کی عورت کی طرح کھانے پکا پکا کر اور کپڑے پریس کر کے شوہر کی واپسی کا انتظار کرے؟ کیا اس کی ذات اتنی ارزاں اور معمولی تھی؟

اتنی خوب صورت بیوی پانے پر بجائے فائق خوشی سے پھولے نہ سماتا اس نے تو اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ اور وہ اس انتظار میں تھی کہ وہ پیروں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگے گا؟

اتنا بڑا دھوکا۔

"آنٹی۔ آپ نے مجھ سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے؟" وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔

"مجھے ایک بات بتاؤ لڑکی۔ پاکستان میں بڑی معصوم بنتی تھیں تم۔ یہ اتنی لمبی زبان اس وقت کہاں چھپا رکھی تھی تم نے؟"

"تو آپ مجھے معصوم سمجھ کر بیاہ کرنے آئیں تاکہ مجھے نوکر بنا کر رکھ سکیں بیٹا تو آپ نے پہلے سے بیاہ رکھا تھا۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟"

"کیا کیا تمہارے ساتھ؟ اتنے لائق فائق دبئی کے رہنے والے لڑکے سے شادی کروا دی۔ اس لڑکی سے فائق نے کورٹ میرج کر لی تھی۔ بہو تو اس گھر کی تم ہو۔ جسے دل سے قبول کیا ہے ہم نے۔ دھیرج رکھو۔ تمہارے خیال رکھنے سے، پیار سے وہ واپس آ جائے گا تمہارے پاس۔"

"دل سے مجھے آپ نے قبول کیا۔ فائق نے نہیں۔ فائق اس عورت کا ہے جس سے اس نے دل لگایا۔ میری زندگی آپ لوگوں نے مل کر خراب کر دی۔"

"ارے مرد کے دل کا کیا ہے۔ پلٹنے میں دیر نہیں کرے گا۔ فائق کو کوفتے بہت پسند ہیں۔ آج تم اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے کھانا بناؤ۔ پھر دیکھنا۔ مرد کا دل معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ دیکھنا کھاتے ہی متاثر ہو جائے گا اور اگر تم ایسے ہی......"

وہ حیرت سے اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے دوست کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور اب دھڑلے سے مشورے دے رہی تھی۔ کیا سمعیہ اتنی ارزاں تھی؟ اسے دوسری، شوہر کی ان چاہی بیوی بننا منظور نہ تھا۔

اس نے رو رو کر ماں کو سب کچھ بتایا۔

طاہر ڈپریشن کا شکار ہو رہا تھا۔ اوپر سے سمعیہ کے معاملے نے گھر کو بہت زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ رخشندہ رو رو کر بے حال تھیں۔ تابندہ خود بھی رو پڑتی۔ فاروق دیکھتے رہتے۔ انہوں نے سمعیہ کے معاملے کو اللہ پر چھوڑا تھا۔ انہیں جھرجھری سی آ جاتی۔ اللہ کی لاٹھی بہت بے آواز ہے۔ وہ لوگ دبئی آئے۔

"میں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ سمعیہ کی بات پاکستان سے طے کر کے گئی تھی۔ یہاں آ کر بیٹا ناخلف نکلا تو میری کیا غلطی؟ بہت ساری عورتوں کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔ مگر ایسے ری ایکٹ کوئی

نہیں کرتا۔ ہم نے اسے دل سے قبول کیا ہے۔ یہ ہماری بہو ہے۔ تھوڑی ہمت سے کام لے۔''

''آپ کو ہمیں انکار کر دینا چاہیے تھا۔ اولاد جوان ہو جائے تو ماں باپ کی نہیں سنتی۔ یہ کوئی انہونی نہیں مگر بہن۔ یہ جو آپ نے کیا...... یہ ایک بیٹی کے ساتھ دھوکا اور ناانصافی ہے۔ آپ پہلے بتا دیتیں۔ ہم سمعیہ کی شادی کہیں اور کر دیتے۔ اب فائق بیٹا اس عورت کو بھولے گا یا نہیں۔ یہ قسمت کی بات ہے۔ میں تو چاہوں گا کہ نہ چھوڑے اس عورت کو۔ کیونکہ اب وہ دو نہیں تین ہیں۔ ان کا بچہ بھی ہے۔ سمعیہ کی زندگی آپ نے ناحق خراب کرنے کی کوشش کی۔ اگر میں کہوں کہ اگر ایسا کچھ اللہ نہ کرے فائزہ بیٹی کے ساتھ ہو۔ دیکھیں میں بد دعا نہیں دے رہا۔ مگر اپنا بویا کاٹنا ضرور پڑتا ہے۔ دوسروں کی بیٹیوں کے لیے اتنا سخت سوچتے ہوئے اپنی بیٹی پر نظر ضرور ڈالنی چاہیے۔ میری کوئی بات بری لگی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہی ہے۔ اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔'' فاروق بہت بردباری سے بولے تھے۔ رخشندہ، سمعیہ اور تابندہ نے نظریں چرائی تھیں۔

''یہ ساری باتیں آپ پر جچتی نہیں فاروق بھائی۔ دوسروں کی بیٹی چھوڑیں آپ نے تو اپنی بیٹی کے ساتھ اچھا نہ کیا۔ ہاں سچ ہے کہ اس نے پیون سے افیئر چلا لیا مگر آپ اسے سمجھاتے کسی اچھی جگہ بیاہتے اسے۔ آپ نے تو بوجھ اتارا ہو نہہ۔ آئے بڑے۔''

رخشندہ نے حیرت سے اعظمیٰ کو دیکھا۔ کیا ہوئی وہ ڈیسنٹ، اور سوبر سی اعظمیٰ۔ یہ تو کوئی محلوں میں رہنے والی لڑاکا سی عورت تھی۔

''ثمن کی اچھے گھر نہ ہو سکی۔ سمعیہ کی تو اچھے گھر میں ہوئی تھی شادی۔ اچھے لوگوں نے صحیح ہونے کا ثبوت دیا۔'' رخشندہ تنک کر بولی۔

''رہنے دیں رخشندہ جہاں آنکھوں سے لحاظ ختم ہو جائے اور زبانیں کھل جائیں۔ وہاں اور کچھ باقی نہیں رہتا۔''

''میں اپنی بیٹی کو یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ اعظمیٰ میں سمعیہ کو لے جا رہی ہوں۔ جب فائق اس عورت کو چھوڑ دے تب مجھ سے بات کرنا۔ دعا کرتی ہوں کہ اللہ فائزہ کے نصیب اچھے کرے۔ تمہارا کیا اس کے آگے نہ آئے۔'' یوں شادی کے صرف تیرہ دن بعد سمعیہ واپس میکے آ بیٹھی۔

☆☆☆

گھر کا عجیب سا ماحول ہو گیا تھا۔ طاہر پریشان سمعیہ دکھی۔ رخشندہ سخت پشیمان تھی۔ وہ ثمن کے لیے فرعون بن گئی تھی۔ نہ تو ہاتھ کچھ آیا۔ الٹا دنیا بھی گئی اور آخرت بھی گئی۔ اولاد کا دکھ اس دنیا کا سب سے بڑا دکھ ہے۔

شدید ڈپریشن کی وجہ سے سمعیہ کی ایک دوست نے اسے مصروف رہنے کا مشورہ دیا۔ آج کل کے دور میں موبائل ایک بہترین ٹائم پاس ہے۔ گوگل، اسکائپ، یوٹیوب، واٹس ایپ، ٹوئیٹر۔ سمعیہ نے بھی یہ ہی کہا۔ فیس بک آئی ڈی بنالی۔ دھڑا دھڑ خدا جانے کون کون سے پیج لائک کرتی رہی۔ کیا کیا کرتی رہتی۔ رخشندہ اسے منع نہ کرتی۔ اس کی بیٹی کے آگے اس کا اپنا کیا آ گیا تھا۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ مالی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ سچ یہ تھا کہ سمعیہ کے آگے اس کا اپنا کیا آیا تھا۔

☆☆☆

فیس بک پر وہ مصروف تھی۔ ایک کے بعد ایک تصویر۔ کبھی نیوز، کبھی کوئی جوک۔ ''وی آر ہیونگ فن۔'' (ہم خوش ہو رہے ہیں۔) کے نام سے ایک پیج تھا جس پر کچھ تصاویر اپ لوڈ تھیں۔

سمعیہ اگر کپل دیکھتی تو نجانے اسے کیا ہونے لگتا تھا۔ دل کٹنے لگتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں ایسی ہی خوش گمان تھی جیسے ہر لڑکی ہوتی ہے۔ کہ وہ اس دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے۔ ہر کوئی اس کی خواہش کرتا ہے۔ ہر کوئی اسے پیار کرتا ہے۔ وہ بے حد خیال رکھے جانے کے قابل تھی۔ ایسے میں اسے بے حد

ارزاں کر دیا گیا تھا۔ وہ جس کو لگتا تھا کہ فائق اسے پا کر اپنی خوش بختی پر یقین نہ کرے گا۔ اس فائق نے اسے دیکھنا تک گوارہ نہ کیا تھا۔

اسے لگتا تھا کہ فائق اسے پلکوں پر بٹھا کر رکھے گا، شہزادی سمجھے گا۔ اس فائق نے اسے گھر کی ملازمہ کا درجہ دیا تھا۔ یا گھر میں رکھی کوئی بے کار یا جان چیز۔ ایسے میں کپل دیکھنا اس کے لیے بہت تکلیف دہ بات تھی۔ مگر ''وی آر ہیونگ فن'' پیج پر کئی جوڑے تھے۔ وہ کسی جنگل میں تھے۔ خوش ہو رہے تھے۔ اور ایک وہ تھی۔

وہ پیج اوپن کر کے ایک کے بعد ایک تصویر دیکھنے لگی۔ یہ ساؤتھ افریقہ کا کوئی جنگل تھا۔ سبھی جوڑے انگریز تھے۔ ایک تصویر پر وہ ٹھٹکی۔ وہ تصویر بے حد خوب صورت تھی۔

ایک لڑکی جنگل میں کھڑی تھی۔ آس پاس بہت سارے درخت تھے، نیچے پھول تھے۔ اس لڑکی نے گہرے نیلے رنگ کی جینز کے ساتھ سرخ فراک جیسی ٹاپ پہن رکھی تھی۔ جس میں زرد رنگ کے پھول تھے۔ زرد رنگ کے کاؤ بوائے شوز پہن رکھے تھے۔ لمبے بال کھلے ہوئے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ لمبے قد کا چوڑا چکلا۔ سفید رنگت' بھورے بال۔ چوڑا سا چہرہ گہرے نیلے رنگ کی جینز کے ساتھ زرد ٹی شرٹ۔ زرد بوٹ۔ وہ لڑکی کے پیچھے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے لڑکی کی پھولوں کے لیے ایکسائیٹمنٹ اور خوشی محسوس کر رہا ہو۔ وہ دونوں ساتھ تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پارٹنر تھے۔ مگر کچھ اور بھی تھا جو انہیں پارٹنر ظاہر کر رہا تھا۔ دونوں نے ایک جیسی ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ لڑکی کی ٹاپ میں جو زرد رنگ تھا اس رنگ کی لڑکے نے شرٹ پہن رکھی تھی۔ جینز کے رنگ بھی ایک سے تھے۔ سمعیہ نے بہت تفصیل سے دیکھا۔ اتنا ہینڈسم لڑکا کچھ دیر تو وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ مگر اس کی نظروں کی سمت بھی دیکھنا ضروری تھا۔ اب اس نے لڑکی کے چہرے پر غور کیا ...... یہ لڑکی تو اس نے کہیں ...... ''او میرے خدا۔ یہ تو ثمن ہے۔'' اس نے سی مور ———— پر پنچ کیا۔ کئی تصاویر اس جوڑے کی آ گئیں۔

ایک تصویر میں دونوں آبشار کے قریب کھڑے تھے۔ ثمن ہی تھی وہ۔ پانی سے کھیلتے ہوئے بے تحاشا خوش ہو رہی تھی۔ اس کے بال ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ لڑکا کچھ دیر درخت سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اگلی تصویر میں دونوں درختوں میں سے چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ دونوں نے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

''مسٹر اینڈ مسز ابراہیم خان۔'' اس نے نام پڑھا۔ اسے یاد آیا پاپا نے اس پٹھان کا نام ابراہیم خان ہی لیا تھا۔ وہ فوراً ماں کے پاس آئی۔

''ماما...... یہ دیکھیں، یہ ثمن ہے نا؟''

''ہاں مگر یہ لڑکا کون ہے؟ نسوار خان نے کہا تھا اس نے ثمن کو بیچ دیا ہے تو......''

سمعیہ نے فوراً ابراہیم کی تصویر کو کروپ کر کے الگ کیا۔ کمپیوٹرائز طریقے سے نسوار خان جیسی داڑھی اور ٹوپی پہنائی۔ اوہ گاڈ یہ نسوار خان اور درحقیقت ابراہیم خان تھا۔

یہ سب کیا تھا؟ خواب تھا یا حقیقت؟ نسوار خان ایک بہروپیا تھا؟ مگر...... سمعیہ کا دماغ الجھ گیا تھا۔ رخشندہ بھی حیران تھی۔

سمعیہ ان کی اور تصاویر دیکھنے لگی۔ یہ تصویر بہت رومینٹک تھی۔ جنگل میں یہ تصویر جس زاویے سے لی گئی تھی اس میں پیچھے کافی پھول اور سبزہ تھا۔ درمیان میں ایک درخت، درخت کے اردگرد کافی پھول تھے۔ درخت کے دائیں جانب اور پیچھے سرخ، بائیں جانب پیلے اور آگے گلابی پھول تھے۔ درخت کے پاس ثمن کھڑی تھی سامنے ابراہیم کھڑا تھا۔ ابراہیم کا سائڈ پوز تھا۔ وہ والہانہ انداز میں قدرے جھک کر اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ثمن کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہاتھ ابراہیم کے سینے پر یوں رکھے ہوئے تھے جیسے اسے ہٹا رہی ہو۔ اس تصویر میں کچھ غلط نہ تھا، کچھ عجیب نہ تھا مگر...... کچھ تو تھا۔

"بہت پیار کرتا ہے ابراہیم اس سے۔" سمعیہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ ہر کوشش کے باوجود ثمن سمعیہ سے آگے ہی تھی۔ خوب صورتی میں تو تھی ہی قسمت میں بھی تھی۔

کئی اور تصاویر تھیں۔ جن میں فیملی پکچرز تھیں سمعیہ نے غصے سے موبائل دور پھینک دیا۔ وہ الجھ گئی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ ثمن ساؤتھ افریقہ میں کیوں اور کیسے تھی؟ ابراہیم خان اگر یہ تھا تو وہ کون تھا؟ یہ کیسی گتھی تھی؟

☆☆☆

فاروق بہت خوش خوش آفس سے آئے تھے۔

ان کی ریٹائرمنٹ میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔

"کیا بات ہے۔ آج بڑے خوش ہیں۔" رخشندہ نے پوچھا۔ خود وہ بری طرح اپ سیٹ تھی۔ طاہر کا کمرے میں بند رہنا الگ، سمعیہ کا اجڑ جانا الگ اور ابراہیم خان اور ثمن کی گتھی الگ۔

"ہاں بہت خوش ہوں۔ سب کو بلاؤ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

"جی اچھا۔"

"یہ طاہر کمرے میں کیوں بند رہنے لگا ہے۔ اس بزنس کا کیا ہوا جو دوست کے ساتھ مل کر شروع کیا تھا؟" وہ انجان بنتے ہوئے معصومیت رخشندہ نے نظریں چرائیں۔

"اور اس کی گاڑی کہاں ہے؟"

"خراب ہے۔ ورکشاپ میں کھڑی ہے۔" رخشندہ نے جھوٹ بولا۔ طاہر گاڑی بیچ چکا تھا۔

"آپ بتائیں۔ اتنے خوش کیوں ہیں؟" پھر ملازمہ سے بولی۔ "سلمہ کھانا لگاؤ۔"

"ہاں خوش ہوں۔ بہت خوش دراصل میں نے اپنی تمام ریٹائرمنٹ ایدھی میں دے دی ہے۔ آج کاغذی کارروائی مکمل ہو جائے گی۔ رقم آفس سے ایدھی ہوم چلی جائے گی۔ یہ نیک کام کر کے میں بہت مطمئن ہوں۔" رخشندہ کے سر پر بہت وزنی پتھر آ کر گرا تھا جیسے۔

"کیا؟"

"ہاں۔ ایک اور خوشخبری ہے۔ آفس میں، میں اپنے بعد کسی ایک فرد کو جاب دلوا سکتا تھا۔ یہ سہولت ہوتی ہے تو۔ طاہر تو بزنس کر رہا ہے۔ اطہر ابھی پڑھ رہا ہے تو میں نے خاور کو جاب دلوا دی ہے۔ تابندہ کے بیٹے کو اب تو خوش ہونا؟"

"مگر...... آپ نے تو کہا تھا کہ اطہر کو آفس میں جاب دلوائیں گے۔" وہ زلزلوں کی زد میں تھی۔

"اطہر ابھی پڑھ رہا ہے۔ تعلیم مکمل ہو جائے تو طاہر کے بزنس میں شامل ہو جائے گا۔ اتنا بڑا بزنس ہے گاڑیوں کا۔ دونوں بھائی کر لیں گے۔" لاپروائی اور مزے سے وہ بول رہے تھے۔ رخشندہ نے بزنس اور خاص طور پر "اتنے بڑے بزنس" پر سر ہی تھام لیا۔ وہ نکما تو گھر بیٹھا ہوا تھا۔

"ریٹائرمنٹ کے پیسے ایدھی میں کیوں دیے۔" اس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو بیٹے بزنس کر رہے ہیں۔ بیٹیوں کی

شادی ہو چکی ہے۔ اب بیٹے ہمیں پالیں اور پینشن بھی تو ہوگئی میری۔"

"میرے خدایا۔ اتنی بڑی رقم فالتو تھی؟" وہ رونے والی ہوگئی۔

"اللہ کی راہ میں فالتو کی چیز نہیں دی جاتی۔ وہ میری حق حلال کی کمائی تھی۔ اللہ میرے گناہ معاف کرے۔"

"اور آپ کی فیملی؟ وہ کیا کرے گی۔"

"فیملی کون سا میرے پیسے کی محتاج ہے؟ سب کامیاب ہیں۔ خاص طور پر طاہر۔"

"اف۔" رخشندہ کو لگا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ دو امیدیں تھیں۔ اطہر کی سرکاری نوکری وہ اس بے کار خاور کو دلوادی۔ ریٹائرمنٹ وہ صدقے کے طور پر دے دی۔ کروڑوں کی رقم بیٹی اجڑ کر گھر آ بیٹھی تھی۔ بیٹے بے کار بیٹھے تھے۔ پیسہ پاس نہ رہا تھا۔ رخشندہ کا دل چاہا دیوار سے سر دے مارے۔

اسے فاروق پر تو غصہ آیا ہی۔ تابندہ اور خاور پر بھی بہت آیا۔ مگر کرتی کیا؟

☆☆☆

سمعیہ نے فیس بک پر ابراہیم خان کو سرچ کیا۔ آسانی سے مل گیا تھا۔ اس نے اسے کھولا۔ دو، ڈھائی ماہ پہلے کی تصاویر دیکھنی شروع کیں۔ دیکھتے دیکھتے اس کی شادی کی تصاویر آئیں۔ وہ تصاویر جو پاکستان میں بنیں سرخ رنگ کے لباس میں ملبوس ثمن، شلوار سوٹ میں ملبوس ابراہیم۔ ولیمہ (رسیپشن) ثمن سفید برائیڈل گاؤن میں ملبوس تھی۔ فرنچ جوڑا۔ بہت اچھا میک اپ۔ ابراہیم کے تو چہرے پر نظر نہ ٹکتی تھی۔ فیملی فوٹوز۔ ایک اور فیملی جن کے دو بچے تھے۔ ان کے ساتھ پکچرز ان کی الگ سے پکچرز۔ جنگل کی پکچرز۔ ایک تصویر میں ثمن سرحدی علاقائی میرون لباس میں کھڑی تھی۔ ہیئر اسٹائل پٹھانوں جیسا۔ ماتھے اور ٹھوڑی پر کھدے نشانات جو ظاہر ہے صرف میک اپ تھا۔ مگر وہ دیسی نخرے سے فراک دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پھیلاتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ ساتھ ایک شعر لکھا تھا۔

جمال یار کو دیکھا تو یہ جانا
عطا کرنے میں رب کتنا سخی ہے

سمعیہ کی آنکھیں نہیں دل رو پڑا تھا۔ خون کے آنسو رو پڑا تھا۔ شوہر کے معاملے میں، محبت کے معاملے میں وہ کتنی بدقسمت نکلی تھی اور ثمن۔

تابندہ فاروق کو شکریہ کہتے تھک نہ رہی تھی خاور کا تو مستقبل سنور گیا تھا۔ گورنمنٹ کی نوکری آج کل کسے ملتی ہے آسانی سے۔ رخشندہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ عظمیٰ نے سمعیہ کو طلاق دینے کی دھمکی دی تھی کہ خود آجائے ورنہ فائق طلاق بھیج دے گا۔

دروازے پر بیل ہوئی تھی۔ تھکے انداز میں طاہر نے دروازہ کھولا۔ پوسٹ مین نے ایک براؤن لفافہ اسے دیا تھا۔ طاہر نے کھولا۔ فاروق نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اندر لے گئے۔ فاروق نے کھولا ثمن اور ابراہیم کی تصویر تھی۔ وہی تصویر جس کو دکھا کر ثمن کو برباد کیا گیا تھا۔ فاروق دیکھ رہے تھے۔ پچھلی سائڈ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ طاہر نے کہا۔ "یہ کیا لکھا ہے؟"

" طاہر بھائی، جو چیز جس کو دینے کا وعدہ آپ نے اس سے کیا۔ وہ اس تک پہنچ چکی ہے اور جو اس کے بدلے میں آپ کو ملنا تھا وہ آپ کے اکاؤنٹ میں جا چکا ہے۔
آپ کی بہن۔ ثمن"

طاہر یوں تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

سمعیہ اپنا سامان پیک کر چکی تھی۔ اس نے واپس دبئی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ثمن نے زمین اسی آدمی کو بیچ کر رقم طاہر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دی تھی۔

رخشندہ کو بے حد افسوس تھا مگر ...... جو بویا جائے وہ کاٹنا تو پڑتا ہے۔

☆



عطیہ خالد

آئینہ

کالج کے بعد اس نے ایک اسکول میں جاب کی تھی۔ پرائیوٹ اسکول تھا' تنخواہ بھی کم تھی لیکن وہ یونیورسٹی جانے تک فارغ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

اسکول میں موبائل فون کا استعمال منع تھا لیکن ٹیچرز واش روم میں جا جا کر کتنی کتنی دیر تک فون پر بات کرتی رہتی تھیں۔ بچوں کو ہیڈ ڈاؤن کروا کر وہ اپنی آئی برو بنوایا کرتی تھیں۔ کبھی کسی کی شادی کی البم دیکھا کرتی تھیں۔ کبھی موبائل پر کوئی ویڈیو نکال کر دیکھتی رہتی تھیں یا فیس بک پر مصروف رہتی تھیں۔

اسکول کے بچوں کو ٹیوشن کے لیے مجبور کرنا بھی منع تھا کہ ٹیچرز اسکول میں ہی بچوں کو دل لگا کر پڑھائیں کہ انہیں ٹیوشن کی ضرورت ہی نہ رہے۔ لیکن اس نے دیکھا تھا کہ ٹیچرز ماؤں سے چپکے چپکے معاملات طے کر رہی ہوتی تھیں۔ ایسی مائیں جو یہ چاہتی تھیں کہ بس ان کا بچہ ہی فرسٹ آئے وہ ایسی لالچی ٹیچرز کے پاس بچوں کو ٹیوشن بھیجنے پر مجبور تھیں۔

پرنسپل صاحبہ ہر آدھے گھنٹے بعد آ کر کلاسز کا راؤنڈ لیا کرتی تھیں کہ ٹیچرز آپس میں باتیں تو نہیں کر

رہیں۔لیکن پرنسپل کو پتا ہی نہیں تھا کہ ٹیچرز نے کوریڈر کے ایک کونے پر ایک چھوٹا سا آئینہ چھپا کر رکھا ہوا۔ جیسے ہی پرنسپل اپنے آفس سے نکلتیں، ٹیچرز کو پتا چل جاتا تھا۔

وہ اس سارے سسٹم پر حیران ہوتی تھی۔سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ جو بچے محنتی تھے اور فرسٹ آسکتے تھے' وہ اس لیے فرسٹ نہیں آتے کیونکہ وہ ٹیچر کے پاس ٹیوشن کے لیے نہیں جاتے تھے۔کسی بچے کی محنت کا حق مار کر کسی دوسرے کو پوزیشن دے دینا کہاں کا انصاف تھا۔

ایک دو بار اس نے ٹیچرز سے بات کی کہ ایسے اپنے کام میں ڈنڈی مارنا بھی جائز نہیں ہے۔ناجائز کمائی صرف کالے دھن سے ہی نہیں حاصل ہوتی۔ اپنے کام سے ناانصافی کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔کچھ تو ہنس دیتیں۔کچھ اسے اس کے پیٹھ پیچھے — پاگل کہتیں۔

ربر پنسل لے کر اس نے ٹیچرز کو ٹیوشن والے بچوں کے ٹیسٹ ٹھیک کرتے ہوئے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اس کی کلاس کا ایک طالب علم ارتضیٰ بہت لائق تھا۔وہ گھر پر ہی اپنے دادا کے پاس پڑھتا تھا۔وہ ہمیشہ چوتھے یا پانچویں ہی آتا تھا۔اس بار اس نے ان سب کے ٹیسٹ لیے تو وہ ارتضیٰ کا ٹیسٹ پیپر لے کر پرنسپل کے آفس میں چلی گئی اور انہیں اس کے سب ٹیسٹ دکھائے کہ دیکھیں یہ بچہ اتنا لائق ہے پھر بھی پوزیشن نہیں لیتا۔جو بچے فرسٹ آئے تھے' ان کے ٹیسٹ بھی دکھائے کہ میڈم دونوں کا فرق دیکھ لیں۔پرنسپل نے بغور جائزہ لیا۔کلاس ٹیچر کو بلایا اور باز پرس کی۔ٹیچر کا منہ بن گیا۔

''ارتضیٰ نقل بہت کرتا ہے میڈم۔'' مس کو تو آگ ہی لگ گئی۔

''نہیں میڈم وہ بہت لائق بچہ ہے۔اسے نقل کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میڈم میں اس اسکول میں تین سال سے جاب کر رہی ہوں۔ یہ تو ابھی دو مہینے پہلے ہی آئی ہیں۔ہمیں اسکول کے سب بچوں کے بارے میں اچھی طرح سے معلوم ہے۔وہ بہت چالاکی سے نقل کرتا ہے۔کسی کو پتا بھی نہیں چلنے دیتا۔''

وہ اتنی صفائی سے جھوٹ بولنے والی ٹیچر کا منہ دیکھتی رہ گئی جو سات سال کے بچے کی محنت پر صرف اس لیے پانی پھیر رہی تھی کہ اسے اپنی مرضی کے بچوں کو فرسٹ لانا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک بوتیک کے اسٹور میں اسسٹنٹ سپروائزر کی جاب مل گئی تھی۔اس کا کام مشکل تھا لیکن اسے اچھی تنخواہ دی جارہی تھی۔لیکن آئے دن کوئی نہ کوئی میٹریل کم ہو جاتا تھا۔جو لوگ کپڑے کی کٹنگ کرتے تھے وہ بچے ہوئے ٹکڑے گھر لے جاتے تھے۔کسی کو کچھ بھی گھر لے کر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن کوئی باز ہی نہیں آتا تھا۔

بٹن، موتی، الاسٹک، لیس، وغیرہ کے پیکٹ کے پیکٹ آئے دن غائب ہوتے رہتے تھے۔کوئی لنچ باکس میں چھپا کر لے جاتا تھا تو کوئی کپڑوں کے نیچے چھپا کر۔آئے دن اس کی کسی نہ کسی سے لڑائی ہو رہی ہوتی تھی۔میڈم اس پر چیختی تھیں' اور وہ ان سب سے پوچھتی تھی کہ یہ چیزیں گئیں کہاں؟

کئی بار اس نے سب کو قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔حدیثوں کا حوالہ دیا کہ ایسا کرنا بھی چوری ہی ہوتا ہے۔وہ اپنی حلال کی کمائی میں حرام شامل نہ کریں لیکن وہاں کوئی باز نہیں آرہا تھا۔حتیٰ کہ سنیئر سپر وائزر جس کی تنخواہ تیس ہزار تھی وہ بھی اپنے بیگ میں شیفون کے دوپٹے ڈال کر لے جاتی تھی۔ایک دن اس نے انہیں پکڑ لیا۔

''میڈم! اگر آپ پوری ایمان داری سے کام کریں گی تو آپ کے تیس ہزار ہی تیس لاکھ بن جائیں گے۔آپ کے رزق میں اللہ اتنی برکت دے دے گا کہ

آپ کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' اس نے بہت افسوس سے میڈم سے کہا۔

اس کی نصیحتوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ناچار اس نے جاب ہی چھوڑ دی۔

وہ روز روز ہر کسی سے لڑ نہیں سکتی تھی۔ ان کی تلاشی نہیں لے سکتی تھی۔ لیکن وہ چپ چاپ یہ سب دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''اسکول سے بھی لڑ کر نکلی تھیں۔ یہاں سے بھی لڑ کر آ گئی ہو۔ تم چاہتی کیا ہو؟'' امی کے تیور بہت خراب تھے۔

''میں لڑتی نہیں ہوں امی۔ سب کو یہ یاد دلاتی ہوں کہ ایسے نہ کریں۔ اللہ کو یہ پسند نہیں ہے۔'' وہ بجھے دل سے دوپہر کا کھانا کھا رہی تھی۔

''بیٹا دنیا ایسی ہی ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ جسے اللہ ہدایت دے دیتا ہے' اسے سب کچھ دے دیتا ہے۔ یہ بے ہدایتے لوگ ہیں۔ انہیں حرام حلال کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ کبھی قرآن کو کھول کر پڑھا ہو تو پتا ہو انہیں کہ اللہ کو کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔ تم فکر نہ کرو' میں نے تمہارے انکل سے تمہاری جاب کی بات کی ہے۔'' اس کی اداسی دیکھ کر امی نرم پڑ گئیں۔

ایک مہینے بعد اسے انکل کے توسط سے ایک چینل میں جاب مل گئی۔ انکل نے کچھ ایسے جاب ملنے کی خوشخبری سنائی تھی کہ جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔

''اب جتنی تمہاری عقل کام کرے گی' اتنا ہی تم پیسہ کماؤ گی۔ چھاپو جتنا پیسہ چھاپ سکتی ہو۔'' انکل ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے۔

وہ سمجھ نہیں سکی کہ انکل کا اس بات سے کیا مطلب ہے۔ ایک سیلری والی جاب میں وہ اپنی مرضی سے کیسے پیسہ چھاپ سکتی ہے۔ منافع وغیرہ کی امید تو اپنے بزنس میں رکھی جاتی ہے۔ جاب میں ایک الاؤنس یا سیلری کے بڑھنے کی امید ہوتی ہے پر وہ بھی سالوں بعد۔

انکل بھی اسی چینل میں ایڈیٹنگ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ شکریے کے طور پر امی نے انکل کو مٹھائی بھجوائی تو انہوں نے مٹھائی رکھ لی اور صاف صاف یہ بھی کہہ دیا کہ ''بیٹیا کی پہلی تنخواہ ان کی ہو گی۔ آخر کو اتنی بڑی جاب دلوائی ہے۔''

وہ ہکا بکا رہ گئی۔ رشوت کی یہ نئی قسم اسے اب معلوم ہوئی تھی۔

''اگر ایسی ہی بات تھی تو انکل پہلے بتاتے کہ جاب ملنے پر تمہیں' مجھے پہلی سیلری دینی ہو گی۔ میں اسی وقت انکار کر دیتی۔ رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنمی ہوتے ہیں۔''

''رشوت نہیں ہے یہ حرا۔ اتنا بڑا کام کیا ہے انہوں نے کچھ دینا دلانا تو ہمارا فرض بنتا ہے۔ آج کل سب جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''ہم نے ہر گناہ کو ''ایسا ہی ہوتا ہے'' کہہ کر جائز کر لیا ہے امی۔ اب تو ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہو رہا کہ ہم کتنے بڑے بڑے گناہ بس ایسے ہی کرتے جا رہے ہیں۔ یہ رشوت ہی ہے۔ ماڈرن زمانے کی رشوت۔''

امی چپ رہیں۔

اس کی پہلی تنخواہ آئی تو سبھاؤ سے انکل کو دے آئیں۔ وہ بہت دن تک خفا رہی۔ امی نے اسے منانا چاہا تو وہ خفگی سے بولی۔

''آپ نے مجھے بھی ایک گناہ میں شامل کر لیا۔''

''تمہیں اتنی بڑی نوکری پر لگوایا ہے انہوں نے۔ کوئی بات نہیں اگر تھوڑا بہت انہیں بھی دے دیا تو۔''

''دینے پر مجھے اعتراض نہیں ہے امی۔ اسلام نے دینے دلانے کے کتنے طریقے بتائے ہیں ہمیں۔ تحفہ دو۔ قرض دو۔ خیرات دو۔ صدقہ دو۔ ضرورت مند کی ضرورت پوری کرو۔ کتنے پیارے پیارے طریقے ہیں یہ سب۔ اور یہ بھی کہا کہ ایسے دو کہ

دائیں سے دو تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ لیکن اسلام کو ایک روپے کی یا ایک کوڑی کی رشوت بھی منظور نہیں ہے۔ گناہ ہے یہ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس گناہ کو ہم نے فیشن ایبل بنا دیا ہے۔ پڑھے لکھوں نے اسے کمیشن کا' تحائف کا نام دے دیا ہے۔''

امی بے چاری چپ ہو گئیں۔

وہ زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ زیادہ سیانی ہو گئی ہے۔ کہہ کر اس کا مذاق اڑایا جانے لگا تھا۔

کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ ہاں وہی غلط ہے' باقی سب ٹھیک ہیں۔

☆☆☆

چینل میں اس کے ساتھ چینل میں کام کرنے والی سدرہ' اس کے منہ پر اس سے کہتی تھی کہ وہ اپنا منہ بند رکھا کرے اور اس کے کاموں میں مداخلت نہ کیا کرے۔

یہ سدرہ ان چار پانچ لوگوں میں سے ایک تھی جن کے پاس اسکرپٹ کے ون لائنز آتے تھے۔ اسے بہت سے ون لائنز پسند آجاتے تھے لیکن رائٹرز پسند نہیں آتے تھے۔ اس لیے وہ رائٹر سے کہہ دیتی تھی '' آپ کا ون لائنز تو کسی کام کا نہیں ہے۔ چینل سے پاس نہیں ہوگا۔ آپ کچھ اور لکھ کر بھیجیں۔''

لیکن خود وہ اس ون لائنز کو ایک دوسری رائٹر کو دے دیتی تھی کہ وہ اس پر کام کرلے۔ جس رائٹر کو وہ ون لائنز دیتی تھی' وہ رائٹر بدلے میں اسے کمیشن دیتی تھی۔ جیسے انکل نے اس سے کمیشن لیا تھا۔

اس نے ایک دن اپنے باس سے سدرہ کے بارے میں دبے دبے انداز میں بات کی تو باس نے مصروف انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔ کرتا ہوں کچھ۔''

وہ امی سے بات کرتی تو امی الٹا کہتیں '' وہ چپ کر کے کام کرے۔ کسی کے معاملے میں پھنسنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

ایک دن ایک رائٹر آفس آئی۔ تھوڑی پریشان تھی۔ بار بار کہہ رہی تھی کہ میرا اسکرپٹ مکمل کروا دیں۔ ڈرامہ بنا دیں' مجھے پیسوں کی بڑی ضرورت ہے۔ اس نے ان سے وعدہ کرلیا۔ ان کے جانے کے بعد ان کا اسکرپٹ نکلوایا۔ اچھی طرح سے پڑھا اور پھر سدرہ کے پاس لے گئی۔

''ان کا اسکرپٹ تو بہت اچھا ہے۔ سین بھی اچھے لکھے ہوئے ہیں۔ پھر اس پر کام کیوں روک دیا تھا۔'' اس نے سارا اسکرپٹ اس کی میز پر پھیلا دیا تھا۔

''کسی کام کا نہیں لکھتیں یہ۔ ڈرامہ کیا خاک بنے گا اس پر۔ نہ سر ہے نہ پیر ہے۔ کباڑ خانہ۔ بچوں کی طرح ڈائیلاگ لکھے ہیں' نہیں بھئی۔ پھر باس ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیوں پاس کیا ایسے اسکرپٹ کو۔ تم نئی ہو' تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ پھینک دو اسے۔ دوبارہ ہاتھ نہ لگانا اسے۔''

وہ بڑی پریشان ہوئی۔ اسے تو اسکرپٹ کہیں سے بھی بے کار نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ رائٹر سے وعدہ کر چکی تھی کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔ اس نے دوبارہ سدرہ سے بات کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آفس میں کام کرنے والی دوسری لڑکی ماہ نور اسے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

''چھوڑ دو اس اسکرپٹ کو حرا۔ اس پر کبھی ڈرامہ نہیں بنے گا۔ کیوں اپنی نوکری کے پیچھے پڑی ہوئی ہو۔ سدرہ کی بہت پہنچ ہے اس آفس میں۔ باس بھی اسی کی بات سنتے ہیں۔ چپ کر کے کام کرو۔''

''لیکن ماہ نور! خود پڑھ لو اسے۔ بہت اچھا لکھا ہے انہوں نے۔ بہت ہٹ ہوگا یہ ڈراما۔''

بھئی یہ سدرہ ہے نا' اس کی لڑائی ہو گئی تھی اس رائٹر سے۔ کوئی معمولی سی بات تھی۔ رائٹر نے بس اتنا کہہ دیا تھا کہ '' وہ تو بہت اچھا لکھ کر بھیجتی ہے لیکن سدرہ کو ہی اس کے لکھے ہوئے کی سمجھ نہیں آرہی۔ وہ ذرا غور سے اور دھیان سے پڑھنے کی کوشش کرے۔''

بس پھر اس نے کہا کہ میڈم! اگر میں ایسی ہی

ناسمجھ ہوں تو اب دیکھتی ہوں کہ آپ کے لکھے ہوئے پر کیسے ڈراما بنتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن' سدرہ نے اس کا اسکرپٹ آگے نہیں جانے دیا۔ سب سے کہتی پھرتی ہے کہ اس رائٹر کو لکھنا ہی نہیں آتا۔ ایک دو جگہ اور اس رائٹر نے لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی وجہ سے ان کا کام نہیں بن سکا۔''

''اتنی معمولی سی بات پر اس کا پورا کیریئر خراب کر دیا۔ یہ تو پھر ذاتی عناد ہو گیا۔ پروفیشنل ازم میں ذاتی رنجش کو نہیں لاتے۔'' اسے دلی دکھ ہوا تھا۔

''ذاتی رنجش کہو یا کچھ اور کہو۔ یہاں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ پھر یار! یہ لمبا گیم ہے۔ تم نہیں سمجھو گی۔ بہت کچھ ہوتا ہے یہاں۔ کیا کیا سنو گی۔ تم نئی ہو اس لیے تمہیں ہر بات حیران کر دیتی ہے۔''

وہ واقعی نہیں سمجھ رہی تھی کہ وہاں کیا کیا ہو رہا ہے۔ وہ لوگ ہنستے' مسکراتے' کسی کا ون لائنر اٹھا کر کسی اور کو دے دیتے تھے۔ کسی پر غصہ آتا تو بار بار اسے لکھنے کے لیے کہتے تھے۔ پھر سب مل کر ہنستے کہ دیکھا' کیسے تنگ کیا۔ لکھنے والا خود ہی عاجز آ کر لکھنا چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔

''بھگا دیا اسے بھی۔'' وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے تھے۔

☆☆☆

وہ سب اُسے اچھی پی آر کہتے تھے۔ مہمان نوازی کرنا۔ تحفے بھیجنا۔ کبھی کوئی برانڈڈ چیز لے دینا۔ کبھی بکے اور کیک بھجوا دینا۔ یہ تو شکریے کا ایک انداز ہے۔ اس میں کیا بُرا ہے۔ کون کہتا ہے یہ رشوت ہے یا حرام کی کمائی۔ تھوڑا بہت لینے دینے میں کیا حرج ہے۔

ایک دن وہ آفس گئی تو اس نے کم و بیش سات افراد کو اپنے خلاف باتیں کرتے سنا۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہے تھے کہ بڑی ملانی بنتی پھرتی ہے۔ حدیثوں کے حوالے دیتی ہے۔ حلال حرام کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ اسی لیے ابھی تک رکشوں کے دھکے کھاتی ہے۔ وہی پرانے اولڈ فیشن کپڑے پہنتی ہے۔

اسے یہ باتیں سن کر برا لگا۔

وہ بھی چاہتی تو انہیں بتا سکتی تھی کہ اگر وہ ملانی ہے تو وہ چور ہیں۔ ڈاکو ہیں۔ خوشامدی اور منافق ہیں۔ وہ سب بے ایمان ہیں۔

اپنی جاب میں بہت زیادہ بے ایمانی کر رہے ہیں۔ دوسروں کا حق مار رہے ہیں۔ انہیں ان کے کام کی پوری تنخواہ ملتی ہے اس لیے وہ اپنا پورا کام کریں۔ کمیشن یا تحائف نہ لیں۔ اسلام نے اس طریقے کو سخت ناپسند کیا ہے۔

ایک روزینہ تھی' وہ اپنی خالہ کے نام سے اسکرپٹ لکھ رہی تھی۔ اس لیے اسے کسی بھی دوسرے کا لکھا ہوا اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ وہ ریڈ پین لے کر سین اور ڈائیلاگ پر نخوت سے کراس لگاتی رہتی تھی۔ اس سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اس سے زیادہ اچھا لکھے۔

ایک میڈم زلیخا تھیں' وہ ان کی ہیڈ تھیں' ان کی انیس سالہ بھانجی کے اب تک چار ڈرامے لگ چکے تھے۔ ان کے آفس میں انتالیس سال کے ایک منجھے ہوئے رائٹر کا اسکرپٹ آفس میں ادھر ادھر گردش کرتا رہتا تھا۔

ایک دن اس نے وہ اسکرپٹ اٹھایا اور گھر لے جا کر ساری رات لگا کر پڑھا۔ اسکرین کے حساب سے اس میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کیں۔ اگلے دن باس کے پاس وہ اسکرپٹ لے گئی اور انہیں کہانی کے

بارے میں مختصراً بتایا۔ باس کو کہانی اچھی لگی۔

"چلیں بھجوا دیں اسے آگے' بنا لیتے ہیں اس پر ڈراما۔" انہوں نے کھلے دل سے کہا۔

وہ خوش ہو گئی۔ بڑی مشکل سے رائٹر کا نمبر ڈھونڈ نکالا۔ فون کیا تو فون اس کے بیٹے نے اٹھایا۔

"اچھا اچھا۔ وہ میرے ابو تھے' بہت شوق تھا انہیں لکھنے کا۔ آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں؟"

"تھے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"دراصل میڈم! تین مہینے پہلے ہی ان کا ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا ہے۔"

وہ بہت دلبرداشتہ ہوئی۔ امی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ یہ جاب نہیں کرے گی۔

"میں ایسی جگہ پر کام نہیں کر سکتی جہاں ہر کوئی حرام کما رہا ہے۔ مجھے گھن آتی ہے سب سے۔"

"کیسا حرام۔ کسی کا گلا نہیں کاٹ رہے وہ۔ کسی ایسی ویسی چیز کو نہیں بیچتے۔ تم اپنا دماغ درست رکھو سمجھیں۔"

"ہم سب نے ایسی ہی باتوں سے اپنے دل کو مطمئن کر لیا ہے۔ جس کو جتنا موقع ملتا ہے وہ اتنی ہی کرپشن کر رہا ہے۔ امی ہم سب چور ہیں۔ ہم سب اپنی حلال کی کمائیوں کو حرام کر رہے ہیں۔ ہم یہ بھول گئے ہیں کہ صرف چوری' ڈاکے' بے ایمانی' سے ہی رزق حرام نہیں ہوتا۔ کسی کا حق مارنا' کسی کو آگے آنے نہ دینا۔ کام کے اوقات میں فضول باتیں کرنا انکل کی طرح کمیشن کے نام پر رشوت لینا بھی حرام ہے۔

رات دن محنت کرنے والے بچوں کی قابلیت کا انعام کسی اور کو دے دینا بھی گناہ ہے۔ اللہ کو یہ سب پسند نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں میں ان کے ساتھ کام نہیں کروں گی۔"

"تمہارے حساب سے نہیں چلے گی یہ دنیا۔ یہاں کے اپنے قاعدے قانون ہیں۔" امی بار بار اس کے نوکریاں چھوڑنے اور سچ بولنے سے پریشان تھیں۔

"میں اپنے حساب سے کہاں چلانا چاہتی ہوں دنیا کو۔ اللہ کے احکامات پر چلتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اپنا فائدہ کر رہے ہیں لیکن دراصل یہ اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے۔ ان کے دل کا چین سکون غارت ہو جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم پر یہ مصیبت کیوں آئی۔ تب انہیں یاد نہیں آتا کہ کبھی یہ بھی کسی کے لیے مصیبت بنے تھے۔ کبھی انہوں نے بھی کسی کے دل کا چین سکون غارت کیا تھا۔"

"تم وہاں رہ کر جتنوں کے ساتھ اچھا کر سکتی ہو ان کے ساتھ تو کرو۔ اگر پانچ کے ساتھ برا ہو گا تو کسی ایک کے ساتھ تم اچھا کر سکتی ہو۔" اس کی چھوٹی بہن ردا نے اسے مشورہ دیا۔

دو دن سوچنے کے بعد وہ آفس آ گئی۔ لیکن اللہ نے اس کے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔

"مس حرا آفس میں سب کو آپ سے شکایت ہے۔ کوئی آپ سے خوش نہیں ہے۔ آپ ٹھیک سے کام نہیں کرتیں۔ بہت سست اور لاپرواہ ہیں آپ۔ بہت شکایتیں آئی ہیں آپ کے خلاف۔"

اسے جاب سے نکال دیا گیا۔

بعد میں اسے معلوم ہوا کہ سدرہ کی چھوٹی بہن اس کی سیٹ پر آ گئی ہے۔ لیکن وہ مطمئن تھی۔ اسے کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس نے امی سے کہہ دیا تھا۔ "اللہ کی یہی مرضی تھی کہ وہ ایسے لوگوں سے دور رہے' جو اللہ سے اور اللہ کے احکامات سے دور ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میرے ہاتھ میں زیادہ پیسے نہیں ہیں لیکن میرے ایمان پر کوئی حرف نہیں ہے۔ میں کسی کا حق نہیں مار رہی۔ میں کسی سے بے ایمانی نہیں کر رہی۔" وہ مطمئن اور خوش تھی۔ کچھ دنوں بعد علی جو اس کا کزن تھا اس کا رشتہ اس کے لیے آ گیا۔ علی ایک پرائیویٹ ٹیوشن اکیڈمی چلاتا تھا۔ شادی کے بعد حرا بھی اس کے ساتھ مل کر اس کی اکیڈمی میں پڑھانے لگی۔ اس کی زندگی میں اب قرار تھا۔ اطمینان تھا۔ وہ خوش تھی' بہت خوش اور رب رحیم کی شکر گزار بھی۔

☆

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

فروری 2018
کے شمارے کی ایک جھلک



فروری 2018
کا شمارہ شائع ہو گیا

- ''محبت جنوری جیسی'' فرزانہ کھرل کا مکمل ناول،
- ''سنہری دھوپ'' سلویٰ علی بٹ کا مکمل ناول،
- ''محبت تمہارے نام'' سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول،
- ''شہرزاد'' صائمہ اکرم کا ناول،
- ''خواب شیشے کا'' عفت سحر طاہر کا ناول،
- ''عمروں کے سلسلے'' فوزیہ فرخ کا ناولٹ،
- ''آؤ لالہ اُگاتے ہیں'' اُم ایمان قاضی کا ناولٹ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، نور الصباح، عظمیٰ اختیار، اور سعدیہ عمیر کے افسانے،
- ''شگفتہ یاسمین'' کا بندھن،
- ''دستک'' معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ''تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' قارئین کا سلسلہ،
- ''پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں''

اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع فروری 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

نمرہ احمد

حالم

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ





آ تا ہے۔ فاتح سن باؤ کو پہنچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلالیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کرلیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہوجاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کرلیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہوجاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کرلیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کرلیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پگھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہوگیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم اینیس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

دسویں قسط ١٠

گیا تو وہ مسکرا کے پھر سے ان دونوں چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔

ایک کھوٹا سکہ اور ایک پیلا گلاب.....

واؤ.....جسٹ واؤ۔

☆☆☆

رات گہری ہو رہی تھی اور گھوڑا گاڑی کی رفتار قدرے سست ہو گئی تھی۔ وہ ہنوز پنجرے کی سلاخوں سے سر ٹکائے ہوئے تھی۔ البتہ نیند اب پوری ہو چکی تھی اور آنکھیں دور سڑک پہ جمی تھیں۔ اور پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ اتنے تارے' اتنے تارے.... گویا سیاہ دوپٹے پہ افشاں انڈیل دی گئی ہو۔

''اس دنیا میں سب کچھ ہمارے ملائیشیا سے مختلف ہے....بس ایک ہوا ویسی ہی ہے....'' وہ سڑک کو تکتے ہوئے بولی۔

''آپ کی اطلاع کے لیے' چے تالیہ' ہوا بھی ویسی نہیں ہے۔''

''کیا؟'' تالیہ نے چونک کے گردن موڑی۔

''جب ساٹھ ستر سال پہلے امریکہ نے جاپان پہ ایٹم بم برسائے تھے تو وہ بم ساری دنیا کی فضا کو آلودہ کر گئے تھے۔ یعنی ہمارے پلانٹ ارتھ کی فضا میں' مٹی میں' پھلوں میں' ہر چیز میں ہلکا ہلکا سا 137-سیسم شامل ہو گیا تھا اور قیامت تک شامل رہے گا۔ اس سے پہلے یہ قدرتی طور پہ فضا میں نہیں ہوتا تھا۔ یعنی ابھی....'' ایڈم نے گہری سانس اندر کھینچی۔ ''ابھی فضا اس سے پاک ہے۔ مگر ظاہر ہے' آپ کو کیا معلوم۔ آپ کتابیں تھوڑی پڑھتی ہیں۔''

فاتح نے فوراً تالیہ کا چہرہ دیکھا (کوئی ردعمل؟) مگر.... خلاف توقع اس نے برا نہیں مانا۔ بس سر واپس سلاخوں سے ٹکا دیا۔

ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔ جھٹکا اتنا زور کا تھا کہ تالیہ کا سر جھول کے دوبارہ سلاخوں سے آ ٹکرایا۔ لبوں سے کراہ نکلی۔

گاڑی کی اگلی نشستوں سے کوئی جست لگا کے اترا اور پیچھے آیا۔ سر پہ پٹی باندھے وہ سانولا سا آدمی تھا۔ اس نے ان تینوں کو باری باری گھورتے ہوئے سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ اندر بڑھایا جس میں تین رول سے تھے۔ خوشبو بھی اچھی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ تالیہ کا ہاتھ سب سے پہلے بڑھا۔ اس نے جلدی سے رول تھاما اور آنکھوں کے قریب کر کے دیکھا۔ روٹی جیسی چیز میں لپٹا قیمے جیسا آمیزہ۔

اس نے ندیدوں کی طرح دانت اندر گاڑے۔ گیلا بھی تھا جیسے کوئی سانس اندر لگا ہو۔ مختلف سا ذائقہ تھا مگر مزے دار تھا۔ اتنے دنوں کی محرومی جاگ اٹھی۔ وہ جلدی جلدی کھانے لگی۔ فاتح نے باقی دونوں رول تھامے اور ایک ایڈم کی طرف بڑھا دیا۔ رسیاں سختی سے بندھی تھیں مگر لمبی تھیں۔ وہ ہاتھ قدرے آگے پیچھے بڑھا سکتا تھا۔

اب وہ آدمی اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ فاتح نے قدرے اکتا کے اسے دیکھا۔

''وقت ضائع مت کرو' ہم تمہاری زبان نہیں سمجھتے۔''

''کیا تم ہمیں ملاکہ لے کر جا رہے ہو؟'' وہ لقمے سے بھرے منہ کے ساتھ ایک دم بولی۔

اس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ....لہجہ....زبان....اس کے ساتھی مسافروں کے لیے اجنبی تھا۔ وان فاتح نے بے یقینی سے ابرو اٹھائے۔ ایڈم کا منہ کھل گیا۔ وہ آدمی بھی چونکا تھا۔

''ہاں۔ ہم ملاکہ جا رہے ہیں۔''

''مگر تم نے ہمیں باندھا کیوں ہے؟ ہمارا جرم کیا ہے؟'' وہ رات کی تاریکی میں سلاخوں کے پار کھڑے آدمی سے نڈر انداز میں پوچھ رہی تھی۔ فاتح بس اسے دیکھ رہا تھا۔ رول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ہم جانتے ہیں تم اپنے مالک کی قید سے بھاگے ہوئے غلام ہو۔ ہم تمہیں وہاں لے کر جا رہے ہیں جہاں جانے کے تم حقدار ہو۔'' قدرے سختی سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی جھٹکے سے چل پڑی۔ تالیہ کا سر پھر سے سلاخوں سے ٹکرایا تھا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

۔عین وہاں جہاں کو مڑ تھا......

☆☆☆

تیرہ سالہ تالیہ مراد سر جھکائے کرسی پہ بیٹھی تھی۔ میز کے پار کرسی پہ مسز ماریہ براجمان تھیں اور تالیہ کے سامنے بیٹھے پولیس آفیسر کو دیکھ رہی تھیں۔

''چے تالیہ!'' پولیس آفیسر اس کی طرف جھکا سنجیدگی سے مخاطب تھا۔

تالیہ نے ویران چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھیں ایسے خالی تھیں جیسے لٹے ہوئے لوگوں کا دل خالی ہو جاتا ہے۔

''مسز ماریہ نے بتایا ہے کہ سارے یتیم خانے میں سب سے زیادہ ذوالکفلی تم سے گھلتا ملتا تھا؟''

تالیہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلا دیا۔

''اب تک تم جان ہی چکی ہو گی کہ وہ ایک جھوٹا مکار شخص تھا۔ایک کون آرٹسٹ۔ایک چور۔'' وہ بے رحم لہجے میں کہہ رہا تھا۔تالیہ کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔''وہ کوئی رائٹر نہیں تھا۔وہ جعلی کاغذات پہ ادھر آیا اور اوپر تاور سے وہ سامنے والی عمارت کا جائزہ لیا کرتا تھا۔جہاں ایک آرٹ آکشن (نیلامی) ہونی تھی۔''

تالیہ نے پھر سے سر ہلا دیا۔سارے الفاظ معنی کھو چکے تھے۔ذوالکفلی کے غائب ہونے کے بعد ساری دنیا جیسے تاریک ہو گئی تھی۔

''کل رات اس نے نیلامی سے ایک قیمتی ہیرا چُرا لیا ہے اور اب وہ غائب ہو چکا ہے۔میں جانتا ہوں‘ اس نے تمہیں امید دلائی ہو گی کہ وہ تمہیں ایڈاپٹ کرلے گا مگر وہ ایک اسکامر تھا‘ تالیہ۔''

''اس نے مجھے کوئی امید نہیں دلائی تھی۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''بہر حال....ہمیں اس کو گرفتار کرنا ہے....کیا تم ہماری مدد کرو گی؟''

تالیہ نے ایک نظر مسز ماریہ کو دیکھا۔پھر آفیسر کو۔''میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''ہمارے پاس اب تک ذوالکفلی کی ایک بھی تصویر نہیں ہے۔مسز ماریہ کا کہنا ہے کہ تم اسکیچ بنانے میں ماہر ہو۔کیا تم اس کا اسکیچ بنا سکتی ہو یا ہمارے اسکیچ آرٹسٹ کی مدد کر سکتی ہو؟''

وہ چند ثانیے اس کو دیکھتی رہی۔پھر خاموشی سے ایک کاغذ اٹھایا۔ پین ہولڈر سے قلم نکالا اور سر جھکائے قلم کاغذ پہ رگڑنے لگی۔پولیس آفیسر نے گہری سانس لے کر ٹیک لگا لی اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔کام آسان ہو گیا تھا۔

''کیا اس نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے؟ کسی کی جان لی ہے؟'' وہ تیزی سے قلم چلاتے ہوئے سر جھکائے بولی۔

''نہیں مگر وہ چور تھا۔اس نے ہیرا چرایا ہے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے مسز عثمان کے لیے۔''

''مسز عثمان وہی جن کی پوتی کی سالگرہ پہ یتیم خانے میں کھانے کے ڈبے آتے ہیں؟''

''ہاں‘ وہی‘ تالیہ۔'' مسز ماریہ نے تائید کی۔وہ خاموشی سے اسکیچ بناتی گئی۔پھر سر اٹھایا اور کاغذ پولیس آفیسر کے سامنے کیا۔آفیسر نے غور سے اسے دیکھا اور مسز ماریہ کی طرف بڑھا دیا۔

''ذوالکفلی سے کم لوگ ہی ملے تھے۔وہ عموماً کمرے میں رہتا تھا اس لیے یتیم خانے میں زیادہ لوگوں نے اسے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔اس لیے اگر مسز ماریہ آپ تصدیق کر دیں کہ یہ وہی آدمی ہے تو مجھے دوبارہ یتیم خانے کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے۔''

مسز ماریہ نے ''شیور'' کہتے ہوئے مسکرا کے کاغذ تھاما‘ پھر اس پہ نظر ڈالی تو مسکراہٹ سمٹی۔وہ ایک موٹے‘ بھدے آدمی کا چہرہ تھا۔ناک‘ آنکھیں‘ سب کچھ جدا تھا۔انہوں نے چونک کے تالیہ کو دیکھا۔وہ ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔بنا پلک جھپکے۔

''کیا یہی ذوالکفلی ہے‘ مسز ماریہ؟'' آفیسر نے پھر سے کلائی کی گھڑی دیکھ کے عجلت میں پوچھا۔

''سر...جب میں دو سال پہلے یتیم خانے میں آئی تھی تو میری کلائی میں ایک بریسلیٹ تھا...سونے

کا....مگر پھر وہ....'' تالیہ ایک دم سادگی سے کہنے لگی ....اس سے پہلے کہ آفیسر اس کی طرف متوجہ ہوتا' مسز ماریہ جلدی سے بولیں۔

''جی یہی ہے وہ۔'' اور تیزی سے کاغذ واپس بڑھایا۔ رنگت قدرے پھیکی پڑی تھی۔

''شکریہ۔'' اس نے کاغذ تھاما اور تالیہ کو دیکھا۔ ''تمہارے بریسلیٹ کا کیا؟''

تالیہ نے ایک چبھتی ہوئی نظر مسز ماریہ پہ ڈالی جو حیران بھی تھیں اور پھیکی بھی پڑی ہوئی تھیں۔ پھر ذرا سا مسکرائی۔ ''میں کہہ رہی تھی کہ میرا بریسلیٹ ....بالکل آپ کی گھڑی جیسا لگتا تھا۔ اتنا ہی خوبصورت۔''

ماریہ کے لبوں سے بے اختیار سکون بھری سانس خارج ہوئی۔ اف۔

''اوکے۔'' آفیسر رسماً مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ذوالکفلی کی تصویر دکھا کے مزید ہمارے لوگوں کو ہراساں نہیں کریں گے۔ کیونکہ اگر بات پھیل گئی کہ تالیہ نے تصویر بنائی ہے یا تصویر ہماری طرف سے آپ کو ملی ہے تو ذوالکفلی یا اس کے ساتھی ہمیں جانی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں' مسز ماریہ۔ ہم دوبارہ آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔'' وہ اب شکریہ ادا کر رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد آفس میں کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر تالیہ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''تم نے ذوالکفلی کو کیوں بچایا؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔ ''وہ ایک چور ہے۔''

ننھی لڑکی مڑی اور سپاٹ نظروں سے ان کو دیکھا۔ ''یہاں کون چور نہیں ہے؟''

مسز ماریہ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ تالیہ بنت مراد اب باہر جا چکی تھی۔

☆☆☆

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز رات کے مقدس سناٹے کو چیر رہی تھی۔ اس کے سر کا گومڑ پھر سے درد کرنے لگا تھا۔ مگر وہ پرواہ کیے بنا رغبت سے اس رول کو کھا رہی تھی۔

''تم ان کی زبان بول سکتی ہو۔'' فاتح ابھی تک تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ منہ لقمے سے پھولا ہوا تھا۔ (یہ وہ نزاکت سے ٹیبل پہ چھری کانٹے سے کھانے والی سوشلائیٹ نہیں تھی جو ایک رات عصرہ' اشعر اور اس کے ساتھ ان کے ڈائننگ روم میں کھانا کھاتے ہوئے گھائل غزال کی بات کر رہی تھی۔)

''مگر کیسے؟''

''کیونکہ....'' لقمے کے باعث آواز پھنسی پھنسی نکلی۔ ''میں گیارہ سال اسی ملاکہ میں بڑی ہوئی تھی۔ زبان آتی ہے مجھے اور ہاں....وہ کہہ رہا تھا کہ شاید ہم بھاگے ہوئے غلام ہیں۔''

''مگر تمہاری یادداشت تو کھو گئی تھی۔ تمہیں زبان کیسے یاد رہ گئی۔''

''پتا نہیں۔'' تالیہ نے کندھے اچکائے اور تیزی سے کھانے لگی۔

''کیونکہ سر....'' ایڈم کھنکھار کے بولا۔ رول اس کے ہاتھ میں بھی تھا مگر وہ ذرا تہذیب سے کھا رہا تھا۔

''یادداشتیں اور علوم ایک جگہ دماغ میں اسٹور نہیں ہوتے۔ گو کہ ابھی تک اس کی وجہ نہیں معلوم ہو سکی کہ اکثر یادداشت کھو جانے والے لوگوں کو اپنی زبان اور بہت سی عام معلومات کیسے یاد رہ جاتی ہیں' مگر شاید اس لئے کہ ان کے ذہن کا وہ حصہ متاثر ہوتا ہے جہاں ان کی یادیں ہوتی ہیں۔ وہ نہیں جہاں معلومات ہوتی ہیں۔ آپ کھا کیوں نہیں رہے سر؟'' کہتے ہوئے وہ اپنا رول لبوں تک لے گیا اور لقمہ دانتوں سے توڑا۔

فاتح نے جواب میں سوچتی نظروں سے اس

رول کو دیکھا۔ ''اس میں گوشت ہے۔''

''ملاکہ مسلمان ملک ہے' سر۔ یہ حلال ہو گا۔ ویسے بھی اس حالت میں سب جائز ہوتا ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ گوشت ہر دور میں ایک قیمتی غذا رہی ہے۔ اور ان لوگوں نے ہمیں قیدی بنایا ہے۔ قیدیوں کو اتنی اچھی غذا کون دیتا ہے؟'' وہ سوچ میں ڈوبا تھا۔

مگر وہ دونوں اس کی بات پہ غور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ خاموشی سے اپنا کھانا کھا رہے تھے۔

رات قطرہ قطرہ پگھلتی جا رہی تھی.....

☆☆☆

یتیم خانے کے قلعے کا باغیچہ آج رنگوں اور روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے غبارے بکھرے تھے۔ ایک جانب اسٹیج تھا جہاں تقریبِ تقسیمِ انعامات ہو رہی تھی۔ چند مشہور سوشل ورکر خواتین.... سجی سنوری امیر بیگمات ....اور سوٹڈ بوٹڈ اصحاب کرسیوں پہ براجمان تھے۔

مسز ماریہ بھی ایک کرسی پہ براجمان مسکرا رہی تھیں۔ سامنے بچے قطاروں میں کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ سب اچھے سے تیار ہوئے تھے۔ (یتیم خانے کے بچے کم عمری میں ہی خود تیار ہونا سیکھ لیتے تھے کیونکہ ان کو کوئی تیار کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔) چند بچے اسٹیج پہ قطار میں کھڑے تھے۔ ایک ایک کر کے آگے آتے' اور زیورات سے سجی خاتون سے انعام وصول کر کے اسٹیج سے اتر جاتے۔

مسز ماریہ کی نگاہ قطار میں تیسرے نمبر پہ کھڑی تالیہ پہ پڑی تو مسکراہٹ ذرا سمٹی۔ وہ بالوں کی پونی بنائے' خاموش سی کھڑی تھی۔ ذوالکفلی کے جانے کے بعد سے وہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ اور اگر کبھی مسز ماریہ سے سامنا ہو جاتا تو ان کو یوں دیکھتی کہ ان کو نگاہ چرانی پڑتی۔ بات صرف بریسلیٹ کی نہیں تھی۔ کوئی بھی بچے کی بات نہ مانتا۔ بات اپنے دل کے چور کی تھی۔ انہوں نے پھر سے نگاہ چرالی۔

سامنے والے دونوں بچے ہٹے تو تالیہ کی باری آئی۔ خاتون نے مسکرا کے اس سے ہاتھ ملایا اور میز پہ رکھا کھلونے کا ڈبا اس کی طرف بڑھایا۔ تالیہ نے ہاتھ نہیں بڑھائے۔ بس نظریں اٹھا کے ان کو دیکھا۔

''کیا مجھے وہ والا نہیں مل سکتا؟'' اس نے انگلی سے ایک دوسرے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ خاتون کی مسکراہٹ سمٹی' مگر پھر.... اسٹیج پہ بیٹھے اپنی طرف متوجہ لوگوں کو دیکھا....اور کیمرہ مین کو جو تصاویر بنا رہا تھا۔ جلدی سے سنبھل کے مسکرائیں اور ''کیوں نہیں'' کہہ کے ایک دوسرا ڈبا اٹھایا اور اس کی طرف بڑھایا۔

تالیہ نے بہت شوق سے وہ ڈبا پکڑا اور آگے بڑھ گئی۔ نیچے اپنی سیٹ پہ جاتے ہی اس نے وہ ڈبا کھولا۔ اندر تیر کمان تھی۔ کھلونے والی کمان جو اچھی کوالٹی کی تھی اور چند تیر۔ اس نے بہت محبت اور اپنائیت سے اس پہ ہاتھ پھیرا۔ اس سے متعلق کوئی یاد ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اتنا اپنا اپنا سا لگتا تھا کہ....

آگے جو ہوا وہ خود ہی ہوا۔

اس نے خود کو تیروں کا ترکش کمر پہ پہنتے دیکھا۔ پھر کمان سیدھی کر کے تیر اندر لگایا اور اسٹیج کے کونے میں لگے غباروں کی طرف نشانہ باندھا....وہاں گیس والے غبارے ایک ساتھ بندھے تھے جیسے ....غباروں کا گلدستہ ہو۔ اس نے کھینچ کے تیر چلا دیا۔

تیر زن سے اڑتا ہوا عین اس جگہ لگا جہاں غباروں کے دھاگوں کا جوڑ تھا۔ چٹخنے کی آواز آئی اور غبارے غول کی صورت فضا میں بلند ہوئے۔

لوگوں نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ گردنیں مڑیں۔ آوازیں بلند ہوئیں۔ مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ تیر کش سے تیر نکال کے ایک کے بعد ایک فضا میں نشانے پہ چلا رہی تھی۔ فضا میں اڑتے غباروں کو باری باری تیر لگ رہے تھے۔ وہ 'ٹھاہ....ٹھاہ' کی آوازوں کے ساتھ پھٹنے لگے۔ مگر تالیہ نہیں رکی۔ ہاتھوں میں کوئی جنون سا در آیا تھا۔

بچے چیخیں مارتے اٹھ گئے۔ اسٹیج پہ بھی ہلچل مچ گئی۔ مگر وہ تاک تاک کے فضا میں اڑتے غباروں کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نشانہ لیتی ان پہ تیر برسا رہی تھی۔ کوئی تیر خطا نہیں جا رہا تھا۔

غبارے پٹاخوں کی آواز کے ساتھ پھٹتے جا رہے تھے۔

زور سے مسز ماریہ نے اس کے ہاتھ سے کمان کھینچا اور ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کیا تو وہ ہوش میں آئی.... اور ادھر ادھر دیکھا۔

حیرت اور خوف سے دور ہٹے بچے.... اسٹیج پہ کھڑے لوگ.... کیمرہ مین دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہا تھا۔ وہ ایک دم ڈر سی گئی۔ جلدی سے پیچھے کو ہٹی۔ مسز ماریہ برہمی اور بے یقینی سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

اس لمحے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس لڑکی کو وہ مزید اپنے یتیم خانے میں برداشت نہیں کر سکتیں۔ انہیں جلد از جلد اس کو ایڈاپٹیشن کے لیے دینا ہوگا۔ انہیں اس سے چھٹکارا چاہیے تھا۔

یہ لڑکی سحر زدہ تھی۔

☆☆☆

گھوڑا گاڑی تاریک راستے پہ تیز دوڑ رہی تھی۔ فاتح اکڑوں بیٹھا تھا' اور بندھے ہوئے ہاتھ گھٹنوں پہ رکھے تھے۔ رول وہ کھا چکا تھا مگر سوچ میں ڈوبا تھا۔ باقی دونوں بھی خاموش تھے۔ ایسے میں وہ بار بار اپنے بندھے ہاتھ جیب تک لے جانے کے لئے اٹھاتا' پھر ٹھہر جاتا۔ نہ ہاتھ وہ جیب تک لے جا سکتا تھا' نہ جیب میں وہ بٹوہ تھا جس کے اندر جھانکنے کی تڑپ اس کی عادتوں میں شامل تھی۔ جانے وہ کہاں گر گیا تھا۔

تالیہ ہنوز سلاخوں سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ ایڈم باری باری ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' اس نے یکسانیت سے اکتا کے سوال پوچھا تو تالیہ نے چہرہ موڑا۔ اس کی آنکھیں سپاٹ سی تھیں۔

''ہمیں شہزادی تاشہ کو ڈھونڈنا ہے۔ اور وہ ہمیں میرے بابا تک لے جائے گی۔''

''مگر چے تالیہ.... ہم اس وقت قید میں ہیں۔''

اس نے جتا کے یاد کرایا۔

''اب نہیں رہیں گے۔'' کہتے ہوئے وہ سیدھی ہو بیٹھی اور بندھے ہوئے ہاتھ سامنے اٹھائے۔ پھر کلائیوں کو موڑنے لگی۔ ایڈم کی نظروں میں اچنبھا ابھرا۔

''رسیاں پکی بندھی ہیں.... یہ چوڑیاں نہیں ہیں جن سے آپ کلائیاں نکال لیں۔''

تالیہ نے ایک سنجیدہ نظر اس پہ ڈالی۔ ''میں کے ایل کی سب سے ماہر چور اسی لیے ہوں کیونکہ مجھے اپنے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں سے نکالنے کا فن آتا ہے۔'' وہ ایک مخصوص زاویے پہ ہاتھوں کو اکٹھا کر کے موڑے جا رہی تھی۔

فاتح نے ستائش سے ابرو اٹھائی۔ ''میں نے سن رکھا تھا کہ ایسے ٹرکس ہوتے ہیں مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ حقیقت میں ممکن ہے۔ پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔ کس سے سیکھا تم نے یہ؟''

اس نے نظریں اٹھا کے فاتح کو دیکھا۔ ''ایک جادوگر سے۔''

اس کے ہاتھ مسلسل رسیوں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رسی کلائی کی جلد کو چھیل رہی تھی۔ خون بہہ رہا تھا مگر ہاتھ اندر ہی اندر مڑ کے چھوٹا ہو رہا تھا۔ گویا پٹھے خود کو اکٹھا کر لینے کے عادی تھے۔

☆☆☆

وہ لاہور کی ایک اَپر کلاس کالونی تھی جہاں قطار میں چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے تھے۔ تیسرے نمبر کے بنگلے کے اندر کچن میں آؤ تو اونچی سیاہ پونی والی تالیہ سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ وہ بیس اکیس برس کی تھی مگر کافی موٹی اور گول مٹول' شلوار قمیص پہنے' دوپٹہ سائیڈ پہ باندھے وہ مگن سی کھلے نل تلے آخری برتن کھنگال رہی تھی۔ پھر اسے ٹوکری میں رکھا' تولیے سے ہاتھ پونچھے' چولہا بند کیا اور باہر نکل آئی۔

صوفے پہ فربہی مائل ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی تھیں۔ ٹی وی چل رہا تھا اور وہ فون کان سے لگائے

کسی سے محوِ گفتگو تھیں۔ تالیہ جس پل اندر آئی' انہوں نے اسی وقت فون رکھا۔

''کھانا پک گیا؟''

''جی امی۔ کچن بھی صاف ہو گیا ہے۔'' وہ صاف اردو میں بات کر رہی تھی۔ ''ناشتہ ٹیبل پہ لگا دیا ہے' اور دادا جی کو ان کے کمرے میں ناشتہ ابھی دے آئی ہوں (شہناز بیگم کے ماتھے پہ بل پڑے بہرحال خاموش رہیں۔) پھر میں کالج چلی جاؤں گی۔'' پھر ہچکچا کے رکی۔

''امی.... کالج کا ٹرپ جا رہا ہے مری' دو دن کے لیے۔ مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔''

انہوں نے گردن پوری گھما کے اسے دیکھا۔ ''میرے پاس ان فضولیات کے لیے پیسے نہیں ہوتے تالیہ۔ شفقت صاحب کتنی محنت سے کماتے ہیں' ہماری دو بیٹیاں ہیں جن کی ہم نے شادی کرنی ہے۔ اگر یونہی جمع پونجی خرچ کر دیں گے تو شادیاں کہاں سے کریں گے؟''

''مگر مناہل اور زیمل بھی تو پچھلے ہفتے ٹرپ پہ گئی تھیں' ارسل بھی جاتا ہے۔ اور ان کے ٹرپ تو مہنگے والے ہوتے ہیں۔''

''کیونکہ ان کا کالج مہنگا والا ہے۔ تم سرکاری کالج میں پڑھتی ہو' اس لیے اپنی چادر دیکھ کے پاؤں پھیلایا کرو۔'' ناک سکیڑ کے سر جھٹکا اور ریموٹ اٹھا لیا۔

وہ چند لمحے چبھتی نگاہوں سے ان کو دیکھتی رہی۔ وہ ابھی سو کے اٹھی تھیں اور بال جوڑے میں بندھے تھے۔ ٹی وی پہ ڈراما دیکھتے ہوئے بار بار جمائی بھی روکتی تھیں۔ تالیہ سے مکمل بے زار۔

''میں ایک فرینڈ سے ادھار لے کے چلی جاؤں؟''

''میری بلا سے جو بھی کرو۔'' انہوں نے ہاتھ جھلا کے اسے دفعان ہونے کا اشارہ کیا۔

وہ سر کو خم دے کر وہاں سے چلی آئی۔

اوپر آ کے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اس نے بڑے بیڈروم کا دروازہ کھولا جو شہناز اور شفقت صاحب کا تھا۔ کمرہ خاموش پڑا تھا۔ اس کے فوسٹر فادر آفس جا چکے تھے اور شہناز رات کا دوبارہ نشر ہونے والا ڈراما دیکھنے سے پہلے ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے والی نہ تھیں۔ وہ دبے قدموں اندر آئی اور اسٹڈی شیلف کے سامنے رکی۔ تیسرا دراز کھولا۔ اندر ایک خفیہ خانہ تھا۔ تالیہ نے اسے کھولا۔ چابی نکالی۔ پھر ڈریسنگ روم میں آئی اور آخری الماری میں چابی لگائی۔ دروازہ کھل گیا۔

اندر ایک دراز میں نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں۔ اس نے بینک کے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھائی جو پورے ایک لاکھ کی تھی۔ مہارت سے اسپیشل کی پن اتاری' چند نوٹ درمیان سے نکالے' اور پھر اسٹڈی ٹیبل کے دراز سے بڑا اسٹیپلر نکالا۔ گڈی کو دوبارہ اسٹیپل کیا اور احتیاط سے واپس رکھ دیا۔ کوئی بھی ثبوت چھوڑے بنا وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور پیسے چھپا دیے۔

''جاؤں گی تو میں ضرور۔ ہونہہ''

کچھ دیر بعد وہ نیچے دادا جی کے کمرے میں ان کو ناشتہ کروا رہی تھی۔ وہ نحیف اور کمزور سے تھے۔ سر کے سارے بال سفید تھے۔ بستر پہ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اسٹول پہ بیٹھی' چائے پرچ میں ڈالتی' اور ان کے لبوں کے قریب لے جاتی۔ وہ گھونٹ بھرتے۔

''تالیہ!'' مسکرا کے اسے اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگے۔ ''تم میری سگی پوتی نہ ہو کر بھی میری کتنی خدمت کرتی ہو۔''

''ریئلی دادا جی.... یہاں اس گھر میں کوئی اپنی بات مجھے ایڈاپٹڈ ہونے کا احساس دلائے بغیر کیوں نہیں ختم کر سکتا؟'' وہ ہنس کے بولی اور پھر سے چائے پرچ میں انڈیلنے لگی۔

''تم اس گھر میں خوش نہیں ہوتا؟''

''آپ خوش ہیں؟''

انہوں نے گہری سانس لی اور چھت کو دیکھنے لگے۔ ''میں گلہ نہیں کر سکتا۔ شفقت کا باپ ہوتا تو اس

کا حق تھا کہ وہ میری خدمت کرتا۔لیکن میں اس کا چچا ہوں۔اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے یہی بہت ہے۔''

''آپ نے تین دکانیں جو ابا کے نام کر دی تھیں۔اب بھی وہ نہ رکھتے آپ کو۔''اس نے چائے سے بھری پرچ ان کی طرف بڑھائی مگر وہ اب سیر ہو چکے تھے۔

''پیسے سے خوشی نہیں خریدی جاسکتی۔''

''کبھی کسی محل میں رہنے والے کو اداس دیکھا ہے آپ نے؟''اس نے پرچ اور پیالی پرے رکھ دی۔پھر گھڑی دیکھی۔کالج کی بس میں ابھی وقت تھا۔وہ گردن اٹھا کے اسے دیکھنے لگے۔

''تمہیں محل اچھے لگتے ہیں نا؟''

''بہت زیادہ' دادا جی۔''آنکھیں میچ کے اس نے جیسے مزہ لیا۔''میرا دل چاہتا ہے ایک دن میں نیند سے جاگوں تو سامنے ایک سڑک ہو...ایک طرف سمندر ہو....اور سیدھ میں سڑک اوپر ایک پہاڑی تک جاتی ہو....اس پہ ایک محل بنا ہو اور وہ میرا ہو....دیکھیے گا دادا جی....تالیہ ایک دن — بہت امیر ہو جائے گی۔''

''میں جانتا ہوں۔''وہ بولے تو وہ چونکی۔عموماً وہ اس کی ان باتوں پہ تبصرہ نہیں کرتے تھے۔آج کچھ مختلف تھا۔

''کوئی بات ہے دادا جی؟''اس نے ٹھٹک کے ان کا چہرہ دیکھا۔انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تالیہ....میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں' آج ہوں' کل نہیں' اس لیے....''

''آپ اب کیا فلموں کی طرح مجھے اپنی وصیت بتانے لگے ہیں؟''وہ پھر سے ہنس دی۔وہ نہیں ہنسے۔سنجیدہ رہے۔

''یاد ہے کافی عرصہ پہلے میں نے تمہیں ایک علاقے میں ایک پلازہ دکھایا تھا جس میں بارہ دکانیں تھیں؟ جب تم مجھے وہیل چیئر پہ وہاں لے گئی تھیں؟''

''جی' مجھے یاد ہے۔کیوں؟''

''وہ سارا پلازہ میرا ہے۔ان دکانوں کا مالک میں ہوں۔''

تالیہ مراد کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔چند لمحے شل رہی' پھر ادھر ادھر دیکھا۔

''ابا جی کو یہ بات نہیں معلوم' دادا جی؟''

''میں مرتے وقت وہ اس کو دینا چاہتا تھا' ان کا کرایہ میرے اکاؤنٹ میں آتا ہے۔میرا رشتے کا پوتا جبران ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ مگر اب میں وہ پلازہ شفقت کو نہیں دینا چاہتا۔میں وہ.....''اس کی آنکھوں میں دیکھ کے وقفہ دیا۔''تمہیں دینا چاہتا ہوں۔''

تالیہ کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔سانس تک بند ہو گیا۔

''دادا جی...!''

''ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔جبران آئے گا تو میں اس سے قانونی کارروائی کا کہوں گا۔وہ خاموشی سے تمہارے نام ہو جائے گا اور جب تمہاری شادی ہو گی تو تم اس کو بیچ کے اپنی مرضی کا محل خرید لینا کیونکہ میرا دل کہتا ہے' کہ ایک دن ہماری تالیہ کسی محل میں راج کرے گی۔''

وہ یک ٹک ان کو دیکھے جا رہی تھی۔آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے.....

☆☆☆

گھوڑا گاڑی سرپٹ دوڑ رہی تھی....پنجرے میں بیٹھی تالیہ مسلسل کلائیوں کو گھما رہی تھی۔ہاتھوں کو اکٹھا کر کے وہ خاص زاویے پہ ان کو مروڑ کے رسی کو چوڑی کی طرح اوپر دھکیل رہی تھی۔خون آلود ہاتھ دھیرے دھیرے باہر نکل رہا تھا۔

فاتح افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کے زخمی ہاتھوں کو نہیں....اس کے چہرے کو....جہاں کوئی عجیب سا خالی پن تھا...شاید وہ ماضی کی کسی یاد میں گم تھی.....

☆☆☆

چھوٹے سے بنگلے میں معمول سے زیادہ خاموشی تھی۔ کچن میں کھڑی تالیہ نے دوپٹا سر پہ اوڑھ رکھا تھا اور دادا جی کے لیے دلیہ نکال رہی تھی۔ امی صبح ہی سلور کے پیالے لائی تھیں اور حکم ملا تھا کہ چینی کے برتنوں میں دادا جی کو کھانا نہیں دینا' مبادا وہ ٹوٹ جائیں۔ خیر' یہ چاندی کے برتن بھی پیارے تھے۔ قیمتی اور خوبصورت۔

تالیہ نے مسکرا کے دلیہ ان میں نکالا' چمچ' پلیٹ ساتھ ٹرے میں سجائی اور ٹرے اٹھائے باہر چلی آئی۔ لاؤنج کے پرلے کونے پہ دادا جی کا کمرہ تھا' اور خلاف توقع آج امی اور ابا وہیں موجود تھے۔ دادا جی کا بھانجا جبران بھی آیا ہوا تھا۔

وہ اندر داخل ہوئی' سب کو سلام کیا' ایک نظر سب پہ دوڑائی (امی کا بے چین انداز.... ابا کی خاموشی.... پرسکون اور قدرے خوش بیٹھے دادا جی۔ آج کل امی' ابا اکثر دادا جی کے پاس جا بیٹھتے تھے' اور دادا جی کے ان سے گلے دور ہوتے جا رہے تھے۔ جبران بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔)

اس نے خاموشی سے پیالہ دادا جی کی سائیڈ ٹیبل پہ دھرا تو امی فوراً بولیں۔

''تم جاؤ' جبران کھلا دے گا۔''

''جی اچھا۔'' تالیہ نے بس مسکرا کے دادا جی کو دیکھا' وہ بھی جواباً مسکرائے اور سر کو خم دیا۔ وہ واپس پلٹ آئی۔ مگر ذہن میں کچھ کھٹک رہا تھا۔ (جبران کے چکر زیادہ نہیں لگ رہے؟ کل بھی وہ لان میں امی کے ساتھ بیٹھا تھا جب میں ٹیوشن سے آئی تھی۔ کوئی تو بات ہے۔)

وہ کچن میں آئی اور چوکی پہ بیٹھ کے ہتھیلی گال تلے رکھے سوچ گئی۔ (کیا تھا جو اسے کھٹک رہا تھا؟)

قریباً پندرہ منٹ گزرے تھے کہ ابا کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ''تالیہ.... تالیہ۔''

وہ ایک دم ڈر گئی۔ پھر بھاگی بھاگی اندر گئی۔ دروازہ کھولا تو.... ان سب کے چہرے ویسے نہ تھے جیسے وہ چھوڑ کے گئی تھی۔ ابا غصے سے سرخ تھے تو امی کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھیں.... اور دادا جی.... ان کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں آنسو۔

''کیا ہوا؟'' وہ ہکلائی۔

''یہ دلیہ تم نے بنایا ہے نا؟'' امی چمک کے بولی تھیں۔ اس نے جلدی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''جی.... کیا اچھا نہیں بنا؟'' اس کی نظریں دادا جی کی آنکھوں پہ ٹکی تھیں۔

''اچھا؟ ارے اس میں زہر ملا ہوا ہے۔'' انہوں نے پیالے سے چاندی کا چمچ نکال کے سامنے لہرایا۔

''زہر؟'' تالیہ کا سر گھوم گیا۔

''وہ تو شکر ہے میں نے صحت کے پیش نظر گھر میں چاندی کے برتن استعمال کروانے شروع کیے۔ اللہ نے ابا جی کی زندگی بچانی تھی' سو ہم نے وقت پہ دیکھ لیا کہ سارا پیالہ اور چمچ سیاہ پڑ رہا ہے۔ ایسا صرف تب ہوتا ہے جب زہر چاندی کے چمچ کو چھو جائے۔''

وہ چوکھٹ پہ کھڑے کھڑے پتھر بن گئی۔ ایک نظر اس پیالے کو دیکھا جو واقعی سیاہ پڑ رہا تھا۔ آدھا دلیہ زمین پہ گرا ہوا تھا۔ اور پھر مری مری نظروں سے دادا جی کو دیکھا۔ ''مجھے نہیں پتا یہ کیسے ہوا۔ میں نے خود دلیہ بنایا ہے' کسی نے کیسے اس میں کچھ ڈال دیا۔''

''کسی نے نہیں' تم نے ڈالا ہے۔'' ابا جی غصے سے چلائے تھے۔

''تالیہ....!'' دادا جی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا۔ ''تالیہ.... تم چاہتی تھیں.... میں جلدی مر جاؤں؟ اتنی جلدی کیا تھی بیٹے؟'' وہ سارے حساب کتاب کیے بیٹھے تھے۔ پندرہ منٹ سے عدالت لگی تھی اور ساری تفتیش مکمل ہو چکی تھی۔ دادا جی کو یقین دلایا جا چکا تھا۔ ثبوت اس کے خلاف جاتے تھے۔

اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ رنگت سفید پڑ گئی۔ بے یقینی سے ان کو دیکھتے نفی میں گردن ہلائی۔

''میں نے نہیں کیا یہ.... دادا جی.... میں

ایسا کیوں کروں گی؟" گلا رندھ گیا تھا۔اس نے ایک ہاتھ سے چوکھٹ پکڑ لی۔چکر سے آ رہے تھے۔

امی اس کو جواب میں گالیاں دینے لگی تھیں۔ لے پالک' جانے کس نیچ خاندان کی تھی وہ۔ابا کہہ رہے تھے کہ انہوں نے پولیس بلا لی ہے۔ان کی رشتے دار خاتون سب انسپکٹر بس آنے ہی والی ہو گی اور وہ تالیہ سے سارا معاملہ اگلوا لے گی۔

مگر وہ بھاگی نہیں۔وہ چوکھٹ کو پکڑے کھڑی بے یقین سی تھی۔جبران بالکل چپ بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔

"دادا جی.... میں نے یہ نہیں کیا۔میرا یقین کریں۔یہ سب مجھ پہ الزام لگا رہے ہیں۔" وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔

دادا جی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہوں نے چہرہ پرے پھیر لیا۔جبران نے ان کا ہاتھ تھاما تو انہوں نے جواب میں زیادہ سختی سے جبران کا ہاتھ پکڑ لیا۔خون' خون ہوتا ہے۔وہ اپنوں پہ زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔اپنے جیت گئے تھے۔تالیہ کا دل پھر سے کچلا گیا۔

"میں نے یہ نہیں کیا۔" وہ زور سے چیخی۔"یہ سب آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔جبران نے ان کو دکانوں کا بتا دیا ہے۔دادا جی یہ آپ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔"

وہ بھاری بھرکم عورت پیچھے سے آئی تھی۔ تھانیدارنی۔اور اب وہ اس کو پیچھے کھینچ رہی تھی۔ حوالات کی باتیں کر رہی تھی.... مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی' وہ اس کی گرفت میں پھڑپھڑاتی ہوئی چلا رہی تھی۔

"اللہ گواہ ہے' میں نے یہ نہیں کیا۔دادا جی میری طرف دیکھیں۔دادا جی میری بات سنیں۔دادا جی میں آپ کی تالیہ ہوں۔میں آپ کو فجر پہ وضو کروانے آتی ہوں۔میں آپ کو آدھی آدھی رات کو پانی پلانے آتی ہوں۔دادا جی' میں آپ کی واحد فیملی ہوں۔ آپ میری واحد فیملی ہیں۔میری بات تو سنیں۔" وہ اب رو رہی تھی مگر وہ عورت اسے پیچھے کھینچ رہی تھی۔اس نے چوکھٹ پہ ہاتھ سختی سے جما رکھے تھے....ناخن لکڑی پہ گاڑھ دیے تھے۔کھینچنے اور گھسیٹنے کے باعث وہ چوکھٹ سے رگڑتے نشان چھوڑ گئے....کچھ ناخن ٹوٹ گئے....انگلیوں سے خون رسنے لگا مگر وہ چلائے جا رہی تھی....

"دادا جی.... میری طرف دیکھیں تو سہی....دادا جی...."

☆☆☆

زخمی ہاتھ ایک جھٹکے سے رسیوں کی قید سے آزاد ہوئے تھے۔اس نے وحشیانہ انداز میں رسی پرے پھینکی' پھر گردن سے رسی کا طوق نکالا' اور تیزی سے پیروں کے گرد سے گانٹھیں کھولنے لگی۔پیر آزاد کرتے ہی وہ فاتح کی طرف بڑھی۔

"پہلے ایڈم۔" اس نے فوراً اسے روکا۔اور وہ رک گئی۔فاتح کی آنکھوں میں دیکھا۔پھر اثبات میں سر ہلایا اور ایڈم کی طرف آئی۔ایڈم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔فوراً اپنے ہاتھ آگے کر دیے۔البتہ خود دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔وہ اس وقت تالیہ کی خوش گفتاری سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

☆☆☆

وہ چھوٹا اور سادہ سا کمرہ تھا۔تالیہ کا کمرہ۔اس بھاری بھرکم عورت نے اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی اور تالیہ کو کرسی پہ بٹھا کے اس کے ہاتھ دوپٹے سے پیچھے باندھ دیے تھے۔میز پہ قلم کاغذ رکھا تھا۔تالیہ کا سر جھکا تھا اور وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔عورت آگے آئی اور اس کا چہرہ زبردستی اوپر اٹھایا۔

"شکر کرو شفقت بھائی نے مجھے گھر پہ بلا لیا' سب انسپکٹر دردانہ نام ہے میرا۔جانتی ہو تم مجھے اچھی طرح۔بلکہ پورا علاقہ واقف ہے مجھ سے۔تھانے لے کر جاتی تو تم ایک گھنٹے کی مار برداشت نہ کر سکتیں۔" جھٹکے سے اس کی ٹھوڑی چھوڑی۔اس کا بھیگا چہرہ پرے لڑھک گیا۔

عورت اب اس کے سر پہ جھکی غرا کے کہنے لگی۔

"اس کاغذ پہ اعتراف جرم لکھو کہ کس طرح تم نے دادا

جی کو زہر دینے کی کوشش کی۔ ورنہ میں تمہارا وہ حال کروں گی کہ تم یاد رکھو گی۔“

”مجھے دادا جی کے پاس لے جاؤ۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ وہ روتے بلکتے ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔ تھانیدارنی نے زور کا جھانپڑ اس کے چہرے پہ رسید کیا۔ وہ کرسی سمیت نیچے جا گری۔ دردانہ جھکی اور گردن سے دبوچ کے اسے اٹھایا۔

”جو میں کہہ رہی ہوں‘ وہ لکھو۔ بلکہ لکھ تو میں نے دیا ہے‘ اس پہ دستخط کر دو۔“

وہ اسٹامپ پیپر تھا اور وہ تیار تھا۔

تالیہ کے آنسو یکدم رک گئے۔ وہ بالکل ٹھہر گئی۔ چند لمحے کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچتے ہوئے سر اٹھایا اور دردانہ کو دیکھا۔

”اچھا.... کہاں کرنے ہیں سائن؟“ وہ بدلے ہوئے انداز میں بولی تو دردانہ نے گہری سانس لی۔ اور پیچھے سے آ کر اس کے ہاتھ کھولنے لگی۔

”اسی کاغذ پہ.... بالکل نیچے.... جہاں تمہارا نام لکھا ہے.... اور ساتھ تاریخ بھی ڈالو۔“ وہ دوپٹے کی گرہیں کھول رہی تھی۔

”اگر میں سائن کر دوں تو تم مجھے دادا جی سے ملنے دو گی؟“

دردانہ اس کے پیچھے کھڑی تھی‘ اس بات پہ تلخی سے مسکرائی مگر بظاہر نرمی سے بولی۔ ”ہاں۔ بالکل۔“

”اچھا۔ میں کر دیتی ہوں سائن۔“ وہ رضامندی سے جلدی سے بولی اور گردن کاغذ پہ جھکا لی۔ اب وہ تحریر پڑھ رہی تھی۔ دردانہ نے آخری گرہ کھولی تو اس نے ہاتھ کھینچ لیے اور قلم اٹھا لیا۔ پھر کاغذ چہرے کے سامنے لائے تحریر پڑھنے لگی۔ وہ تحریر جس کے مطابق وہ دادا جی کو مارنے کا اعتراف کر رہی تھی۔

دردانہ گہری سانس بھر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ تالیہ نے کاغذ میز پہ رکھا اور دستخط کرنے جھک گئی‘ ساتھ ہی منہ میں کچھ بولی۔ دردانہ نے ابرو اٹھایا۔ ”کیا؟“

وہ پھر جھکے جھکے کچھ بڑبڑائی۔ دردانہ نے اکتا کے چہرہ جھکایا۔ ”کیا بک رہی....“

اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ تالیہ کی مٹھی کی پشت زور سے اس کی ناک پہ آ لگی تھی۔ دردانہ تیورا کے پیچھے کو لڑھکی۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ سنبھل نہیں پائی تھی‘ مگر یہ اختتام نہیں تھا۔ یہ صرف آغاز تھا۔

”مجھے مارا تم نے؟ ہاں؟ تالیہ بنت مراد کو مارا تم نے؟“ وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس پہ جھپٹی اور اسے گردن سے پکڑ کے اٹھایا‘ پھر تابڑ توڑ اس کے چہرے پہ مکے مارنے لگی۔ دردانہ نے چلاتے ہوئے اس کے بال کھینچے مگر تالیہ بھی کافی صحت مند تھی‘ اور اس کا جنون اور جوش کہیں زیادہ تھا۔ چند لمحوں میں اس نے دردانہ کو پھر سے نیچے گرا دیا اور کرسی اٹھا لی۔

”میں تالیہ بنتِ مراد ہوں.... میں محلوں میں رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔ میں دنیا پہ حکمرانی کرنے کے لیے بنی ہوں۔ مجھے مارا تم نے؟“ وہ دیوانہ وار کرسی کی ٹانگ اس پہ برسائے جا رہی تھی۔ دردانہ زمین پہ گری دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کر رہی تھی‘ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا مگر تالیہ اسے مارے جا رہی تھی۔

چند منٹ بعد جب تالیہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تو باہر راہداری میں کھڑے ابا‘ امی اور جبران نے پرامید نظروں سے اس طرف دیکھا.... دروازہ کھلتا گیا اور جو منظر سامنے آیا.... اس سے ان کی مسکراہٹیں سمٹیں۔

سامنے کرسی پہ دردانہ بے حال‘ خون آلود چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی‘ اس کے ہاتھ پیچھے کو بندھے تھے اور گردن نقاہت سے ڈھلکی تھی۔ امی کا منہ شاک سے کھل گیا۔

”دردانہ!“ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتیں‘ دروازے کی اوٹ سے وہ نکل کے سامنے آئی۔

الجھی پونی سے نکلتے بال‘ ماتھے پہ گومڑ اور خون.... سرخ انگارہ ہرنی جیسی آنکھیں‘ اور ہاتھ میں پکڑی چھری۔ (جو وہ الماری میں رکھتی تھی‘ چوری شدہ

پھل رات گئے کاٹ کے کھانے کے لیے!) اس چھری کو لہراتے ہوئے وہ ان سب کو گھورتی آگے آئی۔

"اور کس کو کروانا ہے مجھ سے اعتراف جرم۔ ہاں؟ اور کون مجھے مارنے آئے گا؟ کس میں ہمت ہے کہ اب وہ تالیہ کو ہاتھ بھی لگائے!"

ابا تو وہیں کھڑے رہے مگر امی دو قدم پیچھے کو ہٹ گئیں۔

"اب ہٹو سامنے سے تم لوگ۔ مجھے دادا جی سے ملنا ہے۔" وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ غرا کے بولی تھی۔ "اور اگر کوئی درمیان میں آیا تو میں اس کی جان لے لوں گی۔"

"اس کو.... اس کو نہ چھیڑو شفقت بھائی۔" پیچھے سے نڈھال سی بندھی ہوئی دردانہ درد سے چلائی۔ "یہ واقعی مار دے گی آپ کو۔ یہ پاگل ہو چکی ہے۔"

"تالیہ...." جبران نے پکارا تو تالیہ نے غصے سے اس کو دیکھا۔

"تم نے کیا ہے یہ سب ان کے ساتھ مل کے۔ میں دادا جی کو تم لوگوں کی اصلیت بھی بتاؤں گی اور ثبوت بھی دکھاؤں گی۔ میں تم لوگوں کو...."

"تالیہ! دادا جی کا کچھ دیر پہلے ہارٹ فیل ہو گیا ہے.... دادا جی مر گئے ہیں تالیہ۔" وہ بنا کسی دکھ کے بے تاثر سا بولا۔

تالیہ کے کندھے ڈھلک گئے۔ چھری والا ہاتھ پہلو میں آ گرا۔ چند لمحے وہ ساکن سی کھڑی رہی... پھر بے اختیار سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ تیز تیز زینے پھلانگے اور دھاڑ سے ان کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

جبران درست کہہ رہا تھا۔

دادا جی جا چکے تھے۔

اسے دیر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لب بھینچے، سر جھکائے، اس نے جھٹکے سے رسی کی آخری گانٹھ کھولی تو ایڈم کے ہاتھ کھل گئے۔ وہ جلدی جلدی باقی رسی خود اتارنے لگا۔ سوچا شکریہ کہے مگر پتے تالیہ کا جواب خوشگوار نہیں آنا تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔

وہ واپس مڑی اور اس سے قبل کہ وہ فاتح کی طرف آتی، گھوڑا گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ وہ تینوں بری طرح چونکے۔ فاتح نے گردن موڑ کے پنجرے کی سلاخوں سے دیکھا۔ گاڑی کے سامنے کیا آیا تھا جو وہ رکی تھی، معلوم نہیں ہوتا تھا، مگر اتنا نظر آتا تھا کہ سامنے کوئی لمبی چوڑی سی دیوار تھی۔

"یہ کیسی دیوار ہے؟" تالیہ اپنی طرف سے جھانکنے کی سعی کر رہی تھی مگر کچھ واضح نہ تھا۔

"یہ شہر کی فصیل ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ملاکہ شہر کی فصیل۔"

وان فاتح کے الفاظ تھے کہ کیا.... تالیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

وہ تاریخی شہر.... سلطنتِ ملاکہ کا دارالحکومت "ملاکہ" ان کے سامنے تھا.... جہاں سلاطین کے محل تھے.... جہاں شہزادیاں رہتی تھیں.... کیا وہ واقعی ملاکہ میں داخل ہونے والے تھے؟

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

گھوڑا گاڑی رک چکی تھی۔ چند افراد کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ تالیہ نے سننے کی کوشش کی۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ یہ شہر کی فصیل ہی ہے کیونکہ گاڑی بان غالباً کسی پہرے دار سپاہی سے کہہ رہا ہے کہ وہ کسی...." اس نے کان لگا کے غور سے سننا چاہا۔ "کسی 'ابوالخیر' کا آدمی ہے اور اس کے پاس قیمتی سامان ہے۔ اب فصیل کا سپاہی اس کو اندر جانے کی اجازت دے رہا ہے۔" وہ سن کے ترجمہ کر رہی تھی۔

بھاری گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور گاڑی پھر سے چل پڑی۔

تالیہ نے جلدی سے رسیاں واپس ہاتھوں اور گردن میں لپیٹ لیں، یوں کہ لگے وہ ہنوز مقید بیٹھی ہے۔ اسے دیکھ کے ایڈم نے بھی تقلید کی۔

اب وہ تینوں دم سادھے بیٹھے تھے۔

گھوڑا گاڑی اب شہر کے اندر داخل ہو چکی تھی......

☆☆☆

چھوٹے بنگلے میں اگر بتیوں کی مہک پھیلی تھی۔ لاؤنج میں سفید چادریں بچھی تھیں' جن پہ جا بجا کھجور کی گٹھلیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ فضا میں بریانی کی خوشبو بھی رچی بسی تھی۔ چادریں البتہ خالی تھیں۔ لوگ مردے کو بخش کے جا چکے تھے۔ وہاں صرف وہ بیٹھی تھی۔ سر پہ سفید دوپٹا اوڑھے' اکڑوں بیٹھی' گھٹنوں پہ گال ٹکائے۔ آنسو آنکھ میں ہنوز اٹکا تھا۔ ماتھے کا گومڑ اب نیلا ہو چکا تھا۔

دفعتاً شفقت صاحب اندر داخل ہوئے۔ ایک طرف جوتے اتارے اور ننگے پاؤں چلتے اس کے قریب آئے اور سامنے بیٹھے۔

''تالیہ۔'' انہوں نے آہستہ سے پکارا۔ نہ سخت لہجہ تھا' نہ نرم۔ بس مطمئن۔ وہ گھٹنے پہ گال رکھے بیٹھی دور خلا میں دیکھتی رہی۔

''گھر کی بات تھی' اس لیے میں نے تھانے کچہری کے معاملات کو سنبھال لیا ہے۔ پولیس تمہیں گرفتار نہیں کرے گی۔ سمجھو معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔''

دادا جی نے اس کے نام دکانوں کا انتقال ہی نہیں کروایا تھا ابھی' اس لیے یقیناً انہوں نے جبران سے مل کے سب کچھ آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اب تالیہ کو سزا دینا بے کار تھا۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پلکوں کے کنارے پہ آنسو اٹکا تھا' مگر گرتا نہیں تھا۔

''تمہارے لیے ایک میرج بیورو سے بات کی تھی۔ ایک اچھا رشتہ ڈھونڈا ہے ہم نے۔ لڑکا ملائیشیا کا ہے۔ تمہارے ملک کا۔ اگلے ہفتے نکاح ہو گا اور چند دن بعد تم ملائیشیا چلی جاؤ گی۔ ہم تمہیں اچھا زیور اور کپڑے دے کر رخصت کریں گے اور ہمارے سارے فرائض ادا ہو جائیں گے۔ جو تم نے چا چاچی کے ساتھ کیا' اس کی معافی تم اللہ سے مانگتی رہنا' مگر آئندہ ہمارا تم سے کوئی لینا دینا نہیں ہو گا۔''

وہ جب اسی طرح بت بنی بیٹھی دوسری طرف دیکھتی رہی' تو وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میرے پاس کبھی جیب خرچ جتنے پیسے جمع نہیں ہوئے' لیکن جب بھی کچھ بچا پاتی' تو ایک تنظیم کو خیرات کے طور پہ بھیجتی جو ایشیا کے مختلف ممالک میں کام کر رہی ہے۔'' وہ دیوار کو دیکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولی تو وہ وہیں رک گئے۔

''وہ تنظیم ایک مہم چلا رہی ہے جس کے تحت یتیم خانوں میں وولینٹیر پروگرام کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ وولینٹی پروگرام سمجھتے ہیں آپ' کیا ہوتے ہیں؟ جب اسٹوڈنٹس یا سوشل ورکرز رضا کار بن کے چند دن کے لئے یتیم خانے میں آتے ہیں' بچوں کے ساتھ وقت بتاتے ہیں' اپنی رپورٹس' تھیسز' اور پیپرز لکھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور ان کو لگتا ہے وہ بہت نیک کام کر کے گئے ہیں' مگر نہیں۔'' اس کی دوسری آنکھ میں بھی آنسو اٹک گیا مگر گرا نہیں۔

وہ وہیں کھڑے اس کو سنے گئے۔

''یہ رضا کار یتیم بچوں کو ظالم وارڈن سے زیادہ نقصان پہنچا جاتے ہیں۔ چند دن میں بچے ان کے ساتھ ایک رشتہ بنا لیتے ہیں۔ ہر اجنبی کو دیکھ کے بچوں کو لگتا ہے وہ ان کو ایڈاپٹ کر لے گا مگر جب وہ اپنے بھرے کاغذوں اور رجسٹرز کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں تو بچے کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ساری عمر کے لیے دوبارہ کسی سے محبت کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔''

شفقت صاحب وہیں کھڑے اس کے جھکے سر کو دیکھے گئے۔ جیسے بدقت برداشت کر رہے ہوں۔

وہ دیوار کو دیکھتی رندھی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''اور اگر کبھی وہ زندگی میں آگے جا کر کسی اجنبی کو اپنا مان بھی لے' اور اس سے محبت کر بھی بیٹھے' تو بھی آخر میں اس کو معلوم ہوتا ہے کہ بغیر خون کے رشتے پھیکے ہی ہوتے ہیں اور خون ہمیشہ جیت جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی سے محبت کرنا' کسی سے اٹیچ

ہونا اس بچے کے لیئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں اتنے سال اس تنظیم کو خیرات دیتی رہی تاکہ دوبارہ کوئی رضا کار، کوئی اجنبی کسی یتیم بچے کا دل نہ توڑ سکے۔"

وہ اب خاموش ہو گئی تھی۔ چہرہ ہنوز گھٹنوں پہ رکھا تھا اور آنسو ٹپک کے ہی نہ دے رہے تھے۔ شفقت صاحب نے سر جھٹکا اور اپنے ننگے پیر دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ تالیہ کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے اسے یتیم خانے سے آزادی دی۔ اس کو چھت دی۔ اس کو پال پوس کے بڑا کیا۔ اب اس کی شادی کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے کسی غریب بچی کے لیے؟ غربت کی وجہ سے ہی والدین نے اسے یتیم خانے میں پھینکا ہوگا۔ اگر اپنے اصل گھر میں پلتی بڑھتی تو فقیروں کی سی زندگی گزارتی۔ مگر بھئی انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔" وہ افسوس کرتے باہر نکل گئے۔

اگربتی کی مہک کافور میں گھل کے عجیب سی خوشبو بنا رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو اعصاب کو مزید بھاری کر دیتی ہے۔

☆☆☆

اندھیرا ملاکہ شہر پہ پھیلا تھا۔ گھوڑا گاڑی سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دونوں اطراف میں اندھیرا تھا۔ کہیں ایک منزلہ کمرے سے بنے تھے۔ کہیں ریڑھیاں رکھی تھیں جن کے اوپر چادریں پڑی تھیں۔ کہیں گھوڑے بندھے تھے۔ اِکا دُکا مشعل کسی مکان کے سامنے روشن تھی تو تھی، ورنہ ہر طرف اندھیرا تھا۔ گھوڑا گاڑی اب ایک گلی میں مڑ گئی تھی۔ دونوں اطراف میں چاندنی میں واضح ہوتے مکان بنے تھے۔ بالائی منزلیں سن باؤ کے گھر جیسی تھیں۔ ویسی ہی بالکونیاں.... ویسے ہی دالان۔ وہ سلاخوں سے چہرہ لگائے، محویت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس خاموش سوئے ہوئے شہر کو دیکھ رہی تھی۔

عجیب قدیم شہر تھا.... عجیب قدیم مکان تھے.....

بالآخر گھوڑا گاڑی ایک بڑے گیٹ کے سامنے جا رکی۔

آگے گیا ہوگا؟ تالیہ کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا.....

☆☆☆

کوالالمپور کا خوبصورت شہر اس دوپہر بہت روشن دکھائی دیتا تھا۔ سڑک کنارے ایک اخبار کے اسٹال پہ وہ رکی کھڑی تھی۔ کوالالمپور آنے اور سیمی سے چھٹکارا پانے کے چند ماہ کے اندر وہ خوش خوراکی کے باعث مزید بھری بھری سی ہو گئی تھی۔ گال پہلے سے زیادہ پھول گئے تھے۔ ایسے میں وہ اخبار میں چھپے وان فاتح کے انٹرویو کو دیکھ رہی تھی۔ جب دکاندار نے اس کو چناؤ کا کہا۔ اس نے اخبار اور پھولوں کا تاج دونوں پکڑ رکھے تھے۔

"آپ کو اخبار چاہیے یا تاج؟ یا دونوں؟"

اور تالیہ نے چند لمحوں میں ہی چناؤ کر لیا تھا۔ اس نے اخبار چھوڑ دیا اور تاج سر پہ رکھ لیا۔ وہ پھولوں سے بنا تھا اور پھول بھاری نہیں ہوتے۔ وہ اپنے فیصلے پہ مطمئن سی فٹ پاتھ پہ آگے چل دی۔

اسے پارلر پہنچنا تھا جہاں اس کی شفٹ کا وقت ہونے والا تھا۔ تاج کے باعث فٹ پاتھ پہ چلتے لوگوں نے کئی بار مڑ کے اسے دیکھا تھا۔ کسی نے ستائشی فقرہ بھی کہا۔ وہ بے نیاز سی چلتی گئی۔

ایک دم سے ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کے گردن اٹھائی۔ پتا بھی نہ چلا تھا اور آسمان نے اپنے تھال الٹ دیے تھے۔ موسلا دھار بارش یکا یک شروع ہو گئی تھی۔ اس کے پاس چھتری نہ تھی۔ وہ بھاگ کے دو دکانوں کے چھجے تلے آ کھڑی ہوئی۔ مگر ان چند قدموں کے فاصلے نے ہی اسے بھگو ڈالا تھا۔

منہ بسورے اس نے سر کا تاج اتارا تو دیکھا، سفید اور زرد پھول گیلے ہو کے ادھڑنے لگے تھے۔ ان کو جوڑنا چاہا تو ایک طرف سے تین زرد گلاب ٹوٹ کے قدموں میں آ گرے۔ وہ بے اختیار نیچے جھکی اور زمین پہ گرے پھولوں کو اٹھانے کے لئے ہاتھ

بڑھایا.....

گیلی زمین پہ گرے زرد گلاب.....ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

چند منٹ بعد بھیگی ہوئی تالیہ ایک دفتر کے اندر کھڑی تھی۔ کرسی پہ بیٹھا شخص اسے سامنے والی کرسی پیش کر رہا تھا مگر وہ عجلت میں کھڑی ہی رہی۔

''اگر اخبار میں ایک اشتہار لگوانا ہو تو کتنے پیسے لگیں گے؟'' وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔ دفتر کے شیشوں پہ بارش تڑاتڑ برسے جا رہی تھی۔

☆☆☆

گھوڑا گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔ آگے چار دیواری کے اندر کھلا سا احاطہ تھا۔ وہاں دور دور تک گھوڑے بندھے نظر آ رہے تھے۔ دیواروں پہ چند مشعلیں روشن تھیں جن کے باعث منظر نامہ نیم روشن تھا۔

گاڑی کو روک کے چند افراد نے وہ پنجرہ اٹھایا اور اسے نیچے لا اتارا۔ پھر ایک کونے میں رکھ کے خود آگے بڑھ گئے۔

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جیسے سب ان کو بھول کے سونے جا چکے ہوں۔ نیم اندھیرا اور سناٹا۔ فاتح نے گردن اونچی کر کے دیکھا۔

کچی مٹی کے احاطے میں ایک جگہ بجھی ہوئی لکڑیاں رکھی تھیں گویا شام میں جلتی رہی ہوں۔ ایک کونے میں کنواں بنا تھا۔ سامنے بہت سے گھوڑے قطار میں تھے۔

''یہ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟'' تالیہ کی آواز پہ وہ چونکا۔ وہ الجھی ہوئی سی سوال کر رہی تھی۔ ''کیا یہ ہمیں مار دیں گے؟''

''اگر مارنا ہوتا تو اتنی اچھی غذا نہ دیتے۔'' وہ بولا تو تالیہ نے ایک نظر پنجرے کے دروازے پہ ڈالی۔

''اس کو باہر سے تالا لگا ہے۔ اگر ہم کھول بھی لیں تو اس عجیب شہر میں ہم کہاں جائیں گے' تو انکو؟ میرے بابا جانے کہاں ہوں گے۔ ہم کس سے راستہ پوچھیں گے؟'' اس نے اپنے ہاتھ کی کھلی رسیوں کو مایوسی سے دیکھا۔ ''ہم یہ رسیاں کھول کے بھی قیدی ہیں۔''

''تالیہ....ادھر دیکھو....تالیہ!'' فاتح نے سختی سے پکارا تو تالیہ نے اداسی سے سر اٹھایا۔

''تم پہ پھر سے چار دن پہلے والی قنوطیت طاری ہو رہی ہے۔ ایسے مت کرو۔ مجھے نہیں معلوم تم زندگی میں کن حالات سے گزری ہو' مگر میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ماضی کا ہر واقعہ ہمیں مستقبل کے امتحان کی تیاری کروانے کے لئے پیش آتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پھر سے ہمت ہار دو۔ ہم تمہارے بابا کے بہت قریب ہیں۔ اس لیے شاباش....ہمت کرو اور دروازہ کھولو....یا میرے ہاتھ کھولو تاکہ میں اس کو توڑنے کی کوشش کروں۔'' تالیہ نے گہری سانس لی اور گردن اٹھالی۔ ساری اداسی اس قدیم فضا میں اڑ کے خاک ہوگئی۔

''آپ کے ریڈنگ گلاسز آپ کی جیب میں ہیں نا؟'' وہ ذرا پرسکون انداز میں سوال کرنے لگی تو فاتح کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔

''ہاں کیوں؟'' وہ بندھے ہاتھ بدقت جیب تک لے گیا' عینک نکالی اور اس کی طرف اچھالی۔ تالیہ نے دونوں ہاتھوں سے اسے فضا میں کیچ کرلیا۔ پھر عینک کھولی اور کڑک کی آواز کے ساتھ اس کا بازو توڑ دیا۔ پھر سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ باہر نکال کے تالے میں عینک کے ٹوٹے بازو کا نوکیلا حصہ ڈالا' اور گھمانے لگی۔

''یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا؟'' وہ متحیر ہوا۔ ایڈم البتہ چپ رہا۔ جے تالیہ کی تعریف کا کوئی موڈ نہیں تھا اس کا۔

سلاخوں سے لگی' بازو باہر لے جا کے تالے کے اندر ''چابی'' گھماتی تالیہ فاتح کو دیکھ کے مسکرائی۔

''ایک جادوگر سے!''

عینک کے ہینڈل کی پن تالے کے اندر کی پنوں کو دھیرے دھیرے کھول رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک کیفے تھا جہاں کونے والی کرسی پہ تالیہ

بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ گال تلے رکھے' وہ دوسرے ہاتھ سے میز بجاتی منتظر سی نظر آتی تھی۔ نظریں دروازے پہ لگی تھیں۔ میز پہ ایک اخبار بھی پڑا تھا جس میں ایک واضح اشتہار سامنے نظر آ رہا تھا۔

"میرے فادر جن کا نام ذوالکفلی ہے' کچھ عرصے سے لاپتا ہیں۔ میں ان کو اس پیغام کے ذریعے یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں ہر شام مندرجہ ذیل پتے پہ ان کا انتظار کرتی ہوں۔ میرے پاس ان کا دیا زرد گلاب اور کھوٹا سکہ اب بھی موجود ہے اور میں ان کے پلٹ کے آنے کی آج تک منتظر ہوں۔ اگر ان کو میرا احسان یاد ہے تو براہِ مہربانی پلٹ آئیں۔ تالیہ!"

ساتھ میں کتاب میں رکھے ایک سوکھے زرد گلاب اور کھوٹے سکے کی تصویر بھی شائع کی گئی تھی جو وہ ہمیشہ اپنے سامان میں اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اتنے برس تک تالیہ نے اس پھول کو نہیں کھویا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ایک ہیٹ والا آدمی اندر داخل ہوا۔ ہیٹ اس نے ماتھے پہ جھکا رکھا تھا۔ صرف ہونٹ نظر آتے تھے۔ یا چھوٹی سی کھچڑی داڑھی۔

وہ سیدھا اس کی میز تک آیا اور کرسی کھینچی۔ پھر ہیٹ اتار کے رکھا تو چہرہ واضح ہوا۔

ذوالکفلی اب بوڑھا ہو گیا تھا۔ سر کے بال آدھے سفید تھے۔ جیب میں زرد پھول بھی نہ تھا مگر آنکھیں وہی تھیں۔ مسکرا کے اس نے تالیہ کو دیکھا۔

"کتنے دن سے اشتہار دے رہی ہو' تالیہ؟"

وہ گال ہتھیلی پہ جمائے اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ "آٹھ دن سے۔ شہر کے تینوں بڑے اخبارات میں۔ وہ اس عجیب و غریب سے اشتہار پہ حیران ہوتے ہیں مگر میں جانتی تھی' یہ آپ کی نظروں سے ضرور گزرے گا۔"

وہ صرف مسکرا دیا۔ نظریں اس پہ جمی تھیں۔ "آئی ایم سوری۔ میں کسی الوداع کے بغیر ہی چلا گیا' لیکن میں نے کبھی تمہیں ایڈاپٹ کرنے کی امید نہیں دلائی تھی۔ مجھے معاف کر دینا اگر ایسا ہوا ہو تو۔"

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ کم از کم اب نہیں۔"

"شاید تب بھی نہیں تھا' تب ہی تم نے غلط خاکہ بنایا تھا۔ پولیس میں میرے مخبر بھی ہیں' خبر مل ہی جاتی ہے۔ وہ تمہارا احسان تھا۔ میں شکر گزار ہوں۔ بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" وہ ہاتھ باہم پھنسائے سنجیدگی سے اس کی طرف جھکا۔

"میں چاہتی ہوں' آپ مجھے اپنی طرح بنا دیں۔ بہروپیا۔ چور۔"

ذوالکفلی کو شاک لگا۔ وہ ایک دم پیچھے ہوا۔ "تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ تم تو اتنی پیاری لڑکی ہو۔ تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔"

وہ اسی طرح ہتھیلی پہ چہرہ جمائے بیٹھی اطمینان سے اسے دیکھے گئی۔

"مجھے فیری ٹیلز میں وہ شہزادیاں نہیں پسند ذوالکفلی صاحب جو ایک زہریلا سیب کھا کے مر جاتی ہیں.... یا گھڑی کے بارہ بجاتے ہی خوابوں کی تقریب چھوڑ کے بھاگ جاتی ہیں۔ جنہیں کوئی بھی بھیڑیا' دادی کے کپڑے پہن کے بے وقوف بنا سکتا ہے۔ مجھے تو وہ شہزادیاں پسند ہیں' جو زہر کی بو کو میلوں دور سے سونگھ سکیں.... جو اپنی شیشے کی جوتی محل سے خود کھینچ کے واپس لے آئیں۔ جو اپنے جسم سے سوئیاں نکالنے کے لئے شہزادوں کا انتظار نہ کریں.... جو اپنی ہر شے کو برف بنا دینے کی صلاحیت سے خوف زدہ نہ ہوں.... جو ونڈر لینڈ میں خود کو جان بوجھ کے گم کر لیں جب کہ ان کو سارے راستے آتے ہوں اور جب وہ کسی beast کے قلعے میں داخل ہوں تو ان کو اچھی طرح معلوم ہو کہ اندر کیا ان کا منتظر ہے۔ سو ذوالکفلی صاحب' میں پیاری لڑکی ہوں نہ بننا چاہتی ہوں۔ میں وہ ظالم لڑکی بننا چاہتی ہوں جو ایک دن اپنے محل میں راج کرے گی' اپنی مرضی کی شہزادی بن کے۔"

وہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ بس بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گیا۔

"تم کہاں رہ رہی ہو؟" کوئی سحر سا ٹوٹا تو اس نے سوال کیا۔

"ایک نئی دوست کے ساتھ جو ائیر پورٹ پہ ملی تھی۔ لیانہ صابری۔ مگر اس کو نہیں معلوم کہ میں آپ سے رابطے میں ہوں۔ جو میرے اور آپ کے درمیان ہوگا' وہ ہمارے درمیان ہی رہے گا۔ وہ میرے ہر کام میں میرا ساتھ دے گی مگر میں یہ چھوٹے موٹے ای میل اسکام نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے بڑے کام کرنے ہیں۔"

"تمہیں ان بڑے کاموں کی قیمت ساری زندگی چکانی پڑے گی۔ تمہاری نیک روح بدی سے داغدار ہو جائے گی۔"

"مجھے پروا نہیں ہے۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟"

"ہاں!" ذوالکفلی نے اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہیں میں کوالالمپور کی بہترین کون آرٹسٹ بنا سکتا ہوں۔ تمہارے اندر نیچرل ٹیلنٹ ہے کہانی بازی کا۔ اور تم ذہین بھی ہو لیکن تمہیں اپنا وزن کم کرنا ہوگا۔"

تالیہ نے گال تلے سے ہاتھ ہٹایا اور حیرت سے اسے دیکھا۔ "اچھا ٹھیک ہے میں موٹی ہوں مگر وزن کا اس کام سے کیا تعلق۔"

"تم نے کہا تم 'بہترین' بننا چاہتی ہو۔ کسی بھی فیلڈ میں بہترین بننے کے لئے سستی اور موٹاپے سے نجات ضروری ہے۔ جتنا انسان فٹ ہوتا ہے' اتنا اس میں اسٹیمنا ہوتا ہے اور اتنی وہ محنت کر سکتا ہے۔ اگر تم کچھ سیکھنا چاہتی ہو تو پہلے پچیس کلو وزن کم کرو۔ اور پھر مجھے اس ای میل ایڈریس پہ میل بھیجو۔ اس سے پہلے میں تمہیں کچھ نہیں سکھا سکوں گا۔" اس نے ایک چٹ سامنے رکھی۔ جس پہ ایک ای میل ایڈریس درج تھا۔ تالیہ نے اچنبھے سے چٹ اٹھائی۔

"میں ساتھ ساتھ وزن کم کر لوں گی' کیا آپ ابھی سے....."

"ہرگز نہیں۔ موٹے لوگ بے کار لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے چڑ ہے موٹے لوگوں سے۔ وہ اس بات سے واقف ہی نہیں ہوتے کہ پتلا اور فٹ ہونا ان کی زندگی کو کیسے روشن کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے وزن کو محنت سے کم کر کے خود کو فٹ کر لیتے ہیں' وہ اپنی اپنی فیلڈ میں بہت آگے جا پہنچتے ہیں۔ میں موٹاپے کی لعنت کے ساتھ کسی کے ہمراہ کام نہیں کر سکتا۔ پچیس کلو۔ ٹھیک!" تنبیہہ کرتے ہوئے سنجیدہ چہرہ بنائے وہ اٹھا' اور ہیٹ اٹھا کے سر پہ رکھا۔ وہ چٹ ہاتھ میں لئے گم صم سی اسے دیکھے گئی۔

"میں تمہیں دنیا کا ہر کام سکھا دوں گا۔ تم منٹوں میں بہروپ اور آوازیں بدل لو گی۔ تنگ سوراخوں سے گزر جایا کرو گی۔ تالے تمہارے ہاتھ میں آتے ہی کھل جایا کریں گے۔ تم ہر کام سمجھ لو گی۔ ایسا نہیں ہے کہ تمہیں ہر کام "کرنا" بھی آجائے گا' لیکن تم لوگوں کو کنوینس کر سکو گی کہ تم سب کرنا جانتی ہو۔ اس لیے جب تیار ہو جاؤ تو مجھ سے رابطہ کرنا۔" ایک آخری نظر اس پہ ڈال کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا اور وہ گم صم سی اس ہیٹ والے پراسرار آدمی کو جاتے دیکھتی رہی۔

☆☆☆

عینک کا ہینڈل تالے کے سوراخ میں وہ مختلف زاویوں سے گھما رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھٹک کی آواز کے ساتھ وہ کھل گیا۔ تالیہ مسکرائی۔

اور تالا نکال کے زمین پہ گرا دیا۔ پھر فاتحانہ نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

"صدیوں سے قدیم چینی تالے ایک ہی طرز پہ بنتے آرہے ہیں۔ یہ تو کافی آسان تھا۔" اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور باہر اتری۔ ٹانگیں سیدھی کرنے پہ درد اور تکان محسوس ہوئی مگر ساتھ میں خوشگوار احساس بھی ہوا۔ وہ آزاد تھی۔

اسی پل سامنے دیوار سے بندھا کھڑا گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اپنے مالکوں کا وفادار جانور اس کو باہر نکلتے دیکھتے ہوئے زوردار آوازیں نکال رہا تھا۔ وہ جلدی سے مڑی۔

''ایڈم....فاتح صاحب کی رسی کھولو....ہمیں نکلنا ہوگا اس سے پہلے کہ وہ لوگ باہر نکل آئیں۔''

اس کی ہراساں نظریں عمارت کے بند دروازوں پہ جمی تھیں جہاں سب سونے اندر جا چکے تھے۔ایڈم نے جلدی جلدی اپنے پیر کھولے پھر فاتح کے ہاتھوں کی طرف آیا۔

''ایڈم جلدی کرو۔'' وہ دبا دبا سا چلائی۔

دوسرے گھوڑے بھی ایک ساتھ آوازیں نکالنے لگے تھے۔ایک نے فضا میں اگلے ٹاپ بھی بلند کر دیے۔عمارت کے اندر سے آوازیں آنے لگیں....جیسے لوگ جاگ گئے تھے۔

''ایڈم!'' وہ چیخی۔

''میں کھول رہا ہوں۔'' وہ بدحواسی سے فاتح کے ہاتھوں پہ بندھی رسی کی گانٹھ ڈھونڈ رہا تھا۔اندھیرا اور اتنی گانٹھیں....کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔یکدم فاتح نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔ایڈم نے چونک کے سر اٹھایا.....

''تم جاؤ....'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔''تم دونوں جاؤ اور مراد کو ڈھونڈو۔''

تالیہ سناٹے میں رہ گئی۔''نہیں....ہم آپ کو کیوں چھوڑ دیں؟ نہیں۔''

''بےوقوفی مت کرو'وہ لوگ جاگ گئے ہیں'وہ پہنچ گئے تو ہم تینوں پھنس جائیں گے۔جاؤ۔بھاگو۔''

وہ اب کے برہمی سے اونچا سا بولا۔ہاتھ اس نے پرے کر لیے تھے۔ایڈم شاکڈ تھا۔

''سر....ہم کیسے....آپ کا کیا ہوگا؟''

''وان فاتح کو زندگی میں کبھی کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔تم دونوں میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔میں اپنا معاملہ خود سنبھال لوں گا۔تم جاؤ۔جاؤ۔''

تالیہ نے بےیقینی اور خوف سے اسے دیکھا ....پھر عمارت کو۔اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔کھڑکیوں کے پٹ کھلے پھر دروازے....اس نے بےبس نگاہ فاتح پہ ڈالی۔وہ اس نگاہ کو سمجھ گیا تھا۔

''تم نے کہا تھا اگر سارے ملائیشا میں میرے ساتھ صرف ایک شخص کھڑا ہو تو وہ تم ہوگی۔کوئی بھی انسان میری بات ماننے والا نہ رہے'تم تب بھی میری بات مانو گی۔کیا تمہیں وعدے نبھانے آتے ہیں' تالیہ؟''

تالیہ کے دل پہ زوردار پتھر آگرا۔اس نے ایڈم کو دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔''بھاگو ایڈم!''

پھر دوبارہ فاتح کو دیکھا۔''تالیہ آپ کو بچانے آئی تھی۔تالیہ آپ کا ساتھ نہیں چھوڑے گی' تو انکو۔''

مگر پنجرے میں بیٹھا شخص شانے اچکا کے بولا تھا۔No Offence (برا مت ماننا) مگر فاتح کو کبھی کسی کی مدد یا ساتھ کی ضرورت نہیں پڑی۔میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔اب جاؤ۔''

یہ حکم تھا۔

وہ دونوں پیچھے دیکھے بنا ایک ساتھ بھاگے۔

☆☆☆

عمارت کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلے۔دو تین آدمی ہڑبڑائے ہوئے سے باہر آئے۔ایک کی نظر دور گیٹ پہ پڑی جس کا بڑا سا کنڈا تالیہ کھول رہی تھی۔

''روکو....پکڑو!'' وہ حواس باختہ سا چلایا مگر تالیہ کنڈا کھول چکی تھی۔

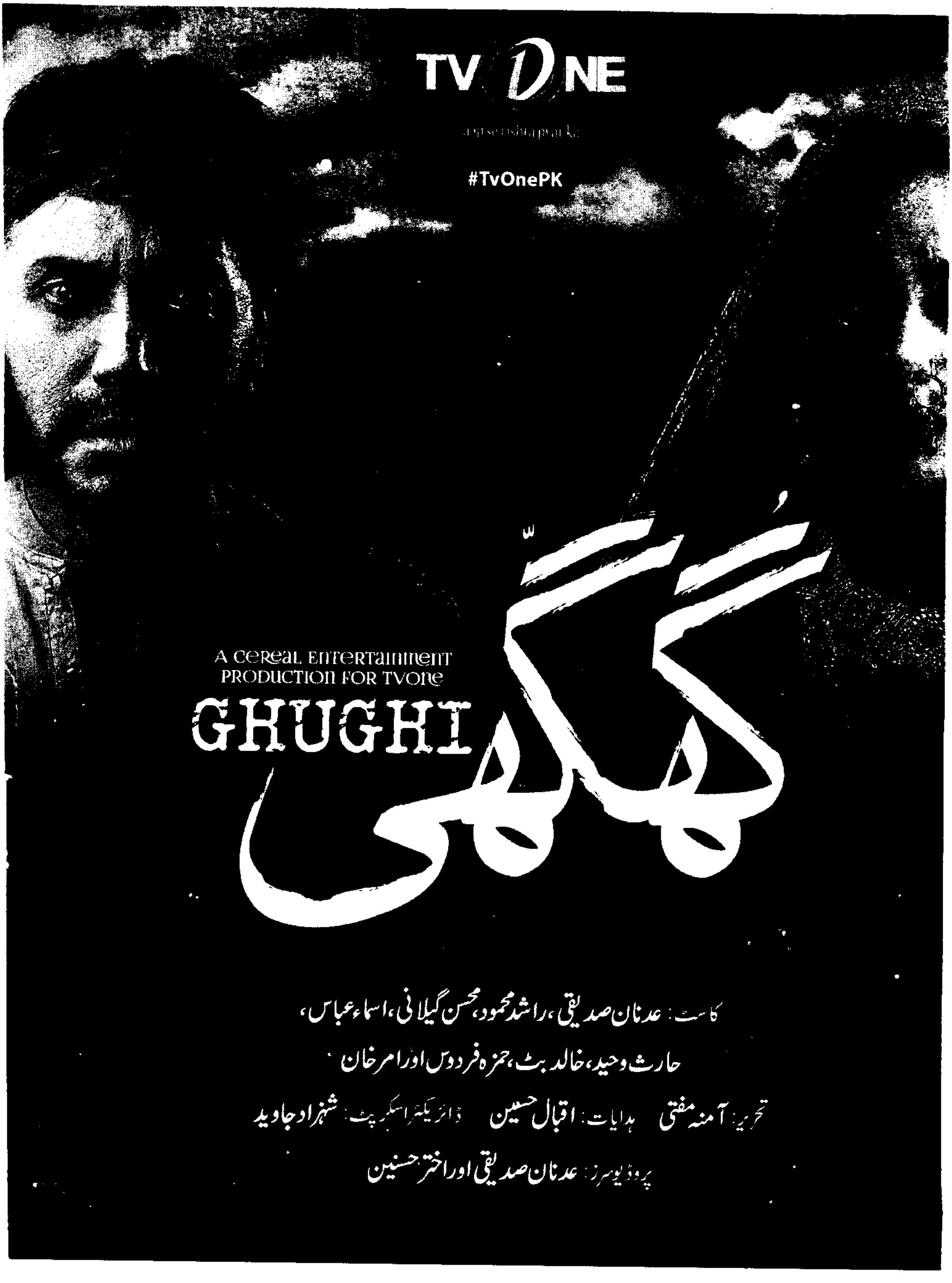
گیٹ کھل گیا۔اور وہ دونوں باہر بھاگ گئے۔

پنجرے میں بیٹھے وان فاتح نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ہر طرف ان لوگوں کی روکو پکڑو کی پکار مچ گئی تھی۔کسی نے مشعل اٹھائی'کسی نے گھوڑے پہ چھلانگ لگائی۔بہت سے لوگ گیٹ کے پار ان کے تعاقب میں دوڑتے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ آنکھیں موندے اکڑوں بیٹھا تھا۔آریانہ دھیرے سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

''کیا آپ کو واقعی کسی کی ضرورت نہیں ہے' ڈیڈ؟''

فاتح نے آنکھیں کھولیں۔سفید لباس والی آریانہ پلکیں جھپک جھپک کے اسے دیکھ رہی تھی۔وہ


TV ONE
#TvOnePK
گھگھی
A CEREAL ENTERTAINMENT PRODUCTION FOR TVONE
GHUGHI
کاسٹ: عدنان صدیقی، راشد محمود، محسن گیلانی، اسماء عباس،
حارث وحید، خالد بٹ، حمزہ فردوس اور امر خان
تحریر: آمنہ مفتی ہدایات: اقبال حسین ڈائریکٹر اسکرپٹ: شہزاد جاوید
پروڈیوسرز: عدنان صدیقی اور اختر حسنین

ایک محبت، ایک داستاں

1940 کی دہائی میں لاہور کے قریبی دیہات میں
مسلمان شیخ اور ہندو ساہوکار برادریاں رہتی تھیں۔ شیخ
ساہوکاروں کے قرض دار تھے۔ عدم ادائیگی پر
پنچایت نے شیخوں کی لڑکی کو تین دن کے لیے
ساہوکاروں کے حوالے کردیا۔ لیکن پھر بربادی کی گئی
عنایت بی بی شیخوں کے [illegible]
[illegible]
ہوگیا۔ رشید نے [illegible]
[illegible]
سے گئی اور اپنے گاؤں کی طرف [illegible]
نے اسے رکھنے سے انکار کردیا کہ پندرہ دن گھر سے
باہر رہنے والی عورت کو کون واپس لیتا ہے۔ [illegible] رشید
کے پاس واپس لوٹ گئی۔ رشید نے اسے مسلمان
کرکے اس کے ساتھ شادی کرلی۔ اور اب [illegible] کا نام
فاطمہ ہوگیا مگر اپنے [illegible] چندر کی یاد اس کے دل
میں بسی رہی۔ اس سارے کھیل میں [illegible] کی اپنی حیثیت
صفر ہوکر رہ گئی۔ اس کا جسم پامال، روح زخمی اور دل
وحشت زدہ تھا جبکہ اس کا وجود صرف ایک ایسا [illegible]

کر رہ گیا تھا جیسے کہ وہ بھی نہیں کھاتے۔ رفتہ رفتہ رشید
نے [illegible] کا گریز اور صرف سمجھوتے کا رشتہ رشید کی شدید
محبت اور بہترین سلوک کی وجہ سے ایک [illegible]
محبت کرنے والی بیوی میں بدلنے [illegible]
میں یہ بات کا [illegible]
[illegible]
[illegible] کے پاس واپس چلی جائے [illegible]
[illegible]
یا رشید کا [illegible]
کہانی کا انجام ہے۔

دھیرے سے مسکرایا۔

''کبھی پڑی تو نہیں۔ لیکن تالیہ کو لگتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

''لیکن نہیں.... آپ درست کہہ رہے تھے.... میرا نہیں خیال آپ کو کسی کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے لیے کافی ہیں۔''

''میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔'' وہ پوری سچائی سے بولا تھا۔

اسی اثناء میں ایک آدمی پنجرے کی طرف دوڑتا آیا اور مشعل کی روشنی میں کھلی رسیاں دیکھنے لگا۔ وہ دم بخود تھا۔ پنجرے کے دروازے پہ ضرب کا کوئی نشان نہ تھا.... وہ جھکا اور زمین پہ گرا تالا اٹھا کے دیکھا۔ وہ صحیح سلامت تھا۔ جیسے چابی سے کھولا گیا ہو' نہ کہ توڑا گیا ہو۔

''کس نے کیا ہے یہ؟ تالا کس نے کھولا ہے؟ بتاؤ۔'' وہ مقامی زبان میں تالا لہرا کے غصے سے فاتح سے بولا تھا۔

''اب آپ کیا کریں گے' ڈیڈ؟'' آریانہ کی قدرے خائف سی سرگوشی سنائی دی۔

''یہ تالا ....'' فاتح اپنی زبان میں تالے کی طرف انگلی کر کے اشاروں میں سمجھانے لگا۔ ''اس آدمی نے کھولا ہے۔ وہ جو....'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا ''لمبے بالوں والا ہے' چہرے پہ زخم کا قوس نما نشان ہے۔ وہ آیا تھا اور اس نے یہ تالا کھول کے ان کو بھگا دیا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے اشارے کر کر کے بتا رہا تھا۔ آدمی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے چونک کے مڑ کے دیکھا۔ زخم کے نشان والا آدمی گھوڑے پہ سوار ہو رہا تھا۔

''کیا اس نے بھگایا ہے ان کو؟'' اس نے اشارے سے پوچھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

''ہاں' اس کے پاس چابی تھی.... اس نے تالے میں ڈالی' اسے کھولا' اور ان کو بھگا دیا۔'' فاتح نے ہاتھوں سے ساری علامتیں بنا کے دکھایا۔ آدمی نے دانت کچکچا لیے۔ غصے سے دروازہ بند کیا' پھر سے تالا لگایا اور اپنے گھوڑے کی طرف دوڑا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں' ڈیڈ؟'' وہ اس کے کندھے کو ہلا کے الجھن سے پوچھنے لگی۔

''سیاست!'' وہ آنکھیں چھوٹی کر کے دور جاتے گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''کس طرف جانا ہے۔'' وہ دونوں تیز تیز دوڑ رہے تھے جب ایڈم نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ گیٹ کے پار تاریک گلیاں تھیں۔ صرف چاند کی چاندنی پھیلی تھی جس سے بمشکل ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دیتا تھا۔

''پتا نہیں۔ بس بھاگو۔'' وہ تیز دوڑ رہی تھی۔ اندھیری گلی میں وہ دونوں بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ پیچھے اس عمارت سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ جاگ چکے تھے اور ان کے تعاقب میں تھے۔

گلیوں کے درمیان سے ہوتے وہ کھلے ہوئے احاطے میں آ گئے۔ یہاں دونوں اطراف میں لکڑی کی دکانیں اور چھابڑیوں کی قطاریں لگی تھیں جو رات کے اس پہر چادروں سے ڈھکی تھیں۔ شاید وہ بازار تھا۔ وہ بنا مڑے بھاگتے گئے۔

تعاقب کرنے والوں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ تالیہ کے سرپٹ دوڑتے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ جسم پسینے میں نہا گیا تھا مگر وہ دوڑے جا رہی تھی۔

سامنے شہر کی طویل فصیل تھی۔ وسط میں گیٹ لگا تھا مگر وہ گیٹ کی طرف نہیں گئے۔ وہ دیوار کے ساتھ آگے دوڑتے گئے۔ یہاں تک کہ گیٹ کے پہریداروں سے دور نکل آئے۔ ایک دوسرے کو کسی ہدایت کی ضرورت نہیں پڑی۔ بولنے یا پوچھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ ایڈم نے دیوار پہ جست لگائی اور اوپر چڑھنے لگا۔

دور سے مشعلوں کی روشنی قریب آ رہی تھی.... آوازیں' شور.... تالیہ دیوار پہ ہاتھ جمائے پیر اوپر جمانے لگی۔ فصیل اتنی اونچی نہ تھی۔ صرف علامتی تھی۔

چند لمحوں میں وہ دونوں وقت کے مسافر دیوار کے پار کود چکے تھے۔

سامنے لمبی سڑک تھی.... اور اس کے گرد کھیت تھے۔ وہ دونوں کھیتوں کی طرف دوڑتے چلے گئے۔

"وان فاتح کہتے ہیں' ان کو میری ضرورت نہیں۔" وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "مگر میں نے جو خواب دیکھا تھا' وہ اس کے الٹ تھا۔"

وہ کھیتوں میں داخل ہو چکے تھے۔ پیچھے فصیل کا گیٹ کھلتا دکھائی دیے رہا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آ رہی تھی۔ یقیناً وہ لوگ شکاری کتے ساتھ لائے تھے۔

"وہ مجھے خواب میں کہہ رہے تھے کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔"

"سیریسلی چے تالیہ.... کیا یہ ان باتوں کا وقت ہے؟" وہ حواس باختہ سا بھاگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور انہوں نے کہا تھا کہ ان کو میری ضرورت ہے.... اور مجھے ان کی.... لیکن آج انہوں نے یہ کیوں نہیں کہا۔"

کھیتوں کے دائیں طرف جھاڑیاں تھیں اور ان کے پار جنگل۔ ایڈم کے قدم اس طرف اٹھنے لگے۔ وہ بھی اسی سمت میں بھاگ رہی تھی۔

یہ کوئی اور جنگل تھا۔ اس رین فاریسٹ سے میلوں دور۔ مگر ویسا ہی تھا۔ اونچے درخت ...جھاڑیاں.... کہیں بلندی کہیں نشیب۔

وہ دونوں بھاگتے چلے گئے۔

تیز سانس لینے کی آوازیں.... ہانپتے ہوئے بار بار گردن موڑ کے پیچھے دیکھنا اور اندھا دھند دوڑنا....

کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں تعاقب کر رہی تھیں.....

پھر ایک دم وہ رک گئی.... جھک کے گہرے گہرے سانس لینے لگی.... وہ جو چند قدم آگے نکل گیا تھا' واپس مڑا۔

"چے تالیہ.... رکیں گی تو ان کا شکار بن جائیں گی.... دوڑیے...." وہ اس کے کندھے کے پیچھے گھبراہٹ سے کچھ دیکھتا تھا....

"نہیں...." اس نے پھولتی سانسوں کے درمیان دائیں بائیں گردن ہلائی۔ "ان کے پاس شکاری کتے ہیں۔ تالیہ نہیں بھاگے گی۔" وہ کہتے ہوئے دائیں طرف بڑھی.... چند قدم اٹھائے۔

"چے تالیہ... یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"تالیہ اور ایڈم میں یہی فرق ہے... ایڈم تم شکار بن کے سوچتے ہو.... میں شکار باز بن کے سوچتی ہوں...." وہ ادھر ادھر جھاڑیوں میں ہاتھ مار رہی تھی۔ "اگر میں شکاری ہوتی تو تالیہ اور ایڈم کو کیسے ڈھونڈتی؟"

"کیسے؟"

"دو چیزیں.... دو چیزیں ہوتی ہیں شکاری کتوں کے پاس جن سے وہ شکار کو پکڑتے ہیں...." اس نے جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرتے انگلیوں کی وی بنا کے پیچھے دکھائی۔ "ان کی رفتار اور سونگھنے کی حس...." وہ دھونکنی کی طرح چلتے تنفس کے درمیان رک رک کے کہہ رہی تھی۔ "رفتار اتنی تیز ہو گی جتنا تیز مالک چل سکتا ہے' اس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی ہوتی ہے..... شکاری کتوں کو زنجیر کے بغیر کوئی نہیں جنگل میں لاتا۔ ...اور اس کا مالک اتنا تیز نہیں ہے.... وہ زخم کے نشان والا آدمی.. وہ موٹا ہے... اس لیے کتوں کو ہم تک پہنچنے میں وقت لگے گا.....ہمیں کتے سے زیادہ نہیں' اس کے مالک سے زیادہ تیز بھاگنا ہے۔"

بھونکنے کی آوازیں ہر پل قریب ہو رہی ہیں.....

"اور دوسری چیز....؟" وہ گھبرایا کھڑا تھا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- سونیا آصف

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

"کتے کی حس شامہ... سونگھنے کی حس ...."
کہتے ہوئے اس نے چاند کی روشنی میں چند پتے کھینچے..."کالی مرچ کا پودا...اور وہ دیکھو..." بازو لمبا کر کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔"وہ شہتوت کا درخت.... منلکدو.... انڈین شہتوت.... ان کی خوشبو کتوں کے لیئے نا قابلِ برداشت ہوتی ہے.... وہ اس بو کا تعاقب نہیں کرتے .... ان کو خود پہ مل لو ایڈم.... ہم شکاریوں سے اور کسی طرح سے نہیں بھاگ سکتے....."

"یہ سب آپ کو کس نے بتایا ہے تالیہ؟" وہ دم بخود کھڑا تھا۔ تالیہ نے زرد چہرہ اٹھا کے نقاہت سے اسے دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ بے حال ہو گئی تھی، کلائیوں سے خون ہنوز رس رہا تھا۔

"کیوں کہ میں شکار باز ہوں۔" پھر وہ ایک درخت کی جانب لپکی۔"اور اس لیے بھی کیونکہ کے ایل کے جس کون آرٹسٹ نے مجھے چوریاں کرنا سکھایا تھا' اس نے مجھے پولیس کے کتوں سے بچنا بھی سکھایا تھا۔" ایک درخت کے پاس وہ رکی اور دیوانہ وار پتے توڑنے لگی۔ ایڈم فوراً جھاڑیوں کی طرف دوڑا۔

"کالی مرچ یا شہتوت سے زیادہ اسکن کیئر اچھی رہتی ہے کتوں کو دھوکا دینے کے لئے۔" اپنا علم یاد آیا تو جھاڑ دیا۔

"مگر میرے خواب کے مطابق یہاں مرچیں اور توت ہی ہیں۔" وہ پتوں کو مسلنے لگی۔ ان کا رس .... ان کی خوشبو.... نا قابلِ برداشت تھی مگر تالیہ دیوانہ واران کو خود پہ ملے گئی۔

ایڈم بھی خود پہ پتے اور ان کے ننھے پھول مسل مسل کے مل رہا تھا۔ آس پاس تیز خوشبو آنے لگی۔ تالیہ کو زوردار چھینک آئی۔ اس نے ناک بند کر لی اور پھر ایک درخت کی کھوہ میں جا بیٹھی۔

دور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جنگل میں ذرا سی حرکت جو درخت کے قدموں میں کی جاتی' اس سے درخت ہلکا سا ہلتا اور وہ حرکت اوپر پتوں تک پہنچتے پہنچتے زوردار جھنجھناہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مزید بھاگنے کا مطلب تھا اپنی پوزیشن سے تعاقب کاروں کو آگاہی دینا۔ وہ مزید بھاگ نہیں سکتے تھے۔ ایڈم بھی اس کے ساتھ کھوہ میں آ بیٹھا۔ اب وہ دونوں آس پاس کے درختوں سے بھی چھپ چکے تھے۔

چند لمحے خاموشی سے کٹ گئے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ' دور کتوں کے غرانے کی آواز.... دوڑتے قدم.... یہ جنگل کسی رین فاریسٹ کی طرح ہی تھا۔ گیلا... کیچڑ آلود... گھنے درخت... اور ہر طرف اندھیرا۔

ایسے میں ایڈم نے ساتھ بیٹھی تالیہ کو دیکھا جو گھٹنوں کو سینے پہ لگائے' سمٹی بیٹھی' محتاط سی تعاقب کرنے والوں کی چاپ سن رہی تھی۔ آدھی کھلی چوٹی آگے کو ڈالے' مٹی لگا چہرہ' گالوں پہ زخم کے نشان۔ اسے اس سے ہمدردی ہوئی۔

"آپ کو آپ کے خواب یوں مدد بھی دیتے ہیں؟" ذرا نرمی سے پوچھنا چاہا۔

"ہاں... کیوں؟ تم خواب نہیں دیکھتے کیا؟" وہ پٹاخ سے بولی۔ ایڈم کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ لب بھینچ لیے۔

"آپ کو برداشت کرنا چھ سو سال پیچھے آنے سے زیادہ مشکل ہے' چے تالیہ۔"

"پانچ سو ستاون سال۔ کبھی ریاضی کی کتابیں نہیں پڑھیں' کیا؟"

وہ بس اسے دیکھ کے رہ گیا۔ پھر سے لب کھولے ہی تھے کہ تالیہ نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ لی۔

"شش۔" کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ ایڈم کا سانس تھم گیا۔ بدقت تھوک نگلا۔ وہ البتہ بالکل ساکن بیٹھی تھی۔ چہرے پہ پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔

"آپ کو ڈر نہیں لگ رہا' چے تالیہ؟" وہ دبا دبا سا بولا۔ تالیہ نے آنکھیں گھما کے اسے دیکھا۔

"میں لوگوں کے سوتے ہوئے ان کے کمروں میں گھس کے چیزیں بنا آواز کے نکال لاتی ہوں۔ تالیہ کو کسی سے ڈر نہیں لگتا۔" ذرا رکی۔"سوائے سمیع کے۔" آخری فقرہ لبوں میں ادا کیا مگر اس نے سن لیا

تھا۔ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ اتنی بہادر ہو کے اس آدمی سے کیوں ڈرتی ہیں؟"

"پتا نہیں۔" وہ لمحے بھر کو سوگوار نظر آئی' پھر جلد ہی چہرے کو واپس سنجیدہ کر لیا۔ "آوازیں دور جا رہی ہیں۔ ہے نا؟" بھونکنے کی آواز مدھم ہو رہی تھی۔

"کتے شاید واپس پلٹ رہے ہیں۔ توت کے پتوں نے کام کر دکھایا۔" وہ مسکرایا۔

چند منٹ میں آوازیں پست ہوتی گئیں اور پھر بالکل ہی دم توڑ گئیں۔ جنگل میں خاموشی چھا گئی۔ واحد شور پرندوں اور مینڈکوں کی آوازوں کا تھا۔

تالیہ کھوہ سے نکل آئی اور اوپر درختوں کے جھروکوں سے دکھائی دیتے آسمان کو دیکھا۔ یہاں سے وہ واضح نظر نہ آتا تھا۔ بس سیاہی پہ چند تارے تھے جیسے۔

"تارے!" وہ چونکی۔ "ہمیں جنگل سے نکل کے اس تارے کو ڈھونڈنا ہے جو ہمیں الور سونگائی لے جائے گا۔"

"وہ کیا ہے؟" ایڈم بھی باہر نکل آیا۔

"میرے گاؤں کا نام۔" وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ ایڈم اس کے پیچھے لپکا۔

"کیا آپ کو وہ تارہ یاد ہے؟"

"مجھے تاروں کا سارا ڈیزائن یاد ہے' میں پہچان لوں گی۔ تالیہ کچھ نہیں بھولتی۔" کہہ کے وہ رکی۔ "سوائے اپنی زندگی کے دس گیارہ سالوں کے۔" اور ایک دم کھکھلا کے ہنس دی۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

"چے تالیہ' آپ بہت ذہین ہیں۔" وہ بے اختیار بولا تو تالیہ نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

"اور آپ جیسے ذہین لوگوں کو کدھر ہونا چاہیے' جانتی ہیں؟"

"کدھر؟" مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"جیل میں!" وہ سنجیدگی سے جتا کے بولا اور آگے بڑھ گیا۔ تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ غصے سے اس کی پشت کو دیکھا اور پھر پیچھے لپکی۔

"ابھی وہ جیل بنی نہیں جس میں تالیہ مراد کو قید کیا جا سکے۔"

"بن بھی چکی ہے اور پچھلی رات ہم اس میں گزار بھی آئے ہیں' میڈم!"

"اور وہ توڑی کس نے تھی' ہاں؟" وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتی اس کے ہمراہ باہر جا رہی تھی۔ درختوں کی حدود ختم ہوئی تو سامنے سڑک نظر آئی۔ وہ جنگل کو کاٹ کے بنائی گئی تھی اور سیدھی ملاکہ شہر کی فصیل تک جاتی تھی۔

سڑک پہ قدم رکھتے ہی تالیہ نے گردن اوپر اٹھائی تو سیاہ آسمان اپنے تاروں کے ساتھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چند لمحے اوپر دیکھتی رہی' پھر بازو بلند کر کے اشارہ کیا۔

"اگر ہم اس تارے کو اس جانب رکھیں تو....." اشاروں سے بتانے لگی۔ "ہم الور سونگائی پہنچ جائیں گے۔ ہمیں اس سمت میں سفر کرنا ہے۔"

"اوکے!" ایڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سڑک کے درمیان میں کھڑے تھے۔ ایک جانب ملاکہ تھا.... دوسری جانب کا راستہ الور سونگائی کو جاتا تھا۔ تالیہ نے باری باری دونوں اطراف میں دیکھا۔

"ہوسکتا ہے میرے بابا ابھی تک الور سونگائی میں ہوں۔" وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی' پھر چونکی۔ "لیکن وان فاتح ملاکہ میں ہیں۔"

"لیکن ہمیں پہلے الور سونگائی جا کر آپ کے والد کا اتا پتا معلوم کرنا ہے۔ وہاں لوگ کچھ بتائیں گے تو ہم ان کو ڈھونڈ سکیں گے۔"

"اور وان فاتح کو یہیں چھوڑ دیں؟"

"ہم فاتح صاحب کے لیے واپس آئیں گے' مگر ہمیں وہی کرنا ہے جو انہوں نے ہمیں کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"اگر پاپا قید ہو چکے ہیں تو وہ ملاکہ میں ہی ہوں گے یا کسی دوسرے شہر میں۔ الور سونگائی جانے کا فائدہ نہیں۔"

"لیکن فاتح صاحب نے کہا تھا کہ...."

''تم میں اور مجھ میں جانتے ہو کیا فرق ہے؟'' وہ تیزی سے بولی۔ چبھتی ہوئی نظریں ایڈم پہ جمی تھیں۔

''میں کتابیں پڑھنا جانتا ہوں' یہی نا؟''

''تم حکم ماننے کے لیے بنے ہو' لیڈ ہونے کے لیے۔ اور تالیہ حکم دینے کے لیے بنی ہے۔ لیڈ کرنے کے لیے۔ اس لیے تم وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں۔'' انگلی سے اس کے سینے پہ دستک دی تو اس کا انداز حتمی تھا اور آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی۔ ''میں وان فاتح کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گی۔ ہمیں پہلے ان کا سوچنا ہے۔''

''مگر آپ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ...؟''

''کہ کیا؟ یہی کہ ان کو قید چھوڑ کے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ جاؤں؟ مجھے زیادہ عزیز وہ وعدہ ہے جو انہوں نے ابھی مجھ سے لینا ہے۔ مجھے وہ وعدہ نبھانا ہے۔'' اور اس نے فصیل کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''مگر ملاکہ میں وہ لوگ ہماری تلاش میں ہوں گے۔ ہم ان سے کیسے بچیں گے؟'' تالیہ جواب میں مسکرائی۔

''وہ دو بدحال' پھٹے کپڑوں اور میلے چہرے والوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر ہم ایسے نہ رہیں تو وہ ہمیں کیسے ڈھونڈیں گے؟''

ایڈم نے چونک کے اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''بتاتی ہوں۔ پہلے واپس چلو۔ ہمیں صبح ہونے سے پہلے شہر کی دیوار پھلانگنی ہے۔''

وہ سڑک پہ آگے بڑھ گئی۔ اندھیری سڑک' دونوں طرف جنگل اور درمیان میں کھڑا ایڈم.... اس نے ایک بے بس نظر الور سونگائی تک جاتے راستے پہ ڈالی اور پھر تالیہ کے پیچھے چل دیا۔

☆☆☆

صبح کی سفید روشنی اس وسیع احاطے میں پھیل رہی تھی۔ پنجرے میں تنہا بیٹھا وان فاتح آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے دور نظر آتے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں شکاری کتے اور گھوڑے واپس آ کھڑے ہوئے تھے۔

ناکام۔ نامراد۔ وہ تالیہ یا ایڈم کو پکڑ کے نہیں لائے تھے۔ اور ان کے سوار آتے ساتھ ہی ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے تھے۔ چہرے پہ زخم والا غصے اور حیرت سے کچھ کہہ رہا تھا اور دوسرا آدمی انگلی اٹھا اٹھا کے اس کو کھری کھری سنا رہا تھا۔ فاتح خاموشی سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ جانتا تھا کہ ان کا وقتی جھگڑا تالیہ اور ایڈم کو کافی مہلت دلا چکا ہوگا۔

ایسے میں ایک اور آدمی پنجرے کے قریب آیا' تالا کھولا اور اسے کندھے سے کھینچ کے باہر آنے کو کہا۔

فاتح نے زور سے کندھا جھٹکا' اور بندھے ہاتھ سیدھے اٹھائے۔

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ میں خود آ رہا ہوں۔''

زبان وہ نہیں سمجھا تھا مگر اشارہ سمجھ گیا تھا۔ رعب تھا یا کیا' وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وان فاتح بندھے ہاتھوں پیروں کے ساتھ نیچے اترا اور سر اٹھا کے چمکدار سفید ہوتا آسمان دیکھا۔ گردن سے بندھی رسّی پیروں تک جاتی تھی' مگر اس طرح کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتا تھا۔

آدمی اسے اپنی نگرانی میں چلاتا ایک طرف لے آیا۔ عمارت کے دائیں جانب ایک لمبا سا برآمدہ بنا تھا جس میں سلاخوں کے دروازے تھے۔ گویا ایک طویل سا قید خانہ ہو۔ آدمی نے سلاخ دار دروازہ کھولا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ اندر چلا گیا۔ وہ طویل بیرک تھی۔ اور اس میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ نحیف' کمزور' کچھ توانا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس.... چہروں پہ تھکن اور زخم لیے.... کوئی بیٹھا تھا' کوئی لیٹا تھا۔ سب نے اس آدمی کو اندر آتے دیکھا جو گرد لے لباس اور چہرے پہ لگی مٹی کے باوجود بارعب اور باوقار لگتا تھا۔

اس کا اغوا کار اب اس کی رسّیاں کھولنے لگا۔ فاتح نے مزاحمت کیے بغیر ہاتھ سامنے کر دیے۔ رسیاں کھولنے میں کافی دیر لگی۔ پھر وہ باہر نکل گیا تو وان فاتح نے کلائیاں ہاتھوں سے دبائیں گویا درد

سے سکون پانے کی کوشش کی۔

اردگرد تمام قیدی اسی کو دیکھ رہے تھے۔ سب کی نظریں اس پہ جمی تھیں۔

وہ سلاخ دار دروازے کے ساتھ جا کھڑا ہوا' یوں کہ پشت سلاخوں سے لگالی' اور چہرہ ان بدحال' مفلس قیدیوں کی طرف موڑ لیا۔ پھر وہ ہاتھ اٹھا کے ماتھے تک لے گیا۔ (سلام) سر کو خم دیا۔

وہ خالی چہرے اور ویران آنکھوں والے لوگ ٹکر ٹکر اس کو تک رہے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہیں ڈیڈ؟'' ننھی پری نے کان میں سرگوشی کی۔

''یہی کہ یہ لوگ کون ہیں اور اس حال میں کیوں ہیں؟ کس نے حق دیا ان اغوا کاروں کو کہ وہ جیتے جاگتے آزاد انسانوں کو جانوروں کی طرح اس پنجرے میں قید کر ڈالیں؟'' وہ الجھا ہوا تھا.... سوچ رہا تھا۔ لب ہلائے بنا آریانہ کو جواب دے رہا تھا۔

''آپ ان کی فکر کیوں کرتے ہیں' ڈیڈ؟ آپ کو مراد اور اس کی چابی کا انتظار کرنا ہے جس کے ذریعے آپ جلد از جلد واپس اپنی دنیا میں چلے جائیں جہاں ملک کی سب سے طاقتور کرسی آپ کی منتظر ہے۔''

آریانہ پریشانی سے بولی تھی۔ وہ اس کا لاشعور تھا جو اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ دائیں سے بائیں ان خالی چہروں پہ نظریں دوڑا رہا تھا۔ ہر آنکھ میں کرب اور غم کی عجب داستان رقم تھی۔ اس مایوس لمحے میں فاتح رامزل کے اوپر سا انکشاف ہوا۔

''ہم تینوں کا غلطی سے وہ دروازہ پار کرنا... میں سمجھتا رہا وہ ایک حادثہ ہے.... لیکن نہیں۔'' وہ چونک گیا تھا۔ ''وہ حادثہ نہیں تھا۔ میں یہاں کسی وجہ سے آیا ہوں۔ چھ سو سال پہلے کے ملاکہ میں کچھ ہے جو میرا منتظر ہے۔ کوئی مقصد' کوئی کام۔ کوئی شے جو چھ صدیاں پہلے ادھوری رہ گئی تھی اور اسے پورا کرنے کے لیے وقت نے خود کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ ہم وقت کے قیدی ہیں' مگر کسی وجہ سے۔ اور جب تک وہ پوری نہیں ہو گی....'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وقت ہمیں واپس جانے نہیں دے گا۔''

آریانہ دھک سے رہ گئی۔

''اور وہ وجہ آپ کو کیسے معلوم ہو گی' ڈیڈ؟''

اس نے ان لٹے پٹے چہروں سے نظر ہٹا کے ساتھ کھڑی بے چین سی آریانہ کو دیکھا اور مسکرایا۔

''کیا کوئی ایسی پہیلی ہے جو تمہارا باپ حل نہ کر سکا ہو' بے بی؟''

مگر آریانہ نہیں مسکرائی۔ وہ پریشانی سے اس کو دیکھے گئی۔

☆☆☆

ملاکہ کا قدیم شہر جاگنے لگا تھا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی لوگ اٹھ اٹھ کے کام کے لیے گھروں سے باہر نکلنے لگے تھے۔ ایسے میں وقت کے وہ دو مسافر ایک گھر کے باہر کونے میں چھپے بیٹھے تھے۔

وہ لکڑی کا دو منزلہ گھر تھا۔ اوپر ٹیرس' اور کمروں کے دروازے بنے تھے۔ سیڑھیاں بیرونی تھیں۔ گھر کی چھت دوسرے گھروں کی طرح لکڑی کی مخروطی طرز کی تھی۔ وہاں ساری گلی میں مخروطی چھتوں والے لکڑی کے ایک جیسے گھر ہی بنے تھے۔

دفعتاً ٹیرس کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر جاتا دکھائی دیا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیاں اتر کے نیچے گیا' وہ دونوں دیوار کی اوٹ سے نکلے اور جھک کے چلتے ہوئے تیزی سے کمرے میں جا گھسے۔ تالیہ آگے تھی اور ناخوش سا ایڈم پیچھے۔ باہر ابھی تک جامنی اندھیرا پھیلا تھا۔

اندر آتے ہی جو منظر سامنے آیا' اس میں زمین پہ فرشی بچھونا بچھا تھا جس پہ ایک ننھا بچہ سو رہا تھا اور ایک عورت ان کی جانب پشت کیے چادر جھاڑ رہی تھی۔ تالیہ بلی کی چال چلتی اس کے پیچھے آئی اور اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ عورت کو مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ اس کے بازو کے نرغے میں چند لمحوں میں بے ہوش ہو گئی۔ تالیہ نے احتیاط سے اسے اس کے بچھونے پہ ڈال دیا۔

''جب یہ جاگے گی تو اسے لگے گا یہ کمزوری سے چکر کھا کے گر گئی تھی۔'' وہ مڑی تو دیکھا' ایڈم ناخوشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا اس عورت کو تکلیف دینا ضروری تھا؟''

''تو کیا کہتی؟ محترمہ' ہم آپ کے گھر چوری کرنے آئے ہیں' خاموشی سے سائیڈ پہ ہو جائیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں؟''

''آئی کانٹ بلیو کہ میں ایک چوری کی واردات میں شریک ہو رہا ہوں۔''

''اس سے پہلے تم دھوکا دہی کی واردات میں بھی شریک ہو چکے ہو جب تم مجھے دھوکا دے کر فاتح صاحب کو سن باؤ کے گھر لے آئے تھے۔ چابی جوڑ کے۔ اس لیے زیادہ پارسا نہ بنو۔''

''اللہ نے زندگی دی تو واپس جاتے ہی اپنے ہاتھوں سے آپ کو جیل بھجواؤں گا۔'' وہ جل کے بولا۔ تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ صندوقوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''یہ کھاتا پیتا گھرانہ لگ رہا ہے۔ قیمتی چیزیں ہوں گی ان کے پاس۔ خدا کرے اس گھر میں کوئی اور نہ ہو۔ اس لیے جلدی سے اپنے لیے کپڑے ڈھونڈو۔ اس کے خاوند کے آنے سے پہلے ہمیں تیار ہو کے یہاں سے نکلنا ہے۔'' وہ صندوق کھول کے کپڑے الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ کمرے کی دیوار پہ لگی مشعل جل رہی تھی اس لیے سب صاف نظر آ رہا تھا۔

بچہ ہنوز سویا ہوا تھا۔

فجر باسی ہو گئی اور ملاکہ پہ سورج طلوع ہونے لگا تو شہر کی گلیوں نے دیکھا۔ وہ دونوں چپکے سے سیڑھیاں اتر کے گلی میں آ گئے تھے اور اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

اور یہ وہ بدحال وقت کے مسافر ہرگز نہ لگتے تھے۔

تالیہ نے جامنی ریشمی باجو کرنگ پہن رکھا تھا یہ پیروں تک آتا لہنگا نما لباس' اور گھٹنوں تک آتی قمیص' کندھے سے دوپٹہ گزار کے دوسرے پہلو پہ باندھ لیا تھا۔ انگلیوں میں دو انگوٹھیاں اور گردن میں موتیوں کی مالا تھی۔ حمام میں رکھے دودھ سے بنے ملغوبے سے اس نے بال بھی دھو لیے تھے۔ کنگھی بھی کی تھی۔ اور اب سنہری بال کنگھی ہوئے چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے۔ کان میں مصنوعی بڑا سا پھول لگا رکھا تھا۔ اور سر پہ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ یہ ملے طرز کا ہیٹ تھا نہ کہ انگریزی طرز کا جو وہ ملائیشیا میں پہنتی تھی۔ یہ الٹے لٹو کی شکل کا تھا اور ڈوری ٹھوڑی تلے اڑس دی جاتی تھی' یوں کہ آدھا چہرہ چھپ جاتا تھا۔

ایڈم نے بھی ایسا ہی ہیٹ پہن رکھا تھا۔ نیچے کھلا سا پاجامہ' اوپر لمبی قمیص' اور اس پہ نیلے رنگ کی پتلی جیکٹ جو سامنے سے کھلی تھی۔ گویا کوٹ ہو۔ یہ مقامی لباس تھا اور اس پہ کافی کھلا تھا۔

شہر جاگنے لگا تھا۔ لکڑی کے مکان.... ان کے درمیان آتے جاتے لوگ۔ کافی عورتوں کے سروں پہ دوپٹے تھے۔ اور لباس کھلے سے تھے۔ مردوں کے لباس ایڈم کی طرح تھے۔ چند ایک نے گزرتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا بھی۔

غیر مطمئن وہ ایڈم جو بدقت کھلے جوتوں میں چل رہا تھا۔ اور گردن اکڑا کے شانِ بے نیازی سے چلتی تالیہ۔

''سنو.... تم میرے بھائی ہو۔'' راستے میں ہدایت دی۔

''اللہ مجھے جنت میں بھی آپ کا بھائی نہ بنائے۔''

''میں کور اسٹوری بتا رہی ہوں۔'' وہ بنا اثر لیے بولی۔ ''ہم چین سے آئے ہیں۔ مسالوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس زمانے میں یہی کاروبار بہت اِن تھا۔ لوگ انڈیا سے سمندر کے راستے ملاکہ کی بندرگاہ تک آتے اور مسالے بیچتے تھے۔''

''تو ہم انڈیا سے کیوں نہیں آئے؟ چین سے کیوں آئے ہیں؟''

''کیونکہ ہم انڈین نہیں لگتے' ڈفر۔ ہم چینی لگتے ہیں۔'' وہ اسے گھرکتے ہوئے قدم اٹھا رہی تھی۔

چلتے چلتے وہ دونوں بازار کی حدود میں داخل ہو

گئے تھے۔ وہاں لکڑی کی دکانیں گلیوں میں بنی تھیں۔ قہوہ خانے بھی تھے جہاں باہر کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ ریڑھیوں پہ سامان رکھ کے بھی لوگ فروخت کر رہے تھے۔ غرض فجر کے ساتھ ہی بازار میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ بس ایک چیز نہ تھی جو آج کی دنیا میں ہوتی تھی۔ شور۔ ٹریفک کا' موسیقی کا' آوازوں کا۔ اوں ہوں۔ ہرگز نہیں۔ آبادی کم تھی۔ لوگوں کے اپنے بولنے کی آوازیں ہی آرہی تھیں بس۔ وہ دونوں باوقار چال چلتے آگے بڑھتے گئے۔

جہاں کئی عورتیں سر سے پیر تک ڈھکی تھیں' وہاں کئی کندھوں سے گھٹنوں تک کا لباس پہنے ہوئے تھیں' یوں کہ کندھے بھی برہنہ تھے۔ اونچے جوڑے بنائے وہ مردوں کے ساتھ بازار میں کام کر رہی تھیں اور انہیں کوئی ہراساں نہیں کر رہا تھا۔

''عجیب ماحول ہے چھ سو سال پہلے کے ملاکہ کا۔'' وہ اچنبھے سے بڑبڑائی۔

''پانچ سو ستاون سال' چے تالیہ۔'' وہ جتا کے بولا تھا۔ ''اور ہم بازار میں کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس پیسے تو ہیں ہی نہیں۔''

''ایک ہی چیز تھی جو ان صندوقوں سے نہ ملی تھی۔ ایک سکہ یا دمڑی بھی نہیں۔ غالباً وہ اپنے پیسے کہیں چھپا کے محفوظ رکھتے تھے۔''

تالیہ رک گئی۔ ایک دکان کے سامنے کھڑے آدمی کو دیکھا جو کپڑے کا ایک تھیلا اٹھا رہا تھا۔ پھر اس نے سونے کا ایک سکہ دکان دار کی طرف بڑھایا۔

''سونا۔ ہمیں سونا چاہیے۔'' وہ بڑبڑائی۔ زیرک نگاہیں چاروں اطراف میں دوڑائیں۔ قدیم زمانے کے اس بازار میں لوگ معمول کی خریداری کر رہے تھے۔ نگاہ ایک عورت پہ جا رکی جو لہنگے قمیص اور سر پہ دوپٹے میں ملبوس تھی' اور ایک سبزی کی ریڑھی پہ کھڑی' مختلف قسم کے پالک کے پتے اٹھا اٹھا کے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور کلائی میں موٹے کنگن تھے۔

''تم یہیں رکو۔ میں ابھی اس کے ہاتھ سے تھوڑا سا زیور اتار کے لاتی ہوں۔''

''ہیں؟'' ایڈم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''مگر کیسے؟''

تالیہ نے ہیٹ ذرا سر پہ اوپر کیا تو دھلا دھلایا صاف چہرہ اور اس پہ چھائے مشکوک تاثرات ایڈم کو نظر آئے۔

''کیوں؟ تمہیں کیوں بتاؤں؟ تاکہ کل کو تم وہی تکنیک سیکھ کے چوریاں کرتے پھرو اور تمہارا گناہ بھی میرے سر آئے؟''

''آپ مجھے اچھی نیت سے بتا دیں نا۔ میری حفاظت کی نیت سے۔ تاکہ کل کو اگر میں بھرے بازار میں ہوں تو مجھے معلوم ہو کہ چوراچکے کیسے میرے ہاتھ سے گھڑی اتار سکتے ہیں اور میں ان کو موقع نہ دوں۔''

تالیہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔ بات میں وزن تھا۔

''ویسے تو یہ کام پریکٹس سے آتا ہے مگر تکنیک یہ ہے کہ....'' وہ نخریلے انداز میں شانِ بے نیازی سے بولی۔ ''پہلے ٹارگٹ سے ہاتھ ملاؤ۔ زور سے۔ اور اس کی گھڑی یا انگوٹھی کو زور سے دباؤ۔ جب بھی ہاتھ میں پہنی چیز زور سے دبائی جاتی ہے تو ہماری جلد پہ وہ ایک ''احساس'' چھوڑ جاتی ہے۔ اگلے ہی لمحے گھڑی کو آہستہ سے اتار لو۔ مگر چونکہ زور سے دبایا تھا' تو ٹارگٹ کو لگے گا کہ اس نے ابھی تک ہاتھ میں کچھ پہن رکھا ہے۔ اسے کافی دیر بعد سمجھ میں آئے گا کہ اس کا ہاتھ خالی ہے۔ آیا سمجھ میں؟''

ایڈم نے حیرت اور بے یقینی سے دونوں ابرو اٹھائے۔ ''واؤ.... اور گردن سے زیور کیسے اتارا جاتا ہے؟''

''تم کون سا زیور پہنتے ہو گردن میں جو میں تمہیں تمہاری حفاظت کے لیے اس تکنیک کا راز بتاؤں۔ چپ کر کے کھڑے رہو ادھر۔ میں ابھی آرہی ہوں۔'' ناک سکیڑ کے ہونہہ کہتی آگے بڑھ گئی۔

ایڈم بظاہر ریڑھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس پہ بڑے بڑے دوریان (ایک قسم کا پھل) رکھے تھے۔

ان کی مہک اتنی تیز تھی کہ ہر سو پھیلی تھی۔ وہ ان کو اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگا۔ دوکان دار نے کچھ کہا تو وہ گڑبڑا کے مسکرا دیا اور پھل واپس رکھ دیے۔

کن اکھیوں سے دیکھا۔ تالیہ اس عورت سے ٹکرائی، پھر اس کے ہاتھ تھام کے خود کو سنبھالنے کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتی نظر آرہی تھی۔ لمحے بھر کا کھیل تھا۔ وہ واپس آئی اور رومال میں چھپے کڑے دکھائے۔ انگوٹھی اس نے انگلی میں پہن بھی لی تھی۔

"اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کر دیجیے گا' تو انکو ۔" ایڈم محمد نے بے اختیار آسمان کو دیکھا۔ "میں صرف اپنی جان بچانے کے لیے ان خاتون کا ساتھ دے رہا ہوں جن کے جہنم میں جانے میں مجھے کوئی شک نہیں رہا۔"

وہ کرارا سا جواب دیتی مگر ایک دم ہر طرف شور سا مچا۔ آوازیں۔ گھوڑوں کی ٹاپ۔ لوگ دونوں طراف میں ہٹنے لگے۔ ہٹو بچو کے نعرے لگے۔ بگل.... اعلانات.... راستہ صاف ہونے لگا۔

وہ دونوں بھی جلدی سے ایک دکان کے چھپر تلے آکھڑے ہوئے۔

"کیا ہو رہا ہے؟ راستہ کیوں صاف کیا جا رہا ہے؟" وہ حیران پریشان سا تالیہ سے پوچھنے لگا کیوں کہ اعلان اور نعرے اس کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

تالیہ یک ٹک اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے کوئی قافلہ سا آرہا تھا۔

"بے تالیہ.... بتائیں نا.... یہ اعلان کس چیز کا ہے؟"

"شہزادی۔" وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی۔ "ملاکہ کی شہزادی کی سواری آرہی ہے۔ ادب سے راستہ چھوڑا جا رہا ہے۔" اس کی آنکھیں اس طرف لگی تھیں۔ ان میں تپش سی ابھرنے لگی تھی۔

"ظالم شہزادی آرہی ہے ایڈم.... وہ دیکھو۔"

سب کچھ سلو موشن میں ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈم نے فوراً اس جانب دیکھا۔ کچھ جوش، کچھ خوشی سے۔ شمال کی سمت سے قافلہ سا آرہا تھا۔ آگے گھڑ سوار تھے۔ کوئی بگل بجا رہا تھا۔ کوئی تلواریں تانے ہوئے تھا۔ درمیان میں شاہی طرز کی بگھی تھی۔ سونے چاندی کے تاروں سے اس پہ نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور سیاہ چمکدار گھوڑے اس میں جتے تھے۔ وہ ست روی سے چل رہی تھی۔ بگھی کی کھڑکی کھلی تھی، پردہ ہٹا تھا اور اندر.... تالیہ نے ان ہی پُرتپش نگاہوں سے بگھی کو دیکھتے گردن اونچی کی....

گھوڑے قریب آرہے تھے۔ دونوں طرف لوگ شوق اور رعب کے زیر اثر شاہی سواری کو دیکھ رہے تھے۔ نعرے بھی گونج رہے تھے.... جو یقیناً شہزادی کے حق میں تھے.. جواب میں کھڑکی سے انگوٹھیوں سے مزین خوبصورت ہاتھ نکلا۔ اب شہزادی اپنے ہاتھ سے ان نعروں کا جواب دے رہی تھی۔ بگھی کے پہیے قریب آرہے تھے۔ جہاں ایڈم دم بخود کھڑا تھا وہاں تالیہ کا سانس تک رک چکا تھا۔

کھڑکی قریب آئی۔ اندر بیٹھی عورت کا نیم رخ نظر آیا۔ بڑا سا تاج جس سے لڑیاں نکل رہی تھیں۔ سرخ لباس جس کے کندھوں پہ سنہرے تاروں کا کام نظر آتا تھا۔ بندھے بالوں کا جوڑا اور کانوں میں لمبے لمبے، ہیرے اور سونے کے آویزے۔ لبوں پہ سرخ لپ اسٹک۔ وہ خوشبوؤں میں بسی شہزادی خوب گوری اور چھوٹی آنکھوں والی تھی۔ کافی خوش شکل تھی۔ بس خوش شکل۔ مسکرا کے اب وہ اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں تالیہ اور ایڈم کھڑے تھے۔

تالیہ بنا پلک جھپکے نگاہیں اس پہ جمائے ہوئے تھی۔

دفعتاً شہزادی کی نظریں تالیہ مراد پہ آرکیں۔ تالیہ نے ہیٹ اوپر اٹھایا۔ سنہری بال اور ان کے ہالے میں دمکتا چہرہ۔ زخم کے نشان اور آنکھوں کی سرد نفرت....

شہزادی کی کاجل لگی آنکھوں نے چند لمحے تک اس لڑکی کو دیکھا پھر نگاہیں آگے لے گئی۔ مگر وہ.... وہ ان ہی سرد نظروں سے اس کو دیکھے گئی۔ بگھی دور چلی گئی۔ سپاہیوں کے گھوڑے آگے بڑھ گئے۔

ایک سحر سا ٹوٹا۔

''اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنا سنا تھا۔'' ایڈم مایوسی سے بولا۔ تالیہ نے تنگی سے سر جھٹکا۔ پھر ساتھ کھڑے بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ وہ بھی دور جاتے قافلے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''کیا آپ لوگ شہزادی کو پسند کرتے ہیں؟''

آدمی نے چونک کے اسے دیکھا تو وہ مسکرائی۔

''میں اور میرا بھائی پہلی دفعہ چین سے ملاکہ آئے ہیں' علاقے سے واقف نہیں ہیں اس لیے پوچھ رہی ہوں۔'' اس کا لہجہ مختلف تھا اور وہ یہ زبان ٹھیک سے بول نہیں سکتی تھی۔ مگر آدمی سمجھ گیا۔ سر ہلایا۔

''جب اتنے مسلح سپاہی ساتھ ہوں تو کون شہزادی کو ناپسند کر سکتا ہے۔'' انداز میں طنز تھا۔

''میں نے سنا ہے شہزادی بہت ظالم ہے۔ اور سونگائی سے بہت سے لوگ قید کروائے ہیں اس نے۔''

''ایسا ہی ہوا ہے۔ پورے ہفتے سے گرفتاریاں جاری ہیں۔ سارے قید خانے بھر چکے ہیں۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ یہ قید خانے کہاں ہوں گے؟''

وہ سرسری سا پوچھ رہی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آدمی نے کندھے اچکا دیے۔

''محل میں ہی ہوں گے مگر یہ ظلم شہزادی نے اکیلے نہیں ڈھایا۔ بنداہارا اس میں برابر کا شریک تھا۔ یہ سارے بندے اسی کی ایما پہ پکڑے گئے ہیں۔''

''ظاہر ہے وہ اس کا باپ ہے' دونوں ایک جتنے ہی قصوروار ہیں۔'' وہ تنفر سے بولی۔

بوڑھا گردن گھما کے ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

''کس کا باپ؟''

''شہزادی تاشہ کا باپ۔ ملاکہ کا بنداہارا (وزیر)۔''

بوڑھے آدمی کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔ ''بنداہارا شہزادی کا باپ نہیں ہے اور یہ شہزادی ''یان سوفو'' تھی' جو چین کے بادشاہ کی بیٹی ہے اور مرسل شاہ سلطان کی ہونے والی بیوی۔ بنداہارا تو سلطان کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ شہزادی سے تو اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

تالیہ ہکا بکا رہ گئی۔ سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''تو یہ شہزادی تاشہ نہیں تھی؟''

''شہزادی تاشہ کون ہے؟'' وہ آدمی اتنا ہی حیران تھا۔ ایڈم بے بسی سے ترجمے کا منتظر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''شہزادی تاشہ.... ملاکہ کی شہزادی.... بنداہارا کی بیٹی.... جس کے قصے دور دور تک مشہور ہیں۔'' وہ بے چینی سے بولی۔ کچھ غلط تھا۔

''میں نے محل میں کافی عرصہ کام کیا ہے' بیٹی۔ ہمارے ملک میں تاشہ نام کی کوئی شہزادی نہیں ہے۔ میں یہ نام پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔''

تالیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ تاریخ کی کتابیں کیسے غلط ہو سکتی تھیں؟

''تو پھر.... بنداہارا کی بیٹی کا کیا نام ہے؟''

''پچھلے بنداہارا کی تو کوئی بیٹی ہی نہیں تھی.... دو بیٹے تھے مگر پانچ روز قبل اس کو پھانسی دے دی گئی اور بیٹے جلاوطن کر دیے گئے۔ اس نے سلطان کے پھوپھی زاد کے ساتھ مل کے سارے پمبورو کے لوگوں کو پکڑوایا' مگر وہ سلطان کا پھوپھی زاد.... اس نے محل میں آتے ہی بنداہارا کا پتا بھی صاف کر دیا اور خود نیا بنداہارا بن بیٹھا۔''

''اور اس کی بیٹی؟'' اس کی آواز کانپی۔

''اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ دس گیارہ سال کی۔ وہ چند دن پہلے کھو گئی تھی۔ مگر راجہ مراد کو لگتا ہے اپنی بیٹی کے کھونے کا کوئی غم نہیں ہے۔'' بوڑھا آدمی افسوس سے کہہ رہا تھا۔ ''سب جانتے ہیں وہ سلطان سے ناراض ہو کے الور سونگائی میں جا بسا تھا۔ سب جانتے ہیں وہ خود پمبورو تھا مگر اس نے اپنے ساتھیوں سے غداری کی۔ چال چلی۔ اس نے سارے لوگوں کو پکڑوا دیا اور سلطان کا پسندیدہ بن بیٹھا۔ پچھلا بنداہارا شہزادی ''یان سوفو'' کا ہمدرد تھا۔ اسی کی طرح

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ظالم، مگر راجہ مراد "یان سوفو" سے زیادہ ظالم ثابت ہونے والا ہے۔ سلطان آنکھیں بند کر کے اس پہ اعتبار کرتا ہے اور سچ پوچھو۔ تو اس وقت.... سرزمینِ ملاکہ کا سب سے طاقتور شخص.... اصل بادشاہ.... راجہ مراد ہی ہے.... وہ ہمیشہ سے شاہی خاندان کا حصہ تھا.... چند سال غریب لوگوں کے ساتھ رہ کے بھی وہ نہیں بدلا۔ وہی تکبر، وہی طاقت کی حرص۔" بوڑھا نفرت اور غصے سے بول رہا تھا۔ ساتھ کھڑے دو آدمی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

تالیہ مراد سفید چہرے کے ساتھ پیچھے ہٹی۔ ایک قدم.... دو قدم۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ سرخ آنسو جن میں خوف تھا۔ وحشت تھی۔ بے یقینی تھی۔

"راجہ مراد کہاں رہتا ہے؟"

"ابھی تو وہ سبز پہاڑی والے محل میں رہائش پذیر ہے۔ یہاں سے چند کوس دور.... اس طرف...." ایک آدمی جوش سے بتانے لگا۔ وہ مردہ چہرے کے ساتھ پلٹی۔ ایڈم ناسمجھی سے اس کے پیچھے لپکا۔

"چے تالیہ.... یہ کیا کہہ رہا تھا۔"

تالیہ نے اسی سمت قدم اٹھاتے زیور کی پوٹلی اس کی طرف بڑھائی۔

"تم یہیں رکو۔ میرا انتظار کرو۔"

"مگر میں کیسے...."

"حکم مانو، ایڈم۔ حکم مانو۔" وہ بھیگی آواز میں بولی تھی۔ قدم رک نہیں رہے تھے۔ وہ چلتی جا رہی تھی۔ ایڈم وہیں ٹھہر گیا۔ حیران پریشان۔

فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ راستے صاف تھے۔ آبادی کم تھی۔ راستہ بتانے والے بہت تھے۔ وہ ساحل کی سمت میں جا رہی تھی۔ بے جان قدموں سے۔ توانا قدموں سے۔ سرد مردہ دل سے۔ گرم کھولتے ہوئے دل سے۔ پتھریلی آنکھوں سے۔ آگ کی لپٹیں لیے آنکھوں سے۔

سڑک کے اردگرد اونچے ناریل کے درخت لگے تھے۔ سڑک پہاڑی پہ اوپر تک جاتی تھی۔ ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آ رہا تھا۔ جہاں سپاہی تھے۔ کشتیاں کھڑی تھیں۔ وہ سڑک کے آغاز پہ رکی اور گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔

سامنے سبز پہاڑی کی چوٹی پہ ایک خوبصورت محل واقع تھا۔

بھوری لکڑی کا بنا مخروطی چھت کا اونچا محل۔

اس کی چار دیواری کا بیرونی گیٹ بند تھا اور باہر شاہی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔

تالیہ بنتِ مراد نے ہیٹ کی ڈوری دو انگلیوں سے کھینچی اتنے زور سے.... اتنے زور سے۔.. کہ وہ ٹوٹ گئی اور ہیٹ نیچے جا گرا۔ سمندر سے آتی ہوا سے اس کے سنہری بال پیچھے کو اڑنے لگے۔ اور ان کے ہالے میں دمکتا سفید گلابی خوبصورت چہرہ دور سے پہریداروں کو نظر آنے لگا۔ وہ چونکنے ہوگئے

"وہ ملاکہ کی سب سے خوبصورت شہزادی تھی۔"

وہ چمکدار آنکھیں محل پہ جمائے قدم قدم اوپر سڑک پہ چڑھ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"اتنی سحر انگیز کہ اس کے سامنے چاند سورج شرما جائیں۔"

شاہی پہریدار رک کے اس کو دیکھنے لگے جو جامنی لباس میں، گردن میں موتی پہنے نیچے سے اوپر چلتی آ رہی تھی۔ (چرچ کے احاطے میں وہ ایک ڈری سہمی لڑکی ہے جس کو مسز ماریہ نے نرمی سے تھاما ہے.... اور اسی نرمی سے اس کا بریسلیٹ اتار لیا ہے۔)

"وہ جب محل کی بارہ دریوں میں چلتی تھی تو ادب سے لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔" وہ دھیرے دھیرے اوپر چڑھ رہی تھی۔ سنہری بال ہوا سے پیچھے کو اڑ رہے تھے۔

(مسز ایگنیس نے اسے چور کہتے ہوئے زور سے اس کے منہ پہ تھپڑ مارا ہے.... گیارہ سالہ بچی تیورا کے نیچے جا گری ہے۔ اب وہ چلا چلا ———

کے اپنے پیسوں کا پوچھ رہی ہیں۔)

جب وہ دربار میں آتی تو وزراء' درباری اور غیر ملکی سفیر بے اختیار کھڑے ہو جاتے تھے۔

(وہ دبے پاؤں رات کو یتیم خانے کے فریج سے بن نکال کے منہ میں ٹھونس رہی ہے۔ خوف سے بار بار دروازے کو بھی دیکھتی ہے۔)

تالیہ مراد بنا پلک جھپکے پتھر نگاہیں گیٹ پہ جمائے اوپر چڑھ رہی تھی۔ قدم بہ قدم۔

"وہ بولتی تھی تو سلطان دم سادھے اس کو سنا کرتا تھا۔"

(وہ گھاس پہ بیٹھی اسکیچ بنا رہی ہے.... مسکرا رہی ہے اور زرد گلاب کوٹ میں اٹکائے ذوالکفلی اس کے ساتھ بیٹھا کسی بات پہ ہنس رہا ہے۔)

"وہ بہت سی زبانیں بول سکتی تھی۔"

(وہ لاہور کے اس بنگلے میں فرش پہ پوچا لگا رہی ہے.... رگڑ رگڑ کے.... اور قریب بیٹھی 'ماں' کی اردو اور پنجابی کی گالیاں سن رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔)

"تیر اندازی' تلوار زنی' گھڑ سواری' نیزہ بازی.... وہ سب جانتی تھی۔"

(وہ اونچے اڑتے غباروں پہ ایک کے بعد ایک کر کے تیر چلا رہی ہے.... کمان ہاتھ سے کھینچی جاتی ہے اور ایک زوردار چھپڑا اس کو آکے لگتا ہے۔)

"وہ لکھ پڑھ بھی سکتی تھی۔"

(وہ تاریک کمرے میں لیمپ جلائے کتابیں کھولے بیٹھی پڑھ رہی ہے.... ہاتھ میں سیب ہے جسے وہ ساتھ ساتھ کھا بھی رہی ہے۔)

"رقص اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے بھی واقف تھی۔"

(وہ ذوالکفلی کے ساتھ جم میں کھڑی ہے۔ اوپر لگے ہینڈل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے وہ اپنے پیر مشقت سے زمین سے اٹھا لیتی ہے۔ اور وہ گھڑی پہ وقت نوٹ کر رہا ہے۔ پھر اسے مزید بہتر کرنے کے لیے کہتا ہے۔)

"چین اور ملاکہ کا کوئی ایسا کھانا نہ تھا جو وہ پکا نہ سکے۔"

(وہ سوپ پارلر کے کچن کے کاؤنٹر ٹاپ پہ آلتی پالتی کر کے بیٹھی ہے' سر پہ جالی دار ٹوپی ہے اور سوپ بناتے بوڑھے شیف سے ہنس کے کچھ کہہ رہی ہے)

"کوئی ایسا ٹانکا نہ تھا جس کو وہ کاڑھ نہ سکے۔"

(وہ حفاظتی عینک لگائے' دستانے پہنے احتیاط سے ایک گلدان پہ دھاگے لپیٹ رہی ہے۔ ساتھ ہی اصلی قدیم گلدان پڑا ہے جس کی جگہ اس کو یہ گلدان رکھنا ہے۔)

"وہ حرم کی نگران تھی۔"

(وہ تھپڑوں اور ٹھڈوں سے موتی دردانہ کو فرش پہ گرائے مار رہی ہے۔ دردانہ ہاتھ جوڑ رہی ہے۔ اس کا خون بہہ رہا ہے۔ مگر وہ اس کو پیٹے چلی جا رہی ہے۔)

"بندہارا کی سب سے قابل اعتماد مشیر۔"

(وہ ائیر پورٹ کے باتھ روم سے ڈرڈر کے بیگ لیے نکلتی ہے۔ خوف.... ڈھیر سارا خوف۔)

"وہ سیاست کے داؤ پیچ سے بھی تھی۔"

(وان فاتح اس کو اسٹڈی میں بلا کے اسے فائل کی وجہ سے چور کہہ رہا ہے.... پھر وہ عصرہ کو زیرِ لب کوستی تیز تیز سیڑھیاں اتر رہی ہے۔)

"غرض کیا تھا جو راجہ کی بیٹی کو کرنا نہیں آتا تھا؟"

(وہ جنگل میں ہرنوں کو دور درختوں سے چھپ کے دیکھ رہی ہے۔ پھر تاک کے خنجر مارتی ہے۔ خنجر فضا میں تیرتا ہوا سیدھا ننھے غزال کی گردن میں جا لگتا ہے۔ وہ وہیں تڑپ کے گر جاتا ہے۔ سرخ خون بہہ رہا ہے۔)

"اسی لئے اس کو تاشہ پسو نا کہا جاتا تھا۔"

تالیہ مراد چلتے چلتے گیٹ تک پہنچ گئی تھی۔ پہریدار برہمی اور ناگواری سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟" گرج کے پوچھا۔

تالیہ نے آنکھیں اٹھا کے باری باری ان تینوں

کو دیکھا۔

("پسونا یعنی ساحرہ۔")

"راجہ مراد کو باہر بلاؤ۔ میں راجہ سے ملنے آئی ہوں۔" اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ اوپر محل کی ایک کھڑکی میں کھڑے آدمی نے چونک کے اسے دیکھا تھا۔

(ساحرہ.....)

تالیہ نے آنکھیں مزید اوپر اٹھائیں۔ دور محل کی کھڑکی میں کھڑا شخص.....جو سونے کے تاروں سے مزین شاہی چغے میں ملبوس تھا.....اور جس کے سر پہ قیمتی کپڑا بندھا تھا.....وہ کوئی لکڑہارا.....کوئی مفلوک الحال آدمی نہ تھا۔

وہ اٹھی گردن والا.....عقابی نگاہوں سے اسے دیکھنے والا.....راجہ مراد ہی تھا۔

اور وہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اچنبھے سے گیٹ پہ کھڑی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو گردن اٹھا کے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اور تم ہو کون؟" پہریدار نے گرج کے پوچھا۔

"میں؟" اس نے اپنے سینے پہ انگلی رکھی۔ نظریں اوپر پہ جمی تھیں۔

"میں راجہ مراد کی بیٹی ہوں۔" بلند آواز میں کہا۔

کھڑکی میں کھڑا آدمی سن رہ گیا۔ یک ٹک۔ بے سدھ۔

"راجہ کی ایک ہی بیٹی تھی جو....." پہریدار نے مداخلت کی کوشش کی۔

"جو پانچ دن پہلے کھو گئی تھی' میں جانتی ہوں۔ اس کا نام تالیہ تھا۔ میں وہ نہیں ہوں۔ میں راجہ کی بڑی بیٹی ہوں' اس کی چینی بیوی کی واحد اولاد جس کو راجہ نے چین بھیج دیا تھا۔ اور اب راجہ نے ہی مجھے واپس بلایا ہے۔" چالباز نے کہانی گھڑ لی تھی۔ "اس لیے میرے سامنے سے ہٹ جاؤ' اور دروازے کھول دو کیونکہ میں.....میں بنداہارا کی بیٹی ہوں۔" وہ گردن اٹھائے اونچی گرج دار آواز میں کہہ رہی تھی۔ انگلی سے سینے پہ دستک بھی دے رہی تھی۔ منتقم آگ برساتی نظریں اوپر جمی تھیں۔ پھر پہریداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"میں کہہ رہی ہوں دروازہ کھولو.....کیونکہ میں.....میں ملاکہ کی شہزادی ہوں.....جاؤ اور بنداہارا کو خبر کرو۔"

پہریدار نے سر کو قدرے ادب سے خم دیا۔

"اور.....شہزادی.....میں کس نام سے ان کو خبر کروں؟"

(وہ آرٹ گیلری کے آفس میں کھڑی تھی۔ اور عصرہ مسکرا کے سامنے کھڑے فاتح سے اس کا تعارف کروا رہی تھی۔ "یہ تالیہ مراد ہے۔"

فاتح نے سر کو خم دیا اور مسکرا کے رسماً بولا۔ "کیسی ہو تم' تاشہ؟")

"میرا نام....." تالیہ نے اٹھی گردن اور سرد آنکھوں سے اوپر دیکھتے کہا۔

"تاشہ بنت مراد راجہ ہے۔ بنداہارا سے کہو.....اس کی بیٹی شہزادی تاشہ آئی ہے....."

ہم قیدی وقت کے

اس نے خواب میں دیکھا.....

وہ اس چھوٹے کمرے میں مراد کے سامنے کھڑی ہے.....

آتش دان میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دے رہی ہے.....

دروازے پہ سپاہی آواز لگا رہے ہیں کہ وہ محل سے آئے ہیں.....مراد حاضر ہو.....

"تالیہ.....قوم کا راہبر قوم کا باپ ہوتا ہے.....اس کو قربانی دینی پڑتی ہے.....یہ میری قربانی کا وقت ہے.....وہ مجھے لینے آئے ہیں.....مگر تم سے

میں اتنا چاہتا ہوں تالیہ.....کہ تم میرا ایک حکم مان لو....." مراد سنجیدگی سے کہہ رہا ہے۔ تالیہ کی آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں مگر وہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔

"جی بابا.....میں کیا کروں.....مجھے بتاؤ بابا۔"

"یہ قربانی تمہیں الور سونگائی کے لوگوں کے

لیے دینی ہوگی.... تالیہ.... اور اپنے بابا کی اٹھی گردن اور وقار کے لیے.... دوگی نا؟"

آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل رہے ہیں.... وہ "ہاں" میں گردن ہلاتی ہے۔

"میں یہ چاہتا ہوں تالیہ.... کہ تم...." وہ اس کے ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہتا ہے۔ "تم ان تمام باتوں کو اپنے اندر راز کی طرح دفن کر لو جو تم نے مجھ سے پمبورو کے متعلق سنی تھیں۔"

آنسو تالیہ کی آنکھ میں ٹھہر جاتا ہے۔ "وہ کیوں بابا؟"

"کیونکہ پمبورو کا باب آج سے بند ہو رہا ہے۔ سلطان مرسل نے ہمیں واپس شاہی محل بلوا لیا ہے۔ اب ہم محل میں رہیں گے تالیہ' اپنی اصلی جگہ پہ۔"

تالیہ ایک دم اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے کھینچتی ہے۔ "اور شکار بازوں کا کیا ہوگا؟"

"ان کو شہزادی کے سپاہی گرفتار کر رہے ہیں' مگر ہمیں کوئی گرفتار نہیں کرے گا۔ یہ دستک دینے والے ہمیں محل میں لے جانے کے لیے آئے ہیں' گرفتار کرنے نہیں۔"

وہ بے یقینی سے اس کو دیکھتی ہے۔ "مگر بابا.... شہزادی کے سپاہیوں کو کیسے معلوم کہ کون شکار باز ہے' کون نہیں؟ کس نے بتائے پمبورو کے لوگوں کے نام انہیں؟"

"کسی قوم کا راہنما اس کا باپ ہوتا ہے' اس کو مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ چند نام دینے کے عوض سوچو میں محل میں جا کر اپنے ہزاروں لوگوں کی بھلائی کے لیے کتنے کام کر سکتا ہوں۔"

"اور گاؤں کے لوگ؟ وہ تو قید خانوں میں مر جائیں گے۔ تو وہ خزانہ؟ وہ جو آپ کو لانا تھا۔ اس کا کیا؟" وہ قدم بہ قدم پیچھے ہٹ رہی ہے۔ چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔

"شش.... اس کا ذکر اپنے سینے میں دفن کر لو اور میرے ساتھ محل چلنے کی تیاری کرو۔ خزانہ ہمارا ہے' اور ہمارا ہی رہے گا۔"

دستک اب مسلسل ہو رہی ہے۔ "مراد حاضر ہو۔" بار بار پکارا جا رہا ہے۔ مراد اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

"میں ابھی ان کے ساتھ محل میں جا رہا ہوں' سلطان کی خدمت میں پیش ہونے۔ تم دروازہ بند کر لو اور باہر نہ نکلنا۔ اچھا!" وہ پیار سے اس کے سر کو تھپکتا ہے مگر وہ ایک دم سر جھٹک دیتی ہے۔ مراد اثر لیے بنا باہر کی طرف بڑھ جاتا ہے....

تالیہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی ہے۔ مراد اسے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سپاہی اس کو تعظیم پیش کرتے ہیں اور بگھی کی طرف لے جاتے ہیں۔ تالیہ آس پاس دیکھتی ہے۔ قریب میں بہت سے مکان قطاروں میں بنے نظر آ رہے ہیں اور سپاہی ان کے دروازے توڑ توڑ کے اندر سے لوگوں کو نکال رہے ہیں.... عورتیں ان کے پیر پڑ رہی ہیں' بچے رو رہے ہیں مگر وہ ان کے مردوں کو گھسیٹ کے گھوڑا گاڑیوں میں ڈال رہے ہیں۔

تالیہ کی آنکھیں بے بسی سے گلابی پڑنے لگتی ہیں۔

وہ ایک دم بھاگ کے الماری کے پٹ کھولتی ہے۔ اندر چھپی بوتل نکالتی ہے اور بلند کر کے دیکھتی ہے۔ بوتل کے پیندے میں چابی کے دونوں ٹکڑے بیٹھے ہیں۔

اسے معلوم ہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ یہ مشروب پیے بغیر وہ چابی تک نہیں پہنچ سکتی۔

وہ کارک کھینچ کے بوتل لبوں سے لگاتی ہے' اور مشروب اپنے اندر انڈیل لیتی ہے.... گھونٹ بہ گھونٹ.... مشروب اس کے خون میں شامل ہو جاتا ہے.... یہاں تک کہ چابی کے دونوں ٹکڑے اس کے لبوں سے آ ٹکراتے ہیں۔ وہ ان کو ہتھیلی پہ نکال لیتی ہے اور ڈلی کو سوراخ میں ڈالتی ہے۔ ہلکے سے کلک کے ساتھ چابی جڑ جاتی ہے۔ لمحے بھر کو وہ چمکتی ہے اور پھر.... ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

تالیہ زنجیر میں پروئی چابی کو کلائی میں پہن لیتی ہے....

اور یہیں خواب ٹوٹ جاتا ہے۔

☆☆☆

''چے تالیہ .... یہ کیا کہہ رہا تھا؟'' ایڈم جھنجلا کے اس کے پیچھے آیا۔

شہزادی کی سواری جا چکی تھی اور اس بوڑھے سے بات کرنے کے بعد تالیہ بے خودسی بازار میں چلتی جا رہی تھی۔

''تم یہیں رکو.... میرا انتظار کرو۔'' کہہ کے اس نے زیور کی پوٹلی ایڈم کی طرف بڑھائی۔

''مگر میں کیسے....''

''حکم مانو' ایڈم۔ حکم مانو۔''

''مگر مجھے بتائیں تو سہی کہ اس آدمی نے کیا کہا۔''

وہ ٹھہری اور اس کی طرف گھومی۔ اس کی آنکھیں عجیب ہو رہی تھیں۔

''اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ شہزادی یان سوفو تھی۔''

''تو یہ شہزادی تاشہ نہیں تھی؟''

''شہزادی تاشہ کوئی نہیں ہے' ایڈم۔ شہزادی تاشہ کوئی نہیں ہے۔''

ایڈم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ''مگر میں نے خود کتابوں میں اس کا ذکر پڑھا ہے' چے تالیہ۔''

تالیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''وہ ...... میں ہوں۔''

ایڈم کا منہ کھل گیا۔ لمحے بھر کو دونوں خاموش کھڑے رہے۔

''خیر.... آپ کا قصور نہیں ہے۔ شہزادی کی سواری دیکھ کے میں بھی چند لمحے کے لیے خود کو شاہی منظرنامے کا حصہ سمجھنے لگا تھا مگر اب وہ جا چکی ہے۔ آپ واپس آجائیں۔'' ساتھ ہی تالیہ کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ''یہ کتنی انگلیاں ہیں' آپ بتا سکتی ہیں؟''

مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔ ''ابھی جب میں اس بوڑھے سے بات کر کے ہٹی تو میں نے وہ خواب دوبارہ دیکھا جو جنگل میں دیکھا تھا مگر اس دفعہ وہ مکمل تھا۔ میرے بابا کو وہ لوگ گرفتار کرنے نہیں آئے تھے۔ عزت سے لے جانے آئے تھے۔ اور ہم تاشہ کی نہیں شہزادی یان سوفو کی بات کر رہے تھے۔ میرا باپ شہزادی کے مظالم میں برابر کا شریک ہے۔ میں کسی لکڑ ہارے کی نہیں' بنداہارا مراد راجہ کی بیٹی ہوں۔''

ایڈم بالکل شل کھڑا رہ گیا۔ ہکا بکا۔

''اس لیے تم یہیں رکو۔ جس گھر سے ہم نے کپڑے چرائے تھے اس کے عقب میں میرا انتظار کرو۔ میں رات کو تم سے ملنے ادھر آؤں گی۔ ابھی مجھے اپنے بابا کے پاس جانا ہے۔'' وہ آگے بڑھ گئی۔

''مگر....''

''حکم مانو' ایڈم۔ حکم مانو۔'' اس کے قدم رک نہیں رہے تھے۔ چند ساعتیں لگی تھیں اس کو بنداہارا کے محل پہنچنے میں۔

''کس نام سے خبر کروں' شہزادی؟'' محل کا پہریدار مؤدب انداز میں پوچھ رہا تھا اور تالیہ اوپر دیکھ رہی تھی جہاں محل کی ایک کھڑکی میں وہ شخص کھڑا تھا۔

''میرا نام تاشہ بنتِ مراد ہے۔ شہزادی تاشہ۔''

☆☆☆

کچھ دیر بعد وہ سپاہیوں کی معیت میں اندر داخل ہو رہی تھی۔ وسیع سبزہ زار۔ درمیان میں پتھریلی روش۔ آس پاس اونچے برآمدے اور ان کے اوپر مخروطی چھتیں۔ وہ محل قدیم فنِ تعمیر کا ایک شاہکار تھا۔

برآمدہ عبور کر کے وہ محل کے اندر آئے۔ کھلی کھڑکیوں کے باعث راہداریوں میں مناسب روشنی تھی مگر باہر کی نسبت قدرے اندھیرا تھا۔

سپاہی اسے ایک چھوٹے کمرے میں لے آیا جہاں طویل میز بچھی تھی اور اس کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ اسے وہاں چھوڑ کے پہریدار غائب ہو گیا۔ تالیہ نے کرسی کھینچی مگر بیٹھی تو چونک گئی۔ کرسی کی گدی ایسی نرم.... جیسے وہ ہوا پہ بیٹھی ہو۔ اس نے میز کی لکڑی پہ ہاتھ پھیرا.... ملائم اور چمک دار۔ اس سے تو خوشبو

بھی آتی تھی۔ تالیہ نے تحیر سے نظریں گھمائیں۔ بظاہر وہ ملائیشیا کے اچھے گھروں کے جیسا ایک سیٹنگ روم ہی تھا مگر ہر شے مختلف تھی۔

پہریداروں نے ایک دم دروازہ کھولا تو وہ چونکی۔ راجہ مراد تیز قدموں سے اندر داخل ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کمر پہ بندھا تھا اور دوسرا پہلو میں گرا تھا۔ پیروں تک آتی شاہی پوشاک.... گردن میں موتیوں کی مالا....سر پہ کپڑے کی ٹوپی۔ اس سے نکلتے لمبے بال جو کندھوں کو چھوتے تھے۔

اس کی نظریں اوپر اٹھتی ہوئی مراد کے چہرے پہ آن رکیں۔

وہ دبلا پتلا چہرہ تھا۔ قدرے سانولا۔ جیسے دھوپ میں رنگ جل گیا ہو۔ وہ ادھیڑ عمر مگر چھریرے بدن کا توانا مرد تھا۔ آنکھیں بالکل تالیہ کے جیسی تھیں....سیاہ اور گہری مگر ان میں کچھ تھا جو تالیہ کی روشن آنکھوں میں نہ تھا۔ ایک تپش' ایک چبھتا ہوا تاثر۔ جیسے ان آنکھوں کے ذریعے مراد دوسرے کے اندر تک اتر جاتا ہو۔

ان ہی آنکھوں سے وہ تالیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''بابا!'' لب پھڑپھڑائے۔ عجیب میکانکی سا انداز تھا۔ خون کے رشتے کی کشش' جذباتیت' کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ یہ وہ مراد نہیں تھا جس کو وہ خوابوں میں دیکھتی تھی....غریبوں کے لیے لڑنے والا ایک ہیرو....جس کے لوگوں کے لیے وہ خزانہ ڈھونڈنے نکلی تھی۔

یہ تو کوئی اور تھا۔ اس شخص کے ساتھ تو طاقت اور دولت کے جن یوں چپکے تھے کہ ان سے ڈر لگتا تھا۔

ملعون۔ آسیب زدہ۔

''میں...میں تالیہ ہوں۔'' اس نے پھر پکارا۔

وہ خاموشی سے آنکھیں چھوٹی کیے اسے گھورے گیا۔

''پانچ روز پہلے میں چابی لے کر چلی گئی تھی اور ایک دوسری دنیا میں کئی سال گزارنے کے بعد میں پانچ روز پہلے ہی واپس بھی آگئی تھی۔ یہ پانچ دن میں نے سلطنتِ ملاکہ کے جنگلوں میں بھٹکتے گزارے۔ بدقت یہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ آپ بنداہارا بن چکے ہیں۔ اور....'' وہ سوگواریت سے مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ ایک دم مراد اس پہ جھپٹا اور اس کی گردن زور سے دبوچی۔ تالیہ کا سانس لمحے بھر کو بند ہو گیا۔ اسے لگا وہ اسے مار دے گا مگر....

مراد نے ایک جھٹکے سے اس کو موڑا' اس کے بال ہٹائے اور گردن کی پشت دیکھی۔ (وقت کی مہر) پھر گہری سانس لی۔ گرفت ڈھیلی کی اور اسے سیدھا کیا۔

''تالیہ!'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تو اس نے رکی سانس بحال کی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔

''کتنے سال؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولا تو لب ہلتے ہوئے بھی محسوس نہ ہوتے تھے۔

''سترہ۔'' وہ ابھی تک دہلی ہوئی تھی۔

''کون سا زمانہ تھا؟''

''چھ سو سال بعد کا۔''

''تب دنیا کیسی تھی؟'' وہ سوال در سوال کر رہا تھا۔

تالیہ نے ایک پل کے لیے اطراف میں دیکھا۔ ''اس سے بہت مختلف۔ بہت الگ۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''کیا تمہاری شادی ہوئی؟ بچے ہیں؟'' اس کا انداز میکانکی سا تھا۔ بس اس کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی اپنائیت' محبت.....کچھ بھی نہیں۔

''ہماری دنیا میں اتنی جلدی شادیاں نہیں ہوتیں۔'' وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔

اس قدیم دیوان خانے میں وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے مگر درمیان میں گویا صدیوں کا فاصلہ تھا۔ دو دنیاؤں کی دوری تھی۔

''اچھی بات ہے کہ تمہیں اس دنیا نے زنجیر نہیں کیا۔ تم آزاد ہو۔''

ان الفاظ میں کوئی سرد پن سا تھا جو تالیہ مراد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سے گزرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''بے شک۔ میں آزاد ہوں۔ مگر مجھے وہ چابی واپس جانے کے لیے....''

''تم نے اپنا نام غلط بتایا؟ کیوں؟'' وہ اس کی نہیں سن رہا تھا۔

''کیونکہ کوئی یقین نہ کرتا کہ میں تالیہ ہی ہوں۔ پانچ دن میں میں اتنی بڑی کیسے ہوگئی۔ اس لیے میں نے خود کو تاشہ کہلوایا۔''

''اور تاشہ کون ہے؟ میری تو کوئی دوسری بیٹی نہیں ہے۔''

''تاشہ.... اس دنیا میں میرا نام تھا.... مجھے وہاں سب یہی کہہ کے پکارتے تھے۔'' جو منہ میں آیا بولے گئی۔

''اور کیا تمہیں خزانہ ملا؟''

تالیہ نے نفی میں دائیں بائیں گردن ہلائی

''نہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ کیونکہ میں نے بھی خزانے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔'' وہ سپاٹ تھا۔ بالکل سپاٹ۔

''بابا.... میں چاہ رہی تھی کہ مجھے وہ چابی....''

''میں خادم اعلا کو حکم دے رہا ہوں۔ تمہارے لیے خواب گاہ اور شاہی لباس تیار کردے گا۔ تم آرام سے رہو اور خوب کھاؤ پیو۔ تم بنداہارا کی بیٹی ہو۔ تمہیں بنداہارا کی بیٹی کے جیسا لگنا چاہیے۔''

اور بس!

راجہ مراد ان ہی تیز قدموں سے باہر نکل گیا جن سے وہ آیا تھا۔ دروازے پہرے داروں نے کھولے۔ اور اس کے جانے کے بعد بند بھی کر دیے۔ وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

ایسا سکوت اور خاموشی۔ جیسے وہ کسی سونے سے بنی قبر میں ہو۔

ایک دم وہ بھاگ کے کھڑکی کی طرف لپکی اور پردہ ہٹایا۔ نیچے محل کے سبزہ زار پہ پہریداروں اور ملازموں کی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ حالم آنکھوں نے فوراً سے عقابی انداز میں اس سارے احاطے کا جائزہ لیا۔ محل کے گیٹ کس طرف ہیں؟ پہریدار کتنے ہیں اور کہاں ہیں؟ فرار کے کتنے راستے ہیں؟ ممکنہ ہتھیار؟ سیکیورٹی جھول؟

(کیا میں ایک قید سے نکل کے دوسری میں آگئی ہوں؟) ذہن میں کوئی بار بار پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

بازار کی گلی کے دونوں اطراف دکانوں پہ گاہکوں کا رش لگا تھا۔ ایڈم زیور کی پوٹلی لباس میں چھپائے' لوگوں کے درمیان آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتا چوکنا' اور محتاط سا۔ لٹو کی شکل والا ہیٹ سر پہ پہن رکھا تھا۔ سو چہرہ مکمل طور پہ واضح نہ تھا۔

چند موڑ مڑے تو ایک دکان کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ ایڈم کے قدم اسی جانب اٹھ گئے۔

وہ بڑا سا ہال تھا۔ اندر جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ دور دور تک میزیں بچھی نظر آ رہی تھیں جن پہ بیٹھے لوگ بے فکری سے باتوں میں مصروف قہوہ پی رہے تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ ایڈم کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ یہ کوئی سرائے تھی۔ یا شاید قہوہ خانہ۔

اس نے کندھوں کو اکڑایا' اور اندر داخل ہو گیا۔ آگے ایک آدمی چل رہا تھا۔ ایڈم کے حلیے جیسا حلیہ بنائے وہ کندھے پہ ایک تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔ ایڈم نے دیکھا کہ اس نے تھیلا ایک میز پہ دھرا اور کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ پھر چٹکی بجائی اور اندرونی دروازے سے نکلتے لڑکے کو دیکھ کر انگلیوں کی وی دکھائی۔

ایڈم اس کے انداز کی نقالی کرتے ایک دوسری میز تک آیا اور اسی طرح بیرے کو انگلیوں کی وی بنا کے دکھائی۔ لڑکا اثبات میں سر ہلا کے اندر چلا گیا۔ اندر غالباً قہوہ خانے کا باورچی خانہ تھا۔

اب ایڈم نے احتیاط سے قرب و جوار میں

بیٹھے افراد کا جائزہ لیا۔ لوگ ٹولیوں کی صورت بیٹھے بے فکری سے باتیں کر رہے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا' کوئی سنجیدگی سے کچھ سنتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ زبان وہی انجان سی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بیرا ان دونوں کے لیے الگ الگ کھانا لے آیا۔ پہلے تھیلے والے کے سامنے طشت سجائی۔ پھر ایڈم کے پاس آیا اور ایک سوپ کا پیالہ اور ایک مشروب کا گلاس سامنے رکھا۔ پیالے میں دھاتی چمچ رکھا تھا جس سے ایڈم نے سوپ چکھا۔ مچھلی کا سا ذائقہ آیا مگر برا نہیں تھا۔ وہ چمچ بھر بھر کے پینے لگا۔

کن انکھیوں سے اس نے دیکھا کہ تھیلے والا کسی کے آواز دینے پہ پیالہ چھوڑ کے اٹھ گیا ہے۔ دور تین چار افراد کا ایک گروہ بیٹھا تھا جو ہنس کے اونچے نعروں سے اس کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ تھیلے والا ہنستے ہوئے جواب دیتا باری باری ان سے ہاتھ ملانے لگا۔ شاید وہ پرانے دوست تھے۔

ایڈم نے سوپ درمیان میں چھوڑا' تیزی سے اٹھا اور اس کی میز کے قریب سے گزرتے گزرتے اس کا تھیلا اٹھالیا' پھر پیچھے دیکھے بنا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اتنے رش میں کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

گلی میں جاتے ہی اس نے ایک طرف سرپٹ دوڑ لگادی۔ وہ بھاگتا رہا' بھاگتا رہا' یہاں تک کہ مکانوں والی اسی گلی میں آپہنچا جہاں ایک مکان میں صبح انہوں نے لباس تبدیل کیا تھا۔

ایک درخت تلے رک کے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

"اے میرے اللہ تعالیٰ!" ایڈم نے بے چارگی سے اوپر دیکھ کے شکوہ کیا۔ "اس چوری کا گناہ آپ کو چے تالیہ کے سر ڈالنا ہوگا۔ انہوں نے ہی مجھے ایسے کام کرنے کی ترغیب دی ہے۔"

پھر کانوں کو باری باری چھو کے استغفار پڑھا اور تھیلا کھولا۔ دن کی روشنی اتنی تھی کہ وہ بہ آسانی اندر جھانک سکتا تھا۔

اور اندر جھانک کے اسے جھٹکا لگا۔ اس میں چند سکوں کے علاوہ قلم' دوات اور کاغذوں کا ایک بنڈل رکھا تھا۔ مزید کوئی پیسے نہ تھے۔ ایڈم نے کاغذ نکال کے دیکھے۔ وہ ذرا سخت مادے کے بنے قدرے زردی مائل سفید تھے۔ پہلے صفحے پہ چند الفاظ لکھے تھے۔ اس نے پڑھنے کی کوشش کی۔

"بنگارایا ملایو" (ملے گل خطمی۔)

"بنگارایا ملایو!" اس نے اچنبھے سے دہرایا۔

یہ نام اس نے کہاں سنا تھا؟ بنگارایا (گل خطمی) ملائیشیا کا قومی پھول تھا مگر یہ نام.... یہ کچھ سنا سنا لگ رہا تھا۔

اور پھر ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ بنگارایا ملایو' تاریخ کی ایک کتاب تھی جو اسکول کے نصاب میں پڑھائی جاتی تھی۔ وہ مرسل شاہ کے عہد میں لکھی گئی ایک تاریخی داستان تھی جو شہزادی تاشہ پسونا کی زندگی پہ مبنی تھی۔ اس میں اس دور کے حالات کا بھی تذکرہ تھا۔ مگر یہ داستان ایڈم نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ اسکول میں اس نے آپشن میں چھوڑ دی تھی' اور شہزادی تاشہ کا جتنا ذکر اسے معلوم تھا' وہ ساتھ والے کلاس فیلوز کی منہ زبانی سن رکھا تھا۔ بنگارایا ملایو پڑھنے کی اس نے زحمت ہی نہیں کی تھی البتہ دوسری تاریخی کتب اس نے ڈھیروں کی تعداد میں پڑھ رکھی تھیں۔

"از عبداللہ بن ابوبکر۔" ساتھ لکھنے والے نے اپنا نام درج کر رکھا تھا مگر آگے تمام صفحات کورے تھے۔ ابھی اس نے کتاب تحریر کرنا شروع نہیں کی تھی۔

تو سرائے والا آدمی کوئی لکھاری تھا یا مورخ۔ اور اس کو لوگ جانتے پہچانتے تھے۔ تب ہی چند لمحوں میں وہ لوگوں میں گھر گیا تھا۔ مگر.... ایڈم الجھا۔

بنگارایا ملایو کے مصنف کا یہ نام نہ تھا۔ اس کا نام کوئی اور تھا۔ مگر شاید اسے یاد کرنے میں غلطی ہو رہی ہو۔ خیر.... اس نے تھیلا کندھے پہ چڑھا لیا۔ تھیلے کا لمبا سا اسٹریپ تھا جس کو کندھے پہ پہنو تو تھیلا پہلو میں آگرتا تھا۔

ایڈم نے سکے جیب میں رکھے' ہیٹ سر پہ

درست کیا اور اب کے قدرے اعتماد سے ایک طرف کو چل دیا۔

☆☆☆

صبح اس قدیم احاطے پہ بھی پھیلی تھی۔ برآمدوں میں بنی طویل جیل کی سلاخوں کے ساتھ کچھ قیدی کھڑے تھے' کچھ نیچے بیٹھے تھے۔ وان فاتح بھی ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ دو آدمی قیدیوں میں کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ دونوں اس جیل کے پہرے دار بھی تھے۔ ایک کی بغل میں تھیلا لٹکا ہوا تھا جس میں کھانے کا سامان تھا۔ وہ تھیلے میں ہاتھ ڈالتا' ایک گیند جیسی سفید چیز نکالتا اور ایک ایک قیدی کو دیتا آگے بڑھتا جاتا۔ قیدی جھپٹ کے اسے تھامتے اور دانتوں سے کترنے لگتے۔ دوسرا پہریدار کوڑا (ہنٹر) لہراتا اس کے پیچھے آرہا تھا۔ عجیب خوف اور ہیبت تھی اس کے انداز میں۔ قیدی سر جھکائے اپنے اپنے توشے تھامتے اور فٹافٹ کھانے لگتے۔

فاتح خاموشی سے کوڑے والے کا کوڑا دیکھ رہا تھا۔ یہ کس کے لیے تھا بھلا؟

دفعتاً پہریدار فاتح سے چند قدم کے فاصلے پہ آ رکا۔ وہاں ایک سنہری بالوں والا قیدی بیٹھا تھا۔ وہ البینو تھا۔ (پیدائشی بہت گورے' سنہری بالوں والے لوگ) چہرے پہ ناراضی اور لاتعلقی تھی۔ پہریدار نے کھانا اس کی طرف بڑھایا' اور ابھی البینو نے ہاتھ بھی نہ اٹھایا تھا کہ اس نے کھانا گرا دیا۔

وہ البینو کے قدموں میں مٹی پہ گر گیا۔ جہاں فاتح بے یقین رہ گیا' وہاں سارے میں خاموشی چھا گئی۔ سب مڑ مڑ کے دیکھنے لگے۔ البینو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''اسے کھاؤ!'' پہریدار گرج کے بولا' مگر البینو بس اسے غصے سے دیکھے گیا۔ پہریدار دوبارہ چلایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

کوڑے والا آگے آیا اور کوڑا لہرا کے البینو کے بازو پہ مارا۔ البینو نے آنکھیں بند کر لیں۔ لبوں سے کراہ نکلی۔ مگر اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اب ایک پہریدار اس کو مار رہا تھا' دوسرا چلا چلا کے گرد آلود کھانا کھانے کو کہہ رہا تھا' مگر البینو خاموشی سے مار کھاتا رہا۔

قیدیوں کی گردنیں وان فاتح کی طرف گھومنے لگیں۔ نیا آنے والا جری مرد جو سب میں ممتاز لگتا تھا' یقیناً شجاع بھی ہوگا' شاید وہ اس مظلوم کو اس ظلم سے بچائے۔ وہ سب کو اپنی طرف دیکھتا محسوس کر رہا تھا' مگر خاموش بیٹھا رہا۔ بوڑھے کے بازوؤں سے اب خون رسنے لگا تو پہریدار اسے چھوڑ کے آگے بڑھ آئے۔ باقی قیدیوں میں کھانا تقسیم کیا۔ ایک سفید گیند فاتح کی طرف بھی بڑھائی جو اس نے تھام لی۔

اردگرد بیٹھے لوگ مایوسی سے واپس اپنے اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کو امید تھی کہ وہ پہریداروں کو دو لگا دے گا' ان کا ہاتھ روک دے گا' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وان فاتح خاموشی سے اپنا کھانا کھا رہا تھا۔ نظریں اب بھی چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بالکل خاموشی سے۔

☆☆☆

ملاکہ شہر میں سمندر کنارے چھوٹی چھوٹی سبز پہاڑیاں بنی تھیں جن میں سے ایک کی چوٹی پہ بندا ہارا کا وہ خوبصورت محل واقع تھا۔ مخروطی چھتوں والا وہ لکڑی کا بنا محل تھا' اور اس کے ہرے بھرے سبزہ زاروں میں شاہی پہریدار پہرہ دیتے دکھائی دے رہے تھے۔

ایک اونچی کھڑکی میں تالیہ مراد کھڑی نظر آرہی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے' سنجیدگی سے وہ نیچے جھانک رہی تھی۔ اس کے تو اتنے لمبے بال بھی نہ تھے جو کھڑکی سے گرا کے اس کی سیڑھی بن جاتے اور اسے آزاد کر دیتے۔

دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ مڑی اور پردہ تیزی سے بند کر دیا۔ اب کمرے میں روشنی قدرے کم ہو گئی تھی۔ یہ وہی دیوان خانہ تھا جس میں کچھ دیر پہلے وہ راجہ مراد سے ملی تھی۔ دستک پھر سے ہوئی۔

''آجاؤ بھئی۔'' وہ سستی سے بولی' پھر فوراً آواز

کو بارعب بنایا۔

''آ جاؤ!'' کندھے سیدھے کیے اور گردن اکڑالی۔

دروازے کھلے۔ اور ایک ملے لڑکی اندر داخل ہوئی۔ چوٹی بنائے' روایتی لباس کو زرد اور سرمئی رنگ میں پہنے' (گویا یونیفارم ہو) وہ سامنے آئی اور سر جھکا کے سلام کیا۔ ''سلام' شہزادی!''

''ہاں بولو۔''

لڑکی نے آنکھیں اٹھائیں۔ وہ کوئی کنیز لگتی تھی۔

''آقا نے مجھے آپ کی خدمت پہ مامور کیا ہے۔ میرا نام شریفہ ہے۔ آج سے میں آپ کی خاص خادمہ ہوں۔''

''اچھا!'' اس نے بے نیازی سے سر کو خم دیا۔

''مجھے آپ کے لباس کا ناپ لینا ہے۔ آج آپ مہمان خانے میں رہیں گی' صبح تک ہم آپ کے لیے پوشاک تیار کروا دیں گے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ لے لو ناپ۔'' اس نے ابرو اچکا کے بظاہر لاپروائی سے کہا۔ کنیز پلٹی اور کسی کو اشارہ کیا۔ ایک لمبی قمیص اور ٹوپی والا تائی زبان (خواجہ سرا غلام) اور دو کنیزیں اندر آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ناپ کے فیتے' مختلف اوزار اور چند ایک تھال تھے جن پہ طرح طرح کے رنگوں کی ریشم تہ ہوئی رکھی تھی۔ کسی میں زیورات' کسی میں موتی۔

تالیہ نے ایک نظر دیوار پہ لگے بیضوی آئینے کو دیکھا جس کے کناروں پہ سنہری کام ہوا تھا۔ تالیہ کا عکس اس میں صاف نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پہ بے چینی اور آنکھوں میں ناخوشی تھی۔ عجیب سی اداسی' اور پریشانی۔

یہی سب وہ چاہتی تھی۔ نہیں؟

محل۔ شاہزادیوں والی زندگی۔ زیور۔ مگر.... یہ سب پا کر بھی اسے سب سے زیادہ فکر کس کی تھی؟

اس کی جسے وہ پنجرے میں چھوڑ آئی تھی۔

وہ جس کے ہاتھ بندھے تھے۔

وہ جس کی زنجیریں کھول کے وہ اسے آزاد نہیں کر سکی تھی۔

وہ جو اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا کہ مجھے چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔

(وہ یہ کیوں نہیں کہتا تھا کہ میرے ساتھ رہو؟ کب کہے گا وہ یہ؟)

اس نے بازو اٹھا دیے اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی خدمت پہ مامور غلام اور کنیزیں جھٹ پٹ اس کا ناپ لینے لگیں۔

(میرے ساتھ رہو۔ تمہیں میری اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔)

وہ آواز.... اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

بازار میں وہی معمول کی گہما گہمی تھی۔ کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ بول بھی رہے تھے مگر ویسا شور اور آوازیں نہ تھیں جو اپنے زمانے میں ایڈم نے بازاروں میں سنی تھیں۔ ٹی وی کا شور' ٹریفک کی آوازیں۔ ملاکہ کا قدیم شہر ان سب سے پاک تھا۔ وہاں ایک خاموشی سی تھی۔ مقدس' پرسکون خاموشی۔ جس کو گھوڑوں کے ٹاپوں کی چاپ یا بگھیوں کے پہیوں کی آوازیں بھی گھائل نہ کر سکتی تھیں۔

ایسے میں ایڈم غور سے تمام عمارتوں کو دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ لٹو کی شکل کا ہیٹ سر پہ تھا' اور چوری شدہ تھیلا کندھے پہ۔ وہ ایک ایک دوراہے پہ رکتا اور پھر اندازے سے ایک طرف بڑھ جاتا۔ رات وہ کس طرف سے بھاگتے ہوئے شہر سے باہر گئے تھے' اس کی اچھی یادداشت کو صد شکر کچھ بھولا نہیں تھا۔

ایک موڑ مڑا تو بے اختیار لبوں سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ سامنے ہی اس وسیع احاطے کا گیٹ تھا جس کے اندر وان فاتح بند تھا۔ ایڈم ٹھہر گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ یہ بازار کا ہی علاقہ تھا' رہائشی علاقہ نہ تھا۔ یہاں گلی میں ایک ہی چائے خانہ بنا نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔

اس چائے خانے میں بیٹھ کے وہ آسانی سے اس احاطے پہ نظر رکھ سکتا تھا۔ وان فاتح کے ''قریب'' پہنچ کے ہی اس کے اندر توانائی بھر گئی تھی۔ (باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

پری زاد

ظالم سسرال

''اماں یہ کیا آج پھر کھانا نہیں بنا؟'' سمعیہ نے کالج سے آتے ہی خالی کچن دیکھ کر اماں سے پوچھا اور پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔

''بھابھی پھر میکے تشریف لے گئی ہوں گی۔ اماں آپ کچھ کہتی کیوں نہیں ہیں بھائی سے، ہر دوسرے دن بھابھی کو میکہ یاد آجاتا ہے۔ ماں کی بیماری کا بہانہ بنا کر گھر کے کاموں سے جان چھڑاتی ہیں۔'' سمعیہ غصے میں اونچا اونچا بول رہی تھی۔

''مجھ سے اجازت تھوڑی لیتے ہیں۔ بس وہ تو اطلاع دے کر نکل جاتے ہیں۔ کرتی ہوں علی سے بات' یہ کیا روز روز کا تماشا بنا رکھا ہے۔ ایک میری ثنا ہے جو مہینے بعد آکر ماں کو منہ دکھا جاتی ہے فون بھی کرو تو حال احوال پوچھ کر بند کر دیتی ہے۔'' اماں کو بیٹی کا دکھ یاد آگیا۔

''اچھا چل تو ذرا روٹیاں ڈال لے میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی بھوک سے تو کچھ بولا ہی نہیں جا رہا مجھ سے۔'' ورنہ ایک لمبی بحث تو بنتی تھی ناں۔

''ایک تو باہر دھوپ میں جل کر آؤ پھر کچن میں بھی جلو' سمعیہ تن فن کرتی کچن میں داخل ہوگئی۔

☆☆☆

اس اتوار ثنا اپنے شوہر کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ آتے ہی ماں سے جو لپٹی تو جدا ہونے کو دل نہ چاہا۔ اماں بھی کافی دنوں بعد بیٹی سے مل رہی تھیں خوب پیار سے لپٹایا۔ سمعیہ سے بھی بڑے پیار سے ملی۔ سمعیہ بھی بہن کے عرصے بعد گھر آنے پہ خفا تھی مگر بہن کے گلے لگتے ہی سب شکوے بھول گئی۔ البتہ اماں کو ثنا کی آنکھوں میں نمی تیرتی محسوس ہوئی اور چہرہ بھی اداس لگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب ابا، علی بھائی اور شہر یار کے درمیان سیاست پر بحث چھڑی تو تینوں اماں کے کمرے میں آگئیں۔

''ثنا! کیا بات ہے سسرال میں تو سب ٹھیک ہے ناں' شہر یار تیرا خیال تو رکھتا ہے ناں! تیری ساس تو تیرے ساتھ اچھا برتاؤ کرتی ہے ناں!'' اماں نے سارے سوال ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالے۔ ثنا پہلے تو سب ٹھیک ہے ٹھیک کہتی رہی مگر اماں کے زیادہ استفسار پر نم آنکھوں سے ماں کی جانب دیکھا۔

''اماں شہر یار تو میرا بہت خیال رکھتے ہیں مگر میری ساس بہت ظالم ساس ہیں' ہر کام میں روک ٹوک کرتی ہیں کام تو کوئی بات نہیں اماں مگر وہ تو مجھے آپ سے بھی ملنے نہیں دیتیں اور تو اور فون کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ وہ تو جب ساس گھر میں نہ ہوں تو میں فون کر لیتی ہوں۔ اماں! مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ آپ جانتی ہیں ناں میں آپ سب سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی مہینوں بعد میکے آنے کی اجازت ملتی ہے۔'' ثنا بلک بلک کر رو پڑی اور اماں کے کندھے سے جا لگی۔ اماں نے تو کلیجہ تھام لیا۔

''ہائے کیسی ظالم عورت ہے جو ایک بیٹی کو ماں سے ملنے پر پابندی لگاتی ہے' کرتی ہوں میں شہر یار سے بات۔ یہ بھلا کہاں کا انصاف ہوا۔''

''اماں نہیں آپ شہریار سے کوئی بات مت کیجیے گا۔ وہ بھی اس معاملے میں بے بس ہیں۔ میری ساس کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ شہریار بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے۔'' ثنا آنسو صاف کرتے ہوئے سنبھل کر بیٹھ گئی مگر اماں کے دل میں ''ظالم ساس'' کا لفظ کانٹے کی طرح چبھ گیا۔ سمعیہ بھی اس معاملے میں خاموش رہی جیسے خود میں چور بنی بیٹھی ہو کیونکہ ایسی صورت حال تو یہاں بھی درپیش تھی سمعیہ آنسو صاف کرتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

''اماں! بھابھی نظر نہیں آ رہیں، میں تو اپنی باتوں اور پریشانیوں میں بھابھی کا پوچھنا ہی بھول گئی۔'' ثنا کو شام کی چائے پر بھابھی یاد آ گئیں۔

''وہ میکے گئی ہے بشریٰ کی امی کی طبیعت خراب تھی ناں تو صبح علی چھوڑ آیا شام تک آ جائے گی۔'' اماں نے بڑے نرم لہجے میں بشریٰ کے متعلق بتایا۔

''اماں! بشریٰ بھابھی کتنی خوش قسمت ہیں ناں کہ انہیں ہمارے گھر جیسا سسرال ملا۔ آپ جیسی اچھی ساس اور علی جیسا شوہر ملا اور سب سے بڑی بات کہیں آنے جانے میں روک ٹوک نہیں ہے۔'' ثنا کی آنکھوں میں اداسی پھر سے ڈیرے جمانے لگی۔

اور اماں سوچ رہی تھیں کہ شکر ہے انہوں نے علی سے کوئی بات نہیں کی بلکہ کوئی ایسا موقع ہی نہیں ملا جو بات کرتیں (اچھا ہی ہوا جو موقع نہیں ملا) ورنہ وہ بھی آج ایک ''ظالم ساس'' کہلاتیں۔ اور ماں بیٹی کو جدا کر کے اللہ کے حضور گناہ گار ٹھہرتیں یا ماں بیٹی کے آنسوؤں کا سبب بن جاتیں......!

☆



پہلے سے کہاں لوگ تھے اس بات کے عادی
تنگ آ کے اندھیروں سے اُجالوں کو صدا دی

کیا تازہ سخن محفلِ یاراں میں سُنائیں
جو اس پہ کہی تھی وہ غزل اس کو سُنا دی

وہ صحن بزرگوں کی نشانی تھا اس میں
گھر کے مرے افراد نے دیوار اُٹھا دی

تھی کتنی اہم میرے لیے تم کو خبر کیا
وہ بات ہنسی میں جو ابھی تم نے اُڑا دی

آیا جو محبت کا یہ رُخ اپنی سمجھ میں
اے دُشمنِ جاں تجھ کو بہت ہم نے دُعا دی

کیوں مجھ کو نظر آتا ہے ویران یہ کمرہ
کیا میز سے میں نے تری تصویر ہٹا دی

خاور کُھلی آنکھوں سے جسے دیکھنا چاہا
دل میں مرے آباد ہے خوابوں کی وہ وادی

رحمان خاور

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

چہرے پہ برہمی ہے، تبسم نظر میں ہے
اب کیا کمی تباہیٔ قلب و جگر میں ہے

تسلیم حسنِ دوست کی معصومیاں مگر
شامل تو کوئی فتنۂ شام و سحر میں ہے

یارب! وفائے عذرِ محبت کی خیر ہو
نازک سا اعتراف بھی آج اس نظر میں ہے

سمجھے تھے دُور تجھ سے نکل جائیں گے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہ گزر میں ہے

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے، مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

جگر مراد آبادی

پھر صبح کی ہوا میں جی میں ملال آئے
جس سے جدا ہوئے تھے اس کے خیال آئے

اس عمر میں غضب تھا اُس گھر کا یاد رہنا
جس عمر میں گھروں سے ہجرت کے سال آئے

اچھی مثال بنتیں ظاہر اگر وہ ہوتیں
ان نیکیوں کو ہم تو دریا میں ڈال آئے

جن کا جواب شاید منزل پہ بھی نہیں تھا
رستے میں اپنے دل میں ایسے سوال آئے

کل بھی تھا آج جیسا ورنہ منیر ہم بھی
وہ کام آج کرتے کل پر جو ٹال آئے

منیر نیازی



نظم

ہم ایک آواز اور ایک صدا
ہم ایسا تو کر سکتے ہیں
نمرود نے جو بھڑکائی تھی
اُس آگ کے ٹھنڈا کرنے کو
جتنا بھی کیا اک چڑیا نے
ہم اتنا تو کر سکتے ہیں
بن سکتے ہیں
ہم ایک آواز اور ایک صدا
ہم ایسا تو کر سکتے ہیں

اجمل سراج

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ کے ذکر کے علاوہ باتیں زیادہ نہ کرو، اس لیے کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ دیگر زیادہ باتیں، دل کی سختی ہے اور لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور سخت دل (والا آدمی) ہے۔"
(ترمذی)

فوائد ومسائل ؛

ا۔ دل کے سخت ہونے کا مطلب ہے کہ حالات و واقعات سے وہ عبرت و موعظت نہ پکڑے اور وعظ ونصیحت سے کوئی اثر قبول نہ کرے۔

2۔ اللہ کے ذکر کے بجائے فضول باتوں سے قلوب انسانی سخت ہوجاتے ہیں جو نہایت بدبختی کی علامت ہے اس لیے انسان کو اللہ کا ذکر ہی کثرت سے کرنا چاہیے۔

حکیمانہ اقوال،

○ لوگوں کے لیے حدیث سے زیادہ نافع کوئی علم نہیں۔ نہ کوئی عمل طلب حدیث سے افضل ہے بشرطیکہ نیت صحیح ہو لیکن یہ پُرخطر بہت ہے۔

○ کھانے کی لذت اور بدمزگی ہونٹ سے حلق تک رہتی ہے، اس لیے اتنا صبر کرلو کہ وہ حلق سے اتر جائے۔ چونکہ یہ سفر بہت جلد طے ہوجاتا ہے اس لیے اتنا صبر چنداں دشوار نہیں۔

○ جو شخص اللہ کی راہ میں ناپاک کمائی صرف کرتا ہے، گویا وہ پیشاب سے کپڑا پاک کرنا چاہتا ہے

○ ایک شخص نے کہا کہ کچھ نصیحت کیجیے۔ آپ نے کہا "یہ غور کرتے رہنا کہ تمہاری روٹی کہاں سے آتی ہے۔

○ بڑے آدمی کے ساتھ سفر کبھی نہ کرنا کیونکہ تم اس کے برابر خرچ کرو گے تو تمہیں نقصان پہنچے گا، اور اگر اس سے کم اٹھاؤ گے تو وہ تم سے بچے گا۔

○ اس زمانے میں نجات لوگوں سے پرہیز کرنے میں ہے لہٰذا امیروں سے بچو۔ لوگ تم سے کہیں گے کہ امیروں سے ملاقات رکھنے کی صورت میں آپ ضرورت مندوں کی سفارش کرسکتے ہیں، مظلوم کی حمایت کرسکتے ہیں، ظلم کو روک سکتے ہیں، مگر یہ سب شیطان کا فریب ہے

○ اگر تم اپنے آپ کو پہچان لو تو لوگوں کی بری بات سے تکلیف نہ ہو۔

○ عادل امام پانچ ہیں۔ خلفائے اربعہ اور عمر بن عبدالعزیز۔ جو شخص ان کے سوا کسی کو عادل کہے وہ حد سے بڑھ گیا۔

(سفیان ثوریؒ)

علم کی اہمیت،

البیرونی کی سانس اکھڑ چکی تھی اس وقت مشہور فقیہہ ابوالحسن اس سے ملنے آئے۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔
" ایک دن تم نے سوتیلی نانی کے ورثہ کا حصہ طلب

بننے کے بارے میں ایک طے شدہ نکتہ بتایا تھا۔ وہ نکتہ پھر دہراؤ تاکہ اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلوں۔"

انہوں نے غمگین لہجے میں کہا۔ "البیرونی! تمہاری حالت نازک ہے۔"

البیرونی نے کہا۔ "میں جانتا ہوں لیکن کسی بات کا علم حاصل کرکے مرجانا، علم حاصل کیے بغیر مرجانے سے بہتر ہے۔"

ابوالحسن نے اس کی خواہش پوری کی۔ اس نے ان کے الفاظ دہرا کر اچھی طرح ذہن نشین کیے اور اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک پیدا ہوئی۔

ابوالحسن کہتے ہیں۔ "میں اس کے گھر سے رخصت ہوا۔ ابھی گھر سے باہر نکل کر سڑک تک ہی پہنچا تھا کہ اس کے مکان سے رونے کی آوازیں آئیں۔

اس عظیم دانشور کی روح پرواز کرچکی تھی۔

خاتون خانہ

مچھلی والے نے گویا خاتون خانہ کو خوش خبری سنائی۔ "بیگم صاحبہ! آج میں آپ کے لیے زندہ مچھلی لے کر آیا ہوں۔"

اس نے خاتون کو مچھلی دکھائی جو واقعی زندہ تھی اور پھڑک رہی تھی۔ خاتون ناک چڑھا کر بولیں۔ "ٹھیک ہے، زندہ تو ہے مگر یہ بتاؤ کہ تازہ بھی ہے کہ نہیں۔"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

مشورہ

جس چیز کی طلب ہو، اسے بانٹنے لگ جاؤ پھر چاہے وہ رزق ہو، سکون ہو، عزت ہو، محبت ہو، یا پھر آسانیاں ہوں... یقین مانو... وہ واپس پلٹ کر آپ کے پاس آئیں گی، مزید۔

ثمینہ اکرم۔ لیاری

ذوق مطالعہ

ابن رشد کو مطالعے اور کتب بینی کا ازحد شوق تھا۔ کہتے ہیں اس کی ساری زندگی میں صرف دو راتیں ایسی گزری ہیں کہ وہ مطالعہ نہ کرسکا۔ ایک شادی کی رات اور دوسری وہ رات جب اس کے والد نے وفات پائی۔

بے وفا

وہ دھوکے باز اور بے وفا نکلی۔ میں نے فون پر اس سے پوچھا کہ "تم کہاں ہو؟" وہ بولی۔ "میں اپنی دوست علینہ کے ساتھ ہوں۔" حالانکہ علینہ اس وقت میرے ساتھ تھی۔

عنوی اکرم۔ کراچی

خواہش

میں تم کو دو باتوں سے ڈراتا ہوں۔ ایک خواہش کی پیروی، دوسرے آرزوؤں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی انسان کو حق سے روکتی ہے اور خواہشات کا زیادہ ہونا آخرت کو بھلاتا ہے۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

اپنی خواہشات سے اس طرح بچو جیسے اپنے دشمن سے بچتے ہو۔ کوئی شے انسان کے لیے خواہشات کی پیروی اور زبان کا زخم لگانے سے زیادہ دشمن نہیں۔

(امام جعفر صادق علیہ السلام)

بلند کردار

کنفیوشس کہتا ہے بلند کردار آدمی کی نشانی یہ ہے کہ اس کے قول اور عمل میں مطابقت ہوتی ہے اور وہ علم کو اہمیت دیتا ہے۔

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

بچوں کو ڈرانا دھمکانا،

ٹیس برگ کی یونیورسٹی کی خاتون ماہر نفسیات نے ایک سروے کے بعد کہا ہے۔

"جن لوگوں کو بچپن میں دھونس اور ڈانٹ کا نشانہ بنایا گیا وہ سگریٹ نوشی اور دیگر نشوں کی طرف مائل ہوئے۔ بیس سال کی عمر کے بعد ان کا رویہ بہت پُرتشدد تھا۔ ان کی زندگی میں معاشی مشکلات آئیں۔ اور چالیس سال کی عمر تک وہ اپنے مستقبل سے بہت مایوس دکھائی دیے۔

ادھیڑ عمر میں ان میں دل اور ہائی بلڈ پریشر کے مسائل بھی سامنے آئے۔

اس کے علاوہ جن افراد نے بچپن میں تشدد کا سامنا کیا۔ خود اپنے بچوں کو بہت ڈانٹا اور ان پر تشدد کیا۔

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

تبصرہ،

میاں بیوی بازار میں جا رہے تھے کہ اچانک بیوی نے سڑک کے دوسری طرف ذرا غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس طرف کے فٹ پاتھ پر ایک عورت جا رہی ہے۔ جو اپنے خیالات کی وجہ سے بڑی تکلیف اٹھا رہی ہے۔"

"تمہیں اس کے خیالات کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" شوہر نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

"کم از کم ایک خیال کے بارے میں تو معلوم ہو ہی گیا ہے۔" بیوی نے کہا۔

"وہ خیال کیا ہے؟" شوہر نے پوچھا۔

"اس کا خیال ہے کہ وہ سات نمبر کے پاؤں میں پانچ نمبر کے جوتے پہن کر آرام سے چل سکتی ہے۔" بیوی نے جواب دیا۔

کام،

ابلیس کے چند چیلے اس کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ چیلوں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے آج کل آپ نے ابلیسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ کہیں آپ کی صحت تو جواب نہیں دے گئی؟"

یہ سن کر ابلیس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

"تشویش میں مبتلا ہونے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آج کل میں نے اپنا سارا کام نیوز اینکر اور تجزیہ کاروں کو سونپ دیا ہے۔

زندگی،

زندگی ایک ایسی خوبصورت تتلی ہے جو اپنے خوب صورت رنگین پر دکھا کر ہر انسان کو ورغلاتی ہے پھر دیکھتے دیکھتے پھولوں سے لدی کیاری میں گم ہو جاتی ہے۔

(خلیل جبران)

واصف علی واصف کہتے ہیں،

- عروج کے وقت نظریں نیچی ہوں اور لہجہ نرم ہو تو زوال کے وقت زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔
- منافق وہ ہے جو اسلام سے محبت کرے اور مسلمانوں سے نفرت۔
- دل موم کا ہونا اللہ کا تقرب ہے۔
- اگر ظرف نہ ہو تو عطا انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔
- جو ہم خیال ہوں ہمسفر خود بخود ہو جاتے ہیں۔
- مومن وہ نہیں جسے بھائی مدد کے لیے پکارے اور وہ اسے قرآن سنانا شروع کر دے۔

نوال افضل گھمن۔ کراچی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

امت الصبور

آپ کی ڈائری

حمدہ واحد کی ڈائری سے

دو انسان جب مل کر خواب دیکھتے ہیں تو ایک ایسی فضا وجود میں آتی ہے جہاں خاموشی آواز بن جاتی ہے۔ جہاں تنہائی انجمن ہوتی ہے، جہاں منزل اور رستے الگ بھی ہوں تو یکجائی کا احساس ہوتا ہے۔ ان ہی جذبات کی عکاسی کرتی وسیم کاشف کی غزل قارئین کے لیے۔

آدھے اس کے آدھے میرے ہوتے ہیں
ہم نے خواب جو مل کر دیکھے ہوتے ہیں

ایسا نہیں کہ گھر میں کوئی اور نہیں
میں ہوتا ہوں اور پرندے ہوتے ہیں

امی! آپ کی باتیں کڑوی لگتی ہیں
جانتا ہوں مفہوم رسیلے ہوتے ہیں

آوازوں سے بڑھ کر درجہ رکھتی ہے
خاموشی کے اپنے لہجے ہوتے ہیں

سب کی اپنی اپنی منزل ہوتی ہے
سب کے اپنے اپنے رستے ہوتے ہیں

عذرا ناصر/اقصیٰ ناصر کی ڈائری سے

محبتوں کا متلاشی وجود محبت کی قید میں رہ کر طمانیت محسوس کرتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی محبت کے حصار میں رہ کر خود کو محفوظ سمجھتا ہے۔ اس احساس کو گلزار نے عمدگی سے اس نظم میں ڈھالا ہے۔

کئی پنجروں کا قیدی ہوں
کئی پنجروں میں بستا ہوں
مجھے بھاتا ہے قید میں کاٹنا
اور اپنی مرضی سے چناؤ کرتے رہنا
اپنے پنجروں کا

میعادیں طے نہیں کرتا میں رشتوں کی
اسیری ڈھونڈتا ہوں میں
اسیری اچھی لگتی ہے

فوزیہ ثمر بٹ کی ڈائری سے

محبت کی راہ کٹھن سہی لیکن اس راہ کے مسافروں کا ذوق سفر کم نہیں ہوتا۔ کہانیاں انجام کو پہنچے بغیر ختم ہو جائیں تو بھی محبت کرنے والوں کو ایک نشاط آفریں احساس دے جاتی ہیں۔ ان ہی جذبوں کی عکاس ذوالفقار احمد تابش کی غزل قارئین کی نذر۔

کہانی ختم ہوئی، داستاں تمام ہوئی
جہاں پہ سوچا نہیں تھا، وہاں تمام ہوئی

یہاں سے آگے نہ پیچھے کہیں بھی کچھ بھی نہیں
ہماری راہ بھی آکر کہاں تمام ہوئی

خبر کرے کوئی جا کر مرے مسیحا کو
جسے بچانا تھا اس کو، وہ جاں تمام ہوئی

وہ گفتگو جو کبھی ہم میں وہ ناتمام رہی
جو عاشقی تھی ہماری یہاں تمام ہوئی

عجیب بات ہے لیکن یہی ہوا تابش
مری کہانی ترے نام پر تمام ہوئی

نمرہ اقرا کی ڈائری سے

عرفان صدیقی کی یہ غزل میں نے عطاء الحق قاسمی کے کالم میں پڑھی۔ بہت پسند آئی اس لیے قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

گردشِ شام و سحر کے درمیاں چلتی رہی
اک کہانی داستاں در داستاں چلتی رہی

راستی کے راستوں کی خانہ ویرانی محال
کارواں ٹھہرے تو گردِ کارواں چلتی رہی

سرد بازاروں کے مارے شہرِ بے برکت میں بھی
میرے چھوٹے سے محلے کی دکاں چلتی رہی

اک سناٹا نوائے شوق میں ڈھلتا رہا
اک حکایت در حدیثِ دیگراں چلتی رہی

آگ برساتی رُتوں میں بھی کنول کھلتے رہے
دشت میں بھی ایک ہوائے مہرباں چلتی رہی

جانے کس کے ہاتھ میں تھا کاروبار
اور تہمت برسرِ پیرِ مغاں چلتی رہی

شائستہ اکبر کی ڈائری سے

اعتبار ساجد کی یہ خوبصورت مگر دل کو اداس کر دینے والی غزل میری خالہ نجمہ کے نام۔

کوئی رقعہ نہ لفافے میں کلی چھوڑ گیا
بس اچانک وہ خموشی سے گلی چھوڑ گیا

جب دیا ہی نہ رہا، خوف ہوا کیا معنی
خالی کمرے کی وہ کھڑکی بھی کھلی چھوڑ گیا

گونجتے رہتے ہیں سناٹے اکیلے گھر میں
در و دیوار کو وہ ایسا دکھی چھوڑ گیا

بس اسی حال کی تصویر بنا بیٹھا ہوں
مجھ کو جس حال میں وہ میرا سخی چھوڑ گیا

پہلے ہی درہم و دینارِ محبت کم تھے
اک تہی دست کو وہ اور تہی چھوڑ گیا

زوال افضل گھمن کی ڈائری سے

گرین لائن ٹرین میں دوران سفر چند لائنیں نظر سے گزریں اور دل میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئیں۔ یہ لائنیں سب پڑھنے والوں کے نام۔

اک قصہ اُڑتے پتوں کا
جو سبز رُتوں میں خاک ہوئے

اک نوحہ شہد کے چھتوں کا
جو فصلِ گُل میں راکھ ہوئے

کچھ باتیں ایسی رشتوں کی
جو بیچ نگر میں ٹوٹ گئے
کچھ یادیں ایسے ہاتھوں کی
جو بیچ بھنور میں چھوٹ گئے

تم دشتِ طلب میں ٹھہر گئے
ہم قریۂ جاں کے پار گئے

یہ بازی جان کی بازی ہے
تم جیت گئے ہم ہار گئے

طہٰ گل کی ڈائری سے

اقبال عظیم، خوبصورت نعتیں جن کی پہچان ہیں میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

مجھے اپنے ضبط پر ناز تھا سرِ بزمِ شب کیا ہوا!
میری آنکھ کیسے چھلک گئی مجھے رنج ہے یہ کیا ہوا

میری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کچھ نیا نہیں
ابھی روشنی، ابھی تیرگی نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

مجھے جو بھی دشمنِ جاں ملا وہی پختہ کارِ جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا وار خطا ہوا

مجھے آپ کیوں نہ سمجھ سکے یہ اپنے دل سے پوچھیے
میری داستانِ حیات کا تو ورق ورق کھلا ہوا

جو نظر بچا کر گزر گئے میرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ میرے ہی شہر کے لوگ تھے میرے گھر سے گھر ملا ہوا

ہمیں اس کا کوئی حق نہیں کہ شریکِ خلوص ہوں
نہ ہمارے پاس نقاب ہے نہ خنجر آستین میں چھپا ہوا

میرے اک گوشہ فکر میں میری زندگی سے عزیز تر
میرا ایک ایسا بھی دوست ہے جو کبھی ملا نہ جدا ہوا

مجھے اک گلی میں پڑا ہوا اک بدنصیب کا خط ملا
کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا، کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

مجھے ہم سفر بھی ایسا ملا شکستہ حال میری طرح
کئی منزلوں کا تھکا ہوا، کہیں راستوں میں لٹا ہوا

ہمیں اپنے گھر سے چلے ہوئے سرِ راہ عمر گزر گئی
کوئی جستجو کا صلہ ملا، نہ سفر کا حق ادا ہوا

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

انسر عباسی ——— ہری پور

عجب اندھیرا ہے تیری محفل میں ساقی
ہم نے دل بھی جلا دیا روشنی نہ ہوئی

آسیہ فرید ——— ملتان

دورِ غربت میں اجنبیت کا بھرم ہے اس قدر
مجھے آئینے سے بھی پوچھنا پڑ گیا ہے پہچانا مجھے

انجل ——— ڈہرکی

افسوس کہ سمجھا نہ ہمیں اہلِ نظر نے
ہم وقت کی جھیل میں ہیروں کی طرح تھے

شازیہ گلزار ——— بھکر

شکوے تو یوں کرتے ہو
جیسے صرف میرے ہو

تسنیم کوثر ——— کراچی

اس نے کہا کہ کون سا تحفہ ہے من پسند
میں نے کہا وہ شام! جو اب تک ادھار ہے

نادیہ اشرف ——— رلیٹے ونڈ

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— گلستان جوہر کراچی

طویل اثرات چھوڑ جاتا ہے
یوں تیرا مختصر سا یاد آنا

فائزہ بھٹی ——— پتوکی

شاید کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراق
گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

یہ برف موسم شجرِ جاں میں کچھ اور لمحے ٹھہر گیا تو
لہو کا دل کی گلی گلی میں مقام ممکن نہیں رہے گا

شازیہ سعید ——— شاہ نکڈر

ہم کج ادا چراغ کہ جب بھی ہوا چلی
طاقوں کو چھوڑ کر سرِ دیوار آ گئے
اب دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے
اب کے مقابلے پہ مرے یار آ گئے

فردوس رانی ——— ملتان

ہم ہی سادہ تھے کیا اس پہ بھروسا کیا کیا
ہم ہی ناداں تھے کہ لوگوں کی نہ مانی لوگو

ثمینہ اکرم ——— کراچی

ہم اہلِ دل کو بھی کردار کیا دیے گئے ہیں
کہ زخم کھاتے گئے ہیں، دعا دیے گئے ہیں

حرا ملک ——— دہارکی

اس میں کیا ہے کیا نہیں، مجھ کو اس سے کیا غرض
وہ مجھے اچھا لگا، میں نے سوچا کچھ نہیں

زارا ڈوگر ——— گوجرانوالہ

زندگی کا ہے خلاصہ وہی اک لمحۂ شوق
جو تری یاد میں اے جانِ جہاں گزرا ہے
حالِ دل سن کے وہ آزردہ ہیں شاید ان کو
اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے

عظمیٰ شفیق ——— جڑانوالہ

جب تک وہ بھی اپنے خول سے باہر آ نہیں جاتا
پیار بھرے خط لکھنا، نیچے اپنا نام نہ لکھنا
عشق میں ہیں کچھ کام جو دھیرے دھیرے ہوتے ہیں
دھیرے چلنا، تم آغاز میں ہی انجام نہ لکھنا

نمرہ، اقرأ ——— کراچی

ہر کڑی راہ میں، ہر منزل پر
تیرے ہی غم کو صدا دی میں نے

حمدہ واحد خان ———— کراچی

ہے کوچۂ جاناں سے پرے بھی کئی منظر
دل نے کبھی اس راہ سے ہٹ کر نہیں دیکھا

ملائکہ کوثر ———— بسم اللہ پور

ہمارے ہی دل سے مزے ان کے پوچھو
وہ دھوکے جو دانستہ ہم کھا رہے ہیں
جفا کرنے والوں کو کیا ہو گیا ہے
وفا کر کے بھی ہم شرما رہے ہیں

سعدیہ سلیم ———— کراچی

کہیں ملے تو اسے یہ کہنا
گئے دنوں کو بھلا رہا ہوں
وہ اپنے وعدے سے پھر گیا ہے
میں اپنے وعدے نبھا رہا ہوں

شازیہ ہاشم میواتی ———— کھڈیاں خاص

نہ کسی کو میرا خیال تھا، نہ کوئی بھی محرم حال تھا
مرے دل کے گرد و نواح تک نہ شعاعِ نورِ سحر گئی

اقراء جٹ ———— منچن آباد

نہیں معلوم کیا کہانی تھی
آنسوؤں میں بڑی روانی تھی
وہی اختر شماریاں اور میں
یہ روایت بہت پرانی تھی

عابدہ ظہیر عابی ———— جہلم

ایسے نہ تھے ہم اہل دل اتنے کہاں خراب تھے
ہم بھی کسی کی آس تھے، ہم بھی کسی کا خواب تھے

کبریٰ مہتاب رانا ———— بوسال لکھا

ادھورے پن سے گھبرا کر آخر
میں نے اُسے مکمل چھوڑ دیا

اقراٗ عزیز ———— دریا خان جلبانی

منتظر میرے زوال کے ہیں
میرے اپنے بھی کمال کے ہیں

اقصیٰ ناصر ———— گلستان جوہر

تیری نگاہ کے صدقے پھر سے یاد آیا
بھلا دیا تھا جو درسِ اولیں میں نے



نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

امامہ راشد......انڈیا

چھ سات سال کی عمر سے ہی بچوں کی کہانیاں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ کتابیں پڑھنا میرا واحد شوق تھا تو غلط نہیں ہوگا۔ پھر تو جو کتاب ہاتھ لگتی وہ پڑھ لیا کرتی تھی۔ اگر چھٹیوں میں کہانی کی کتابیں نہ ملتیں تو اگلی جماعت کی اردو، سائنس اور تاریخ کی کتابیں پڑھ لیا کرتی تھی۔

چھٹیوں میں جب نانی کے گھر جاتی تھی تو خالہ کو ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے دیکھتی تھی۔ یہیں سے میرے ڈائجسٹ پڑھنے کے سفر کا آغاز ہوا۔

عام زندگی کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں اور پھر ان میں دیے گئے چھوٹے چھوٹے سبق پڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ نہ عنوان دیکھتی تھی نہ لکھاری کا نام۔ جب کہانیوں کی سمجھ آنے لگی تو ان دونوں باتوں پر دھیان دینا شروع کیا۔ ''ایمان، امید، محبت'' کی ایمان علی، ''محبت من محرم'' کی افق، مصحف کی محمل ابراہیم، ''ابن القلم'' کی زینب، ''یارم'' کی ویرا امرحہ، کارل، عالیان، سائی، ان کی یونی، عہد سکوت کی وشمہ اور رہ نورد شوق کی دینا۔ یہ سب اور ایسے بہت سے کردار میرے پسندیدہ بنے۔ جن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ رہ نورد شوق کا پرنٹ نکلوا کر میں نے اپنی امی کو دیا تھا پڑھنے کے لیے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس رائٹر کی اور کہانیاں بھی دو پڑھنے کے لیے۔ مقید خاک جو اہرام مصر پر لکھی گئی تھی بہت اچھی تھی۔ ''دیے کے اندر ایک دیا'' اس کہانی کا جملہ ''ہٹ دھرمی سرما کی برف کی طرح ہوتی ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے نہ قدر۔'' یہ اور اس طرح کے کئی جملے ہیں جو مجھے بے انتہا پسند ہیں۔ ناول پڑھنے سے میری اردو بہتر ہوئی۔ اللہ جانے کتنے نئے الفاظ ڈائجسٹ پڑھنے سے ہی سیکھے ہیں۔

پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ کہانیاں لکھنے والی رائٹرز پاکستان سے ہیں۔ جب معلوم ہوا تو خوشی بھی ہوئی اور صدمہ بھی (کیوں کہ کچھ رائٹر بہت پسند ہیں اور وہ انڈین نہیں ہیں، اس بات کا دکھ ہوا) میں نے پاکستان کو ان رائٹرز کی کہانیوں سے ہی جانا ہے۔ عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق، آمنہ ریاض، سمیرا حمید، نمرہ احمد، سمیرا شریف طور، عفت سحر طاہر اور بھی بہت سے رائٹرز ہیں جنہیں بہت شوق سے پڑھا ہے۔ میری ایک دوست میری طرح ڈائجسٹ پڑھنے کی شوقین تھی۔ ہم دونوں اکثر کہتے تھے کاش ہم لوگ صرف دس دن کے لیے پاکستان جا سکیں اور ان تمام شہروں کو دیکھ سکیں جن کے بارے میں ہم کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔

ڈائجسٹ پڑھ کر اور ذاتی شوق کی وجہ سے بھی پاکستان کے بارے میں اتنا کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ اب جب فیس بک پر بننے والے پاکستانی دوستوں سے پاکستان کی بات کروں تو وہ کہتے ہیں ہمیں یقین نہیں کہ تم پاکستان سے نہیں ہو۔ ہاہاہاہا۔ شاید یہی فائدہ ہوتا ہے ہم زبان ہونے کا۔ اگر مجھے اردو نہ آتی ہوتی تو میں پاکستان کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جان پاتی۔ اتنے سارے کردار اور کہانیاں جو ڈائجسٹ میں بکھری ہوئی تھیں، وہ میری زندگی کا حصہ کیسے بنتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ڈائجسٹ کی کہانیوں میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ انڈیا

میں لکھنے اور پڑھنے کا ماحول الگ ہے۔ یہاں پر تقریباً ہر ٹاپک پر لکھا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کا ریڈر میچورڈ ہے۔ جہاں تک میں نے پاکستانی کہانیاں پڑھی ہیں یہاں ٹاپک محدود ہیں۔ صرف چند رائٹرز ہیں جو ہر بار الگ لکھتی ہیں۔

ج: پیاری امامہ! آپ کے خط پڑھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے۔ فن کی کوئی سرحد نہیں ہوتی جس طرح آپ ہمارے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں اس طرح ہم بھی انڈیا کے مصنفین کی تحریریں پڑھتے ہیں ہمیں انڈیا کے بہت سے مصنفین بہت پسند ہیں۔ اجیت کور، امرتا پریتم، آغا محمد اشرف، شمس الرحمان فاروقی، گلزار، رام لعل، کرشن چندر اس کے علاوہ بے شمار مصنفین ہیں جن کی تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ امرتا پریتم کی کافی کہانیاں ہم نے شائع بھی کی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہر موضوع پر کہانیاں لکھی جارہی ہیں ادبی رسائل میں میچورڈ کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں البتہ ڈائجسٹ میں ہم تھوڑی احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈائجسٹ ہر عمر کی لڑکیاں پڑھتی ہیں اور ان کے ناپختہ ذہن ان کہانیوں کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ پھر بھی سمیرا حمید، ایمل رضا، فائزہ افتخار اور رخسانہ نگار نے بہت میچورڈ اور متنوع موضوعات پر بھی بہت اعلا معیار کی تحریریں لکھی ہیں۔

اقراء جٹ ...... منچن آباد

ماڈل گرل پوری دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ جمی ہوئی تھی۔ (قارئین سے جو بھی سروے کیا جائے اس پر انعام رکھنا چاہیے۔ ''حسن المآب'' سائرہ رضا ونڈرفل۔ ''اسے ہم فرض کرتے ہیں'' صدف نثار جی بہت اعلا لکھا الفاظ نہیں تعریف کے لیے ''محبت جنوری جیسی'' فرزانہ کھرل ونڈرفل، اپنا پن یمنیٰ اختر بہت نائس۔ ایمل رضا، عطیہ خالد، قرۃ العین خرم ہاشمی، قانتہ رابعہ اور پری زاد سب کے افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ عجب گل سے ملاقات زبردست رہی اور علی جوش سے بھی۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔

ج: پیاری اقرا آپ کی تجویز اچھی ہے ان شاء اللہ سالگرہ نمبر کے سروے میں ہم انعام رکھیں گے۔ افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔

ناہید اسماعیل ...... کراچی

نئے سال کے لحاظ سے ٹائٹل کچھ پرانا سا لگا۔ سب سے پہلے بات ہوجائے ''حسن المآب'' کی حسنل کو تو ہدایت غلطی لگ ہی نہیں رہی تھی سو ہوا بھی یہی، موسیٰ سے کی گئی اسکار کی تمام باتیں دل کو چھو گئیں بلکہ اس پورے منظر نے بے حد متاثر کیا، سائرہ نے کہانی کے کسی بھی رخ کو نظر انداز نہیں کیا حتیٰ کہ رام ناتھ کو بھی، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ حلیمہ کی متکبر ذہنیت بھی عبدالمبین پر عیاں ہوجاتی، بہرحال اختتام بہترین ہوا۔ ''دشت جنوں'' بھی غالباً اختتام کی طرف گامزن ہے۔ ''دشت جنوں'' کی کسی بھی قسط نے ہمیں بور نہیں کیا۔ ''حالم'' کی کیا ہی بات ہے ہر منظر میں کوئی نئی چونکا دینے والی بات ہوتی ہے۔ کچھ قارئین کے مطابق کچھ چیزیں غیر حقیقی ہیں لیکن ہمارے خیال میں دلچسپی سے بھرپور بھی تو ہیں۔ یونہی دل چاہا کہ ہم بھی ایسے کسی ٹریپ ڈور سے گزر کے اپنے بچپن کے بے فکر سنہرے دور میں چلے جائیں اور پھر واپس آنا بھول جائیں۔

صدف نثار کا مکمل ناول بہتر لگا۔ ثمن پر بہت بری گزری۔ سرور فاطمہ کی تحریر ٹھیک لگی لیکن ہیروئین کا ''قصائی پن'' پسند نہیں آیا۔ یمنیٰ اختر کا ناولٹ بہت ہی اچھا لگا گو کہ موضوع نیا نہیں تھا لیکن ہر رائٹر کا جداگانہ انداز ہی کسی پرانے موضوع کو بھی منفرد اور بھرپور بناتا ہے۔ اختتام خوش گوار ہونے کی وجہ سے اور بھی بھایا۔

افسانوں میں قانتہ رابعہ نے اپنی باقی تحریروں سے ہٹ کر لیکن ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا، عطیہ خالد کے ''جنت'' نے بھی اچھا سبق دیا اور جی ناظمہ زیدی کے ''پروہنے'' تو واقعی ''سوہنے'' نکلے۔ مہوش طالب کا افسانہ متاثر نہ کرسکا۔ اب بات ہوجائے بیسٹ آف دی منتھ افسانوں کی (افسانوں ...... اس لیے کہا جناب کہ دسمبر کا بھی شامل ہے، وہ تحریر تھی ''بیٹوں کی ماں'') اور اس بار ہے ''شکر'' بہت، بہت اور بہت ہی خوب، ایمل نے بے حد آسان لفظوں میں سمجھایا کہ بات محض ''لوگوں'' ہی کی نہیں بات تو ''بندوں'' کی ہے۔ خلوص نیت اور دل کی تمام ترسچائیوں کے ساتھ، ویلڈن ایمل رضا۔

انٹرویوز اچھے ہی تھے ویسے ہمیں ڈاکٹر عمر فاروق

جیسی شخصیات کے انٹرویوز پڑھ کر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ جنہوں نے وطن عزیز کا نام واقعی روشن کیا ہو۔

سروے میں عطیہ خالد لاہور اور ثمینہ بھارت کے جوابات پسند آئے۔ ثمینہ اکرم، بہار کالونی لیاری کو ہمارا تبصرہ پسند آیا بہت شکریہ (جبکہ ہم ان کا تبصرہ پڑھ کر سوچتے ہیں کہ کتنا اچھا اور رواں لکھتی ہیں)۔

نفسیاتی الجھنیں میں بہن "ع" کا خط پڑھ کر یہی سوچ آئی کہ بہن "ع" کو اللہ پر بھروسہ ہونا چاہیے کہ ان کی شادی کب اور کس سے ہوگی یہ سب تو لوح محفوظ پر لکھا جا چکا ہے پھر ایسی حرکتیں کرنے کی کیا ضرورت۔

ج: پیاری ناہید! بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے آپ نے، بہت شکریہ۔ اس میں شک نہیں کہ سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور وہی پیش آتا ہے جو لکھا جا چکا ہے لیکن انسان بہت بے صبرا اور جلد باز ہے اور یہ اس کی سرشت میں شامل ہے اور یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ انسان کی سرشت نہیں بدل سکتی۔

ہیروئین کے "قصائی پن" پر آپ کو اعتراض ہے پرانی اردو شاعری پڑھیں تو لگتا ہے کہ محبوبہ کا کام ہی ہوتا تھا کہ وہ عاشقوں پر قتل طبع آزمائی کرے۔ بہر حال آج کے دور کی بات کریں تو خواتین بڑے بڑے کارنامے سر انجام دے رہی ہیں اگر ایمرجنسی میں ایک مرغی کے گلے پر چھری پھیر دی تو اس میں کیا برائی ہے۔

سمیعہ حنیف منور......راولپنڈی

چند ماہ سے میری ساس امی بیمار ہیں تو مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ آج بھی بہ مشکل وقت نکالا ہے کہ "حالم" نے مجبور کر دیا۔ کہانی نے اچانک ٹوئسٹ لیا کہ سانس ہی رک گئی۔ بے حد ہپنا ٹائز کرنے والا ناول ہے۔ بہت بہت خوب صورت دیگر حسن المآب، دشت جنوں بہترین جا رہے ہیں اگر تو آخری قسط میں موسیٰ بی نے دوسری شادی کر لی تو موسیٰ کو پڑھتے ہوئے دماغ میں جنید جمشید چمکتے ہیں

"ہمارے نام" میں ناہید اسماعیل، امامہ ملک اور مہر النساء کے خطوط پڑھ کر تو مزا ہی آ گیا۔ آپ کی لکھاری تو ہر فن مولا ہیں ہی قاری بہنیں بھی کم نہیں۔

ج: پیاری سمیعہ! اللہ تعالیٰ آپ کی ساس کو صحت عطا فرمائے۔ سائرہ رضا نے یہ ناول جنید جمشید کی زندگی کے اوپر نہیں لکھا۔ کچھ باتوں میں مماثلت اتفاقیہ ہے۔

سمیرا اصغر......لاہور

"کرن کرن روشنی" پڑھ کر ہماری معلومات میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ شعر و شاعری سے اب کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے اس لیے سرسری سا پڑھتی ہوں۔

"ہمارے نام" میں قارئین کی تنقید اور تعریف پڑھ کر بھی مزا آتا ہے۔ مگر نفسیاتی مسائل میں عورتوں اور لڑکیوں کے "عصیلی مسائل" پڑھ کر مجھے تو بہت حیرت اور افسوس ہوتا ہے کہ ایک ان پڑھ عورت کو تو اچھے برے کا کوئی خاص پتا نہیں ہوتا شاید مگر ایک پڑھی لکھی عالمہ فاضلہ جس نے قرآن پاک کو ترجمہ اور تفسیر سے پڑھا ہوتا ہے۔ اس کی عقل کو کیا ہو جاتا ہے جو یہ غلط کاموں میں پڑ جاتی ہے۔

"حسن المآب" میں سائرہ جی نے بہت ہی اچھا اینڈ کیا۔ موسیٰ نے مہرو کے ساتھ نکاح کر کے اچھا کیا حسنل کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ (ناشکری)

"حالم" بہت اچھا جا رہا ہے۔ ویل ڈن نمرہ جی آپ تو نمبرون ہیں۔

نومبر کے شمارے میں نفسیاتی مسائل میں کراچی کی حنا قمر صاحبہ کا خط پڑھ کر بہت ہی افسوس ہوا۔ آپ نے انہیں کسی خیراتی ادارے میں جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر یہ نکاح پر راضی ہیں تو میں اپنے بھائی کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں بھائی کی بیوی وفات پا چکی ہے کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ میری والدہ سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی ہیں۔ ہمیں ان کی بہت فکر ہوتی ہے۔ شکریہ!

ج: پیاری سمیرا! آپ نے درست لکھا ہے کہ تین بچوں کا باپ نہ لڑکا ہوتا ہے نہ اس قسم کی دوستیاں جائز ہیں۔ اس طرح کی دوستیاں یا شادیاں کبھی بھی سچی خوشی نہیں دیتیں۔ ایک شادی شدہ بیوی بچوں والے شخص سے شادی کرنا خسارے کا سودا ہے بٹا ہوا شخص نہ خود خوش رہتا ہے نہ خوش رکھ سکتا ہے۔ عدنان بھائی نے بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

حنا قمر کی شادی ہوگئی ہے لیکن ہمارے معاشرے میں بہت ساری حنا قمر ہیں۔ آپ ان کی مدد کر سکتی ہیں۔ ہم آپ کا خط شائع کر رہے ہیں۔ اگر کسی نے رابطہ کیا تو

آپ تک پہنچا دیں گے۔ آپ ہمیں اپنا فون نمبر لکھ کر بھجوا دیں۔ ہمارا فون نمبر یہ ہے۔ 021- 32721666
خواتین کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

فوزیہ......میانوالی

میرا خیال ہے کہ میرے والدین کے بعد میری شخصیت کی تربیت اور تمام مثبت خصوصیات کو اجاگر کرنے میں خواتین ڈائجسٹ کی رائٹرز کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔
جس بات نے مجھے خط لکھنے کے بہت پرانے ارادے کو عملی جامہ پہننے پر مجبور کیا وہ سائرہ رضا کا ناول ''حسن المآب'' ہے۔ تمام اقساط اچھی تھیں لیکن آخری قسط نے تو کمال کر دیا۔ آپ یقین نہیں کریں گی لیکن یہ سچ ہے کہ ناول کی کچھ باتوں نے تو باقاعدہ ہلا کر اور رلا کر رکھ دیا۔ ہم انسانوں کے وہ گناہ، وہ غلطیاں جن کا ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا اس سب کو سائرہ باجی بہت خوب صورتی سے سامنے لائی ہیں۔ ہم لوگ جو کہ مذہب سے آگاہی قرآن وحدیث کے بعد صرف درس وعظ میں تلاش کرتے تھے وہ اب ہمیں خواتین ڈائجسٹ کی لکھاریوں کے ذریعے بھی ملتی ہے۔ کتنے ہی سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں۔ کتنے ہی ابہام دور ہو جاتے ہیں اس سب کے لیے میں ادارے اور تمام رائٹرز کی بہت ممنون ہوں۔
ایک درخواست اور ہے کہ آپی اگر میں آپ سے یا کسی رائٹرز سے براہ راست رہنمائی لینا چاہوں بذریعہ خط و کتابت تو کیا ایسا ممکن ہے؟

ج: پیاری فوزیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ رائٹرز نے ہمیں سختی سے تاکید کی ہے کہ ان کا فون نمبر یا ایڈریس کسی کو نہ دیا جائے وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر خط و کتابت یا فون پر بات نہیں کر سکتیں اگر آپ کو کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو ہمیں لکھ بھیجیں ہم متعلقہ عالم کی طرف آپ کی رہنمائی کر دیں گے۔

افشاں افسر، حمیرا مظفر......ایبٹ آباد

شعاع اور خواتین میرے پسندیدہ ڈائجسٹ ہیں۔
نمرہ احمد تو میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ نمرہ کے ناول مجھے بہت پسند ہیں۔ نمل بہت اچھا تھا۔ اب ''حالم'' بھی زبردست جا رہا ہے۔ آمنہ ریاض کا ''دشت جنوں'' بھی بہت اچھا ہے۔ خوش نصیب تو کبھی کبھی بدنصیب لگتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے نسبت زہرا کھروڑ پکا سے انسیت سی لگتی ہے۔

ج: افشاں اور حمیرا! آپ کی ''انسیت'' نسبت زہرا تک پہنچا رہے ہیں خواتین اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رابعہ نیلم، ثنا نیلم......نامعلوم

کسی بھی ڈائجسٹ میں یہ پہلا خط اور پہلی کاوش ہے ہمارے گھر میں ڈائجسٹ چوری چھپے پڑھے جاتے تھے میری بہنیں ہمیشہ بابا اور بھائی سے چوری پڑھتی تھیں۔ مگر مجھے نمرہ کے ناولز نے اتنا اعتماد دیا ہے کہ میں سب کے سامنے پڑھتی ہوں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ میرے ساتھ اب میرا بھائی بھی پڑھنے لگا ہے جو بہنوں کو ڈائجسٹ پڑھتے دیکھ کر پھاڑ دیتا تھا تو میں یہ کہوں گی کہ آپ کے ڈائجسٹ کا ہر شمارہ پچھلے سے بڑھ کر اچھا ہوتا ہے۔

ج: پیاری رابعہ اور ثنا! آپ نے پہلی بار خط لکھا ہے۔ شاید اسی لیے شہر کا نام لکھنا بھول گئیں۔ آئندہ خط لکھیں تو شہر کا نام ضرور لکھیے گا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب آپ کو خواتین ڈائجسٹ چھپا کر نہیں پڑھنا پڑتا اور آپ کے بھائی صاحب بھی اب خواتین ڈائجسٹ کے شیدائی بن چکے ہیں۔

سانحہ ارتحال

گزشتہ دنوں ہماری دیرینہ ساتھی شاہین رشید کو انتہائی دکھ اور صدمے سے گزرنا پڑا۔ ان کے ماموں کے داماد آصف حسین قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے اور اسی دن ان کے ماموں بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ وانا علیہ راجعون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ بہن شاہین رشید کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور دعا گو ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

فہمیدہ خواجہ...... ہری پور

میرا اور خواتین ڈائجسٹ کا ساتھ 86ء1985ء سے مسلسل ہے اور دعا ہے کہ ہمیشہ ساتھ رہے (آمین) خواتین ڈائجسٹ ہمارے گھر میں سب ہی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ میری آپی، امی اور پھر میں یعنی فہمیدہ خواجہ اس میں تمام رائیٹرز زبردست ہیں اور بہت خوب لکھتی ہیں۔ کسی ایک کی بھی تعریف نہ کرنا میرے خیال میں رائیٹرز کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ "کرن کرن روشنی" سے لے کر "بیوٹی بکس" تک تمام سلسلے اپنی مثال آپ ہیں۔ نمرہ احمد کا "حالم" آمنہ ریاض کا "دشت جنوں" فرزانہ کھرل کا "دھم گیا شور جنوں" اور سائرہ رضا کا "حسن المآب" اپنی مثال آپ ہیں۔

ج: پیاری فہمیدہ! خواتین ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے آپ کو تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں؟ آپ ہمارے لیے فیملی ممبر کی طرح ہی ہیں۔ آئندہ خوب صورت تبصرے کے ساتھ شریک ہوں۔ ہم منتظر رہیں گے۔

مصباح عزیز...... ڈیرہ غازی خان

واہ واہ سائرہ جی آپ نے کیا خوب لکھا میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں کہ "حسن المآب" کی شان میں مدح سرائی کر سکوں۔ اتنا شاندار اینڈ۔ حیرت اس بات کی ہے کہ کہیں بھی کہانی کی کوالٹی میں کمی محسوس نہیں ہوئی یعنی شروع سے لے کر آخر تک شاندار اور برقرار۔

میں نے خواتین اور شعاع اس وقت سے پڑھنا شروع کیا جس وقت میں اردو کے ہجے کر کے پڑھتی تھی۔ میری نانی اماں خالائیں اور ماموں گھر میں سب کو پڑھتے دیکھ کر پڑھنا شروع کیا۔ اور اب میں 32 سال کی ایک عورت ہوں۔ تین عدد بچوں کی ماں ہوں۔ اور جاب ' گھریلو ذمہ داریوں جیسی ٹف روٹین کے باوجود میں ڈائجسٹ ضرور پڑھتی ہوں ایمان پختہ ہوتا ہے جب ہم اتنی معیاری کہانیاں پڑھتے ہیں سبق آموز نصیحت آمیز۔

ج: پیاری مصباح! ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے جب ہم اپنی اتنی پرانی قارئین سے ملاقات کرتے ہیں۔ اگر اتنے طویل عرصہ سے خواتین ڈائجسٹ سے جڑا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خواتین ڈائجسٹ اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے اور یہ بات ہمارے لیے بے حد طمانیت کا باعث ہے۔

ثانیہ مشعل اشرف...... حویلی لکھا، تحصیل دیپالپور، ضلع اوکاڑا

دل اس قدر اداس تھا کہ حد نہیں۔ رونے کی شدید خواہش کو بمشکل دل میں دبائے "حالم" شروع کیا اور صفحہ نمبر 174 پر پہنچ کر تو میں دنگ رہ گئی جب یہ پڑھا کہ۔

"برداشت سے دوستوں کی بری بھلی باتوں پہ منفی ردعمل دینے سے خود کو روکنا ہوتا ہے......"

اور پھر میں نے جانے کتنی بار یہ الفاظ پڑھے۔ ایسا لگا جیسے نمرہ احمد نے یہ الفاظ بالکل میرے لیے لکھے ہوں۔

"حسن المآب" موسیٰ کے حسن سلوک، جو اس نے رام ناتھ کے ساتھ کیا خوش کر دیا۔ مگر...... آہ۔ سائرہ جی! کیا جنی اور "دل موم کا دیا" کی الفت جیسی عورتیں کبھی نہیں سدھر سکتیں؟؟؟ حقیقی زندگی میں ان کو برداشت کرنا بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ میرے بے حد نزدیک دو ایسی عورتیں ہیں جو جنی اور الفت کا پرتو ہیں۔ "اسے ہم فرض کرتے ہیں" کو پڑھ کر شدید حیرت ہوئی۔ ایسے ماں باپ اور بہن بھائی جو صفائی کا موقع ہی نہ دیں جبکہ ان کو تو گواہی دینی چاہیے تھی۔ "دشت جنوں" کی اگلی قسط کا بہت شدت سے انتظار ہے۔

ناولٹ دونوں ہی اچھے لگے۔ "شکر" ایمل رضا نے اچھا لکھا۔ "شکر" کی روح سمجھانے کے لیے شکریہ ایمل جی! "نظم اور غزلیں" سب ہی اچھی لگیں۔ "مزاج میں بھی شائستگی" پڑھ کر آہ نکلی۔ کتنے اچھے لوگ تھے اور کتنی جلدی چلے گئے۔

ج: پیاری ثانیہ! ہر انسان کی فطرت مختلف ہوتی ہے اسی طرح اس کی پسند ناپسند بھی مختلف ہوتی ہے۔

"حسن المآب" کو دنیا کی رنگینیاں متاثر کرتی تھیں۔ میڈیا کی چکا چوند' اپنے حسن کا خراج لینا اچھا لگتا تھا۔ اسے اپنی تعریف اور سراہے جانا پسند تھا، اس نے اسی راستے کا انتخاب کیا۔ اسی طرح الفت نے ہمیشہ اپنے دل کی سنی۔ آپ اپنی قریبی خواتین کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ انسان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو بہتر بنائے۔ دوسرے کیا کرتے ہیں وہ جانیں اور ان کے کام۔

"اسے ہم فرض کرتے ہیں" اس ماہ اس ناول کی دوسری قسط شامل ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو آپ کے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔

اقراء ممتاز......سرگودھا

ٹائٹل گرل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ آپی آپ نے تو یاد نہیں کیا سوچا، ہم ہی آپ کی محفل میں حاضر ہو جائیں۔ علی جوش اور عجب گل سے ملاقات اچھی رہی۔

محبتیں، گلاب اور جگنو سب بہنوں نے جیسے پیارے پیارے جگنو کی روشنی جیسے جواب دیے۔

سب سے پہلے حالم پڑھا۔ اس کہانی کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ حالم پڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں بھی پچھلی صدی میں تالیہ، فاتح اور ایڈم کے ساتھ —— ان کے ساتھ ادھر ادھر بھٹک رہی ہوں۔ کہانی بہت خوب صورتی کے ساتھ آگے جا رہی ہے۔

مکمل ناول "اسے ہم فرض کرتے ہیں" کیا امیزنگ سٹوری تھی۔

ناولٹ "چلو اک بار پھر سے" اچھی اسٹوری تھی۔

افسانہ "جنت بھی" اچھی اسٹوری تھی۔ خالی ہاتھ میں اسد خالی ہاتھ ہی رہ گیا۔ ناولٹ "اپناپن" کیا مزاحیہ اسٹوری تھی۔ ثمن اور سیما کی شرارتیں اور نوک جھونک ہنسنے پر مجبور کر گئی۔ پہلی دفعہ سنا ہے مرغی کو ہارٹ اٹیک بھی ہوتا ہے ہاہاہا۔

ج: پیاری اقرا! آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ ہم نے آپ کو یاد نہیں کیا۔ ہم آپ کو ہی نہیں اپنی تمام قاری بہنوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ان کے خط نہیں آتے تو ان کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ بس اظہار نہیں کرتے کیونکہ کسی ایک قاری بہن کا نام لکھیں گے تو دوسرے قارئین کو محسوس ہوگا اور سب کا نام لکھیں گے تو ناول، افسانے اور دیگر سلسلے کہاں شائع کریں گے۔

ثناذوالفقار......نورے والی رحیم یار خان

سرورق اچھا تھا۔ انٹرویوز سرسری سے ہی دیکھے۔

"جگنو، گلاب اور محبتیں" میں سب نے اچھے جواب دیے۔ حافظہ عائشہ ستار کی شرارتیں پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔

"پردے کے پیچھے" قانتہ رابعہ نے بہت اچھا افسانہ لکھا۔ عظمیٰ کے باپ نے بالکل درست فیصلہ کیا۔

"شکر" ایمل رضا کا ایک اور بہترین افسانہ بہت شکریہ ایمل رضا اتنا اچھا افسانہ لکھنے کے لیے۔ "جنت" وہی پرانی کہانی تھی۔ "خالی ہاتھ" اور "سوہنے پروہنے" بھی اچھے افسانے تھے۔

"چلو اک بار پھر" کہانی کے ہیرو، ہیروئن لگتا ہے بہت سست تھے۔ انہیں چلنے پھرنے کی زحمت نہ ہو اس لیے یمنیٰ اختر نے کہانی کو ایک آفس میں ہی مکمل کر دیا۔ لیکن یمنیٰ اختر کا انداز تحریر مجھے بہت پسند ہے۔

"اپناپن" سرور فاطمہ نے اچھا پیغام دیا۔ "حسن المآب" سائرہ رضا نے بہت اچھا اختتام کیا۔ "دشت جنوں" لگتا ہے کہ آیو شمتی کا راز بہت جلد کھلنے والا ہے۔

ج: پیاری ثنا! تین ماہ سے آپ کے خط اس لیے شامل نہیں ہوئے کہ آپ کے تین نہیں ہمیں صرف ایک خط موصول ہوا اور وہ بھی بہت تاخیر سے —— اس لیے ہم اسے شامل نہیں کر سکے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔

ہما فاروق......گوجرانوالہ

سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" سے استفادہ کیا۔ "جگنو، گلاب اور محبتیں" میں سب قارئین بہنوں کے انٹرویو اچھے لگے۔ سب سے پہلے سائرہ رضا کو "حسن المآب" جیسا بیسٹ ناول لکھنے پر مبارک باد۔ "حسن المآب" کی آخری قسط بہت جان دار تھی۔ حسنل بہت خودسر تھی۔ یہی آرزو تھی کہ وہ سدھر جاتی۔ مگر حقیقت میں اس کے دل پر مہر لگی تھی۔ مگر پھر بھی ناول بہت پسند آیا۔

نمرہ احمد کا "حالم" بھی زبردست جا رہا ہے۔

صدف نثار کے مکمل ناول کی اگلی قسط کا انتظار ہے پہلی قسط بھی بہت اچھی لگی۔ ایمل رضا کا افسانہ "شکر" حقیقت سے قریب ترین تھا۔ قانتہ رابعہ کا افسانہ "پردے کے پیچھے" بھی اچھی کاوش تھی۔ باقی افسانے "جنت"۔ "خالی ہاتھ" اور "سوہنے پروہنے" بھی اچھے تھے۔ آپی پلیز سائرہ رضا، عمیرہ احمد، نمیرہ احمد کا انٹرویو بھی ضرور چھاپیں شکریہ۔

ج: پیاری ہما! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ انٹرویو کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کر لیں۔

صابرہ بیگم......چک شمالی

میرا بہت ہی دل کرتا ہے

امتل بہن سے ملنے کو، دیکھنے کو۔ کبھی اس وقت خط لکھا کرتی تھی جب بالوں کو کنگھی کرنے کی تو کیا سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ پھر بھی دن کھینچ کھانچ کر وقت نکال لیتی تھی۔ خواتین کرن پڑھنے کے لیے۔ اب صرف دیوانگی رہ گئی بستر کی حد تک۔ جوڑ جوڑ دیکھتا ہے مگر جوانی کی پڑی عادتیں بھلا چھٹتی ہیں۔ میاں نے اللہ زندگی بخشے مجھے اس عادت سمیت قبول کیا۔ جنوری کا خواتین جنوری جیسا ہی لگا۔ من بھایا سا سب سے پہلے ہمارے نام پڑھا۔ ایسا مزا آتا ہے جیسے ساری قارئین بہنیں ایک ہی خاندان سے ہوں اور بہن تم اس خاندان کو سنبھالے بیٹھی ہو۔

سائرہ رضا کی تحریر ''حسن المآب'' بہت ہی دیدہ دل سے لکھی گئی کہانی دل میں اندر تک جگہ بنا گئی۔ بہت مبارک ہو سائرہ بچے۔ حالم کے بارے میں ادھر ادھر سے بہت کچھ سن چکی ہوں ایسا ہے ویسا ہے مزا نہیں آ رہا ہے لیکن میں کھل کر رائے دینے والوں میں سے ہوں۔ تحریر کا مطلب ہے طرز تحریر۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو کمال دلچسپی سے پڑھنے میں بے شک خوابوں کی دنیا مگر مزے کی۔

دشت جنوں آمنہ بہن نے ڈرا ڈرا کے بہت پیارا لکھا۔ آمنہ سے تنزیلہ کی یاد آ گئی۔ یہ پرانی رائٹرز کہاں چلی گئیں۔ رخسانہ نگار، فائزہ افتخار، راحت جبیں اور ثمرہ کیا لکھتی تھیں۔ سادہ انداز میں بھی قاری کو پکڑ کر رکھنے والی۔ اگر ان کی جھلک نظر آتی تھی تو سائرہ رضا، صائمہ اکرم، مصباح علی، عطیہ خالد میں یہ مصباح بھی آئی چھائی اور غائب ہو گئی۔ جنہیں ذرا سا لکھنا ہی چھوڑ جاتی ہیں۔ ایک ام ثمامہ بھی بہت اچھے افسانے لکھتی تھیں، وہ بھی اب دکھائی نہیں دیتیں۔ اس ماہ کے افسانوں میں پردے کے پیچھے قانتہ رابعہ کا بہت ہی سادہ انداز میں دلچسپ موضوع خوب اچھا لگا۔

جنت کا موضوع پرانا مگر ایسا کہ ہزار بار بھی لکھو تو کم ہے۔ عطیہ نے بہت پیارا لکھا۔ خالی ہاتھ بھی اچھی تحریر تھی۔ ناولٹ میں ''چلو اک بار سہی'' ثمینہ نے موضوع بہت سبق آموز چنا مگر معذرت انداز تحریر کچھ مزاج پر نہیں چڑھا۔ اپنا پن سرور فاطمہ نے اتنے سرور میں لکھا کہ مجھے تو سخت سردی میں بھی سرور آ گیا۔ ہر مہینے ہلکے پھلکے مزاح والی تحریر لکھوالیا کرو۔ بہن ہم بوڑھوں کا بھی دل بہل جاتا ہے۔

ج: پیاری صابرہ! ماہ و سال سے عمر کا حساب لگا سکتے ہیں لیکن جوانی یا بڑھاپے کا نہیں۔ لگتا ہے کہ آپ نے بڑھاپے کے احساس کو اپنے اوپر زیادہ ہی طاری کر لیا ہے۔ ہمت سے کام لیں اور کھڑی ہو جائیں۔ بستر تو رات کو سونے کے لیے ہے۔ دن میں اس کا کیا کام۔ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں اور لوگوں سے میل ملاقات میں وقت گزاریں۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ تہہ دل سے ممنون ہیں کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔

شبنم حنیف......لاہور

سرورق پیارا تھا۔ حسب معمول سب سے پہلے ''دشت جنوں'' پڑھا۔ اس قسط میں آمنہ ریاض ایک نیا موڑ لے کر آئی ہیں۔ ناظمہ زیدی کے افسانے ''سوہنے پروہنے'' نے بہت متاثر کیا۔ ہمارے نام میں جویریہ مریم کا خط زیادہ اچھا لگا۔ ہم لوگ بھی جب لائٹ چلی جاتی تو رضائی میں ٹارچ کی روشنی سے کہانی مکمل کرتے تھے۔ اور امی کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے کتابوں میں رسالے چھپا کر پڑھتے تھے۔ انٹرویو میں عجب گل سے ملاقات اچھی رہی۔ خاتون کی ڈائری میں ارم کمال کی ڈائری سے اختر شیرانی کا احوال محبت زبردست تھا۔ میری بیاض سے میں حفظہ وقاص کا شعر پسند آیا۔ آپی سمیرا حمید سے قسط وار ناول لکھوائیں نا۔ ان کے گزشتہ ناول ''یارم''۔ ''محبت من محرم'' میرے فیورٹ ہیں۔

ج: پیاری شبنم! آپ نے اس بار جلدی خط لکھا اس لیے شامل اشاعت ہے۔ تمام سلسلوں پر تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ سمیرا حمید تھوڑی سی مصروف ہیں۔ لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد قارئین کے لیے ناول لکھیں گی۔

ہنیہ نور......راولپنڈی

8 جنوری، 2018ء کے خواتین میں ماہ دولت کا خط چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ باجی! یقین کریں ''ڈونلڈ ٹرمپ'' کو امریکا کا صدر منتخب ہوئے پر اور نواز شریف کے نااہل ہونے پر عمران خان کو بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی ہو گی جتنی مجھے اپنا خط چھپنے کی ہوئی......

ثمرہ جی کیسے لکھ لیتی ہیں اتنی جامع تحریریں...... بہت،

بہت، بہت بڑا والا شکریہ اس قدر اچھا ناول ہمارے لیے لکھنے پر...... باجی کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ نمرہ احمد کی عمر کیا ہے؟

"دشت جنوں" آمنہ جی شاباش زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتی یہ کہانی خدا جانے کس موڑ پر رکے گی......

"حسن المآب" سائرہ رضا اس قدر جامع تحریر لکھنے پر مبارک باد قبول کیجیے۔

"اسے ہم فرض کرتے ہیں" صدف نثار بہت اعلیٰ ابراہیم کا کردار بہت پسند آیا۔ ناولٹ "چلو اک بار پھر" یمنیٰ اختر اور "اپنا پن" سرور فاطمہ بہت اچھے تھے۔ افسانے سارے بہت بہت اچھے تھے مگر "پردے کے پیچھے" قانتہ رابعہ اور "سوہنے پروہنے" رائٹر کا نام سمجھ میں نہیں آیا بہت ہی زیادہ پسند آئے۔ خط سب کے اچھے تھے۔

محمد علی جوش سے مل کر اچھا لگا۔ عجب گل سے ملاقات بھی اچھی رہی۔

ج: پیاری ہنیہ نور! تو اپزا کی ترکیب دی جا چکی ہے۔ آپ کی فرمائش پر دوبارہ شائع کر دی جائے گی۔ تھوڑا انتظار کریں۔

نمرہ احمد کی عمر اگر سالوں کے پیمانے سے دیکھا جائے تو وہ ابھی بہت کم عمر ہیں لیکن تحریر کی پختگی اور ان کا مشاہدہ اور مطالعہ ان کی عمر سے بہت زیادہ ہے۔

شازیہ ستار......ڈیرہ غازی خان

میٹرک میں تھے تو تب آپ کو خط اور دیگر سلسلے بھیجتے رہتے تھے جو فوراً آپ کی نظر کرم سے چھپ جاتے تھے۔ پھر میٹرک کے بعد شادی ہو گئی بالکل مختلف حالات پیدا ہوئے۔ ان میں اتنا کھوئے کہ دوبارہ قلم اٹھانے کی جرات ہی پیدا نہیں ہوئی۔ اب کتنے ہی کردار صفحہ قرطاس پر مچلنے کو تیار ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی کی منتظر ہوں۔ آپ نے اتنے اچھے قلم کار پیدا کیے ہیں، یقین کریں اگر ہمارے پاکستان میں اصلی انصاف ملنے لگے تو ادب کی دنیا میں کچھ مصنفات بہت بڑے ایوارڈ کی حقدار بن جائیں گی۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، سمیرا حمید، سائرہ رضا، ایسی قلم کار ہیں جو ذہنوں سے لے کر ضمیر تک جھنجوڑ دیتی ہیں۔

پچھلے ماہ دسمبر میں چھپا افسانہ "چار بیٹوں کی ماں" ایسا ذہن پہ چھایا ہے کہ سب کو سناتی پھر رہی ہوں۔ ہماری معاشرتی بے حسی کی فل عکاسی کر رہا ہے۔ آپ سے ایک شکایت کرنی ہے جی، ہم پنجاب کے جنوبی شہر ڈی۔ جی۔ خان میں رہتے ہیں میری بھابھی بالکل ینگ ——— ہیں تین چھوٹے بچے ہیں ان کے گردے ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے دونوں فیل ہو گئے ہیں۔ تو اسی سلسلے میں بھائی بھابھی لوگ کراچی آئے۔ نہ پوچھیں ان کے ساتھ کیا حال ہوا؟

ج: پیاری شازیہ! اللہ تعالیٰ آپ کی بھابھی کو صحت دے۔ ان کے ساتھ کراچی میں جو کچھ ہوا، اسے جان کر بہت افسوس ہوا۔ کراچی میں پچھلے دو ڈھائی عشروں میں بدترین حالات رہے ہیں۔ قتل و غارت، ڈاکہ زنی اور بھتہ خوری عام تھی۔ اب موجودہ حکومت کے دور میں کافی بہتری آئی ہے۔ قتل و غارت میں بھی کمی ہوئی ہے۔ اگر جمہوریت رہی تو ان شاءاللہ مزید بہتری آئے گی۔

آپ ضرور لکھیں۔ ہمارا تعاون حاضر ہے۔ اگر قابل اشاعت ہوا تو جگہ پانے میں دیر نہیں لگے گی۔

اقراء الیاس......مرید کے ضلع شیخوپورہ

تینوں شمارے اگر ایک ہی تاریخ کو مل جائیں تو بندہ بازار کے اتنے چکر لگانے سے بچ سکتا ہے۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا مجھے تو کسی بھی انسان کے چہرے کی خوب صورتی اس کے چہرے پر پھیلی نرم سی مسکراہٹ ہی لگتی ہے۔ "محبتیں گلاب اور جگنو" بہت سی قارئین کے ذہنوں کے بند دریچوں میں چھپے الفاظ، راز، جذبات اور سب سے بڑھ کر احساسات کو کھل کر بیان کرنے کا ایک سنہری پیام لگا۔

مسرت الطاف احمد کو پڑھ کر ہلکا سا حیرت کا جھٹکا لگا منفرد اور جامع انداز بیان پر وہ مجھے میریڈ لگی تھیں۔ میری طرح شعبہ تدریس سے تعلق رکھنے والی، اگر انہیں میری بات تھوڑی بہت بری لگی تو معذرت خواہ ہوں۔ ناولز اور افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ پلیز آمنہ ریاض صاحبہ جلدی جلدی آیوشمتی کے بارے میں بتا دیں۔ قانتہ رابعہ "پردے کے پیچھے" چھپی حقیقتوں کو دیکھنے کے بعد مسکرانے اور سوچنے پر مجبور کر گئی۔ "چلو اک بار پھر" یمنیٰ اختر کا نام پہلی بار دیکھا بدگمانیاں تو لمحوں میں چھوٹ جاتی ہیں مگر رشتے بنانا مشکل۔ "حالم" یہاں آ کر چلتا قلم خود بخود رک سا جاتا ہے کیا لکھیں؟ نمرہ احمد کی تعریف میں "حالم" ایک قسط نہ پڑھنے کی بنا پر سمجھ ہی نہیں پا رہی وہ تینوں جنگل میں کیسے پہنچ گئے۔ سائرہ رضا جتنی بھی تعریف کروں

کم ہر ایک کردار کے ساتھ انصاف سرور فاطمہ آپ کی ہمت کو سلام۔ ہیروئن سے مرغی ذبح کروالی اور پھر بکرے کی بھی باری لانے والی تھیں۔ فاطمہ زیدی کے ساتھ میں بھی یہی کہوں گی "اک شمع روشن کرنی ہے"۔ "اسے ہم فرض کرتے ہیں" دونوں اقساط اکٹھی پڑھ کر کچھ کہہ سکوں گی۔

ج: پیاری اقرا! ہم خلاصہ اسی لیے دیتے ہیں کہ قارئین اگر کوئی قسط نہ پڑھ سکیں تو انہیں کہانی سمجھنے میں دشواری نہ ہو، آپ خلاصہ پڑھ لیں' آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ وہ فاتح کے گھر میں راستہ پا کر خزانہ ڈھونڈنے نکلے تھے۔ ایک دروازے کے ذریعے ماضی میں پہنچ گئے ہیں۔

مہر گل......اٹک

اب تک ہماری تیسری نسل آپ کی خاموش قاری تھی لیکن اس تیسری نسل کو یہ خاموشی گراں گزری اور اس نے خاموشی کو توڑنے کے لیے کاغذ قلم تھام لیا ہے۔

ہم لوگوں نے اپنی پیدائش سے پہلے کے بھی رسالے پڑھے ہیں ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ڈائجسٹ بھی پڑھتے ہیں۔

ہمارے بڑوں نے کبھی بھی ہمیں رسالے پڑھنے سے منع نہیں کیا۔ ہمارے ابو کا یہ واقعہ پڑھیں تو آپ خود سمجھ جائیں گی کہ ہمارے والدین ہمیں کیسے سپورٹ کرتے ہیں۔

جب میری نظر کم ہو گئی تھی اور مجھے ڈاکٹر نے زیادہ پڑھنے سے منع کیا تھا تو امی نے میرے ڈائجسٹ پڑھنے پر پابندی لگا دی تھی تو ابو امی سے چھپ کر مجھے ڈائجسٹ لا کر دیتے تھے اور کہتے روز اور ہر وقت نہ پڑھنا' بس کسی کسی وقت پڑھ لیا کرنا۔ اب ابو بیرون ملک ہوتے ہیں تو بھائی لا کے دیتا ہے۔ میری امی شادی سے پہلے کی مسلسل قاریہ ہیں اور میری امی کی شادی 1992ء میں ہوئی تھی تو خود سوچ لیں کہ آپ کی کتنی پرانی قاریہ آپ سے مخاطب ہے۔ ہماری امی کا کہنا ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے سے بچیوں کو نہ روکا جائے۔ یہ بچیوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" سے دل کو منور کیا اور پھر چھلانگ لگائی۔ اپنے فیورٹ "حالم" پہ لیکن اس بار یہ کیا کیا؟ اگر ایسے ہوتا ہے تو ہم تو بھی اپنے بچپن میں جانا چاہیں گے۔

"دشت جنوں" بھی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ سائرہ رضا کے "حسن المآب" نے تو سحر زدہ کر لیا۔

"اسے ہم فرض کرتے ہیں" میں ثمن کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے اور یہ ان کی خالہ کیوں ہر وقت ان کے گھر میں پائی جاتی ہیں۔

"چلو اک بار پھر سے" بھی زبردست کہانی تھی۔

"اپنا پن" میں ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی ایک عورت کوئی جانور بغیر کسی مجبوری کے ذبح نہیں کر سکتی۔ لیکن ایک تو شمع نے ایک بے زبان جانور پر ظلم کیا' دوسرا وہ اسے دکاندار کے پاس لے جا سکتی تھی لیکن اس نے خود ہی اسے ذبح کر لیا کیوں؟

افسانوں میں ایمل رضا کا "شکر" ٹاپ آف دی لسٹ رہا۔ قانتہ رابعہ کا "پردے کے پیچھے" بھی زبردست رہا۔ چونکہ ہم بھی پٹھان ہیں تو جب عجب گل نے پٹھانوں کے بارے میں کھرا سچ کہا تو ہمیں بہت اچھا لگا۔

ج: پیاری گل! آپ کس زمانے کی بات کر رہی ہیں' عورتیں بڑے بڑے کام انجام دیتی رہی ہیں۔ کیا آپ نے نہیں پڑھا کہ عورتیں جہاد میں بھی حصہ لیتی رہی ہیں۔ کفار سے مقابلہ کرتی رہی ہیں۔ کچھ صحابیات زخمیوں کو پانی پلانے کا فریضہ انجام دیتی تھیں لیکن بہت سی خواتین نے باقاعدہ لڑائی میں حصہ لیا ہے تو ایک مرغی ذبح کرنا کون سا بڑا کام ہے۔ قصائی تک لے جاتے جاتے مرغی صاحبہ فوت ہو جاتیں تو ان کا گوشت حرام ہو جاتا اس لیے فوری طور پر حلال ہونا ضروری تھا۔

ثمینہ اکرم......بہار کالونی، کراچی

جنوری کا خواتین اپنے وقت پر ملا۔ اس دفعہ میں نے خواتین بیک سائیڈ سے شروع کیا۔ لہٰذا تبصرہ بھی اسی ترتیب سے کروں گی۔ "نفسیاتی وازدواجی الجھنیں" میں قاری لڑکی "ع" کا خط پڑھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوئی۔ کس قدر ڈھٹائی سے اپنی والدہ کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ پھر اپنی حرکتیں بیان کرتے ہوئے بھی

نہ جھجک اور نہ شرم' اس پر ستم یہ کہ محترمہ قرآن پاک ترجمہ و تفسیر سے پڑھی ہوئی ہیں۔ عدنان بھائی نے تو بہت ہلکا ہاتھ رکھا' نرمی سے جواب دیا۔ اگر عدنان بھائی کی جگہ میں ہوتی تو ایسا جواب دیتی کہ دن میں تارے نظر آ جاتے۔

ناظمہ زیدی کے قلم میں بھی نکھار آتا جا رہا ہے "سوہنے پروہنے" سادہ سا اچھا افسانہ لگا۔ سچ ہے کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

"دشت جنوں" اس ماہ کی قسط نے کچھ دل میں جگہ بنالی ہے، کیف زرگل اور یاسر تینوں دوستوں کے ایڈونچر کی وجہ سے کہانی میں کچھ نیا پن آیا ہے۔ "محبتیں گلاب اور جگنو" نئے سال کا سروے میں سب کے جوابات اچھے لگے۔ اپنی کمی بہت محسوس ہوئی۔ (میں اپنی ذاتی مصروفیات کی بنا پر سروے میں شامل نہیں ہو سکی تھی) قانتہ رابعہ کے قلم کا ڈنکا ہر سو بجتا ہے ان کی کوئی تحریر ہو اور دل پر اثر نہ کر سکے یہ تو ناممکن ہے۔ "پردے کے پیچھے کیا ہے" ایک بہترین کہانی۔ بہترین پیغام۔ ایمل رضا کا افسانہ "شکر" تو سب افسانوں پر بازی لے گیا۔ جو شکر گزار ہوتا ہے۔ اللہ اسی پر مہربان ہوتا ہے۔ "حسن المآب" کی آخری قسط کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ابھی تو ناول پڑھنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ کہ یہ ختم بھی ہو گیا

ج: پیاری ثمینہ! حسب روایت تبصرہ بہت خوب ہے۔ نفسیات میں بہن "ع" کے خط کے متعلق آپ نے جو لکھا وہ درست سہی لیکن اتنی سخت باتیں مناسب نہیں اسی لیے ہم وہ شائع نہیں کر رہے ہیں۔ تعلیم اپنی جگہ لیکن تربیت کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ پھر ماحول کے اثرات ہوتے ہیں۔ ماں ہی بھٹکی ہوئی ہو تو وہ بچوں کو سیدھی راہ کیسے دکھائے گی پھر بڑے ہو کر اس بہن نے جو ماحول دیکھا، اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ غلطیوں پر مطعون کرنے، ملامت کرنے کے بجائے سمجھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سیدھی راہ دکھائے۔ آمین۔

مسرت الطاف احمد...... کراچی

ماڈل گرل کا انداز کچھ خاص نہیں بھایا۔ "دشت جنوں" کی یہ اپی سوڈ انٹرسٹنگ تھی "حالم" کی قسط نے جو پلٹا کھایا بلاشبہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن دلچسپ ہے۔ ایڈم اور تالیہ کی کھٹی میٹھی نوک جھونک بہت مزہ دے گئی۔ "اپناپن" شمع اور سیما کی گیدرنگ زبردست تھی۔ خاص طور پر سیما کی ایکٹنگ تو لاجواب تھی' تحریر ہلکی پھلکی مسکراہٹ لبوں پر لے آئی۔ "اسے ہم فرض کرتے" یہ تحریر فلمی اسٹوری جیسی تھی۔ اینڈ میں تو جھول ہی جھول محسوس ہوا "حسن المآب" لاسٹ اپی سوڈ نے تو دھمال کر دیا۔ حسنل کی ہٹ دھرمی نے شاکڈ کر دیا۔ موسیٰ کا فیصلہ آؤٹ اسٹینڈنگ تھا۔ لاسٹ اپی سوڈ تمام اقساط کا نچوڑ تھی۔ "چلو ایک بار پھر" مائنڈ بلوئنگ تحریر تھی' سچ میں مزا آ گیا۔ تھیم سپرڈوپر تھا۔ کردار نگاری زبردست تھی ڈائیلاگز تھیم اور یکتا کے ماضی کی خوشگوار یادوں کو یاد کر کے، ان کی کھٹی میٹھی نوک جھونک بہت مزہ دے گئی۔

ج: پیاری مسرت! "اسے ہم فرض کرتے ہیں" کا اختتام تو ابھی ہوا ہی نہیں پہلے اس کا اختتام پڑھ لیں پھر اپنی رائے دیں۔

ہادیہ خاتون، حمنہ خاتون...... بھاول نگر

خواتین اور شعاع سے ہمارا رشتہ کافی پرانا ہے۔ آج ہم آپ کو اپنے غم میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ چھ ماہ کے وقفہ سے ہماری دو مائیں ہمیں یتیم کر گئیں۔ ہماری امی جون 10 بمطابق 14 رمضان المبارک کو اور ہماری خالہ جان جو کہ ہماری ساس اور چچی ہیں۔ 27 دسمبر کو جب کہ بھائی کی شادی میں صرف دو دن باقی تھے' رحلت فرما گئیں اور ہمارے اکلوتے بھائی کی خوشی دونوں ماؤں کو نصیب نہ ہوئی۔ سات بہنوں کا ایک ہی بھائی اور والد صاحب بھی چار سال پہلے داغ مفارقت دے گئے۔

ج: ہادیہ اور حمنہ! ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور ہمیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دونوں ماؤں کی مغفرت فرمائے۔ اور آپ کے بھائی کو زندگی کی خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

☆

خبریں و بریں

واصفہ سہیل

لی جنڈ

لی جنڈ کرکٹر سعید اجمل کو پی سی بی کی جانب سے انوکھا الوداعیہ دیا گیا ہے۔ پی سی بی نے ریٹائر ہونے والے اس کھلاڑی کا ڈوپ ٹیسٹ لے لیا۔ (کیوں......؟) سابق ورلڈ کلاس اسپنر ڈوپ ٹیسٹ کے لیے پی سی بی کی جانب سے اپنا نام آنے پر حیران رہ گئے۔ (پی سی بی جو نہ کرے وہ کم ہے۔) کئی سابق کھلاڑیوں نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ سعید اجمل کو الوداعی پارٹی دینے کے بجائے یہ منفی رویہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ (جی سابق کھلاڑی ہی تنقید کر سکتے تھے‘ موجودہ بے چارے تو اپنے کیریر کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور ہیں۔) ایک انتہائی بہترین کھلاڑی پر آئی سی سی نے اعتراض کیا اور پی سی بی نے اپنے کھلاڑی کا دفاع کرنے کے بجائے ہمیشہ آئی سی سی کی حمایت کی۔ جب کہ دوسرے ممالک خاص طور پر پڑوسی ملک ہمیشہ آئی سی سی کے سامنے اپنے





عہد ساز

منو بھائی راہی ملک عدم ہوئے۔ عام طور پر لوگ انہیں ڈراما نگار کے طور پر جانتے ہیں۔ جن کے کریڈٹ پر بے شمار مشہور ڈرامے ہیں جن میں ”دشت“۔ ”سونا چاندی“ اور ”جھوک سیال“ وغیرہ شامل ہیں۔

زندگی سمجھنے اور زندگی سے پیار کرنے والے منو بھائی کبھی پچھتاوے کا شکار نظر آئے نہ حالات سے پژمردہ۔ روشن امیدی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

منو بھائی مجسم صحافت اور مجسم انسانیت تھے۔ صحافت و ادب کے ہر شعبے پر ان کی مکمل دسترس تھی۔ خبر بنانے سے لے کر اداریہ لکھنے اور فیچر سے کالم لکھنے تک ہر صنف پر انہیں مکمل عبور تھا۔ مگر اس سب سے بڑھ کر وہ اپنی درویش صفت طبیعت اور صبر و قناعت کی وجہ سے آئیڈیل انسان تھے۔

کھلاڑیوں کو سپورٹ کرتا ہے۔

خود اعتمادی

ٹی وی اداکارہ عروبہ مرزا کہتی ہیں کہ ”مجھے اب تک فلموں سے کوئی آفر نہیں آئی۔(افسوس ہوا......کیا؟) اگر آتی تو بھی شاید ہی میں فلموں میں کام کروں (کیوں......؟) پہلی وجہ گھر سے اجازت نہیں ملے گی (تو ٹی وی ڈراموں میں کام کی اجازت کیسے مل گئی......؟) اور دوسرا یہ کہ ——— میں رومانٹک اسٹوری والی فلموں میں کام نہیں کر سکتی۔(ہیں......؟؟؟ مطلب ڈراموں میں......؟ اور فلموں میں......؟) ہاں اگر مجھے بہترین اسکرپٹ کی آفرز ہوئیں جس میں کوئی سبق (کس کے لیے......؟) یا معاشرے کی بہتری کے لیے میرے لائق کردار ہوا تو شاید (یعنی ابھی بھی شاید......؟) میرے گھر سے مجھے اجازت بہ آسانی مل جائے۔ (اب وہ اصلاحی معاشرتی فلمیں کہاں بن رہی ہیں جو......) عروبہ کا کہنا ہے کہ ڈراموں میں کام کرنے کا اپنا ہی ایک مزا ہے۔ مگر میں ہمیشہ ہی معیاری کام کرتے رہنا چاہتی ہوں۔ میرا اپنا منفرد اسٹائل ہے۔ (آہم......سو تو ہے)۔ عروبہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں اداکارہ بن گئیں۔(ویسے آج کل تو اداکار نہیں بھئی ڈاکٹر بھی اچھے اداکار ہیں۔)

ہنگامہ

میرا کو تو خبروں میں رہنے کا فن آتا ہے۔ مگر یہ اداکارہ لیلیٰ کو کیا ہو گیا کہ انہوں نے خبروں میں آنے کے لیے انتہائی برا طریقہ اپنا لیا۔ فلمیں تو اب ٹی وی اداکاروں کے ساتھ بن رہی ہیں تو لیلیٰ کی وہاں سے تو چھٹی ہو ہی گئی۔ اب لیلیٰ مارننگ شوز میں آ رہی تھیں مگر کب تک......تو فلم کے حوالے سے ہونے والی ایک تقریب میں لیلیٰ نے روتے ہوئے میرا کے متعلق کہا کہ، اداکارا میرا نے میرا کیریر تباہ کر دیا۔(اپنا تو بچا نہ سکیں آپ کا کیا تباہ کرتیں لیلیٰ!) میرا نے میری زیرو میٹر گاڑی چھین لی۔(کیا خواب میں......؟)



میرا بوائے فرینڈ بھی چھین لیا۔(اوہ......! کچھ عرصہ پہلے ایک ٹی وی شو میں لیلیٰ، میرا کے بھائی احسن کے ساتھ شادی کی رسمیں کر رہی تھیں تو کہیں......؟) اور تو اور مجھ سے پینتیس لاکھ روپے ادھار لیے ہیں، وہ بھی واپس نہیں کر رہی۔ (ادھار محبت کی قینچی ہے لیلیٰ!) میں اب خاموش نہیں رہوں گی (بلکہ شور و ہنگامہ کروں گی......بھئی خبروں میں رہنے کے لیے) لیلیٰ نے مزید کہا کہ ”ان کے خلاف ایک مافیا کام کر رہی ہیں (میرا مافیا......؟) مجھے کام نہیں دیا جاتا۔“ (تو میرا کو کون سا کام مل رہا ہے......)۔

☆☆☆

ادھر ادھر سے

☆ ان دنوں ملک میں ”دانشور“ زیادہ ہیں اور لومڑ کم۔ ٹیلی ویژن پر جتنے بھی لومڑ نمودار ہوتے ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ دانشور جلوہ افروز ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر سیاسی تجزیہ نگار، دو نمبر کالم نگار، ریٹائرڈ فوجی ادیب یہاں تک کہ شاعروں کے تعارف میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کے مشہور دانشور ہیں۔

(مستنصر حسین تارڑ......کاروان سرائے)

☆

آپ کا باورچی خانہ

عظمیٰ ناصر

نام کے لحاظ سے تو میں اس سلسلے میں حصہ لینے کی حقدار نہیں کیونکہ میرا اپنا باورچی خانہ نہیں ہے۔ ہاں مگر باورچی خانے سے میرا تعلق دن رات کا ہے اور میرا تعارف ہے۔ ایک جوائنٹ فیملی کی بہو۔

یہ سب لکھنا میں نے اس لیے ضروری سمجھا کہ اس سلسلے میں آنے والی ہر خاتون اپنے طور پر ایک مثالی کچن کا خاکہ پیش کرتی نظر آتی ہیں مگر یہاں بہت سی ایسی بھی خواتین ہیں جو اس سلسلے میں حصہ لینے کے لیے (اپنا الگ باورچی خانہ جہاں وہ من مرضی سے کام کریں، اس کو سجائیں بنائیں) طویل عرصے سے خواب دیکھ رہی ہیں۔ اللہ ان کے خواب کو پورا کرے۔ (آمین)

س: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: بات شادی شدہ زندگی سے پہلے پوچھی جاتی تو میں فٹ سے جواب دیتی "موڈ" کا مگر یہاں پر اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کھانا سب سے بہتر شکل اور ذائقے کے ساتھ تیار ہو اور بغیر کسی مین میکھ کے کھالیا جائے۔

س: کھانے کا وقت ہے۔ اچانک مہمان آجائیں، کسی ایسی ڈش کی ترکیب جو فوری تیار کی جا سکے؟

ج: ویسے تو ہمارے کوئی ایسے مہمان نہیں اور اگر بالفرض کبھی ایسا ہو بھی جائے تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ساس کیا کہتی ہیں۔ اگر گرین سگنل آجائے تو چکن کڑاہی اور بگھارے چاول جیسی ڈش جلدی اور آسانی سے بن جاتی ہے اور ہر کوئی پکانا جانتا ہے۔

س: کچن عورت کے سلیقے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج: یہ سچ ہے کہ کسی بھی عورت کا سلیقہ اس کے کچن سے ظاہر ہوتا ہے مگر آپ چاہے کتنی ہی تربیت اپنے میکے سے لے کر آجائیں یا آپ مزاجاً جتنی بھی نفاست پسند اور ستھرے مزاج کی ہوں۔ شادی کے بعد زیرو سے شروعات کرتے ہیں۔ آپ وہاں پر ہمارے یہاں تو ایسا...... ہمارے یہاں تو ویسا کر کے ماحول خراب تو کر سکتے ہیں مگر میرا انہیں خیال نئی آنے والی کو اتنا مارجن دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق سسرال والوں کو چلائے۔ یہاں سب کچھ نئے سرے سے شروع ہوتا ہے اور یہاں آپ ایفی شنسی جھاڑنے کے لیے کتنا ہی باورچی خانہ کو چکن کر لیں۔ جب دوسرا فرد آ کر اس کا ستیاناس مار دے تو سگھڑاپے کا جوش صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور اگر اسی طرح معاملات آٹھ دس سال پر محیط ہو جائیں تو صابن کے پانی سے بو بھی آنے لگتی ہے۔

س: صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں۔ کوئی خصوصی ڈش؟

ج: ہمارے یہاں چائے پینے کا رواج ہے میں اور میری ساس سلائس یا پاپوں کے ساتھ لیتے ہیں، باقی سب کام پر جانے والے لوگ ہیں۔ ہاں ہفتہ اتوار جب سب گھر پر موجود ہوں تو آلو کے پراٹھے یا آلو کی سبزی اور پراٹھے، روٹی کا اہتمام ہو جاتا ہے۔

س: مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج: بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد اب باہر جانا۔ گھومنا پھرنا زیادہ ہو گیا ہے۔ ویک اینڈ پر اکثر نکلنا ہوتا ہے بچوں کے بہانے۔

س: کھانے کے انتخاب میں موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: یہ سوال بھی میری دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھنے کے مترادف ہے۔ ڈش کا انتخاب ہی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ موسم تو پھر دل سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہاں آپ پوچھ پوچھ کر ہی کھانا بنا سکتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے چنا چاٹ (جو میں اکیلی شوق سے کھاتی ہوں یہاں پر) کے لیے چنے اپنی مرضی سے بوائل کر لیے۔ اب ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ یہ کہا جاتا کہ

بوائل جس مقصد کے لیے کیے ہیں وہی بنا لو مگر کہا گیا، آدھے رکھ دو۔ آدھے کا سالن بنا ڈالو اور ہم کو جو گھٹی میں خاموشی کا نسخہ کیمیا پلایا گیا ہے تو چوں نہ کی اور بنا ڈالا سالن......اور مزے کی بات، ظالم بنا بھی بہت مزے دار تھا۔

س: کھانے میں محنت کی کتنی قائل؟

ج: کھانا پکاتے ہوئے محنت، قسمت اور دعا سب کی قائل ہوں مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قسمت میں ایسا پکانے کو ملتا ہے جس کو ریجیکٹڈ کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً کئی دنوں کی سبزیاں کٹ کے فریز کی ہوئی ہوں یا صومالیہ کی مرغی کی طرح صرف ہڈیاں، گردن یعنی پنجر کیونکہ گوشت کسی اور شوق کی نذر ہو گیا ہو تو پکانے کا دل کتنا چاہے گا، آپ سب سمجھ سکتے ہیں مگر پھر بھی پکا کر رکھ دیا جائے اور اس پر محنت بھی بہت کر لی جائے تو ذائقہ کے شہنشاہ لوگوں کو ایسی چیزیں پسند کہاں آئیں گی۔

ٹپ

جب لوگ اپنے سلیقے کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں تو میں دل و جان سے مانتی ہوں کہ وہ واقعی سگھڑ ہیں مگر وہ کچن جو اچھی حالت میں نہ نظر آئیں۔ ان خاتون خانہ کو بھی چھوٹتے ساتھ پھوہڑ کا خطاب مت دیں۔

بات اقتدار کی ہے۔ شاید میں بھی چند سالوں میں ایک الگ انداز سے یہ سب لکھوں ......امید پر دنیا قائم ہے۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

اسپیگھٹی بالز

ضروری اشیاء:۔

اسپیگھٹی (ابال لیں)	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
اخروٹ	ایک چوتھائی کپ
پیاز (چوپ کرلیں)	دو عدد
جو کا دلیہ	آدھا کپ
پارسلے (چوپ کرلیں)	دو کھانے کے چمچے
تلسی کے پتے (خشک)	ایک چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
تھائم پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
مکئی کے دانے (ابلے ہوئے)	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
ٹماٹو ساس	ایک کپ

ترکیب:۔ پیالے میں اسپیگھٹی پسے ہوئے، اخروٹ، پیاز، دلیہ، ٹماٹو ساس، پارسلے، نمک، تلسی کے پتے، لہسن پیسٹ، تھائم پاؤڈر، سویا ساس اور مکئی کے دانے ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔ اس سے چھوٹی گولیاں بنالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور درمیانی آنچ پر یہ بالز تل لیں۔ جب سنہری اور کرسپی ہوجائیں تو نکال لیں۔ سرونگ ٹرے میں رکھ کر پاستا یا ڈبل روٹی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

دیگچی چکن قورمہ

ضروری اشیاء:۔

مرغی کا گوشت	ایک کلو
پیاز	تین عدد
دہی	ایک کپ
لہسن، ادرک	تین چائے کے چمچے
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ثابت کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
لونگیں	بارہ عدد
دارچینی	تین ٹکڑے
چھوٹی الائچی	چھ عدد
بڑی الائچی	پانچ عدد
سفید زیرہ	دو چائے کے چمچے
جائفل	آدھا ٹکڑا
جاوتری	1/3 چائے کا چمچہ
بادیان کے پھول	تین عدد
ایسنس	چند قطرے
دودھ	ایک کپ
چاروں مغز	دو چائے کے چمچے
ناریل پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
گھی	ایک کپ

ترکیب:۔ جائفل جاوتری، بادیان کے پھول، بڑی الائچی کے دانے اور چھوٹی الائچی پیس لیں۔

پین میں گھی گرم کرکے پیاز تل کے سنہرا کرکے نکال لیں۔ اس گھی میں چکن، لہسن، ادرک پسا ہوا، لال مرچ، دھنیا، ہلدی، نمک، زیرہ پسا ہوا، ایک چائے کا چمچہ، ثابت لونگیں، سیاہ مرچ، دارچینی 6 عدد، چھوٹی الائچی ڈالیں۔ دہی پھینٹ کر ڈالیں اور آدھا کپ پانی چکن گلنے کے لیے ڈالیں اور پکنے دیں۔

تلی ہوئی پیاز کوٹ لیں۔ اس میں ایک چائے

کا چمچہ زیرہ، ناریل پاؤڈر، چاروں مغز پیس کر ڈالیں اور سب چیزیں مکس کریں۔ جب اچھی طرح مکس ہو جائے تو اس میں جائفل، جاوتری والا پسا مسالا آدھی مقدار میں ڈالیں اور مکس کریں۔

جب ڈھکن میں پانی ختم ہو جائے تو تیز آنچ کر کے اس کو بھون لیں اور بھونتے وقت تلی ہوئی پیاز میں ملائے مسالاجات ڈالیں، اچھی طرح مکس کریں۔ اس کے بعد دودھ ڈالیں اور مکس کر کے دم پر لگا دیں۔ آخر میں قورمہ تیار ہونے پر جائفل، جاوتری کا بقیہ مسالا اور باریک کٹی ادرک اور چند قطرے ایسنس کے ڈالیں ڈھکن ڈھک دیں، 10 منٹ بعد دودھ والے نان اور تافتان کے ساتھ پیش کریں۔ چاروں مغز نہ ملیں تو کوئی حرج نہیں۔

چکن کے ساتھ یلو رائس

ضروری اشیاء

مرغی کا گوشت (بغیر ہڈی)	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
تیل	تین کھانے کے چمچے
پیاز (بڑے کیوبز کاٹ لیں)	دو کپ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
لہسن (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:۔ گوشت میں، نمک، لہسن، ادرک پیسٹ، مسٹرڈ پیسٹ، سیاہ مرچ پاؤڈر، زیرہ اور ایک کھانے کا چمچہ تیل لگا کر رکھ دیں۔ ایک برتن میں تیل گرم کر کے اس میں لہسن تل لیں۔ ہلدی اور نمک ڈال کر ہلکا سا بھونیں اور چاول شامل کر کے مکس کر دیں اور 3 منٹ تک دم پر رکھیں۔

مسالا لگا کر رکھے ہوئے گوشت کو سیخوں (اسکیور) پر لگائیں۔ پہلے پیاز اس کے بعد گوشت اس کے بعد دوبارہ پیاز لگائیں، اسی طرح ساری سیخیں تیار کر لیں اور باربی کیو کر لیں یا ساس پین میں تیل گرم کر کے تمام تل لیں اور یلو رائس کے ساتھ پیش کریں۔

جیلی ڈیلائیٹ

ضروری اشیا:۔

دودھ	دو گلاس
اسٹرابیری کسٹرڈ	ڈھائی کھانے کا چمچہ
چینی	دو کھانے کے چمچے
گرین جیلی	ایک پیکٹ
کریم	حسب ضرورت
سیب، کیلے،	حسب پسند
ویفر	سجاوٹ کے لیے

ترکیب:۔ پیکٹ پہ دی گئی ہدایت کے مطابق جیلی تیار کر لیں اور سرونگ گلاس میں ڈال کر جما دیں۔ دیگچی میں دودھ گرم کر کے اس میں چینی اور پانی یا دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر گھول کر شامل کر دیں اور گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے پر سیب اور کیلے شامل کر دیں۔ سرونگ گلاس میں جمی ہوئی جیلی پر پہلے کریم کی تہہ لگائیں۔ اس کے بعد کسٹرڈ ڈال دیں۔ جیلی اور کریم سے گارنش کر کے ٹھنڈا کر کے ویفر کے ساتھ پیش کریں۔

افسانہ

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

شبنم۔ راولپنڈی

میرا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے۔ ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ بھائی بڑے ہیں' مجھ سے بڑی بہن کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک بہن چھوٹی ہے وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ میں بی اے کے بعد فارغ تھی' سوچا کوئی جاب کرلوں۔ والدین شادی کرنا چاہتے تھے لیکن کہیں بات نہیں بن رہی تھی' عام سی شکل وصورت' درمیانے درجے کی تعلیم اور بھاری جہیز کا بھی امکان نہ ہو تو۔ ایسی صورت میں رشتہ ذرا مشکل سے ہی آتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسمارٹ تھی' پہننے اوڑھنے' بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ تھوڑے سے ردوکد کے بعد ابو نے جاب کی اجازت دے دی۔ میری دوست نے ایک جاب کا بتایا۔ آفس میں اسسٹنٹ کی جاب تھی۔

میں نے جا کر انٹرویو دیا' سلیکشن ہو گیا' ایکسپورٹ امپورٹ کی فرم تھی۔ فرم کے مالک عبداللہ صاحب خاصے عمر رسیدہ تھے' میرے ساتھ ہی نہیں' آفس کے تمام افراد کے ساتھ ان کا رویہ بہت مشفقانہ تھا۔ ایک دن میں ان کے کمرے میں گئی تو وہاں ایک صاحب بیٹھے تھے' عمر تیس بتیس سال ہو گی۔ جس چیز نے مجھے چونکایا وہ ان کی وجاہت تھی' دراز قد' کشادہ پیشانی اور روشن آنکھیں۔

تھوڑی دیر کے لیے میری نظریں ان پر جم سی گئیں' میرے اس طرح مبہوت ہونے پر وہ تھوڑا سا چونکے تو مجھے احساس ہوا' میں نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔ عبداللہ صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا' وہ عبداللہ صاحب کے بیٹے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چھٹیوں پر گئے ہوئے تھے۔ اب واپس آ گئے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ ہی کام کرنا ہوگا۔ مجھے یہ سن کر قدرے گھبراہٹ سی ہوئی لیکن بہرکیف کام تو کرنا ہی تھا۔

وہ بہت سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے۔ مجھے تو خیر وہ پہلی نظر میں ہی بہت اچھے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی دیگر خوبیاں بھی سامنے آئیں تو اور بھی گرویدہ ہو گئی۔ ان کا جھکاؤ اپنی طرف محسوس کیا تو میری پسندیدگی محبت میں بدل گئی۔ وہ شادی شدہ تھے' دو بچے بھی تھے' بیوی سے پسند سے شادی کی تھی بقول ان کے بیوی میں کوئی خرابی بھی نہیں تھی۔ بہت خیال رکھنے والی اور محبت کرنے والی بیوی تھی پھر ایک بار ان کے گھر کے فنکشن میں ملاقات بھی ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی' بے حد حسین اور خوش گفتار لڑکی تھی' اسے دیکھ کر مجھے اپنا آپ بہت معمولی سا لگا۔

میں ان سے کترانے لگی' انہوں نے میرے رویے میں تبدیلی محسوس کرلی۔ ایک دن سنجیدگی سے مجھے پرپوز کر دیا' مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ انہوں نے کہا' انہیں اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ ان کی پسند تھی اور آج بھی ہے لیکن محبت کا جو احساس وہ میری ذات میں محسوس کرتے ہیں۔ بیوی کے ساتھ انہیں کبھی نہیں محسوس ہوا' انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے برابر کے حقوق دیں گے لیکن اپنے خاندان میں جگہ نہیں دے سکیں گے کیونکہ بیوی ان کی ماموں زاد ہے۔ شادی کے بعد وہ مجھے علیحدہ گھر میں رکھیں گے اور فی الحال شادی کو ظاہر بھی نہیں کریں گے۔ کچھ عرصے بعد مناسب موقع پر سب کو بتا دیں گے۔

میں تو ان کی محبت میں پاگل تھی ہر بات پر راضی تھی لیکن جب گھر جا کر امی' ابو کو بتایا تو جیسے بھونچال آ گیا۔ وہ کسی صورت تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اول تو پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی ٹھیک نہیں ہے پھر خفیہ شادی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ابو کہتے ہیں کہ یہ شادی میرے لیے زندگی بھر کا پچھتاوا بن جائے گی۔ آپ مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ جب شریعت میں دوسری شادی کی اجازت ہے تو پھر وہ لوگ جو ہر بات میں شریعت کا حوالہ دیتے ہیں اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

ج: شریعت میں دوسری شادی کی اجازت تو ہے لیکن یہ شرط ہے کہ دونوں بیویوں کو برابر کے حقوق دیے جائیں۔ عام طور پر دو شادیاں کرنے والے دونوں بیویوں سے مساوی سلوک نہیں کرتے۔ پھر خفیہ شادی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ ان صاحب نے تو پہلے ہی کہہ دیا کہ وہ آپ کو اپنے خاندان میں کوئی جگہ نہیں دیں گے۔ آپ خود سوچیں کہ پھر آپ کا مقام کیا ہوگا۔ وہ شادی کر کے آپ کو کسی گھر یا فلیٹ میں آپ کو رکھیں گے۔ آپ کسی کے سامنے یہ نہیں کہہ سکیں گی، وہ آپ کے شوہر ہیں۔ جب آپ کو ان کی ضرورت ہوگی' وہ آپ کے پاس نہیں ہوں گے۔ اپنی بیوی سے بہانہ بنا کر چھپ چھپا کر آپ کے پاس آئیں گے۔ وہ بھی کچھ دیر کے لیے۔

یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ آپ سے سچی محبت کرتے ہیں تو بھی ان کی زندگی میں بیوی بچوں کی حیثیت مسلمہ ہے۔ بیوی سے محبت نہ سہی انسیت تو ہوگی اور پھر بچوں کی محبت سے تو انکار کیا ہی نہیں جاسکتا پلڑا اسی جانب جھکے گا۔ آپ ان کے خاندان میں وہ مقام کبھی حاصل نہیں کرسکیں گی جو اُن کی پہلی بیوی کا ہے کیونکہ وہ ان کی ماموں زاد ہے۔

ایک بات یاد رکھیں، جو مرد دوسری شادی کرتے ہیں' وہ اپنی پہلی بیوی کے لیے عزت و احترام کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے ایک احساس جرم بھی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے بچے جب ان کا احترام نہیں کرتے تو ان کو اپنی دوسری شادی پر پشیمانی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ پھر ان کے بیوی بچوں کی نفرت کا نشانہ بھی آپ ہوں گی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خفیہ شادی کر رہے ہیں تو خاموشی سے طلاق بھی دے سکتے ہیں تب آپ کہاں جائیں گی۔

بہتر یہ ہے کہ ہوش کے ناخن لیں' عشق' محبت' ڈراموں کی فلموں کی باتیں ہیں۔ ڈرامے چند اقساط پر مشتمل ہوتے ہیں اور فلم تین گھنٹے میں ختم ہوجاتی ہے جبکہ زندگی کا سفر کتنا طویل ہے آپ نہیں جانتیں۔ اپنی زندگی کو کھیل نہ بنائیں' زندگی میں محبت سے زیادہ قیمتی چیز عزت ہے۔ محبت کا رشتہ وہاں بنائیں جہاں آپ کا کوئی مقام متعین ہو۔ آپ کو محبت کے ساتھ عزت بھی مل سکے۔

نسیم بانو۔ کراچی

میرا رشتہ ماموں کے ہاں بچپن سے طے ہے' یہ بات مجھے اس وقت بتائی گئی جب میں نے بی اے کیا اور ماموں شادی کا تقاضا کرنے کے لیے گھر آئے۔ مجھے یہ سن کر شدید جھٹکا لگا' میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ماموں کا بیٹا میٹرک پاس تھا' میٹرک بھی اس نے بڑی مشکل سے کیا تھا۔ شکل و صورت ٹھیک تھی۔ ماموں کے ساتھ ہی کام کرتا تھا لیکن سب سے بڑی خرابی اس میں یہ تھی کہ وہ نشے کا عادی تھا۔ ہر قسم کا نشہ کرتا تھا' اس کی چھوٹی بہن جو میرے ساتھ پڑھتی تھی' وہ مجھے اس کی ساری باتیں بتاتی تھی۔ میری طرح وہ بھی اس بات سے لاعلم تھی کہ اس کے بھائی سے میری بات طے ہے۔ وہ گھر کی سب باتیں بتاتی تو بھائی کا ذکر بھی کرتی اگر اسے اس رشتہ کا علم ہوتا تو شاید وہ محتاط رہتی۔

جب میں نے گھر والوں کو یہ بات بتائی اور اس رشتے پر شدید احتجاج کیا تو انہوں نے کہا "شادی سے پہلے سب ایسے ہی ہوتے ہیں' شادی کے بعد جب ذمہ داری پڑے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" آپ مجھے بتائیں، کیا وہ ٹھیک ہو جائے گا؟ کیا وہ نشہ چھوڑ سکتا ہے؟

ج: جب اس قسم کے خط ملتے ہیں تو مجھے شدید حیرانی ہوتی ہے' والدین نہایت ناز و نعم سے اپنی بچیوں کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کے لیے ایک جوتی' ایک سوٹ کے انتخاب کے لیے دس دکانیں چھانتے ہیں لیکن جب ان کے لیے زندگی بھر کے ساتھی کے انتخاب کا مرحلہ آتا ہے تو اس وقت ان کے نزدیک اولاد کی زندگی کے بجائے اپنے بہن بھائیوں اور خاندانی رشتوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ رشتے قائم رہیں' خواہ اولاد تمام زندگی رو رو کر گزارے۔

نشہ چھوٹ سکتا ہے لیکن اس وقت جب کوئی سچے دل سے چھوڑنا چاہے۔ اس کے لیے باقاعدہ علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ لڑکا نشہ چھوڑنا چاہتا ہے یا چھوڑ دے گا۔

بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے والدین کو سمجھائیں کہ وہ آپ کی زندگی کو کسی امتحان میں نہ ڈالیں' کسی شریف لڑکے کا انتخاب کریں خواہ غریب ہی ہو۔

☆

بیوٹی بکس

امت الصبور

شاہدہ امام...... کراچی

س: بچپن میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بہت چھوٹی عمر میں کچن سنبھالنا پڑا۔ میرے ہاتھوں اور کلائیوں پر جلنے کے نشانات ہیں۔ کیا یہ نشانات غائب ہو سکتے ہیں۔ میں مہنگی کریمیں نہیں خرید سکتی۔ کوئی آسان سا نسخہ بتایئے گا؟

ج: شاہدہ! آپ درج ذیل نسخوں پر عمل کریں۔

(1) ایلو ویرا جسے گھیکوار بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا گودا لے کر نشانات پر دائروں کی شکل میں ملیں پھر آدھے گھنٹے کے لیے یوں ہی چھوڑ دیں۔ بعد میں دھولیں۔

(2) ناریل کا تیل گرم کرلیں پھر اپنی ہتھیلی پر لے کر پانچ، دس منٹ تک مساج کریں۔

(3) لیموں کا رس ان داغوں پر لگائیں۔ دس منٹ بعد دھولیں۔ اس سے نہ صرف نشانات غائب ہو جائیں گے بلکہ جلد بھی صاف اور چمک دار ہو جائے گی۔

زینب خان...... پشاور

س: میرا رنگ بہت گورا تھا۔ مجھے ٹائی فائڈ ہوا تو چہرے کا رنگ بہت خراب ہو گیا ہے، ہاتھ پاؤں کی جلد بھی عجیب ہو گئی ہے۔ پیر پھٹ جاتے ہیں۔ چاہے جتنا بھی رگڑ کر دھولوں، ایڑیاں صاف نہیں ہوتیں؟

ج: بیماری کے بعد اگر یہ خرابیاں پیدا ہوئی ہیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ جسمانی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوا اور غذا جزو بدن نہیں بن رہی ہے۔ سب سے پہلے تو آپ غذا کی طرف توجہ دیں۔ ٹائی فائڈ کے بعد کچھ عرصے تک پرہیز لازم ہے، خاص طور پر تلی ہوئی بیکری کی اشیاء اور مٹھائی وغیرہ کا گھی، تیل بھی کم استعمال کریں۔ ناشتے میں دودھ، دلیہ، اور پھلوں کا استعمال کریں۔ دوپہر کا کھانا ایک چپاتی ہلکے نمک مرچ کے شوربے سے کھائیں۔ زیادہ تیز مسالہ دار اشیاء سے فی الحال پرہیز کریں۔ کچھ عرصے بعد استعمال کرسکتی ہیں کھانے میں لوکی اور چقندر کا استعمال زیادہ کریں۔ رنگ صاف کرنے اور جلد کو چمک دار بنانے کے لیے درج ذیل نسخوں پر عمل کریں۔

(1) دودھ میں بادام پیس کر اس کو کریم جیسا بنائیں۔ اسے چہرے پر دس منٹ تک لگا رہنے دیں پھر منہ دھولیں۔

(2) ایک انڈے کی سفیدی، شہد لے کر اس کو اچھی طرح پھینٹ لیں جب وہ جھاگ کی طرح ہو جائے تو اس میں ایک چمچہ لیموں کا رس اور ایک چمچہ شہد ملالیں۔ اس کو روئی کے پھاہے سے چہرے پر لگائیں۔ جب خشک ہو جائے تو چہرہ صاف پانی سے دھوئیں۔

(3) رات سونے سے پہلے ایک چمچ بالائی میں آدھے لیموں کا رس ملالیں اور چہرے پر لگا کر اچھی طرح جذب کریں پھر منہ دھو کر چہرے پر کوئی کولڈ کریم لگائیں۔ جن بہنوں کے چہرے پر مہاسے اور کیل وغیرہ ہیں، وہ بالائی کے بجائے لیموں کے رس میں شہد ملا کر لگائیں۔

(4) ہاتھوں اور پیروں کے لیے ایک چمچہ لیموں کے رس میں ایک چمچہ گلسرین ملالیں پھر چھوٹی چمچی بورک پاؤڈر ملا کر تینوں کو یکجا کرلیں۔ ایک شیشی میں ڈال کر باتھ روم میں رکھیں ہر وضو کے بعد اس کو لگائیں۔ ہاتھ، پیروں کی جلد نرم ہو جائے گی اور رنگت بھی نکھر آئے گی۔

خالدہ...... لیہ

فوری طور پر آنکھوں کے گرد کے حلقے چھپانے کے لیے کوئی طریقہ بتائیں۔ کیونکہ میری اس ماہ شادی ہے میں پارلر نہیں جاسکتی۔

آنکھوں کے گرد حلقوں کی ایک وجہ نیند کی کمی ہے۔ خون کی کمی تھکن اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے بھی آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ پوری نیند لیں۔ کم از کم آٹھ گھنٹے کی نیند بہت ضروری ہے۔ فوری طور پر حلقے کم کرنے کے لیے میک اپ سے پہلے آلو کے قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ دس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ چار گھنٹے تک یہ حلقے نظر نہیں آئیں گے۔